اشرافیہ اور عوام

سعید آسی

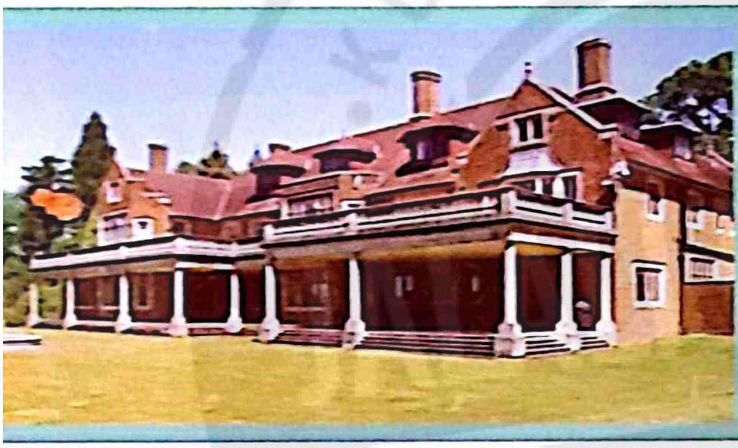

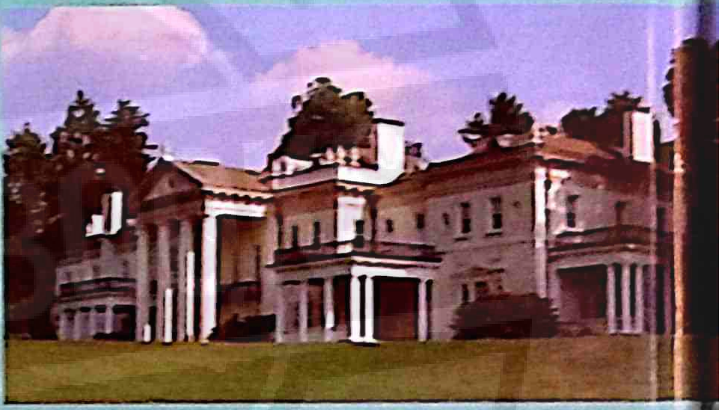

منتخب کالموں کا مجموعہ

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

اشرافیہ اور عوام

سعید آسی

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

2021ء

نام کتاب : اشرافیہ اور عوام

مصنف : سعید آسی

بہ اہتمام : علامہ عبدالستار عاصم

ناشر : قلم فاؤنڈیشن، انٹرنیشنل

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

ملنے کا پتا

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ لاہور کینٹ پاکستان

0300-0515101 / 0323-4393422

qalamfoundation3@gmail.com

انتساب

اپنی معصوم و بے باک پوتی

صوفیا شاہد

کے نام

جس کی دنیا کو کھوجنے کی لگن

مجھے زندہ رہنے پر اکساتی ہے

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

فہرست

حرفِ اوّل	سعید آسی	11
''اسیں اپنے آپے مرجانا''		14
''ستے خیراں''		17
بجٹ سے پہلے کی خوش گمانیاں		20
کرونا ویکسین پر سیاست		23
''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا''		26
راہِ ہدایت کا متقاضی کرونا کا خوف		29
کرونا پر تصدیق کی متقاضی کچھ کہانیاں		33
کرونا کا خوف اور میرا تجسّس		36
جو سکھایا سبق ''کرونا'' نے		39
مسلمانوں کے حصّے میں آئی تضحیک		42
خدا کی رسّی		45
ڈھونگی سوامی وشوا آنند		48
خوف اور لاک ڈاؤن پر دنیا کی کھلتی زبانیں		52
اتھل پتھل کا اہتمام		55
خوف اور حقارت		58
گوروں کے دیس کا باسی خالص پاکستانی		61
''عمرِ رواں'' میں عمرِ رفتہ کی یادیں		64

✧ ''الٰہی خیر ہو''	68
✧ رفتگاں کی یادیں' توبہ توبہ	71
✧ دکھوں کی سانجھ۔ میں اور رؤف طاہر	75
✧ آہ! ظفر اللہ جمالی' قادر حسن اور ناظم شاہ	80
✧ ''ناکردہ گناہی بھی گناہوں میں چلی آئے''	85
✧ آسودۂ خاک ہستیاں پیر کبیر شاہ اور رحمت علی رازی	88
✧ اسے بہت جلدی تھی	92
✧ سعید اظہر سے تعلقِ خاطر کی چار دہائیاں	96
✧ ڈاکٹر مبشر حسن اور یادوں کے کھلتے در	100
✧ مجید نظامی اور میری نیاز مندی	105
✧ نوائے وقت کے 81 سال	109
✧ ''معاملہ ہی کیا ہوا گر زیاں کے لیے''	114
✧ پی آئی سی واقعہ۔ انا کی تسکین یا محرومیوں کا غصہ؟	118
✧ میں علامہ صاحب کیلئے دعا گو ہوں	122
✧ پریس کلب کا مقبوضہ پلاٹ اور میری یادیں	127
✧ ''ایہہ گلاں ہُن کرن دیاں نئیں''	138
✧ عوامی مقبولیت کے زعم سے لگی رونقیں	141
✧ سیاست اور موسم کا تغیّر و تبدل	144
✧ ماہِ مقدس اور تکریمِ انسانیت	148
✧ ''میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا''	151
✧ جتن سے پکائی کھیر پر فاتحہ	154
✧ ریاست' آئین اور عوام کی درگت	157
✧ ٹامک ٹوئیاں	161

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

✧ اصلاحِ احوال۔تنقید وتجاویز	164
✧ ہماری جمہوریت کا ''مینوفیکچرنگ فالٹ''	168
✧ سینٹ انتخابات کے اسباق	171
✧ سیکرٹ بیلٹ۔کہیں ہپ' کہیں تھو	175
✧ ضرورت ہے ''فرمانِ امروز'' کی	179
✧ خرابی کے در	183
✧ چودھری شجاعت کی تڑپ	186
✧ ''الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا''	189
✧ پہلا دن	192
✧ لمحۂ خیر کیلئے لمحۂ فکریہ	196
✧ بھٹکاوے کا عنصر اور رائیگانی کا سفر	199
✧ ''یہ روایت میری سرکار نہ ڈالی جائے''	202
✧ ''میرا کہا لکھ لو''	206
✧ گلگت بلتستان کے انتخابی نتائج اور ڈراؤنے خواب	209
✧ امریکی عوام کے شعور کو میرا سلام	213
✧ جمہور کو رگڑے	217
✧ جمہوریت کو گرانے کے جتن	221
✧ مہنگائی کے توڑ کا مجرب نسخہ	224
✧ اندھا قانون اور اُجلا انصاف	228
✧ سیاسی مخالفین کو بزور دبانے کا شاہکار کلچر	231
✧ ہائے ری ہماری توقعات	235
✧ ''پر اجے قیامت نہیں آئی''	238
✧ ''افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر''	242

✧ ''اتنے نہ در بناؤ کہ دیوار گر پڑے''	246
✧ آگے آپ کی مرضی ہے	250
✧ بس آگاہ رہیے جناب!	253
✧ ''مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ''	256
✧ ٹرمپ، مودی گٹھ جوڑ اور ہماری خوشیاں	260
✧ دوسروں کیلئے بوئے کانٹوں سے اپنی آزمائش	264
✧ فاضل عدلیہ کا گھر کا معاملہ	268
✧ ''بھول کس سے ہوئی ہے''	271
✧ آگے آپ خود سمجھدار ہیں	275
✧ پانچ جولائی کا جواز اور سبق	278
✧ دہری شہریت - آئین وقانون کی حکمرانی یا جنگل کا معاشرہ؟	282
✧ لاشوں پر حکومت	286
✧ سابق حکمرانوں کی ''خرابیاں''	289
✧ پاکستان کا سیاسی نقشہ اور ریڈکلف ایوارڈ	292
✧ بنی اسرائیل۔ مشیت ایزدی اور ہماری آزمائش	295
✧ قومی حمیت اور قومی تشویش	299
✧ ''یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو''	302
✧ ''اے چاند یہاں نہ نکلا کر''	306
✧ ''دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ''	310
✧ میکرون کی مکروہ حرکت	313
✧ پوائنٹ سکورنگ کی ظالم سیاست	316
✧ مسلم دنیا اور اقوام متحدہ کی افادیت کا سوال	320
✧ گورننس کا چیلنج اور عوام کا اضطراب	324

✧ ٹرمپی ثالثی اور افغان امن عمل کا کباڑہ	328
✧ بسم اللہ کیجئے جناب!	331
✧ نازشاہ کی پکار اور ہمارا احساسِ زیاں؟	335
✧ پاکپتن کا سفر اور کیفیت دل	339
✧ قائداعظم کی فہم وبصیرت اور ہماری عاقبت نااندیشیاں	342
✧ ستمبر 65ء کا جذبہ اور آج کے حقائق	346
✧ ''اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا	349
✧ ''بُل فائٹنگ'' کی منظر کشی	353
✧ ''تیری کیا اوقات ہے بندے جس پہ تُو اتراتا ہے''	356
✧ ''ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی''	360
✧ ہاتھ الٹا گھما کر کان پکڑنے کی کوشش	363
✧ افغان الیکشن کمشن کا ''معرکہ'' اور ہماری سر پھٹول	366
✧ مشرف کیس کا مفصل فیصلہ اور آئین کی پاسداری کا سوال	370
✧ گزرتے سال کا آخری المیہ	374
✧ سوال ترمیم کا نہیں، سول سپریمیسی کا ہے	377
✧ ''ناطقہ سربگریباں ہے، اسے کیا کہیے''	381
✧ عوام اور اشرافیہ کے لئے الگ الگ قانون کا پراپیگنڈا	385
✧ ''بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے''	389
✧ چھپن چھپائی کا سفاکانہ کھیل	392
✧ یوم اقبال اور کرتارپور راہداری	395
✧ کرتارپور راہداری والی سرشاری	398
✧ دہشتگردی کی اصل تشریح اور حکمرانوں کی منشاء	401
✧ لاک ڈاؤن نہیں، آنکھ کی شرم کا اہتمام کریں	404

✧ ''یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا''	407
✧ کریڈٹ اور دُہائی	411
✧ نظریہ ضرورت کو پہلا ڈنٹ	414
✧ عاصمہ جہانگیر	421
✧ انڈہ پہلے یا مرغی	426
✧ بھٹولیگیسی اور زرداری قیادت	429

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

حرفِ اول

مجھے اکثر یہ سوچ الجھائے رکھتی ہے کہ خالق کائنات، رب کعبہ کی منشاء اپنے بندوں میں کسی قسم کی تفریق یا امتیاز پیدا کرنے کی تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بندوں میں امتیاز اپنے رب کی تابع فرمانی، عبادت گزاری، نیک اعمال اور خالقِ کائنات کی مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کے حوالے سے تو ہو سکتا ہے اور یہی معاملات کسی انسان کے لئے جنت اور دوزخ کے ابدی ٹھکانے کا تعین کرتے ہیں مگر انسانوں میں امیری اور غریبی کا امتیاز پیدا کرنا انسانوں کی اپنی ذہنی اختراع یا فتور ہے۔ جس رب کعبہ نے ہوا، پانی اور دوسرے قدرتی وسائل پر ہر ذی روح کو مساوی دسترس دے رکھی ہو جس کا چھین لیا جانا کروفر میں پڑے اور کبریائی کی متعفن سوچ میں ڈوبے انسانوں سمیت ہر ذی روح کی ایک ہی لمحے میں یکا یک موت کا باعث بنے گا اور وہی روز قیامت ہوگا۔ تو وہ رب کعبہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو وسائل سے مالا مال کرنے اور کسی کے لئے وسائل سے محرومی کا کیونکر روادار ہو سکتا ہے۔ یہ سب انسانی ذہن کی شیطانیت ہے جو قومی اور قدرتی وسائل کی لوٹ مار کرنے والے انسانوں میں دوسروں پر برتری کا خناس پیدا کرتی ہے اس لئے میں کچھ لکھنے کیلئے قلم اٹھاتا ہوں تو انسانوں کے مابین روا رکھے جانے والے امتیاز کو میرا دل حکم خداوندی کے کھاتے میں ڈالنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر خدمت خلق کو خداوند کریم اور رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے افضل عبادت کا درجہ دیا ہے تو ایک انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کا استحصال اور اس تناظر میں اس کا مظلوم ہونا خالق کائنات اور خاتم النبیینؐ کو کیسے گوارا ہو سکتا ہے چنانچہ میرے ذہن میں اس معاملہ میں کوئی ابہام نہیں کہ انسانوں کے مابین اونچ نیچ، امتیاز اور تفریق کے کارنامے ہم نخوت و تکبر کے مارے انسان خود ہی سرانجام دیتے ہیں۔ میں اکثر اپنے کالموں اور شاعری میں اس انسانی علت کو ہی فوکس کرتا ہوں اور یقین کامل رکھتا ہوں کہ خالقِ کائنات کی کسی ایک مخلوق کی کسی دوسری

مخلوق کے ساتھ زیادتی پر اسے خالق کائنات کی جانب سے ہی سزاوار ہونا ہے۔ چاہے وہ اس فانی دنیا میں سزا بھگتے یا آخرت میں۔ خدا کی رسی نے اسکی گرفت کرنی ہی کرنی ہے۔

اسی طرح میں انسانی معاشرے میں آئین' قانون اور انصاف کی عملداری کا بھی قائل ہوں اور اس میں کسی قسم کی گرہ لگانا بھی میں گناہِ کبیرہ اور جرم عظیم سمجھتا ہوں۔ اگر ہمارے معاشرے میں آئین وقانون کی حکمرانی' انصاف کی عملداری اور شرف انسانیت والی انسانی اقدار نہیں پنپ پائیں تو اس معاملہ میں بھی انسانی برتری والا زعم ہی کارفرما رہا ہے۔ حکمران اشرافیہ طبقات اسی خناس کا شاہکار ہوتے ہیں جن کے بارے میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے بجا طور پر یہ فتویٰ دیا تھا کہ......ع

پیتے ہیں لہو' دیتے ہیں تعلیم مساوات

اقبال نے اپنی نظم ''شکوہ' جواب شکوہ'' میں مالک ارض وسما خداوند کریم کے ساتھ زمینی خداؤں کا ان اشعار کے ذریعے کیا خوب موازنہ کیا ہے کہ......

تم ہو آپس میں غضبناک' وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں' وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

سو آئین وقانون کے تحت قائم کسی سسٹم پر مجھے انسانی نخوت وتکبر حاوی ہوتا نظر آتا ہے تو میرا قلم بھی اس پر سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ میں نے اپنے قلم کے اس احتجاج کو ہی اپنے منتخب کالموں کے نئے مجموعہ ''اشرافیہ اور عوام'' کے صفحات میں سمویا ہے۔ جس عرصے کے دوران یہ کالم لکھے گئے اس میں کرونا وائرس کی غضبناکیوں سے انسانی معاشروں اور معیشتوں میں رونما ہوتی اتھل پتھل کے مناظر بھی شامل ہیں اور وزیراعظم عمران خان کے ریاست مدینہ کی طرز پر پاکستانی معاشرہ تشکیل دینے کے دعوؤں کے برعکس انسانی کسمپرسی اور بے حالی و بدحالی کے اندوہناک مناظر بھی اسی عرصہ کا خاصہ بنے ہیں جس کی جھلک آپ کو ''اشرافیہ اور عوام'' میں شامل میرے

کالموں میں نظر آئے گی۔ میں بہر صورت تکریم انسانیت کا داعی و قائل ہوں اس لئے تحقیر انسانیت پر میرا دل کڑھتا اور جلتا ہے، چاہے اس کا اہتمام کرونا وائرس کا خوف پیدا کر کے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ اس معاملہ میں مجھے آپ کی تعریف و توصیف کی نہیں، حمایت اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ کرونا وائرس کو خود بھی بھگت کر میں انسانی امتیاز اور تحقیر انسانیت کا باعث بننے والی کسی بھی سوچ کو حکمِ ربی سمجھ کر قبول کرنے کو ہرگز آمادہ نہیں۔ خدا ہمیں انسانی نخوت و تکبر کی بیماری سے محفوظ فرمائے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

سعید آسی

سبزہ زار سکیم، لاہور

6/جون 2021ء

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

''اسیں اپنے آپے مر جانا''

ہم نہ جانے کن کن مافیاز کے شکنجے میں جکڑے زندگی کو بے ڈھب انداز میں گزار رہے ہیں۔ کبھی ہم شوگر مافیا کی مسلط کردہ مہنگائی کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہوتے ہیں، کبھی فلور ملز مافیا اور آئل مینوفیکچررز اپنی من مانیوں پر اتر کر ہمیں یرغمال بنائے رکھتے ہیں اور کبھی فارماسیوٹیکل کمپنیاں کمیشن پر رکھے گئے اپنے ڈاکٹروں کے ہاتھوں کسی معمولی مرض کی بھی مہنگی ترین اور غیر ضروری ادویات تجویز کرا کے ہماری جیبوں پر ڈاکے ڈال رہی ہوتی ہیں۔ یہ سارے مافیاز درحقیقت حکومتوں کی چھتری کے نیچے پروان چڑھتے ہیں اور حکمران طبقات کے انکے ساتھ مفادات وابستہ ہوتے ہیں تو ان کیلئے حکومتی گورننس بھی آنکھیں موند لیتی ہے یا ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح اس ڈھیل میں یا خفیہ اور ظاہری آشیرباد کے تحت حکومتی چھتری کے نیچے ان مافیاز کے کاروبار چل اور چمک رہے ہوتے ہیں۔ عوام روزافزوں مہنگائی کے ہاتھوں لٹتے، پستے ہوئے چیخ و پکار کرتے ہیں تو حکومتی اکابرین کی جانب سے بھی محض طفل تسلی کیلئے مہنگائی پر تشویش کا اظہار اور اس پر قابو پانے کے اقدامات کی ہدایات پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر پڑھی، سنی اور دیکھی جانے لگتی ہیں مگر مہنگائی کے عفریت کو قابو کرنا حکمران اور مافیاز کے مفاداتی طبقات کا مطمح نظر ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے دکھاوے کو کسی بے ضابطگی، ناجائز منافع خوری اور اس مقصد کیلئے پیدا کی گئی مصنوعی قلت کے اسباب کی ''تہہ'' تک پہنچنے کیلئے انکوائری اور جوڈیشل کمیشن بھی قائم ہو جاتے ہیں اور قوم کو لالی پاپ دے دیا جاتا ہے کہ فلاں کمیشن کی رپورٹ آتے ہی ''کلپرٹس'' قانون و انصاف کے شکنجے میں آ جائیں گے، پھر رپورٹ منظر عام پر آتی ہے۔ مصنوعی گرانی اور قلت پیدا کرنیوالے کرداروں کے نام بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ دو چار دن سخت ایکشن اور متعلقین کو کیفر کردار کو پہنچانے کے دل خوش کن بیانات حکمران طبقات کی جانب سے سننے کو ملتے ہیں اور پھر مافیاز کے معاملات پر آنکھیں دوبارہ کبوتر کی طرح بند کر لی جاتی ہیں جیسے کوئی سانحہ جو گزر گیا ہے، کبھی رونما ہی نہ ہوا ہو۔ تو جناب! ان

مافیاز کو حکومتی سرپرستی حاصل ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور بھلا کیا ہوسکتا ہے کہ انکے معاملات میں انکوائری اور جوڈیشل کمیشنوں کی رپورٹیں بھی دب جاتی ہیں اور دھن دولت کی دیوی انہیں کورنش بجالاتی نظر آتی ہے۔ ان من مانیوں میں مصنوعی مہنگائی پیدا کر کے صرف لوٹ مار ہی نہیں کی جاتی' دونمبر ادویات اور کھانے پینے کی ناقص اشیاء کی تیاری کیلئے جعلسازی کر کے انسانی صحت برباد کرنے کا مکروہ کھیل بھی آزادانہ کھیلا جاتا ہے۔

جب مافیاز کے معاملہ میں کسی احتساب اور جوابدہی کا کوئی تصور ہی باقی نہ رہ گیا ہو تو وہ اپنے تیار کردہ زہر کو بھی جام صحت بنا کر فروخت کرنے میں مکمل آزاد ہونگے' اور کسی بے چارے کو کوئی مرض لاحق بھی نہ ہو تو وہ فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے رکھیل ڈاکٹروں کے مشورے پر الا بلا قسم کی ادویات استعمال کر کے مرض الموت کو گلے لگا بیٹھتے ہیں۔ مجھے مختلف عوارض کے باعث اپنی صحت کے حوالے سے تجسس رہتا ہے اور میں متعلقہ مرض سے افاقہ کیلئے دستیاب مختلف ادویات کی چھان پھٹک کرتا رہتا ہوں۔ گوگل سرچ سے بھی کچھ معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ بالخصوص شوگر' کولیسٹرول' یورک ایسڈ کی زیادتی کے اسباب و محرکات کا کھوج لگانے کیلئے میرا تحقیق کا عمل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ کئی عوارض کے حوالے سے تو کئی خوفناک انکشافات بھی میرے سامنے آجاتے ہیں۔ ہم شوگر کے دائمی مرض سے پریشان رہتے ہیں اور ڈاکٹر تبدیل کرتے ہیں تو ادویات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ کئی بے چارے تو صبح شام انسولین کا انجکشن لگا کر بے حال و نڈھال ہوئے ہوتے ہیں اور اذیت ناک زندگی گزارتے ہیں جبکہ میری تحقیق میں آنے والی ایک جید ڈاکٹر کی رپورٹ نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا جنہوں نے دنیا کے معروف ڈاکٹروں کی تحقیق اور عرق ریزی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ 200 تک کے شوگر لیول پر کوئی شخص شوگر کے مرض میں لاحق نہیں ہوتا۔ مگر ڈاکٹروں کی تجویز کردہ ادویات استعمال کرتے کرتے وہ شوگر کا مریض بن جاتا ہے۔ انکے بقول شوگر کے مرض کا علاج ادویات سے زیادہ غذا کی پرہیز اور ایکسرسائز میں ہے۔ آپ پرہیزی غذا اپنا معمول بنالیں تو شوگر کا مرض آپکے قریب بھی نہیں پھٹکے گا مگر آپ چاہے کسی مستند ڈاکٹر سے بھی رجوع کرینگے تو وہ آپ کو خوفزدہ کر کے مختلف ادویات کے استعمال کا عادی بنادیگا کیونکہ یہ ادویات تجویز کرنے کا ہی اس ڈاکٹر کو متعلقہ فارماسیوٹیکل کمپنیوں کی جانب سے کمیشن ملتا ہے۔

ارے صاحب! اور تو اور۔ معروف عالمی فارماسیوٹیکل کمپنیوں نے اب ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ حکومتوں کو بھی خریدنا شروع کردیا ہے۔ اس وقت پوری دنیا کرونا وائرس کی مختلف اقسام کے

پھیلاؤ کے خوف میں مبتلا ہے اور اس سے چھٹکارے کا ہر ممکن چارہ کیا جارہا ہے۔ بے شک کسی مرض کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے اور جس قدرتی آفت نے گزشتہ تقریباً دو سال سے پوری دنیا کو جکڑا اور مضبوط معیشتوں تک کی تباہی کا اہتمام کر رکھا ہے' اسے تو ہرگز معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس مرض سے بچاؤ کیلئے چین' امریکہ' برطانیہ سمیت دنیا بھر کی مستند سائنسی' تحقیقاتی لیبارٹریوں میں کئی مہینوں کی ریسرچ کے نتیجہ میں مختلف ویکسینز منظر عام پر آئیں اور جھٹ پٹ ان کا استعمال بھی شروع ہوگیا۔ پھر مؤثر اور مضر صحت ویکسین کی مختلف تھیوریاں سامنے آئیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کیلئے بعض ویکسینز کے بارے میں شکوک و شبہات بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں خود ایسٹرازینیکا ویکسین لگوانے کے بعد اس کیخلاف جاری پراپیگنڈا سے متاثر ہوا اور نڈھال رہا تاہم اسکے مضر اثرات کے حوالے سے سارے شکوک و شبہات آہستہ آہستہ زائل ہوگئے۔ اس موذی مرض کا ویکسین ہی اس وقت واحد علاج ہے تو اس سے اجتناب کیوں' مگر ہمارے تو خود کئی ذمہ داران نے ویکسین لگوانے کے معاملہ میں شکوک و شبہات پیدا کئے ہیں۔ پنجاب کی وزیر صحت یاسمین راشد نے جو خود ڈاکٹر بھی ہیں' باقاعدہ پریس کانفرنس کا اہتمام کرکے ویکسین کے ممکنہ مضمرات سے لوگوں کو خوفزدہ کیا اور اعلان کیا کہ میں ہرگز ویکسین نہیں لگواؤں گی۔ اور اب تو کمال ہی ہوگیا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل صحت میجر جنرل عامر اکرام نے گزشتہ دنوں ایک سیمینار میں خطاب کرتے ہوئے اپنے تئیں انکشاف کیا کہ پاکستانی باشندوں کو کین سائنو ویکسین اسکے مضمرات کا کھوج لگانے کیلئے بطور ٹرائل لگائی گئی جس سے پاکستان نے یہ ویکسین تیار کرنے والی کمپنی سے ایک کروڑ ڈالر کمائے۔ انکے بقول کئی اور ممالک بھی اپنی ویکسین کے فیز تھری کا کلینکل ٹرائل پاکستان میں کرنا چاہتے ہیں جس سے پاکستان کو کروڑوں ڈالر کی آمدنی ہوگی۔ یقیناً اس مقصد کے تحت ہی ہر فرد کیلئے ویکسین لگوانا لازمی قرار دیا گیا ہے چنانچہ پاکستان اور پاکستانیوں کو محض کمیشن کی خاطر ویکسین کے مضمرات جانچنے کی تجربہ گاہ بنا دیا گیا ہے۔ اقبال نے بہت پہلے کہا تھا کہ ''قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند''۔ خدا اس قوم کو ہر افتاد و آفت سے محفوظ رکھے مگر ہمارا چال چلن تو ''آ بیل مجھے مار'' والا ہی لگتا ہے۔ گویا۔۔۔

اسیں اپنے آپے مر جانا
ایہہ کھچ لو رسا پھاہے دا

''ستے خیراں''

ویسے تو فرزندِ راولپنڈی شیخ رشید کا یہ بیان بھی ان کی چھوڑی جانے والی ''پھلجڑیوں'' ہی میں شامل ہوگا کہ عمران خاں مقدر کا سکندر ہے جسے نکمی، نااہل اور نالائق اپوزیشن ملی ہے مگر ہماری اپوزیشن بھی تو شیخ رشید ہی نہیں، ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان اور شہباز گل کی چھوڑی گئی پھلجڑیوں کو بھی عوام سے بطور حقیقت تسلیم کرانے پر تلی بیٹھی ہے۔ شاید عمران خاں کو بھی 2018ء کے انتخابات میں حکومت سازی کے لیے عددی اکثریت حاصل نہ کر پانے کے باوجود اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ وہ کسی کی بیساکھیاں استعمال کر کے مسند اقتدار سنبھال لیں گے تو اپوزیشن بنچوں پر آنے والے لوگوں سے انہیں اپنے اقتدار کے لیے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہوگا اس لیے انہوں نے اپنے اس بیان سے رجوع کر کے اقتدار حاصل کرنے کو ترجیح دی کہ انہیں اقتدار کے لیے عوامی اکثریت حاصل نہ ہوئی تو وہ اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنا قبول کر لیں گے مگر اقتدار کے لیے کسی کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوں گے۔

عمران خاں نے اقتدار میں آنے کے لیے جن جماعتوں اور آزاد ارکان کی حمایت حاصل کی اور ان کی مدد سے وہ وفاق ہی نہیں، پنجاب میں بھی حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے، انہیں اپنے ساتھ ملائے رکھنے کے لیے بے شک انہیں قدم قدم پر ان کے ہاتھوں بلیک میل ہونا پڑا ہے مگر اپنے اقتدار کے تین سال کے دوران انہیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے علاوہ سینیٹ میں بھی اپوزیشن بنچوں کی جانب سے اپنے اقتدار کے کھو جانے والا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ اپوزیشن کی جانب سے انہیں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تو صدر مملکت کے انتخاب کے مرحلے میں ہی آ گیا تھا۔

یہ میری ہی نہیں کئی مستند سیاسی اور آئینی حلقوں کی بھی رائے تھی کہ قومی، صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ میں جتنے لوگ اپوزیشن بنچوں پر بیٹھے ہیں وہ یکسو ہو کر صدر کے لیے اپنا امیدوار لائیں تو

حکمران جماعت کے امیدوار کے مقابلے میں اس کی کامیابی یقینی ہے۔مگر جن اپوزیشن جماعتوں نے اپنی اپنی موقع پرستی اور مفاد پرستی کی سیاست کے تحت عمران خاں کے اقتدار کی راہ ہموار کی اور انہیں پنجاب میں بھی پی ٹی آئی کی حکومت بنانے کا آسان موقع فراہم کر دیا، ان کی قیادتیں صدر کے لئے مشترکہ امیدوار لانے پر بھی متفق نہ ہو سکیں اور اس طرح ماسوائے سندھ کے وفاق اور صوبوں میں عمران خاں کا طوطی بولنے لگا۔اس سے یہ اہم نکتہ ان کے دماغ میں سما گیا کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ ساتھ چاہے عوام کو بھی زچ کر لیں اور ان کے روٹی روزگار کے مسائل اپنے پارٹی منشور کے مطابق حل نہ کرنے کا بھی طے کر یں۔اپوزیشن بنچوں پر بیٹھے لوگ ان کے طرز حکمرانی کے لیے کسی قسم کا چیلنج نہیں بن سکیں گے۔ چنانچہ پی ٹی آئی حکومت نے پورے اطمینان کے ساتھ پٹرولیم، گیس، بجلی، ادویات کے نرخ بتدریج بڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کیا' روپے کے مقابلے میں ڈالر کو بھی جستیں بھرنے کا نادر موقع فراہم کیا' ضمنی میزانئے لا کر بھی عوام پر ٹیکسوں کا نیا بوجھ ڈالا' آئی ایم ایف کی شرائط کے ساتھ اس کا بیل آؤٹ پیکج بھی قبول کر لیا اور اس کے عوض عوام کے تن کے کپڑے اُتار کر آئی ایم ایف کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ پھر قومی میزانیوں میں براہ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں کے انبار لگا کر عوام کے لیے مرے کو مارے شاہ مدار والا ماحول بنایا اور ان کے بے حس و بے بس ہونے پر انہیں شتر بے مہار مہنگائی کے ساتھ ساتھ لا انتہاء بے روزگاری کے بھی جھٹکے لگانا شروع کر دیئے مگر اپوزیشن جماعتوں نے ان کی حکومت کو گزند نہ پہنچنے دینے کی پالیسی اختیار کر لی۔عمران خاں اور ان کی ٹیم نے احتساب کے حوالے سے اپوزیشن جماعتوں کے قائدین کو بھی خوب رگڑا لگایا۔انہیں چور ڈاکو کے لقب سے نوازا اور ان کی تحقیر و بے توقیری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو طوعاً کرہاً اپوزیشن جماعتوں نے پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (پی ڈی ایم) کے نام سے اتحاد تشکیل دے کر حکومت کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔اس پلیٹ فارم پر اپوزیشن کے ملک بھر میں یکے بعد دیگرے سات بڑے جلسے ہوئے۔عوام اپنے گوناں مسائل کی بنیاد پر پی ڈی ایم کی تحریک کا چارہ بننے کے لیے خوش دلی سے آمادہ ہو گئے اور تحریک میں ایسی جان پڑ گئی کہ حکومت کو اپنی بقاء کے لالے پڑ گئے۔ ماحول اور منظر ایسا بن گیا کہ فی الواقع ''صبح گیا یا شام گیا'' والی کیفیت نظر آنے لگی۔ بلاول اور مریم میں بہن بھائی والا مثالی رشتہ استوار ہوتا نظر آیا اور حکمران جماعت کی اپنی صفوں میں بھی کھلبلی پیدا ہونے لگی۔اسی فضا میں متعدد ضمنی انتخابات کے مراحل آئے جن میں اپوزیشن کامیابی کے جھنڈے گاڑتی

چلی گئی۔ پھر سینیٹ کے انتخابات کا مرحلہ آیا تو اس میں بھی اپوزیشن سرخرو اور حکومت زچ ہوتی نظر آئی اور پھر سینیٹ کے قائد حزب اختلاف کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو یکا یک پانسہ ہی پلٹ گیا۔ پیپلز پارٹی اور اے این پی نے مسلم لیگ (ن) اور مولانا فضل الرحمان سے یوں راہیں جدا کیں جیسے ان میں کبھی کوئی قربت پیدا ہوئی ہی نہیں تھی۔

کہاں وہ متحدہ اپوزیشن کہ ''ان ہاؤس'' تبدیلی کے حالات مکمل سازگار بنا چکی تھی اور کہاں یہ اپوزیشن کہ اپوزیشن بنچوں پر اسکے اتحاد کا دور دور تک کہیں گمان نظر نہیں آتا۔ آخر اس اپوزیشن اتحاد کو بے وقعت بنانے اور توڑنے کے لیے کہیں سے تو بجلی کڑکی ہوگی کہ ماضی قریب میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑنے اور ماضی کی طرح کسی کے اشارے پر نہ ناچنے کا عہد و پیمان کرنے والے ''بہن بھائی'' کی جبینوں پر بھی ایک دوسرے کے لیے ناگوار شکنیں پیدا ہوتی نظر آنے لگیں، اب اس اتحاد کی جوتیوں میں دال بٹ چکی ہے تو حکومت کے لیے عوام دشمن بجٹ منظور کرانے میں بھی کیا امر مانع ہو سکتا ہے۔

آئی ایم ایف کی شرائط کے مطابق پنشنروں کی پنشن میں سے ساڑھے سات فیصد بطور ٹیکس منہا کرنے کا تو پہلے ہی ٹھوس عندیہ مل چکا ہے۔ آنے والے وفاقی اور صوبائی میزانیوں میں اور کس کس کے آشیانے پر بجلی گرتی ہے، سب کھل جائے گا، بس چند روز کی ہی تو بات ہے۔ اس لیے شیخ رشید کی پھلجڑی پر صاد کرنے میں کیا مضائقہ ہے کیونکہ اپوزیشن تو اب حکمران جماعتوں کے اندر سے کسی ممکنہ ''کرشمے'' کی توقعات باندھے بیٹھی ہے اور جہانگیر ترین گروپ میں اسے امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ مگر بھائی صاحب! حکومت گرانے کی پوزیشن میں آنے والی متحدہ اپوزیشن کی پلیٹ میں چھید ہو سکتے ہیں تو حکومتی پارٹی کے اندر سے پندرہ بیس لوگ تو دہی کے ساتھ کلچہ کھانے پر ہی قناعت کرلیں گے۔ عمران خاں اور ان کی حکومت کے لیے سب خیراں ہیں۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ عوام کا ملیدہ بنائیں، خط غربت سے نیچے کے ماحول کو پروان چڑھائیں اور کسی بھی معاملہ پر احتجاج نہ کرنے والے عوام کی لائنیں لگوا کر ان کی کوڑوں سے تواضع کریں، وہ کسی احتجاج کے راستے پر نہیں آئیں گے۔ بس یہ التجا ضرور کریں گے کہ کوڑے لگانے والوں کی تعداد بڑھا دی جائے تاکہ انہیں اپنی ''تواضع'' کے لیے زیادہ دیر لائین میں نہ لگنا پڑے۔

بجٹ سے پہلے کی خوش گمانیاں

جون کا مہینہ قوم کے لیے اُمید و یاس کا مہینہ ہوتا ہے۔ چونکہ اس ماہ وفاقی اور صوبائی میزانیوں کا نزول ہوتا ہے جو حکومتوں کے لیے تو امتحان ہوتے ہی ہیں مگر عوام الناس کے لیے بہت بڑا امتحان ہوتے ہیں۔ سرکاری ملازمین اور پنشنر حضرات سارا سال اسی توقع میں جون کا انتظار کرتے ہیں کہ انہیں بجٹ میں تنخواہوں اور پنشن میں اضافہ کی صورت میں مہنگائی کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ ریلیف مل جائے گا۔ اس کے لیے ان کی تنظیمیں بجٹ سے پہلے پہلے احتجاجی مظاہروں اور جلسوں جلوسوں کی شکل میں حکومت پر دباؤ ڈالنے کے حربے بھی اختیار کرتی ہیں جن کے ذریعے تنخواہوں اور پنشن میں خاطر خواہ اضافہ کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔ اس وقت بھی ایپکا، پنشنرز ایسوسی ایشن اور دوسری مزدور تنظیمیں کہیں مظاہرے کر رہی ہیں اور کہیں سڑکوں پر دھرنے دیئے بیٹھی ہیں جبکہ عوام الناس کو اس بات کی فکر لاحق ہوتی ہے کہ بجٹ میں نئے ٹیکسوں کا بوجھ کہیں ان کے کندھے پر ہی نہ آ جائے جو پہلے ہی براہِ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے عسرت و بے بسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اور اب تو بے روزگاری اور کساد بازاری سے پیدا ہونے والے روزمرہ کے مسائل نے عام آدمی کا کچومر ہی نکال دیا ہے۔ ان عوام میں بلاشبہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے عمران خاں کے ساتھ وابستہ اپنے رومانٹسزم کے باعث انہیں اپنے دکھوں کے مداوا اور مسائل کے حل کے لیے مسیحا کے طور پر دیکھنا شروع کیا تھا اور انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے انہیں وفاقی اور صوبائی حکمرانی کے مینڈیٹ سے سرفراز کرنے کے لیے ذرہ بھر توقف نہیں کیا تھا۔ عمران خاں اور ان کی پارٹی کے اقتدار کے اڑھائی سال سے زیادہ کے عرصہ میں ان عوام کی تو مٹی پلید ہو کر رہ گئی ہے جنہیں سابقہ حکمرانوں کے مسلط کردہ روٹی روزگار کے مسائل سے خلاصی تو کیا ملنی تھی، وہ مہنگائی

کے سونامیوں اور بے روزگاری کے عفریت کے پیدا کردہ نئے گھمبیر مسائل کے دلدل میں دھنستے چلے گئے اور اپنے قائد کے قول زریں کے برعکس تھوڑا سا گھبرانے کی اجازت طلب کرتے نظر آئے۔

اب انہی عوام کو وفاقی اور صوبائی میزانیوں کی آمد کا شدت سے انتظار ہے اور ان کی سرخوشی قابلِ دید و شنید ہے کہ اب کی بار تو بجٹ سے پہلے پہلے ان کی ممدوح حکومت کی جانب سے دودھ، شہد کی نہریں بہانے کے مناظر بنا دیئے گئے ہیں۔ حکومت کی جانب سے سالانہ جی ڈی پی (گروتھ ریٹ) یعنی شرح نمو کا یک چار فیصد تک جا پہنچنے کے ڈنکے بجائے جانے لگے جس کو ''موڈیز'' نے بھی اپنی رپورٹ کے ذریعے تڑکا لگایا چنانچہ حکومت سے ٹکرانے کی منصوبہ بندی کرنے والے اپوزیشن قائدین دانتوں میں انگلی دبا کر بیٹھ گئے۔ حیرت کا اظہار کرتے اور اس دعوے کو کسی پھکڑ کے کھاتے میں ڈالتے نظر آئے اور پھر گورنر سٹیٹ بنک باقر رضا نے شرح نمو چار فیصد تک جا پہنچنے کی تصدیق کرتے ہوئے آئندہ سال تک یہ شرح چار عشاریہ آٹھ فیصد تک جانے کی نوید سنائی تو عوام الناس کے پپڑیاں جمے ہونٹوں سے بھی پھلجڑیاں پھوٹنے کا منظر بن گیا۔ ان کے دل بلیوں اچھلنے لگے کہ حکومت نے قومی معیشت مستحکم کر لی ہے تو اب ہمارے اقتصادی حالات میں بہتری بھی کوئی دور کی بات نہیں۔ وزیر خزانہ شوکت ترین نے یہ کہہ کر تو دل ناہنجار کے سارے شکوے ہی ختم کر دیئے اور سارے بوجھ ہی پاٹ دیئے کہ ایف بی آر کی جانب سے ٹیکسوں کی وصولی ناقابلِ یقین حد سے بھی آگے نکل گئی ہے، جو ہزاروں ٹریلین ہے۔ ظاہر ہے یہ ساری رقم قومی خزانے میں جمع ہوئی ہے تو اس سے حکومت کے لیے عوام کی فلاح کے منصوبے بنانا اور انہیں روٹی روزگار کے مسائل میں ریلیف دینا اور بھی آسان ہو جائے گا اور ماشاءاللہ نیب کی موجودہ حکومت کے اڑھائی سال کے دوران کارکردگی کا تو خود وزیر اعظم عمران خاں گزشتہ روز عوام کے ساتھ ٹیلی فونک رابطے کے دوران اعتراف کر رہے تھے جن کے بقول نیب نے لوٹ مار والے سابقین کے گزشتہ دس سال کے عرصہ کے مقابل موجودہ اڑھائی سال کے عرصہ میں چوروں ڈاکوؤں سے کھربوں روپے زیادہ وصول کئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ رقم بھی قومی خزانے میں ہی آئی ہے۔ جس سے سرپلس بجٹ بنانا حکومت کے لیے چنداں مشکل نہیں رہا۔

شوکت ترین تو یہ مژدہ بھی سُنا چکے ہیں کہ جولائی سے مہنگائی کی شرح میں کمی واقع ہونا

شروع ہو جائے گی، ارے صاحب! ان ڈھیر ساری خوشخبریوں اور توقعات کے ساتھ اس ماہ یکے بعد دیگرے وفاقی اور صوبائی میزانئے منصۂ شہود پر آنا شروع ہوں گے تو ان میں بہتی دودھ اور شہد کی نہریں دیکھ کر راندۂ درگاہ عوام کا خواہ مخواہ ڈبکیاں لگانے کو کیوں دل نہیں چاہے گا۔ اگر یہ بجٹ آئی ایم ایف کی شرائط کی پاسداری کئے بغیر تیار ہو رہے ہیں جس کا وزیر خزانہ ٹھوس عندیہ دے چکے ہیں تو جناب انہیں ٹیکس فری بجٹ دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا، آپ بے شک اسے ابھی سے منہ بھر کر عوام دوست بجٹ کہنا شروع کر دیں کیونکہ اسباب تو سارے عوام دوست بجٹ کے پیدا کر لئے گئے ہیں، چنانچہ عوام آج یکم جون سے ہی سرخوشی سے جھومنے کی تیاری پکڑ لیں۔ لیکن بجٹ آنے کے بعد عوام کے لیے چکرا کر گھومنے کے حالات پیدا ہو گئے تو انہیں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ حکومت نے اقتصادی استحکام کی خوش گمانیاں دکھا دکھا کر عوام کے دلوں میں اپنے سہانے مستقبل کی امیدیں ہی اتنی جگا دی ہیں کہ وہ اب بجٹ میں مروجہ ٹیکسوں کی شرح بڑھتی دیکھنا چاہیں گے نہ نئے ٹیکس قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ انہیں نئے میزانیوں کے ذریعے روزگار کے دروازے بھی کھلتے نظر آنے چاہئیں اور آسمانوں تک پہنچی روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں بھی زمین کی جانب واپس لوٹتی دکھائی دینی چاہئیں۔ انہیں تو اب وطنِ عزیز ریاست مدینہ کے قالب میں ڈھلتا بھی نظر آنے لگا ہے اور یہ ساری امید بھری نگاہیں آنے والے وفاقی اور صوبائی میزانیوں پر مرکوز ہیں۔

پھر جناب! بخوبی اندازہ لگا لیجئے کہ حکومت سے وابستہ تازہ تازہ امیدیں عوام کو اس ماہ کے پہلے عشرے میں میزانیوں کے ذریعے پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو ان کا فوری ردعمل کیا ہوگا، آپ مطمئن ہیں کہ ٹکڑوں میں بٹی اپوزیشن آپ کا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں رہی لیکن روایتی اور اعداد و شمار کے گورکھ دھندے میں پھنسے میزانیوں میں عوام کو اپنے لیے کسی قسم کی دادرسی نظر نہ آئی تو یہی عوام آپ کے اقتدار کی بنیادیں جھنجوڑنے والی خطرناک اپوزیشن بن جائیں گے۔ آپ کی خلاصی اب صرف عوام دوست بجٹ کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتی ہے جس کیلئے آپ نے پژمردہ عوام کے دلوں میں دم توڑتے خواب جگا کر خود ہی راہ ہموار کی ہے۔ تو جناب! اب عوام کے جذبات کا بند ٹوٹنے کو ہے، روک سکو تو روک لو۔

کرونا ویکسین پر سیاست

دنیا پر ٹوٹی ہوئی قدرتی افتاد کرونا وائرس نے ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں انسانی معاشرے کا سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی سونا اگلنے والی مضبوط معیشتیں مٹی کے ڈھیر بن گئی ہیں۔ انسانی جانیں بے وقعت ہی نہیں، بے توقیر بھی ہوئی ہیں۔ کروڑوں افراد کرونا کی لپیٹ میں آ کر اپنی جان سے گزر چکے ہیں اور کروڑوں پازیٹو کرونا کے ساتھ اپنی موت کے منتظر ہیں اور قید تنہائی کے دن گزار رہے ہیں۔ بے بسی کی موت کے ایسے اندوہناک مناظر کبھی دیکھے نہ سنے، مگر اس ماحول میں بھی انسانی جاہ و حشمت، نخوت و تکبر اور ایک دوسرے پر غالب ہونیوالی کبریائی کی اکڑفوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس انسانی معاشرے کے عالیجاؤں کو آج بھی اپنے مدمقابل عالیجاؤں کو مات دینے کی فکر لاحق ہے اور اپنی مٹی کو سونا بنا کر بیچنے کی سوچ رکھنے والے ساہوکاروں کو آج بھی بے حد وحساب منافع کمانے کی حرص وہوس نے گھیر رکھا ہے۔ کرونا نے عملاً دنیا کی اخیر ہونے والا منظر بنا دیا ہے مگر کل کس نے دیکھی ہے" کے فلسفے پر کاربند حرص وہوس کے مارے انسانوں کو اپنی عاقبت سنوارنے کی آج بھی کوئی فکر لاحق نہیں۔

کرونا کا آغاز چین کے ایک شہر ووہان سے ہوا تو اسکی ایک سائنسی لیبارٹری کے حوالے سے کئی سازشی تھیوریاں منظر عام پر آنا شروع ہو گئیں۔ امریکہ نے جھٹ پٹ کرونا کے پھیلاؤ کا سارا ملبہ چین پر ڈال دیا اور چین نے جوابی وار کر کے اپنے تئیں سپر پاور کے زعم میں مبتلا امریکی انتظامیہ کو جھنجوڑنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کرونا وائرس پر سب سے پہلے قابو بھی چین نے ہی پایا اور تین ماہ کے اندر اندر ووہان کی سابقہ رونقیں بحال کر کے فتح کا جشن منایا مگر وہاں سے نکلی کرونا وائرس باہر کی دنیا میں کسی کے قابو ہی نہیں آ سکی۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، سپین سمیت پورا مغرب و یورپ اسکی لپیٹ میں آ گیا۔ پہلی سے دوسری اور پھر تیسری لہر۔ جنوبی، وسطی ایشیا، مشرق

وسطیٰ، پوری عرب دنیا اور برصغیر میں بھارت سمیت ہر انسانی معاشرے کا کرونا نے سارا دم خم نکال دیا۔ انسان بے بس اور کمزور ہی نہیں ایک دوسرے سے بیگانے بھی ہوئے اور بھارت کا تو اس وائرس کی تیسری لہر نے عملاً حشر نشر کر دیا۔

ایک ڈیڑھ سال تک بس عالمی ادارہ صحت کے وضع کردہ ایس او پیز کے ڈھکوسلے سے ہی کرونا سے نجات کی تدبیریں ڈھونڈی جاتی رہیں اور اس معاملہ میں بھی اقوام عالم میں مختلف سازشی تھیوریاں سرگرم عمل رہیں۔ پھر کرونا کے علاج کی ویکسین کیلئے عالمی لیبارٹریوں میں تجربات شروع ہوئے تو اس میں بھی چین نے سبقت لی اور سائینوویک کے نام سے اس نے اپنی ویکسین لانچ کر دی جو دنیا بھر میں پھیلی اور کرونا کے تدارک کا مجرب نسخہ گردانی گئی۔ اس سے چین کیلئے دنیا کی قیادت کرنے کا تصور اجاگر ہونا شروع ہوا تو برطانیہ نے آکسفورڈ کی لیبارٹری سے ایسٹرازینیکا کے نام سے انسداد کرونا ویکسین ایجاد کر کے اقوام عالم کیلئے اسکی خوراکوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ پھر امریکہ بھی حرکت میں آیا اور فائزر بائیواین ٹیک کے نام سے اسکی تیار کردہ ویکسین کی مارکیٹنگ بھی شروع ہوگئی۔ اب سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور قطر سمیت پوری عرب دنیا نے اپنے اپنے سرکلر جاری کر کے وہاں مقیم مقامی اور غیر ملکی باشندوں کو انسداد کرونا کی جو ویکسین لگانے کا پابند کیا ہے، اس میں چار قسم کی ویکسین شامل ہے۔ یہ امریکی، برطانوی ساختہ فائزر بائیواین ٹیک، ایسٹرا زینیکا، موڈیرنا اور جانسن اینڈ جانسن ویکسین ہے اور ان عرب ریاستوں کے جاری کردہ سرکلر کے تحت دوسری کوئی ویکسین قابل قبول نہیں۔ اس طرح بالخصوص اوورسیز پاکستانیوں کیلئے ایک نیا جھنجٹ شروع ہو گیا ہے کیونکہ پاکستان میں تو آغاز ہی چینی ساختہ ویکسین سائینوویکس سے ہوا تھا جس کی پاکستان میں مقیم اکثر اوورسیز پاکستانی دونوں ڈوز لگوا چکے ہیں مگر عرب ریاستوں کے سرکلر کے مطابق وہ صرف انکی مقرر کردہ ویکسین لگوانے کی صورت میں ہی عرب ممالک میں داخل ہو سکیں گے جبکہ ابھی تک کوئی طبی تحقیق سامنے نہیں آئی کہ ایک ویکسین کی دونوں ڈوز لگوانے کے بعد کسی دوسری ویکسین کی ڈوز بھی لگائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ابھی تک صرف ہسپانوی تحقیق منظر عام پر آئی ہے جس میں ایک ویکسین کی پہلی ڈوز لگوانے کے بعد دوسری ڈوز کسی دوسری ویکسین کی لگوانا مفید گردانا گیا ہے۔ اس کیلئے ابتدائی طور پر چھ سو ہسپانوی باشندوں پر ''مکس اینڈ میچ ویکسین'' کا تجربہ کیا گیا جس سے مؤثر مدافعتی ردعمل سامنے آیا مگر ایک ویکسین کی دونوں خوراکیں لگوانے کے

بعد دوبارہ کسی دوسری ویکسین کی ڈوز لگوانے سے انسانی جسم پر کیا ردعمل ہوسکتا ہے' یہ ابھی تک فیصلہ طلب معاملہ ہے جبکہ عرب ریاستوں نے چینی ساختہ ویکسین قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ اس طرح جو لوگ اس ویکسین کی دونوں خوراکیں لے چکے ہیں' عرب ریاستوں کیلئے ان کا مستقبل تو تاریک ہو گیا۔

ایک دوسری سازشی تھیوری کے مطابق چینی ساختہ ویکسین کو قبول نہ کر کے طب و سائنس کے شعبہ میں اسکی بالادستی توڑنے کی سازش کی گئی ہے جبکہ اس پر برطانوی ساختہ جس ویکسین ایسٹرا زینیکا کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اسکے مضر اثرات نے ویسے ہی لوگوں کو خوفزدہ کر رکھا ہے کیونکہ اس ویکسین سے انسانی جسم کے اندر خون منجمد ہونے کے شواہد ملے ہیں جو انسانی موت کا بھی باعث بن سکتے ہیں اور کینیڈا میں متعدد افراد یہ ویکسین لگوانے کے بعد فوت بھی ہو چکے ہیں۔ میں نے خود اسی ویکسین کی پہلی ڈوز لگوائی ہے چنانچہ جب اس پر ہونیوالی تحقیق کی رپورٹ میری نظروں سے گزری تو میرے حواس میں فطری طور پر خوف کی ترتڑیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں مگر پہلے ایک دو دن ہلکے بخار اور جسم میں اینٹھن کے سوا کوئی خاص منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مختلف ممالک کی لیبارٹریز میں ایک ہی فارمولے کے تحت انکے اپنے نام سے ویکسین تیار کی جا رہی ہے تو اس میں تفریق پیدا کرنا چہ معنی دارد؟ ہمارے حکمرانوں کو کم از کم اوورسیز پاکستانیوں کو تو کسی نئی افتاد سے بچانا چاہیے جو چینی ویکسین لگوانے کے بعد عرب ریاستوں کی عائد کردہ پابندی کے بعد شش و پنج میں پڑے ہیں۔ یہی وہ اوورسیز پاکستانی ہیں جنہیں وزیراعظم عمران خان قابل فخر قومی سرمایہ قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ عرب ریاستوں کی اختیار کردہ پالیسی کی بھینٹ چڑھ گئے تو پھر حکومت کیلئے تفاخر کا باعث بننے والا چار فیصد گروتھ ریٹ کہاں جا کر ٹکے گا۔ اس سے پہلے کہ بس اخیر ہو جائے' معاملات کو سنبھال لیجئے جناب۔ بڑی طاقتوں کی سیاست اپنی جگہ مگر ہماری تو بقاء کا سوال ہے۔

''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا''

سب سے پہلے تو اپنے ان تمام پیاروں، عزیزوں، دوست احباب کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے کرونا وائرس کا شکار ہونے کے بعد میری ٹیلی فونک اور سوشل میڈیا پر مزاج پرسی کی، میرے ہم قدم رہنے کا احساس دلایا اور مجھے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس وائرس سے مجھے جو ذاتی تلخ و شیریں تجربات حاصل ہوئے اس کا آئندہ کالم میں مفصل تذکرہ کروں گا۔ فی الوقت اپنی اس کیفیت کے اظہار پر ہی اکتفا کروں گا کہ آج کرونا کی لپیٹ میں آنے کے 16, 17 روز بعد بھی نقاہت کے غلبے میں ہوں اور ''جی کردا اے ہن تے سُتے سَوں جایئے'' والی کیفیت بدستور طاری ہے۔ بے شک رب کی رضا کے آگے کوئی پر نہیں مار سکتا اور دعاؤں کی تاثیر سے انکار کی مجال کہاں۔ آپ کی دعاؤں کا بدستور طالب ہوں۔ قارئین محترم کا اصرار تھا کہ کالم میں لمبا وقفہ نہ کروں اس لئے منتشر ذہن کے ساتھ ہی قلم اٹھانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کہیں خیالات بے ربط نظر آئیں تو معاف فرما دیجئے گا۔

اس وقت قومی سیاست و معاملات پر بھی عملاً انتشار کی کیفیت ہی طاری ہے۔ ہر موضوع اور ہر معاملہ طویل بحث کا متقاضی ہے تاہم دو تین سلگتے معاملات پر چلتے چلتے اظہار رائے کی کوشش کروں گا۔ عملاً یہ سارے معاملات اسلام آباد سے متعلق ہیں۔ تازہ معاملہ ڈی چوک پر گزشتہ روز سرکاری ملازمین کے دیئے گئے دھرنے کا حشر تھا۔ سوشل میڈیا پر اس دھرنے پر چھوڑی گئی زہریلی گیس کے چرچے رہے جو بادلوں کی طرح اٹھ کر پورے اسلام آباد کو اپنی لپیٹ میں لیتی نظر آتی رہی اور پھر یار لوگوں کو گورننس کے معاملہ میں اس دھرنے کے حشر کا اسی ڈی چوک پر 15، اگست 2014ء سے شروع ہونیوالے 126 دن کے دھرنے کے ساتھ موازنہ کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ اس حوالے سے یہی تبصرہ متعلقین کی تشفی کیلئے کافی ہے کہ دیگر طبقات کی طرح آج پبلک سروسز کے لوگوں کو بھی تبدیلی کیلئے اپنے رومانٹسزم کا شافی و کافی جواب مل گیا ہے۔ اس سے چند

روز قبل وکلاء برادری کے ہاتھوں اسلام آباد ہائیکورٹ کا جو حشر ہوا وہ یقیناً اس معزز و مقدس ادارے کے اپنے لئے بھی لمحۂ فکریہ ہوگا کہ اس سانحہ سے دو روز قبل عدالت عظمیٰ کے ایک فاضل جج کمرۂ عدالت میں موجود میڈیا کے ارکان سے باقاعدہ ہاتھ اٹھوا کر میڈیا کے آزاد ہونے کے معاملہ میں جواب لے چکے تھے۔ ارے صاحب! ہم میں یہ مجال کہاں کہ یہی سوال انکی جانب واپس لوٹایا جائے مگر وکلاء کے ہاتھوں اسلام آباد ہائیکورٹ کے ہونیوالے حشر کا جسٹس افتخار محمد چودھری کی عدلیہ بحالی تحریک کے ساتھ موازنہ کیا جارہا ہے تو یہ معاملہ اس مقدس و معزز ادارے کیلئے بہر صورت سوچ بچار کا متقاضی تو ہے۔ ''ہم بولے گا تو بولو گے کہ بولتا ہے''۔

اور اب معاملہ درپیش ہے سینٹ کے آنیوالے انتخابات میں ''گھوڑوں'' کی ممکنہ خرید و فروخت کی منڈی کے آگے بند باندھنے کا۔ حکمران پارٹی اس کیلئے پوائنٹ سکورنگ کی پوری تگ و دو میں ہے۔ سینٹ کے انتخابات کیلئے آئین میں موجود خفیہ رائے شماری کا مروجہ طریق کار ''شو آف ہینڈز'' میں تبدیل کرانے کیلئے سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کیا گیا اور اس ریفرنس کی سماعت شروع ہوتے ہوتے خفیہ رائے شماری کی قباحتوں کے طوفان اٹھا کر ان کا رخ عدالت عظمیٰ کی جانب موڑنے کی حتیٰ الوسع کوشش کی گئی۔ ساتھ ہی اپوزیشن جماعتوں کو انکے مابین 2005ء میں لندن میں طے پانے والے میثاق جمہوریت کے کچوکے بھی لگائے گئے کہ آئندہ کیلئے ہارس ٹریڈنگ روکنے کیلئے آپ نے خود ہی تو اس میثاق جمہوریت میں شو آف ہینڈز کا طریقۂ انتخاب رائج کرنے کا عہد کیا تھا۔ اب اسکی مخالفت کرکے آپ گویا گھوڑوں کے اصطبل کے ہی محافظ رہنا چاہتے ہیں۔

بے شک میں خود بھی شو آف ہینڈ کا طریقۂ انتخاب ہی رائج کرنے کے حق میں ہوں مگر اس کیلئے مروجہ آئینی طریق کار کے مطابق ہی تبدیلی لانا ہوگی جو آئین کی متعلقہ شق میں دو تہائی اکثریت کے ساتھ ترمیم کی متقاضی ہے۔ اس کیلئے آپ قومی اسمبلی میں آئینی ترمیم لے آتے تو اپوزیشن آپ پر غصہ نکال کر اپنے سابقہ عہد کی بنیاد پر اس ترمیم کے حق میں ووٹ دینے پر یقیناً آمادہ ہوجاتی مگر آپ نے قومی اسمبلی کے بجائے سپریم کورٹ جانے کا راستہ اختیار کیا جہاں ابھی ریفرنس کی کارروائی شروع ہی ہوئی تھی کہ آپ نے سینٹ کے انتخابات شو آف ہینڈز سے کرانے کا صدارتی آرڈی ننس جاری کردیا جس میں یہ وضاحت بھی کردی گئی کہ اس آرڈی ننس کا اطلاق صرف سینٹ کے موجودہ انتخابات پر ہوگا۔ اگر غور سے سمجھا جائے تو سپریم کورٹ میں ایک کیس کی

سماعت کے دوران آرڈی ننس جاری کرنا اس کیس پر اثر انداز ہونے کی کوشش اور صریحاً توہین عدالت کے مترادف ہے۔ بھلے آپ نے اس آرڈی ننس کے اطلاق کو سپریم کورٹ کے حتمی فیصلہ کے ساتھ مشروط کر دیا مگر اس آرڈی ننس کے ذریعے سپریم کورٹ کے روبرو اپنی خواہش کا اظہار تو کر دیا۔ اس سے بڑی عدالتی کارروائی میں مداخلت بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔ عدالت عظمیٰ نے اس پر بھی نرم رویہ اختیار کیا اور آپ کو محض یہ باور کرایا کہ آرڈی ننس کو عدالت عظمیٰ کے فیصلہ کے ساتھ مشروط نہ کیا گیا ہوتا تو عدالت اسے کالعدم قرار دینے میں کوئی دیر نہ لگاتی۔ آپ کی اس پر بھی تشفی نہ ہوئی تو شو آف ہینڈز کے فیصلہ کیلئے عدالت پر دباؤ بڑھانے کی خاطر آپ ''گھوڑا فروشی'' کی 2018ء والی ویڈیو منظر عام پر لے آئے۔ ارے صاحب! یہ گھوڑا فروشی بے شک ایک لعنتی عمل ہے مگر کس کے ہاتھوں سرانجام پایا؟ متعلقہ ویڈیو کے ایک کردار نے خود ہی نشاندہی کر دی کہ ''گھوڑوں'' کا یہ اصطبل تو خیبر پی کے اسمبلی کے سپیکر ہاؤس میں فاضل سپیکر کی موجودگی میں لگا تھا۔

چلیں وہاں تک ہی کیا جائیں‘ اس وقت تو موجودہ گورنر پنجاب چودھری محمد سرور کے پی ٹی آئی کے ٹکٹ پر پنجاب سے سینیٹر منتخب ہونے کا معاملہ بھی ہارس ٹریڈنگ کی واضح مثال بن کر سامنے آیا تھا۔ ''جے ویکھاں میں عملاں ولے‘ کجھ نئیں میرے پلے'' آپ چیئرمین سینٹ کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک کے حشر کا حالیہ معاملہ ہی لے لیں۔ حضور 14 طبق تو روشن ہو جاتے ہیں۔ اس ہارس ٹریڈنگ کا فائدہ سمیٹنے والا کون تھا۔ اور آپ ان پارٹی قیادتوں سے ہارس ٹریڈنگ روکنے کے متقاضی ہیں جنہوں نے پارٹی فنڈز کے نام پر کروڑوں میں پارٹی ٹکٹ فروخت کرنا اپنا کاروبار بنا رکھا ہے۔ اس کاروبار میں 2018ء کے انتخابات میں تحریک انصاف تو سرفہرست رہی ہے۔ کبھی اسکی بھی جوابدہی ہو جائے کہ پارٹی فنڈز کے نام پر اکٹھی ہونیوالی اربوں روپے کی رقوم کس مصرف میں اور کس کے مصرف میں جاتی ہیں۔ اور کیا آج بھی پارٹی قیادتوں میں اتنا ظرف ہے کہ اپنے کسی بے لوث جیالے‘ متوالے‘ ٹائیگر کو بغیر کسی بھاؤ تاؤ کے محض اسکی خدمات کی بنیاد پر قومی یا صوبائی اسمبلی یا سینٹ یا کسی بلدیاتی سطح پر بھی پارٹی ٹکٹ سے سرفراز کر دیا جائے۔ سلطانی جمہور میں اصل ''سٹیٹس کو'' تو سلطان کی حکمرانی والا ہے۔ اسے توڑنے کیلئے کوئی آگے آئے گا تو بات بنے گی ورنہ تبدیلی کے نعرے سب ڈھکوسلے ہیں۔ ''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا''

راہ ہدایت کا متقاضی کرونا کا خوف

کیا کسی کے وہم وگمان میں بھی تھا کہ چین کے ایک دورافتادہ شہر ووہان میں اڑھائی ماہ قبل جنوری میں کرونا کے نام سے جنم لینے والا وائرس پھیلتا پھیلتا پوری دنیا کو جکڑ لے گا اور کروفر والا انسان عملاً بے بس ہوکر رہ جائے گا، تو بھائی صاحب! یہی مظاہر قدرت ہیں۔ خدائے لم یزل کے وحدہٗ لاشریک ہونے کی اٹل گواہی اور ہفت آسمانوں سے زمین تک اس کائنات پر جن وانس، چرند پرند اور حشرات الارض تک ہر چیز رب کائنات کے دستِ قدرت میں ہے۔ یہ ساری حقیقتیں رب کائنات نے صحیفۂ آسمانی قرآن مجید میں کھول کھول کر بیان فرمادی ہوئی ہیں مگر ہم لہو ولعب میں ڈوبے متکبر انسانوں کو سارے مظاہر قدرت دیکھ کر بھی عبرت حاصل نہیں ہوتی اور سرکشی ایسی ہے کہ راہِ ہدائت ونجات کی جانب مائل ہی نہیں ہونے دیتی اور تفکر وسوچ کا در وا ہی نہیں ہونے دیتی۔ آج بھی بھٹکے ہوئے روشن خیال ایسی باتوں کو فرسودہ، ناکارہ، غبی ذہن کی پیداوار اور بنیاد پرستوں کی خانہ ساز قرار دے کر اس کا ٹھٹھہ مذاق اُڑاتے نظر آتے ہیں۔ وہ زلزلوں، سیلابوں اور قدرتی آفات کی صورت میں انسانوں پر ٹوٹنے والے عذابوں کو مظاہر قدرت کے طور پر تسلیم کرنے کو آمادہ ہی نہیں اور حقیقت ان کی بس اتنی ہے کہ پل بھر کو آکسیجن بند ہوجائے تو پلک جھپکتے میں ان کا رعونت بھرا سراپا مٹی کا بت بن جائے۔ زلزلوں کو زیرزمین پلیٹوں کے اپنی جگہ سے ہلنے کا باعث تو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی سائنس کی یہی تحقیق ہے مگر یہ پلیٹیں زیرزمین جوڑنے کا اہتمام کس نے کیا ہے اور انہیں ہلا کر زلزلوں کی نوبت لانے کا اہتمام کون کرتا ہے، نام نہاد روشن خیالوں کو اس میں مظاہر قدرت کی حقانیت کی کوئی جھلک نظر ہی نہیں آتی۔ خالقِ کائنات نے کروفر والے انسانوں کی ایسی سرکشی کا اہتمام بھی ان کے بدترین انجام کی صورت میں انہیں نشانِ عبرت بنانے کے لئے کیا ہوتا ہے۔ بے شک خدا کی رسی بہت دراز ہے اور انسانوں کو یہ نصیحت ہے کہ وہ کسی

بہکاوے میں نہ آئیں۔ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔

آج بے شک پوری دنیا میں سراسیمگی کا باعث بننے والا کرونا وائرس بھی خالقِ کائنات کے آگے اس کی مخلوق بشمول فرعون ذہن انسانوں کی بے بسی کا زندہ ثبوت ہے۔ ہم نے اپنی دھرتی پر دس سال قبل ڈینگی کی شکل میں قدرت کی طرف سے آنے والی ایسی ہی آزمائش کو بھگتا ہوا ہے۔ یہ وائرس مچھر کی شکل میں یورپ سے ایشیاء میں داخل ہوا اور 2005ء میں اس نے ہماری دھرتی کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا اور 2011ء میں اس کی زہرناکی کے اصل مضمرات سامنے آئے جب اس کے وار سے ہر انسان بے بس نظر آنے لگا۔ پنجاب میں ہزاروں انسانوں کی زندگیاں اس وائرس کی بھینٹ چڑھ گئیں اور اس کے موثر علاج کی فوری طور پر کوئی تدبیر نہ ہوسکی، میں نے خود بھی اس وائرس کی زہرناکی کو بھگتا ہوا ہے اس لئے اس مرض سے لاحق ہونے والی پژمردگی، قنوطیت اور بے چارگی کی کیفیت سے بخوبی آگاہ ہوں۔

بے شک تنومند انسانوں کو انواع و اقسام کے مرض لگانا اور پھر انہیں شفایاب کرنا رب کائنات ہی کے دست قدرت میں ہے۔ اس کی مخلوق بس اسکے احکام کے تابع رہے اور سرکشی اختیار نہ کرے۔ آپ ڈینگی، کرونا اور اس جیسے دوسرے امراض اور وباؤں کے اسباب کے حوالے سے اپنے تئیں قیافے لگاتے رہیں مگر اصل سبب مظاہر قدرت سے انسانی سرکشی ہی ہوتا ہے جس پر اسے جھنجوڑنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کرونا کے اسباب میں چینی باشندوں کی خوراک میں شامل ایسے جانور اور چرند پرند بتائے جا رہے ہیں جنہیں کھانے کی رب کائنات نے ممانعت فرمائی ہوئی ہے۔ اگر انسانی تحقیق سے کرونا وائرس کا یہی سبب برآمد ہوا ہے تو یہ مظاہر قدرت سے انسانی سرکشی کا ہی ثبوت ہے۔ یقیناً چینی باشندوں نے اس کا ادراک کیا اور دین اسلام کے متشددانہ مخالف ہونے کے باوجود وہ اس کی حقانیت تسلیم کرنے اور راہ ہدائت کے لئے ربِ کائنات کی جانب رجوع کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ اس حوالے سے سوشل میڈیا پر چلنے والی بے شمار ویڈیوز میں آپ چینی صدر کو ایک مسجد میں جا کر نمازیوں سے چینی قوم کے لئے رحم کی اپیل کرتے، بے شمار چینی باشندوں کو مساجد میں سجدہ ریز ہوتے اور خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت کلام پاک سنتے دیکھ چکے ہوں گے۔ یہ بدلی ہوئی وہ چینی سوچ ہے جس نے اپنی دھرتی پر مسلمانوں کا ناطقہ تنگ کیا ہوا تھا۔ کرونا کے جھٹکے نے انہیں مظاہر قوت کی حقانیت سے آشنا کر دیا جن کی تحقیق کے

مطابق کرونا وائرس قدرت کی جانب سے ممنوع اور حرام قرار دی گئی اشیاء کے کھانے سے پیدا ہوا ہے تو پوری دنیا پر پھیلنے والے اس وائرس کے بھی بلاشبہ یہی اسباب ہوں گے جس کی اقتصادیات و معیشت آج تباہی کے دہانے پر پہنچی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

اگرچہ اس وائرس سے اب تک ہونے والی انسانی اموات چار ہزار کے قریب ہیں مگر اس وائرس نے متاثرہ انسانوں کو عملاً اچھوت بنا دیا ہے جن کا سامنا کرنے سے بھی دوسرے انسان خوف کھاتے ہیں اور احتیاطی تدابیر نے عالمی معیشت کو ادھیڑ اور اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ چین میں اب تک اس کی معیشت کو پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ گیارہ ہزار ارب ڈالر لگایا گیا ہے۔ آج بیشتر ممالک کی فضائی پروازیں بند ہیں۔ کاروباری اور تجارتی مراکز کے شٹر ڈاؤن ہو چکے ہیں۔ لوگ ہوٹلوں، ریستورانوں اور دوسرے پبلک مقامات پر جانے سے گریز کر رہے ہیں اور کرونا سے متاثرہ ممالک میں کاروبار حیات ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ مصافحہ، معانقہ تو دور کی بات، لوگ اتنے خوفزدہ ہیں کہ کرونا وائرس کے مشتبہ افراد کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی معیشت تباہی کے کس دہانے پر آن کھڑی ہوئی ہے، اسی طرح آج پہلی بار سعودی عرب کے مقامات مقدسہ میں بھی مکمل سنسانی اور ویرانی نظر آ رہی ہے۔ سعودی حکومت نے مقامی اور غیر ملکی باشندوں کے لئے طواف کعبہ پر بھی پابندی عائد کر دی ہے، چنانچہ عمرہ زائرین جہازوں سے آف لوڈ کئے گئے اور پھر عمرہ ویزے بند کر دیئے گئے۔ سو جہاں ایک لحہ کے لئے بھی کبھی خالقِ کائنات کی عبادت نہیں رکی تھی آج وہاں ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ یہ یقیناً قدرت کی طرف سے ہم سرکش انسانوں کے لئے بہت بڑی آزمائش اور مقام عبرت ہے۔ ذرا اپنے حال احوال، معاملات و معمولات اور اپنے کردار و اعمال کا جائزہ تو لیجئے۔ ہم احکام خداوندی پر کس حد تک عمل پیرا ہیں۔ اسکی متعین کردہ ممنوعات و مکروہات کے لئے اپنے دل میں کتنی نفرت اور کتنی رغبت رکھتے ہیں۔

حلال اور حرام میں کتنی تمیز کرتے ہیں اور اپنی زندگیاں کس حد تک خالقِ کائنات کی بندگی میں گزارتے ہیں۔ اس حوالے سے خالقِ کائنات نے مظاہر قدرت بھی اور قیامت کی نشانیاں بھی کتاب ہدائت میں کھول کھول کر بیان فرما دی ہیں۔ آپ اس کی روشنی میں اپنے ماحول اور معاملات کا جائزہ لیں اور انسانوں پر افتاد بن کر ٹوٹے ہوئے کرونا وائرس کے اسباب جانیں۔

بے شک یہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اگر چینی باشندوں میں ایک معمولی جھٹکے پر حلال اور حرام کی تمیز پیدا ہوگئی ہے تو ہم مسلمانوں کو سود کے حرام ہونے کے احکام خداوندی کی تعمیل کیلئے اب تک کیوں راہِ ہدائت حاصل نہیں ہو پائی۔ ہماری تو پوری معیشت آئی ایم ایف کے سودی قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے اور بنکاری کا سارا نظام ہی سود کی بنیاد پر کھڑا ہے تو بھائی صاحب! ہمارے لئے تو یہی قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں اور ہم سے عبرت کی متقاضی ہیں۔ اگر ہم عبادت کے لئے آج خدا کے گھر اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جانے سے بھی قاصر ہیں تو یہ ہم سے خدا کے روٹھ جانے کا ہی ثبوت ہے۔ آج خواتین مارچ کے انسانیت سوز نعروں اور ایجنڈے پر بات کی جائے تو نام نہاد روشن خیال ہذیانی کیفیت میں تنقید کے نشتر چلاتے نظر آتے ہیں جبکہ گلیوں بازاروں میں بے حیائی کا فروغ بھی قربِ قیامت ہی کی کھول کھول کر بیان کی گئی نشانیاں ہیں۔ سو اپنے اعمال کو سدھاریئے۔ جاہ و حشم کی سوچ سے باہر نکلئے، کروفر والی زندگی کی حیثیت ایک تنکے سے بھی کم جانئے اور قدرت کی دکھائی گئی راہ ہدائت پر آجایئے، اسی میں آپ کی نجات ہے۔ باقی سب غبار ہے، مشتِ غبار۔

کرونا پر تصدیق کی متقاضی کچھ کہانیاں

سب سے پہلے تو اپنے گزشتہ کالم کے حوالے سے ایک ضروری وضاحت۔ میں نے جسٹس اقبال حمید الرحمٰن صاحب کے استعفٰی کا تذکرہ کرتے ہوئے سہواً یہ لکھ دیا کہ انہوں نے اپنے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر ہوتے ہی اسلام آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے منصب سے استعفٰی دے دیا تھا۔ اس پر میرے احباب جسٹس (ر) حسنات احمد خان، معروف قانون دان محمد اظہر صدیق اور پیشہٴ انصاف و وکالت سے متعلق بعض دوسری شخصیات نے میری اس سہو کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ جسٹس اقبال حمید الرحمٰن نے اسلام آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے نہیں بلکہ سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے استعفٰی دیا تھا۔ یقیناً ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر اسکی وضاحت ضروری ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل میں جسٹس اقبال حمید الرحمٰن کیخلاف درخواست اسلام آباد ہائی کورٹ بار کے اس وقت کے سیکرٹری نے دائر کی تھی جس میں ان پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے بطور چیف جسٹس اسلام آباد ہائیکورٹ اپنے انتظامی اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے اسلام آباد ہائیکورٹ میں تقرریاں کیں۔ اس درخواست پر جس وقت سپریم جوڈیشل کونسل نے کارروائی کا آغاز کیا اس وقت جسٹس اقبال حمید الرحمٰن کی سپریم کورٹ کے جج کے منصب پر تعیناتی ہو چکی تھی تاہم ان کیخلاف دائر ریفرنس کا تعلق انکے چیف جسٹس اسلام آباد ہائیکورٹ کے منصب کے ساتھ تھا جس کا میں اپنے مورخہ 25/ اکتوبر 2016ء کے کالم میں مفصل تذکرہ کر چکا ہوں۔ میں نے بات جسٹس حمید الرحمٰن کی عزت و وقار کے حوالے سے کی تھی کہ انہوں نے اپنے اُجلے دامن پر کوئی ایک چھینٹا بھی نہ پڑنے دینے کی خاطر اپنے خلاف دائر ہونیوالے ریفرنس کے بے بنیاد ہونے کے باوجود اپنے منصب سے استعفٰی دے دیا۔ ہمارے معاشرے میں ایسی شفاف شخصیات خال خال ہی ملتی ہیں۔

آج دراصل مجھے ایک صوبائی وزیر سید صمصام بخاری کی سوشل میڈیا پر چلنے والی ایک ہونیوالی آڈیو ٹیلی فونک کال پر بات کرنی ہے جس میں وزیر موصوف غالباً اوکاڑہ ڈسٹرکٹ

ہیڈ کوارٹر ہسپتال کے ڈی ایچ او کے ساتھ تلخ ترش لہجے میں جھگڑا کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے ایک عزیز دوست کی نعش اسکے ورثاء کو دینے کی بجائے اپنے پاس کیوں رکھی ہوئی ہے جبکہ وہ کرونا کا مریض بھی نہیں تھا۔ اس ٹیلی فونک کال میں وزیر موصوف کے دھمکی آمیز لہجے اور الفاظ کی تو میں قطعاً حمایت نہیں کرتا اور اب لاہور ہائیکورٹ نے بھی اس معاملہ کا نوٹس لے لیا ہے تاہم وزیر موصوف نے جس معاملہ کی نشاندہی کی وہ آجکل دوسرے بے شمار کرونا کیسز کے حوالے سے بھی زبانِ زد عام ہے اور ہسپتالوں میں کرونا کے مریضوں یا مشتبہ مریضوں کے ساتھ جس پراسرار انداز میں ڈیل کیا جارہا ہے، اسکے بارے میں کئی سچی جھوٹی کہانیاں سوشل میڈیا پر وافر مقدار میں زیرِ گردش ہیں اس لئے اس معاملہ کی وضاحت تو بہرصورت ہونی چاہیے۔

اس حوالے سے ایک بڑی کہانی یہ چل رہی ہے کہ ہسپتال میں انتقال کر جانے والے کرونا کے کسی بھی مریض کے لواحقین کو میت دیکھنے، غسل دینے، اسکی نماز جنازہ میں شریک ہونے اور خود اسکی تدفین کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور اگر کسی میت کے لواحقین اسکی حوالگی پر اصرار کرتے ہیں تو ان سے لاکھوں میں بھاری معاوضہ لے کر میت انکے حوالے کر دی جاتی ہے۔ بصورت دیگر انہیں لاش کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ کرونا مریض کی لاش کی حوالگی کیلئے خطیر رقم وصول کرنے کی گواہی تو مجھے اپنے داماد سے بھی مل گئی جس کے ایک قریبی عزیز کا ایک ہسپتال میں کرونا کے مرض میں انتقال ہوا تو اسکے بقول، ہسپتال کی انتظامیہ نے فوت ہونیوالے شخص کی لاش اسکے ورثاء کی منت سماجت کے بعد ان سے 16 لاکھ روپے وصول کر کے انکے حوالے کی جبکہ وہ ہسپتال میں اسکے ٹیسٹوں اور علاج معالجہ کے بھی تقریباً اتنے ہی اخراجات اٹھا چکے تھے۔

اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کرونا مریض کے انتقال پر اسکی نعش کے ذریعے کرونا مرض کے پھیلنے کے خدشہ کے تحت نعش کے غسل، کفنانے، نماز جنازہ پڑھنے اور دفنانے کا بندوبست ہسپتال انتظامیہ کی جانب سے کسی سرکاری ایجنسی کے زیرِ اہتمام خود ہی کیا جاتا ہے تو پھر کسی نعش کو لاکھوں روپے وصول کر کے اسکے ورثاء کے حوالے کرتے وقت کیا اس نعش کے ذریعے کرونا کے نہ پھیلنے کا بھی بندوبست کر لیا جاتا ہے اور وہ کیا بندوبست ہوتا ہے جبکہ لاش کے ورثاء اسکے غسل سے تدفین کی رسومات تک سارے انتظامات خود ہی کرتے ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مد میں وصول کی جانیوالی رقوم کس کھاتے پر چڑھتی ہیں اور کس کے زیرِ استعمال آتی ہیں۔ اس حوالے سے کچھ کہانیاں یہ بھی چل رہی ہیں کہ ہسپتال سمیت جہاں بھی کرونا کے کسی

مریض کی ہلاکت ہوتی ہے اسے فی لاش ایک لاکھ روپے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (ڈبلیو ایچ او) کے فنڈ سے وصول ہو جاتے ہیں اس لئے ہسپتالوں میں کرونا کے مرض سے زیادہ سے زیادہ ہلاکتیں رجسٹرڈ پر چڑھائی جارہی ہیں۔ ان میں سرکاری اور پرائیویٹ سب ہسپتال شامل ہیں۔ یقیناً یہ کہانیاں غیر مصدقہ ہیں جن کے اندر سے بعض اور کہانیاں بھی جنم لے رہی ہیں جو شرف انسانیت کی تذلیل کی عکاسی کرتی ہیں اس لئے اس معاملہ کی بہرصورت اعلیٰ سطح پر وضاحت آنی چاہیے کہ کسی کرونا مریض کی لاش کی حوالگی کیلئے اسکے ورثاء سے معاوضہ لیا جارہا ہے یا نہیں اور اگر لیا جارہا ہے تو کس بنیاد پر اور کس مقصد کے تحت۔ اسی طرح کرونا کے مریضوں کے عوض ڈبلیو ایچ او سے کوئی گرانٹ مل رہی ہے تو اسکی بھی وضاحت ہونی چاہیے تاکہ لوگوں کے دلوں میں کرونا مریضوں کے ہسپتالوں میں علاج معالجہ کے حوالے سے جو تحفظات ہیں' ان کا ازالہ ہو سکے۔

کرونا کے پھیلتے مرض سے تو میرے سمیت یقیناً کسی کو انکار نہیں اور اسی طرح اس کا پھیلاؤ روکنے کیلئے ڈبلیو ایچ او کے تجویز کردہ احتیاطی اقدامات پر مکمل عملدرآمد بھی ضروری ہے جن میں ماسک کے پہننے کی پابندی تو ہمہ وقت ہونی چاہیے۔ کرونا نے انسانی آبادیوں اور دنیا کی معیشتوں میں جو تباہ کاریاں کی ہیں اس کا اندازہ تو گزشتہ روز جاری ہونیوالی آئی ایم ایف کی رپورٹ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ تاہم میری تشویش کرونا مریضوں کی تعداد میں حیران کن اضافہ اور کرونا مریضوں کی لاشوں کی بے حرمتی کے حوالے سے پھیلتی کہانیوں پر ہے۔ اگر ڈبلیو ایچ او نے مستند ڈاکٹروں کی ریسرچ کی بنیاد پر اپنی یہ رپورٹ بھی جاری کر دی ہوئی ہے کہ کرونا مریض کی لاش سے کرونا پھیلنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ لاش سانس لیتی ہے نہ اسکی ناک بہتی ہے کہ اسکے جسم کے اندر موجود کرونا باہر آئے اس لئے کرونا مریض کی لاش کی مذہبی عقائد کے مطابق تدفین کی رسومات ادا کی جاسکتی ہیں۔ پھر ہمارے پاس کرونا مریض کی لاش اسکے ورثاء کے حوالے نہ کرنے یا بھاری معاوضہ لے کر حوالے کرنے کا کیا جواز ہے۔ صمصام بخاری کی لیک ہونیوالی ٹیلی فونک کال بھی اسی معاملہ کی تصدیق کی متقاضی ہے۔ انہوں نے متعلقہ ڈاکٹروں کو دھمکی تو یقیناً اپنے جاگیردارانہ کلچر کے مطابق دی مگر کرونا مریض کی لاش اسکے ورثاء کے حوالے نہ کرنے اور پراسرار انداز میں دفنانے کے حوالے سے جو کہانیاں چل رہی ہیں' جناب اس بارے میں تو لوگوں کے ذہن صاف کریں ورنہ ہمارے معاشرے کے خالصتاً کاروباری ہونے پر مہر تصدیق ہی ثبت ہوگی۔

کرونا کا خوف اور میرا تجسّس

ان دنوں ہمارا پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا ایک نامعلوم جرثومے پر حاشیہ آرائی، قیافوں اور قیاس آرائیوں سے بھرا پڑا ہے مگر میرا تجسّس کچھ اور طرح کا ہے۔ ربِّ کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔ جس کے لئے پروردگار نے انسان کو سوچ بچار، تجسّس اور نفع نقصان کو پہچاننے کی صلاحیت سے سرفراز کیا۔ اسے اپنا رزق خود تلاش کرنے کے راستے دکھائے۔ اس کے لئے نیکی اور بدی کے تصورات اجاگر کئے اور اس بنیاد پر جزا اور سزا کے تصور سے بھی اپنی اس مخلوق کو بخوبی آگاہ کر دیا۔ بطور مسلمان آخرت پر ہمارا ایمان وعقیدہ ہے اور ''کل نفسٍ ذائقۃ الموت'' ایک اٹل حقیقت ہے۔ جس کے لئے ہر ذی روح کی موت کا وقت بھی متعین ہے۔'' اس طرح موت ہی زندگی کی محافظ ہوتی ہے جو کسی فرد کی موت کے متعینہ وقت تک اسے مرنے نہیں دیتی۔ سو اس نظام کائنات کی ہر حقیقت وحکمت خالق کائنات کے دست قدرت میں ہے۔ اگر خالقِ کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اسے کائنات کے دیگر عوامل اور دوسری مخلوقات پر فضیلت دی ہے اور شرف انسانیت کو انسانی معاشرے کی بنیاد بنایا ہے تو آج میرا تجسّس یہی ہے کہ کرونا نام کے حشرات الارض سے بھی کہیں نیچے کے نامعلوم جرثومے کے محض خوف سے اشرف المخلوقات کو آج قہر مزلت میں کیوں دھکیل دیا گیا ہے کہ آج اس وائرس کی زد میں آنے کے خوف نے سارے انسانی رشتے اور جذبے ہی یکلخت مٹا دیئے ہیں۔ شرف انسانیت کے وصف سے ہی پلک جھپکتے میں محروم کر دیا ہے۔ لازمی مذہبی عبادات کے تقاضوں سے ہی پرے ہٹا دیا ہے۔ آج کرونا وائرس کی زد میں آنے والا ایک انسان دوسرے انسان کے لئے نفرت وحقارت کی علامت بن گیا ہے۔ اسکی زندگی انتہائی بے بسی والی تنہائی میں گزرتی ہے۔ دوسرے انسان اور مسیحا تک اسکے قریب جانے سے خوف کھاتے ہیں۔ کسی کا دل اس کے لئے قربت والے جذبات پر نہیں پسیجتا اور کسی کو اس کے احسانات اور قریبی

رشتہ داری کا بھی پاس نہیں رہتا اور اسی بے بسی کی حالت میں جب اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرتی ہے تو اس کی اشرف المخلوق والی حیثیت اور نام نسب کچھ بھی اس کے کام نہیں آتا۔ بس وہ کرونا زدہ جسم کا لوتھڑا بن جاتا ہے جس کی نہ میت کو غسل دینے کے لئے کوئی انسانی جذبہ جوش مارتا ہے نہ اس کی میت کو کندھا دینے کے لئے کوئی شرف انسانیت کے ناطے آگے بڑھتا ہے، نہ اس کی نماز جنازہ میں شرکت کارِثواب بنتی ہے اور نہ اسے مذہبی رسومات کے مطابق ڈھنگ سے دفن کرنے کا کوئی اہتمام ہو پاتا ہے۔ ایسے بے بس و لاچار اور راندۂ درگاہ انسان کے لئے بہادر شاہ ظفر کی اس حسرت کا ہی اظہار ہو سکتا ہے کہ......

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا ، نہ کوئی مزار ہوتا

بے شک ہر انسان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور اس ناطے سے کوئی انسان موت سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ موت کو گلے لگانا ہی ہماری آخرت کی تیاریوں کا لازمی حصہ ہے مگر ایسی موت کس کی خواہش ہو سکتی ہے کہ دینی اور دنیاوی حوالے سے اس کے عقیدت مند بھی اسکے لئے غم کے جذبات سے لبریز نہ ہو پائیں اور اس کے لئے خس کم جہاں پاک والی کیفیت بن جائے۔

یہی وہ خوف ہے جو اشرف المخلوقات کے لئے مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق کرونا وائرس کے ڈراوے میں مرض الموت میں مبتلا کئے جا رہا ہے۔ بس یہی میرا تجسّس ہے کہ اشرف المخلوقات کی ایسی بے توقیری کیا خالقِ کائنات کی منشاء ہو سکتی ہے۔ آج کرونا کے خوف نے ہم سے فرضی اور نفلی عبادات کے سارے لازمی تقاضے چھین لئے ہیں، حرمین شریفین، مساجد اور دوسری عبادت گاہوں سے پرے دھکیل دیا ہے اور گھروں کے اندر بھی ایک دوسرے سے ہاتھ تک ملانے کی اپنائیت سے محروم کر دیا ہے تو خدا نہ کرے کل کو کوئی دوسرا خوف ہمیں نماز، روزہ، حج کی فضیلت سے ہی محروم نہ کر دے۔

بے شک احتیاط لازم ہے اور آج کرونا وائرس سے بچاؤ کے لئے سارا زور اسی پر ہے مگر بھلے لوگو! کچھ اور تجسّس بھی کر لو۔ انسانی معاشرے کو ان دیکھے خوف میں مبتلا کرنے کی اس شورا شوری میں احتیاطی اقدامات کے سوا کوئی دوسری سوچ پنپنے نہ دینا بھی تو کوئی تھیوری ہو سکتی ہے۔

اس حوالے سے سوشل میڈیا پر تو حکمت و دانش کے بہت سے موتی بکھیرے جا رہے ہیں اور طبی مشوروں کی تو کوئی کمی ہی نہیں رہ گئی۔ بے شک ان مشوروں پر کان نہ دھریئے مگر تین معتبر حضرات کی سوشل میڈیا پر چلنے والی ویڈیوز کا ذرا خوف کے اثرات سے باہر نکل کر جائزہ لے لیجئے۔ ہوسکتا ہے انسانی معاشرے کو ان دیکھے خوف میں مبتلا کرنے کی کسی اصل کہانی کا کوئی سرا آپ کے ہاتھ آ جائے۔ ان میں ایک ہمارے سینئر اور فی الواقع معتبر سابق سفارتکار عبداللہ حسین ہارون ہیں اور دوسرے بھارت کے دو جید ڈاکٹر امر آزاد اور بسوا روپ رائے چودھری ہیں جنھوں نے اپنے سالہا سال کے تجربات اور تحقیق و تجسس کی بنیاد پر کرونا وائرس کو کسی قدرتی آفت کے بجائے انسانوں کو خوف میں مبتلا کر کے دوسروں پر اپنی دھاک بٹھانے اور پھر اپنا سودا بیچنے کے لئے کرونا وائرس لیبارٹریوں میں تیار کر کے مخصوص دنیا میں پھیلانا ثابت کیا ہے۔ عبداللہ حسین ہارون نے تو باقاعدہ ریکارڈ کے ساتھ اس مبینہ سازش کی جزیات تک بے نقاب کر دی ہیں اور آپ اسے حسن اتفاق کہیں یا اپنی اپنی تحقیق کا نچوڑ۔ یہ تینوں حضرات امریکہ اور اسرائیل کے اس وائرس کے موجد ہونے پر متفق ہیں جس کے لئے ان کی پیش کردہ دلیلیں اور حقائق بے معنی بھی نظر نہیں آتے۔ ان کے دلائل کے جواب میں کئی حضرات کے یہ دلائل بھی سامنے آئے ہیں کہ اگر یہ امریکہ اور اسرائیل ہی کی ساختہ سازش ہوتی تو امریکہ اور یورپی ممالک خود اس وائرس کی لپیٹ میں کیوں آتے اور امریکہ اپنے ہی لوگوں کو مروا کر کیوں اپنی دھاک بٹھاتا۔

ارے صاحب۔ یہ امریکہ ہی تو ہے جو اپنے مقاصد و مفادات کی خاطر اپنے پیارے لوگوں کی بلی چڑھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اگست 1988ء میں جنرل ضیاء الحق کے ائر کریش کی مثال ہمارے سامنے ہے جس میں امریکہ نے پاکستان میں اپنے سفیر رافیل کی بھی قربانی دے دی تھی۔ بہرحال یہ بھی ایک تھیوری ہے جو غور و فکر کی متقاضی ہے۔ میری تو آج رب کائنات سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمیں کرونا وائرس کے خوف میں ڈوبی بے بسی اور لاچارگی کی موت سے بچائے۔ ہائے کیا خوف ہے کہ مجھے اپنے اس شعر نے بھی خوف سے دہلا دیا ہے کہ.....

خوف کے یوں بیج ہم بونے لگے
کوئی دستک دے تو گھر رونے لگے

جو سکھایا سبق ''کرونا'' نے

آج پوری دُنیا میں اگر کوئی چیز موضوع بحث ہے اور انسانی ذہن پر حاوی ہو چکی ہے تو وہ کرونا وائرس ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی افتاد نے انسانی معاشرے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ کئی انسانی قدریں تبدیل کر دی ہیں یا صفحۂ ہستی سے مٹا دی ہیں اور چار دانگ عالم میں بے بسی کی تصویر بنا کروفر والا انسان ''کرونا سے ڈرنا نہیں، لڑنا ہے'' کے جسم پر طاری کپکپی کے ساتھ نعرے لگاتا ہوا عملاً کسی نہ کسی محفوظ ٹھکانے میں دبکا پڑا ہے۔

یہ وائرس کہاں سے آیا، کیسے نمودار ہوا، کس کے نامۂ اعمال سے پھسل کر پوری دنیا میں پھیل گیا اور انسانی ہلاکتوں کے انبار لگاتا گیا۔ اس کے بارے میں کئی سازشی تھیوریاں سوشل میڈیا پر مٹرگشت کر رہی ہیں اور چین اور امریکہ تو اس وائرس کی ''ایجاد'' کے حوالے سے ایک دوسرے پر ملبہ ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے۔ روس، ایران اور ترکی بھی کرونا وائرس کی مبینہ امریکی سازش کو طشت از بام کرنے والے چین کے موقف کا دم بھر رہے ہیں۔ یہ بحثیں تو جیسے جیسے کرونا وائرس سے انسانی تباہ کاریاں پھیلتی جائیں گی، اس کے ساتھ ہی گرما گرمی کا ماحول طاری کئے رکھیں گی مگر بھلے لوگو۔ اس کرونا وائرس نے لہو ولعب میں لتھڑے انسانی معاشرے میں کچھ اچھائیاں بھی تو پیدا کی ہیں تو کیوں نہ آج ان اچھائیوں کا تذکرہ کرکے انسانوں پر ٹوٹنے والی اس افتاد کے مثبت پہلو اجاگر کئے جائیں۔

تو جناب اس جان لیوا وائرس سے انسانی معاشرے کو جو پندرہ 20 فوائد وثمرات حاصل ہوئے ہیں ان کے تذکرے کو آپ مذاق ہرگز نہ سمجھیں بلکہ اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور غور وفکر کریں کہ قدرت نے اس آفت کو سرکش انسانی معاشرے کے سدھار کے لئے کیسے نعمتِ غیر مترقبہ بنایا ہے۔ انسانی معاشرے کے سدھار کا یہ مجرب نسخہ کرونا وائرس کے ثمرات کی صورت میں

مجھے ایک دیرینہ عزیز دوست اور نوائے وقت میں میرے ایک سابقہ رفیق کار نے بھجوایا ہے جو کرونا وائرس سے بے بس ولاچار ہوئے بیٹھے انسانوں کی تسلی اور تشفی کے لئے من وعن پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

''کرونا وائرس نے سنیما گھر، نائٹ کلب، رقص گاہیں، شراب خانے، جواء خانے بند کرا دیئے، جنسی بے راہروی کے مراکز بند کرادیئے، سود کی شرح بھی کم کرادی، خاندانوں کو ایک طویل جدائی کے بعد ان کے گھروں میں دوبارہ اکٹھا کیا، غیر مرد اور غیر عورت کو ایک دوسرے کو بوسہ دینے سے روکا، عالمی ادارۂ صحت کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور کیا کہ شراب پینا تباہی ہے لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے۔ اسی طرح کرونا وائرس نے صحت کے تمام اداروں کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ درندے، شکاری پرندے، خون، مردار اور مریض جانور انسانی صحت کے لئے تباہ کن ہیں۔ پھر کرونا وائرس نے انسان کو چھینک مارنے کا اصل طریقہ سکھایا اور یہ بھی یاد کرایا کہ صفائی کس طرح کی جاتی ہے جسے حضرت نبی آخر الزمان، محسن انسانیت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف ایمان قرار دیا ہوا ہے۔

اس موذی وائرس کی دیگر خوبیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو یہ ہے کہ اس نے فوجی بجٹ کا ایک تہائی حصہ صحت کی طرف منتقل کرایا۔ دونوں جنسوں کے ناجائز اختلاط کو مذموم قرار دیا، دنیا کے بڑے ممالک کے حکمرانوں کو باور کرادیا کہ لوگوں کو گھروں میں پابند کرنے، جبری بٹھانے اور ان کی آزادی چھین لینے کے انسانی معاشرے اور حکومتی گورننس پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور پھر حضور والا! کرونا وائرس نے انسانی مخلوق کو اپنے خالق ربِ کائنات سے گڑگڑا کر دعا مانگنے، گریہ زاری اور استغفار کرنے پر مجبور اور منکرات وگناہ سے کنارہ کشی پر آمادہ کیا ہے۔ اس نے متکبرین کے کر وفر کا سر پھوڑ دیا اور انہیں عام انسانوں والا لباس پہنا دیا۔ اس نے دنیا کے کارخانوں کی زہریلی گیس اور دیگر آلودگیوں کو کم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے ٹیکنالوجی کو ربّ ماننے والوں کو دوبارہ حقیقی ربّ کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کیا۔ حکمرانوں کو جیلوں اور قیدیوں کی حالت ٹھیک کرنے پر آمادہ کیا اور اس جرثومے نما وائرس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی وحدانیت کو انسانوں سے تسلیم کرایا۔ شرک اور غیر اللہ سے مدد مانگنے سے روکا۔ انسان کو دوبارہ انسانیت، اس کے خالق اور اس کے اخلاق کی طرف متوجہ کیا۔

توجناب! آج عملی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ بظاہر ایک وائرس مگر فی الحقیقت اللہ جل شانہُ کے ایک ادنیٰ سپاہی نے انسانیت کے لئے شر کی جگہ خیر کو مقدم ٹھہرادیا ہے تو پھر تم خدا کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔ پس اے لوگو! کرونا وائرس پر لعنت مت بھیجو۔ یہ تمہارے بھلے کے لئے ہے اور اب بلاشبہ انسانیت اس طرح نہ ہو گی جیسے پہلے ننگِ انسانیت کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ پس توبہ کرو اور اس سے توشۂ آخرت کا اہتمام کرو۔ وماعلینا الا البلاغ۔ چلتے چلتے ان اسباق کا بھی تذکرہ ہو جائے جو کرونا وائرس نے ہمیں سکھائے ہیں گویا......

وہ کتابوں میں درج تھا ہی نہیں
جو سکھایا سبق ''کرونا'' نے

اور ہمیں سبق یہ ملا ہے کہ امریکہ دنیا کا سب سے طاقتور ملک ہرگز نہیں۔ چین نے تیسری عالمی جنگ جیت لی ہے بنا کوئی میزائل یا گولی چلائے۔ اگلا سبق یہ ہے کہ یورپین اتنے مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں جتنے وہ نظر آتے ہیں۔ غریب آدمی امیر آدمی سے زیادہ مضبوط ہے۔ دنیا کے لئے سب سے بڑا وائرس خود حضرتِ انسان ہے۔ کوئی وید، پجاری، پادری خدا کی رضا کے بغیر انسان کو شفا نہیں دے سکتا۔ پھر کرونا وائرس کے اس سبق کو پلے باندھ لیجئے کہ گھروں میں رہ کر بھی کاروبار کیا جا سکتا ہے۔ ہم فاسٹ فوڈ اور غیر ضروری سرگرمیوں کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس دنیا میں اب بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔ اگر ہم زیادہ سکول بنائیں گے تو ہمیں زیادہ ہسپتال بنانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم گاڑیوں کے بغیر بھی چل سکتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت بہت ہے اگر ہم اس کی قدر کریں اور اس کا صحیح استعمال کریں۔ ضرورت سے زیادہ پیسہ کسی کام کا نہیں اور آخری سبق یہ کہ دنیا جتنی بھی ترقی کر لے، وہ قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

توجناب! دیکھا آپ نے۔ کرونا نے کیسے انسانی قدریں تبدیل کی ہیں۔ کرونا تیرا شکریہ

مسلمانوں کے حصّے میں آئی تضحیک

بھارت کی تو یہ خصلت ہے کہ اس نے ہر خرابی، ہر برائی اور اپنی بھی ہر بداعمالی کا ملبہ پاکستان اور مسلمانوں پر ڈالنا ہوتا ہے، چنانچہ کرونا وائرس کی وباء پھیلی تو اس کا ناطہ بھی مسلمانوں اور ان کی بنیاد پر پاکستان کے ساتھ جوڑنے میں مودی سرکار نے ذرا بھر دیر نہ لگائی۔ بھارت میں چن چن کر مساجد اور تبلیغی جماعت کے لوگوں کو نشانہ بنایا گیا، ان پر مظالم کی انتہا کر دی گئی۔ مودی سرکار کے پرودہ ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے تو تبلیغی جماعت کے ارکان کے قتل عام کی مبینہ منصوبہ بندی بھی سوشل میڈیا پر گردش کرنے لگی اور بھارتی سکیورٹی فورسز نے سب سے زیادہ تشدد بھی مساجد میں جانے والے نمازیوں پر کیا۔ اس پر ایک ہندو دانشور خاتون بھی خاموش نہ رہ سکی، جس نے سوشل میڈیا پر اپنا ویڈیو پیغام جاری کر کے تبلیغی جماعت کے خلاف کارروائیوں کے حوالے سے مودی سرکار کی سازشوں کا پول کھولا اور اقوام عالم کے سامنے اصل بھارتی چہرہ بے نقاب کیا۔ اب ایک اسرائیلی تاریخ دان نوح حریری نے بھی بھارت کی مسلم دشمنی کو بے نقاب کرتے ہوئے عالمی برادری کو باور کرایا ہے کہ بھارت کرونا وائرس کے نام پر مسلمانوں کو نشانہ بنا رہا ہے جبکہ یہ وقت نفرتیں پھیلانے کا نہیں بلکہ مل کر کرونا وباء سے نمٹنے کا ہے۔

ارے صاحب! اس معاملہ میں ہم صرف مسلمان مخالف جنونی مودی سرکار کو ہی کیوں دوش دیں، کیا ہم نے خود بھی کرونا وائرس کی آڑ میں شعائرِ اسلامی اور اپنی عبادات وعبادت گاہوں کی بھد اڑانے میں کوئی کسر چھوڑی ہے۔ ہمارے نام نہاد لبرل طبقات نے تو شعائرِ اسلامی، مسنون دعاؤں اور عبادات کو تضحیک کا نشانہ بنانے کیلئے بے ہودہ لطائف اور باجماعت نماز کی ادائیگی کے طریقہ کار پر ایسے ایسے توہین آمیز الفاظ ایجاد کر کے سوشل میڈیا کی زینت بنائے کہ جن کو دیکھ، سن

اور پڑھ کر شرمائیں ہنود و یہود۔ یہ ''لطیفہ'' تو مجہول ذہن والے ہمارے ہر لبرل نے سوشل میڈیا پر پھیلایا کہ ایک خاتون سے دریافت کیا گیا کہ آیا اس نے کرونا وائرس سے بچنے کیلئے سینی ٹائزر یا صابن کے ساتھ ہاتھ دھوئے ہیں تو اس خاتون نے جواب دیا کہ میں نے ہاتھ دھوتے وقت کلمہ شریف پڑھ لیا تھا۔ خاتون کے اس جواب پر لطیفہ گھڑنے والے بدبخت نے یہ پھبتی کسی کہ آپ کے اس عمل سے کرونا وائرس شاید مسلمان تو ہو گیا ہوگا مگر وہ مرا ہرگز نہیں۔ ایسے بے شمار لطائف ہمیں سوشل میڈیا پر بے حد و حساب دستیاب ہیں جو ہمارے اپنے ہی لبرل طبقات نے دین اسلام کے بارے میں اپنے ذہن کی غلاظت کو اجاگر کرتے ہوئے شیئر کئے اور پھیلائے ہیں۔

اور کیا ہم نے بھی کرونا وائرس کی آڑ میں تبلیغی جماعت کے بارے میں زہر اُگلنے اور اس کے بے ضرر ارکان کے ساتھ انسانیت سے گرا ہوا سلوک روا رکھنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے، ان کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک بھارتی ہندو سیکورٹی فورسز نے روا رکھا بعینہ ہم نام نہاد مسلمانوں نے بھی تبلیغ دین کے قطعی بے ضرر اور پرامن مشن میں مصروف اس جماعت کے لوگوں کو چن چن کر ذہنی اور جسمانی اذیتیں دیں اور انہیں پولیس حوالاتوں اور جیلوں میں ڈالا جس پر حکومتی اتحادی مسلم لیگ (ق) کے قائدین چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی کا فوری طور پر سخت ردعمل ایک ویڈیو پیغام کے ذریعے سامنے آ گیا اور اس کے بعد انہوں نے حکمران طبقات کو یہ بھی باور کرا دیا کہ تبلیغی جماعت کو لاوارث نہ سمجھا جائے۔ ہندو خاتون دانشور تو اپنے ویڈیو پیغام میں یہ سوال بھی اُٹھا چکی تھی کہ کیا امریکہ، سپین، اٹلی اور کرونا وائرس کی زد میں آئے دیگر مغربی و یورپی ممالک میں تبلیغی جماعت کے لوگوں نے جا کر کرونا وائرس پھیلایا ہے اگر ہمارے ملک میں بھی تبلیغی جماعت کے لوگوں میں کرونا وائرس کے شواہد ملے ہیں تو بھلے لوگو! ذرا یہ تجزیہ بھی کر لو کہ انہیں کرونا وائرس کہاں سے منتقل ہوا ہے پھر کرونا وائرس کے پاکستان میں پھیلاؤ کا باعث بننے والے ان طبقات کے ساتھ بھی آیا ویسا ہی سلوک کیا گیا ہے جو تبلیغی جماعت کے لوگوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ کہیں ہم بھیڑ چال میں ہنود و یہود کی کسی سازش کا شکار تو نہیں ہو گئے۔ اس معاملہ میں ہمیں اپنے ان عمومی رویوں کا بھی سنجیدگی سے جائزہ لینا ہوگا جو ہم مساجد میں اپنی عبادات کے حوالے سے اختیار

کئے ہوئے ہیں۔ کروناوائرس کا سب سے شافی علاج انسانوں کے مابین سماجی روابط ختم کرنے اور فاصلے قائم کرنے کا نکالا گیا ہے۔ بے شک ہمیں احتیاطی اقدامات اٹھانے چاہئیں، جس کیلئے ہمارے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام بھی متفق علیہ ہیں اور انہوں نے مساجد میں انسانوں کے مابین فاصلے کے حوالے سے حکومتی ہدایات کی پابندی کے ساتھ تعمیل کرائی بھی ہے مگر کروناوائرس کا یہی شافی علاج ہے تو یہ فارمولا بلاامتیاز ہر طبقہ زندگی اور ہر شعبہ زندگی پر لاگو کیا جانا چاہئے۔ وزیراعظم عمران خان تو انسانی فاصلہ قائم کرنے والے سخت لاک ڈاؤن کے شروع دن سے مخالف ہیں، جس کیلئے ان کے اس استدلال میں بھی وزن ہے کہ اس اقدام سے ہم لوگوں کو کروناوائرس سے بچاتے بچاتے انہیں بھوک سے مار بیٹھیں گے۔ انہوں نے 2 روز قبل اسی تناظر میں لاک ڈاؤن میں نرمی کے جو اقدامات اٹھائے، ان پر عملدرآمد کا نتیجہ آج سماجی روابط بڑھنے کی صورت میں ہی برآمد ہوا ہے جبکہ اس سے پہلے امدادی رقوم کی احساس پروگرام کے تحت تقسیم کے مناظر پوری قوم دیکھ چکی ہے کہ خواتین و حضرات یہ رقوم وصول کرنے کی خاطر ایک دوسرے کے اُوپر چڑھے ہوئے تھے۔ سپریم کورٹ نے بھی اسی بنیاد پر حکومتی کارکردگی کا نوٹس لیا، اب لاک ڈاؤن میں نرمی کے نتیجہ میں انسانی فاصلے مزید سکڑ گئے ہیں تو مفتی منیب الرحمٰن، مولانا فضل الرحمٰن، سراج الحق اور دوسرے علماء کرام یہ سوال اُٹھانے میں بھی حق بجانب ہیں کہ کیا سماجی فاصلے کا اُصول صرف مساجد پر ہی لاگو ہوتا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ اس معاملہ پر مشاورت کیلئے صدر مملکت نے کل 18 اپریل کو علماء کرام کی ویڈیو کانفرنس طلب کی ہے۔ آپ نے جو بھی اُصول اور قانون لاگو کرنا ہے، وہ بلاامتیاز لاگو کیجئے اگر صرف مساجد پر ہی اس معاملہ میں ''نظر کرم'' کی جائے گی تو پھر بھائی صاحب! ایجنڈا کروناوائرس کا پھیلاؤ روکنے کا نہیں کچھ اور ہی ہوگا۔

خدا کی رسّی

کرونا وائرس نے اقوام عالم کو کس حد تک اور کس انداز میں متاثر کیا ہے اور اس آفت کے ٹلنے کے بعد کی دنیا کیسی ہوگی۔ اس بارے میں تو آنے والے وقتوں میں بھی بحث جاری رہے گی۔ میری تشویش اس وقت کرونا وائرس کی وجہ سے دینِ اسلام۔ اس کی عبادات، عبادت گاہوں اور اس کی تکریم انسانیت والی خاصیت کے اپنے بیگانوں کے نشانے پر آنے کے حوالے سے ہے۔ اگر آج ہم پر ایسی افتاد آن ٹوٹی ہے کہ کرونا وائرس کا شکار ہونے والے اپنے کسی پیارے کی نعش کو اسلامی تعلیمات اور شرف انسانیت کے تقاضوں کے تحت غسل بھی نہیں دے سکتے۔ اس کی نماز جنازہ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ میت کا منہ نہیں دیکھ سکتے اور اسے صائب طریقے سے دفنا بھی نہیں سکتے اور اسی طرح آج فرضی عبادات کے لئے بھی ہم پر عملاً خانہ کعبہ، مسجد نبویؐ اور مساجد و امام بارگاہوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں تو اس سے بحیثیت قوم ہمارے ساتھ جہاں خدا کی ناراضگی عیاں ہوتی ہے وہیں یہ صورتِ حال ہمارے لئے لمحۂ فکریہ بھی ہے کہ ہمیں کرونا کے خوف کی لپیٹ میں آنے کے باوجود ربِّ کعبہ سے اپنی سرکشیوں کی سزا کا آج بھی کوئی خوف نہیں۔ ہم آج بھی اسی طرح لہو و لعب میں ڈوبے اپنے متکبرانہ رویوں اور لہجوں کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ آج بھی دوسروں کا حق چھین کر کھانے، اپنے سے کمتر انسانوں کی تحقیر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے، سارے وسائل اپنی ہی دسترس میں کئے رکھنے اور پہلے ہی کی طرح مجبور و بے بس لوگوں کا استحصال جاری رکھنے کی ڈگر پر ہی چل رہے ہیں۔ آپ اندازہ لگایئے کہ کرونا وائرس نے نخوت و تکبر میں ڈوبے مادیت پرستوں کی دنیا کیسے تبدیل کی۔ اٹلی اور سپین میں دھن دولت والوں نے کرونا وائرس سے اپنے لوگوں کی لاشوں کے ڈھیر لگتے دیکھ کر اور اپنے پیاروں کی جانیں بچانے کے لئے اپنا دھن دولت کسی کام نہ آنے پر یہ دولت اپنی تجوریوں سے نکال نکال کر گلیوں، بازاروں اور سڑکوں میں بکھیر دی۔ کئی متمول لوگوں نے

اسی بے بسی میں اپنی بلند و بالا بلڈنگوں سے کود کر خودکشی کر لی اور خدا کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے مادیت پرست معاشرے کے ان ملحدوں نے عاجزی کے ساتھ خدا کے حضور سر جھکا دیا۔ ان ملحدوں کے دینِ اسلام کی پناہ میں آنے کے کئی سحر انگیز مناظر بھی سوشل میڈیا کے ذریعے ہم سرکشوں کے مشاہدے میں آ چکے ہیں مگر مجال ہے ناجائز منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں، ناپ تول میں ڈنڈی مارنے والوں، جعلسازی کے ساتھ گھٹیا مال نکالنے اور اس کے زیادہ دام وصول کرنے والوں نے اپنی روش تبدیل کی ہو۔ مجال ہے لوٹ مار سے حاصل کی گئی دھن دولت پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے اشرافیاؤں، ساہوکاروں نے مجبور و بے بس انسانوں کی دیکھ بھال کا کوئی ہلکا سا بھی جذبہ اپنے دلوں میں پیدا ہونے دیا ہو اور اپنی دولت کو ہوا لگائی ہو۔

ماہ رمضان المقدس کا کل 25-اپریل سے آغاز ہو رہا ہے مگر اس مقدس مہینے کی آمد سے پہلے ہی عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر ناجائز منافع کمانے والوں نے اپنی لوٹ مار کا پورا اہتمام کر لیا ہے۔ اپنا گھٹیا مال مہنگے داموں فروخت کرنے کا یہی موقع انہیں غنیمت نظر آتا ہے اور روزے رکھ کر جھوٹ بولنے، غیبت کرنے، مغلظات بکنے اور کسی کا حق مارنے سے انہیں ذہنی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ پھر ہم ایسے ریاکاروں پر خدا کا عذاب کیوں نازل نہیں ہو گا۔ ہمارے لئے تو کرونا وائرس سے مرنے والے اپنے پیاروں کی نعشوں کی بے توقیری ہی مقام عبرت ہونا چاہئے اور اپنے ہی ایسے انجام کا خوف رجوع الی اللہ کے لئے کافی ہونا چاہئے مگر ذرا اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیے۔ کیا ہمیں اپنی عاقبت بچانے اور سنوارنے کے لئے شعائر اسلامی پر کاربند ہونے کی کوئی فکر لاحق ہوئی ہے۔ کیا ہم نے شرفِ انسانیت سے توڑا ہوا اپنا ناطہ جوڑ لیا ہے اور روزِ حساب کی جوابدہی کے لئے خود کو تیار کر لیا ہے؟ ہمارا وہی چلن برقرار و قائم ہے اور احکام خداوندی سے سرکشیوں میں ہی ہماری تسکین ہوتی ہے تو بے شک ہم قہرِ خداوندی کو ہی دعوت دے رہے ہیں۔

ہمارے لئے اس سے بڑا المیہ اور عبرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم رحمت و برکت اور معافی والے مقدس مہینے رمضان المبارک میں بھی اپنی مقدس مذہبی عبادت گاہوں میں خدا کے حضور سر جھکانے سے محروم کر دیئے گئے ہیں اور دنیاداری میں لپٹے ہمارے جید علماء کرام بھی اس کے جواز میں دلیلیں اور تاویلیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں۔ اسلام دشمن قوتوں کے لئے تو یہ موقع غنیمت ہے چنانچہ وہ ہمارے مذہبی اجتماعات اور عبادت گاہوں کو ہی نشانہ بنائے بیٹھے ہیں۔ کرونا وائرس سے بچنے کے لئے

سماجی فاصلہ قائم کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے تو باقی سارے مقامات کو چھوڑ کر تان مساجد پر ہی آ کر ٹوٹتی ہے اور اپنی دنیاداری کے باعث ہم خود بھی اس پراپیگنڈہ کے اسیر ہو رہے ہیں جو درحقیقت امتِ محمدیؐ کی اجتماعی قوت کو توڑنے کی گھناؤنی سازش ہے۔ ملحدوں پر دینِ اسلام کی دھاک ہماری اجتماعی قوت سے ہی بیٹھتی ہے۔ اس لئے انہوں نے کرونا کی آڑ میں اپنا پہلا ہدف مسلمانوں کی اجتماعی قوت توڑنے کا ہی رکھا ہے اگر ہم خود ہی ملحدوں کو ان کے اس ہدف کی تکمیل کا موقع فراہم کر رہے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ خدا ہم سے روٹھ چکا ہے اور ہم اس کی بارگاہ سے ٹھکرائے جا چکے ہیں۔ خود کو سنبھالنے کا چارہ کیجئے اور خشوع خضوع کے ساتھ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جایئے۔ رمضان کے ماہ مقدس کو خدا سے معافی مانگنے کا نادر موقع سمجھئے کیونکہ خدا کی رسی ہمیشہ کے لئے دراز نہیں رہے گی۔ اس کے کھینچے جانے سے پہلے ہی راہ راست پر آ جایئے ورنہ آپ کو پچھاوے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔

ڈھونگی سوامی وشوا آنند

آج دنیا میں کرونا وائرس سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد دو لاکھ دس ہزار تک جا پہنچی ہے اور کرونا کے مریض بھی بڑھتے بڑھتے 30 لاکھ سے تجاوز کر چکے ہیں اور ہمارے ملک پاکستان میں بھی کرونا مریضوں اور اس سے جاں بحق ہونے والوں کی تعداد تشویشناک حد تک بڑھ رہی ہے تو کرونا وائرس سے بچاؤ کے احتیاطی اقدامات تو ہمیں بہر صورت مزید سخت کرنا ہوں گے۔ اگر انسانی، سماجی فاصلے بڑھانا ہی اب تک اس موذی وائرس کا علاج دریافت ہوا ہے تو پورے ملک میں اور ہر شعبۂ زندگی پر اس کا یکساں اطلاق کر کے بھی دیکھ لیا جائے۔ معاملہ صرف اس وقت شکوک کے قالب میں ڈھلتا ہے جب انسانی فاصلے کے حوالے سے ایک دوسرے سے متضاد شعبہ جاتی پالیسی اختیار کی جاتی ہے اور بطور خاص مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو نشانے پر رکھا جاتا ہے۔

اس حوالے سے ان دنوں اس ''فلسفے'' کا بہت زیادہ پرچار کیا جا رہا ہے کہ جان بچانا فرض ہے۔ پہلے جان بچاؤ، پھر باقی کے معاملات دیکھو۔ یقیناً زندگی اور موت دستِ قدرت میں ہے اور بطور مسلمان ہمارا عقیدہ ہے اور فرمان خداوندی بھی یہی ہے کہ ''وہی ہے جو مرض بھی دیتا ہے اور شفا بھی'' مگر کرونا وائرس سے مرنے والے کی نعش کی جس طرح بے توقیری ہو رہی ہے اور کرونا کے مریضوں کو جس ذہنی پستی کی انتہاء میں عملاً اچھوت کا درجہ دے دیا گیا ہے اس کے باعث کرونا کی زد میں آنا اور اس جہان فانی سے کوچ کرنا خوف کی علامت بن چکا ہے اس لئے ہمیں ایسے مرض اور اس کے باعث ہونے والی بے بسی کی موت سے خود کو بچانے کا بہر صورت جتن کرنا ہے۔ اس کے لئے آپ مکمل لاک ڈاؤن کا تجربہ کر کے دیکھ لیں اور اس پر کوئی سیاست نہ کریں۔ لوگ بھوک برداشت کر لیں گے مگر کسی قسم کا امتیازی سلوک بہر صورت برداشت نہیں کریں گے۔ صرف مساجد اور مسلمانوں کی دوسری عبادت گاہوں کو ہدف نہ بنائیں۔ آپ اس کیلئے سعودی حکمرانوں

کے اقدامات کا حوالہ دیتے ہیں تو پھران اقدامات کی پیروی کرتے ہوئے کسی بھی فرد کو گھر سے نہ نکلنے دیں اور کسی بھی کاروبار و اجتماع کی اجازت نہ دیں پھر کسی کو ایسے اقدامات پر کوئی اعتراض نہیں رہے گا ورنہ بطور خاص مساجد کو ویران کرنا الحادی قوتوں کی اس مہم کا ہی حصہ سمجھا جائے گا جو انہوں نے کرونا وائرس کی آڑ میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت توڑنے اور انہیں انتہائی کمتر درجے کا انسان قرار دلانے کے لئے شروع کر رکھی ہے۔

اس معاملہ میں سب سے زیادہ زور بھارت کی مودی سرکار اور اس کی پروردہ ہندو انتہا پسند تنظیمیں لگا رہی ہیں۔ کرونا وائرس کے پھیلاؤ کا ملبہ مسلمانوں پر ڈالنے کی گھناؤنی بھارتی سازش تو اب پوری دنیا میں بے نقاب ہو چکی ہے۔ پھر بھی مودی سرکار پوری ڈھٹائی کے ساتھ مقبوضہ کشمیر اور پورے بھارت میں مسلمانوں کا حشر نشر کر رہی ہے اور اب وہاں مساجد میں اذان دینا بھی تعزیری جرم بنا دیا گیا ہے۔

آپ اس سے ہی اندازہ لگالیں کہ الحادی قوتوں کا اصل ایجنڈہ کیا ہے اور کیا ہمیں کرونا وائرس سے بچاؤ کے احتیاطی اقدامات کی آڑ میں مسلمانوں پر شب خون مارنے کا ہنود و یہود و نصاریٰ کا باطل ایجنڈہ سر جھکا کر قبول کر لینا چاہئے یا اسے دنیا میں بے نقاب کرنے کے لئے مقدور بھر کردار ادا کرنا چاہئے؟

اس معاملہ میں اسلام اور پاکستان دشمن جنونی مودی سرکار اور اس کے چیلے چانٹے کتنے متحرک ہیں اس کی ایک جھلک میں آپ کو بھارت کے ایک ڈھونگی سوامی وشوا آنند کی مسلم مخالف حرکات کی صورت میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ حضرت خود کو ”مدر آف دی ورلڈ“ قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو ورغلانے کے لئے پرچار کر رہے ہیں انسانیت کی بقا کے لئے ان کی 56 سالہ خدمات کے پیش نظر انہیں پیارے اللہ تعالیٰ اور ان کے پیغمبر ”حجور“ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں مدر آف دی ورلڈ مقرر کیا ہے۔ یہ میں کوئی سنی سنائی بات نہیں کر رہا، نہ میں نے اپنے طور پر کوئی داستان گھڑی ہے بلکہ اس ڈھونگی سوامی نے ماہ رمضان المبارک کے آغاز سے ایک روز قبل خود مجھے اپنا واٹس ایپ پیغام بھجوایا جو میرے موبائل فون میں محفوظ ہے۔ یہ ڈھونگی سوامی اتفاق سے میرا فیس بک فرینڈ ہے اور انسانیت کی خدمت کی آڑ میں ہندو کے برتر ہونے کی مجہول ذہنیت چھپا نہیں پاتا۔ میری اس کے ساتھ پہلے بھی اسی تناظر میں ایک دو بار تکرار ہو چکی ہے۔ اب تو اس

نے اپنے ڈھونگ کی انتہاء کردی۔ مجھے بھجوائے گئے اپنے وٹس ایپ پیغام میں دعویٰ کیا کہ ''اللہ اور حجور دونوں مجھ سے روزانہ علی الصبح چار سے پانچ بجے تک مخاطب ہوتے ہیں اور دنیا پر مرتب ہونے والے کرونا وائرس کے اثرات پر مجھ سے رپورٹ حاصل کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے وہ مجھ سے بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، سری لنکا، ایران، عراق اور تمام اٹھاون مسلم ممالک کے حالات کے بارے میں بھی پوچھتے رہتے ہیں۔ اب ماہ رمضان کا آغاز ہورہا ہے تو اللہ اور حجور نے پورے پاکستان کو کرونا وائرس سے بچانے کیلئے مجھے سپیشل ڈیوٹیاں تفویض کردی ہیں۔ ان دونوں کی (نعوذ باللہ) اس منصوبہ بندی کے تحت مکہ اور تمام ممالک کی مساجد میں ماہ رمضان کے دوران مسلمانوں کو اکٹھے نماز نہیں پڑھنے دی جائے گی۔'' اس کے لئے ڈھونگی سوامی نے مجھ سے یہ مدد طلب کی کہ میں وزیراعظم پاکستان عمران خاں اور پاکستان کے ملٹری لیڈر باجوہ صاحب (یہ اسی ڈھونگی سوامی کے الفاظ ہیں) کو اس بارے میں قائل کروں کہ وہ کسی بھی شخص کو مساجد میں جانے کی اجازت نہ دیں۔ اس کے بقول اللہ اور حضورؐ کے پلان کے تحت اگر دنیا کے تمام مسلمان کرونا وائرس کے دوران مساجد میں نہیں جائیں گے اور صرف اپنے گھروں میں نمازیں ادا کریں گے تو دونوں (خدا اور حضورؐ) نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ ان کی نمازیں قبول ہوں گی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے یہی ڈیوٹیاں تفویض کی ہیں کہ میں پاکستان میں مسلمانوں کو مساجد میں جانے سے روکوں۔ ڈھونگی سوامی کے بقول اگر وزیراعظم پاکستان اور باجوہ صاحب پاکستان کی مساجد میں لوگوں کے اجتماعات روک دیں گے تو اللہ اور حضورؐ ان دونوں کا اقتدار قائم رکھنے میں ان کی مدد کریں گے۔ ڈھونگی سوامی کے بقول اس کے 550 ورکرز اس مقصد کے لئے اس کے ساتھ پاکستان کے مختلف علاقوں میں کام کررہے ہیں۔ اللہ اور حضور کا یہ پیغام ہے کہ پہلے اپنی جانیں بچائیں پھر دنیا خود بخود محفوظ ہو جائے گی۔''

ڈھونگی سوامی وشوا آنند کے اس اسلام مخالف زہریلے پیغام کی تہہ تک پہنچتے ہوئے میں نے اسے جوابی پیغام وٹس ایپ کیا کہ حضرت نبی آخر الزمان محمد مصطفیؐ نے رب کائنات سے اپنی امت کو بچانے کا پہلے ہی وعدہ لیا ہوا ہے اور ہمارا ایمان اور عقیدہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی اور پیغمبر نہیں آئے گا اس لئے آپ کیسے دعویٰ کرسکتے ہیں کہ اللہ اور ''حجور'' نے آپ کو پیغمبر کی ذمہ داریاں تفویض کی ہیں۔ کرونا

وائرس خالقِ کائنات کی طرف سے اس کی مخلوق کے لئے ایک آزمائش ہے۔ وہ جب چاہیں گے اس وائرس کو ختم کر کے اپنی مخلوق کو بچا لیں گے۔ ان کے تو بس ''کن'' کہنے سے ارض وسما پر سب کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ خالقِ دو جہاں ہیں اس لئے وہ اپنے معاملات میں اپنی مخلوق سے کیونکر مدد مانگیں گے اور وہ بھلا ہمیں کعبہ اور مساجد میں جانے سے کیوں روکیں گے جبکہ یہ مقدس مقامات انسانیت کے لئے امن کا منبع اور دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ ہیں۔ آپ کا ایجنڈہ مجھے مسلمانوں کی اجتماعی قوت توڑنے والا نظر آتا ہے''

ڈھونگی سوامی نے اس کا جواب دینے کے بجائے مجھے اپنا ایک ویڈیو پیغام وٹس ایپ کر دیا جس میں اس نے متذکرہ بالا اپنے سارے دعوے دہراتے ہوئے یہ ہرزہ سرائی بھی کی کہ اللہ نے صرف جان بچانا فرض قرار دیا ہے جبکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سنت ہے جسے جان بچانے کا فرض ادا کرتے ہوئے مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس پر ڈھونگی سوامی کو اپنے جوابی پیغام میں باور کرایا کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ دین اسلام کے بنیادی ارکان ہیں جنہیں ذات باری تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے جنہیں آپ دین اسلام کے بارے میں اپنی ناقص معلومات کی بنیاد پر یا کسی مخصوص ایجنڈے کے تحت سنت کا درجہ دے رہے ہیں اس لئے آپ اسلامی تعلیمات کے بارے میں اپنی معلومات درست کریں اور لوگوں کو گمراہ نہ کریں۔ اور یہ بھی بتا دیں کہ اللہ نے پاکستان میں لوگوں کو مندروں، گرجاؤں اور گردواروں میں جانے سے روکنے کی ذمہ داری کس کو سونپی ہے اس پر ڈھونگی سوامی آئیں بائیں شائیں کرتا نظر آیا اور اس نے اپنے جواب میں کہا کہ میں اپنے طور پر کوئی ایجنڈہ نہیں چلا رہا نہ میرا کوئی خفیہ پلان ہے آپ میرے جذبات اور اللہ کے پیغام کو سمجھ نہیں پائے۔

یہی درحقیقت الحادی قوتوں کا وہ ایجنڈہ ہے جو وہ ڈھونگی سوامیوں جیسے اپنے آلۂ کاروں کے ذریعے مسلمانوں کی اجتماع قوت توڑنے کے لئے بروئے کار لا رہی ہیں اور یہ ایجنڈہ اب مکمل بے نقاب ہو چکا ہے۔ ہم نے کرونا وائرس سے بچنے کے احتیاطی اقدامات بہر صورت اٹھانے ہیں مگر ہمیں اسلام دشمنوں کی گھناؤنی سازشوں سے بھی خود کو بچانا ہوگا۔ خدا ہمیں اپنے دین کو قائم رکھنے کی ہمت و استقامت دے۔

خوف اور لاک ڈاؤن پر دنیا کی کھلتی زبانیں

اب آہستہ آہستہ لوگوں کو یقین ہونے لگا ہے کہ کرونا وائرس کے پیچھے کوئی خوفناک سازش کارفرما تھی، اس لئے اب ڈرے سہمے لوگوں کی زبانیں بھی کھلتی نظر آ رہی ہیں پھر بھی جن سر پھروں کے دلوں میں ''سائنس'' کا سودا سمایا ہوا ہے، وہ آج بھی اس کائنات میں ہونے والے ہر الٹ پھیر کو سائنس کے کھاتے میں ہی ڈالتے ہیں۔ میں جب کرونا وائرس کو رب کائنات کی جانب سے اس کی مخلوق انسانوں کیلئے آزمائش اور کتاب ہدایت قرآن مجید میں کھول کر بیان کی گئی عذاب الٰہی کی نشانیوں کی نبیاد پر اسے عذاب الٰہی سے تعبیر کرتا ہوں تو میرے روشن خیال دوست اسے میری فرسودہ سوچ سے تعبیر کر کے میری بھد اُڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے کچھ دوستوں پر تو سائنس کا بھوت سوار ہے، چنانچہ کرونا وائرس سے نجات کیلئے انہیں رجوع الی اللہ کی بات ہضم ہی نہیں ہو پاتی۔ اسی بنیاد پر میری ایک روشن خیال دوست سے تکرار بھی ہوگئی جو ہر معاملہ میں سائنس کا تڑکا لگانے اور سائنس سے رجوع کرنے کو ہی دنیا کی بقاء کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ میں نے اس سے اس کے ذہنی مائنڈ سیٹ کی روشنی میں ہی چھیڑ خانی کرتے ہوئے استفسار کیا کہ کیا آپ کرونا وائرس کو سائنس کی ہی ایجاد سمجھتے ہیں، اس نے کھٹ سے جواب دیا جی بالکل۔ پھر تو آپ کو کرونا وائرس کے پھیلاؤ کے حوالے سے امریکہ پر عائد ہونے والے الزامات کو درست تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس نے سپر پاور کیلئے چین کو اپنے مدمقابل آنے سے روکنے کیلئے اس پر کرونا وائرس کی شکل میں حیاتیاتی حملہ کیا جو اُلٹا اس کے ہی گلے پڑ گیا۔ اس حوالے سے اب تک جتنی بھی تھیوریاں سامنے آئی ہیں، آپ انہیں درست مان لیں کہ امریکہ نے اپنی جدید سائنسی ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر ہی یہ کارستانی کی ہے۔

بھئی اب تو اس معاملہ میں امریکہ اور چین کے مابین دوطرفہ الزامات کی جنگ چھڑی ہوئی

ہے اور دونوں ممالک کے ''سیانے'' کرونا کی ایجاد اور اس کے پھیلاؤ کا الزام ایک دوسرے پر تھوپنے کیلئے دور کی کوڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہے ہیں پھر تو آپ کے فلسفۂ سائنس کی ہی فتح ہوئی مگر میرے اس دوست کو اس حوالے سے سائنس کی فتح بھی گوارا نہیں ہوئی اور اُلٹا مجھے ہی فرسودہ سوچ کا حامل گردان کر مجھے کوسنا شروع کر دیا، گویا جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔

میں نے یہ بحث کرونا وائرس کے حوالے سے اصل موضوع کی جانب آنے کیلئے ہی چھیڑی تھی اور اس موضوع سے تو ہمارے روشن خیالوں کو چڑ ہے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس موضوع پر بھی مجھے دقیانوسی سوچ کا حامل ٹھہرایا جائے گا مگر بھائی صاحب! اب تو پاکستان کے علاوہ امریکہ اور چین کے مستند ڈاکٹر بھی یہ گواہی دے رہے ہیں کہ کرونا وائرس کا خوف ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دنیا میں پھیلایا گیا ہے جس کا مقصد انسانوں کو ڈرا ڈرا کر اپنا سودا بیچنے کا تھا ورنہ کرونا کا وائرس اتنا ہی انسانی صحت کو نقصان پہنچاتا ہے جتنا نمونیا اور فلو کے عام وائرس سے انسانی صحت متاثر ہوتی ہے جس کا دستیاب ادویات سے علاج معالجہ بھی ہو جاتا ہے۔ منصوبہ سازوں نے بس اپنی ویکسین کا سودا بیچنے کیلئے انسانی سماجی فاصلے والے احتیاطی اقدامات کا اتنا پراپیگنڈا کیا کہ پوری دنیا لاک ڈاؤن ہو گئی۔ اس کے ہمارے ملک کی معیشت پر جو برے اثرات مرتب ہوئے اور جو ابھی مرتب ہونے ہیں، اس کا اظہار آپ منصوبہ بندی کے وفاقی وزیر اسد عمر کی پریس کانفرنس میں ان کی زبانی سن چکے ہوں گے۔ وہ اسی لاک ڈاؤن کے حوالے سے یہ تلخ حقیقت بیان کر رہے تھے کہ لاک ڈاؤن کے باعث ہمارے ملک میں ایک کروڑ 80 لاکھ افراد بیروزگار اور 10 لاکھ ادارے بند ہو جائیں گے۔ آپ لاک ڈاؤن میں جکڑے امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور اٹالین عوام کے بھی لاک ڈاؤن کے خلاف مظاہروں اور کرونا وائرس کے پھیلائے گئے خوف کے حوالے سے ان کے جذبات کے اظہار کا سوشل میڈیا پر یقیناً مشاہدہ کر رہے ہوں گے اور یہ حقیقت ہے جو مابعد کرونا کی دنیا میں کھل کر سامنے آ جائے گی کہ دنیا میں اتنے لوگ کرونا کے عارضہ سے نہیں مرے جتنے اس کے خوف سے بلڈ پریشر اور شوگر لیول ہائی ہونے سے ہارٹ اٹیک کے باعث مرے ہیں اور پھر کرونا کے چمٹ جانے کے خوف ہی کے باعث اکثر مریض ہسپتالوں میں ڈاکٹروں کی جانب سے علاج معالجہ اور دیکھ بھال میں عدم توجہی کے باعث جان سے گئے۔ حد تو

یہ ہے کہ روٹین کے عارضہ قلب، شوگر، ٹی بی اور کینسر کے مریضوں کو بھی کرونا کے مریضوں کے کھاتے میں ڈال کران کے ساتھ معمول کے علاج معالجہ میں بے اعتنائی روا رکھی گئی جو ان کی موت کا باعث بنی۔ کئی لوگ تو پازیٹو رپورٹ آنے کے ناطے بیٹھے بٹھائے کرونا کے مریض بنا دیئے گئے جن میں سے کچھ خوف سے اور کچھ بے اعتنائی والے رویوں سے عاجز آ کر اگلے جہان سدھار گئے۔ اس حوالے سے پاکستان کے ایک ڈاکٹر مشرف اور ورجینیا امریکہ کی ایک خاتون ڈاکٹر کی ہسپتالوں میں اپنے مشاہدات پر مبنی ویڈیوز تو وائرل ہو چکی ہیں جن میں انہوں نے کرونا وائرس کا خوف پیدا کر کے انسانوں کو بے موت مارنے کی منصوبہ بندی ہی بے نقاب کی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کرونا کا پھیلاؤ روکنے کیلئے احتیاطی اقدامات سے مکمل غافل ہو جائیں۔ ہم عام فلو کا وائرس روکنے کے بھی تو احتیاطی اقدامات اٹھاتے ہیں، بس ویسی ہی احتیاط کرونا وائرس کے معاملہ میں بھی کر لیں مگر انسانوں کیلئے تحقیر کا باعث بننے اور شرف انسانیت کی بھد اُڑانے والی احتیاط سے اب رجوع کر لیجئے۔ بہت ہو چکا۔ جنہوں نے اپنا سودا بیچنا تھا، انہوں نے اس کی راہ ہموار کر لی ہے۔ آپ لاک ڈاؤن ہو کر بیٹھے رہیں گے تو بھوک کے راج والے ہولناک اقتصادی بحرانوں کو دعوت دے کر اپنا حال اور مستقبل دونوں خراب کریں گے۔

اور بھوک ایسا روگ ہے جو انسانی قدریں تک ملیامیٹ کر دیتا ہے۔

مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک اطوار کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی

آپ خود کو خوف سے باہر نکالیں، اپنے تئیں احتیاطی اقدامات جاری رکھیں اور زندگی کے معمولات کی جانب واپس لوٹ آئیں ورنہ آدھی دنیا خوف سے مر جائے گی اور باقی بھوک سے۔

بھوک بڑھنا ہی بغاوت کا سبب ہے آسی
یہ روایت میری سرکار نہ ڈالی جائے

اتھّل پتھّل کا اہتمام

آ ثار یقیناً کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے۔ایک طرف کرونا دنیا کو لپیٹنے کی جلدی میں نظر آ رہا ہے اور دوسری طرف اس فکر سے بے نیاز کچھ جنونی ممالک کی قیادتیں اپنے توسیع پسندانہ مقاصد و عزائم کی بنیاد پر اپنے ہاتھوں دنیا کی تباہی کا اہتمام کرتی نظر آ رہی ہیں۔ابھی امریکہ اور چین کے مابین محاذ آ رائی نمایہ بحث بھی پوری شدت کے ساتھ جاری ہے کہ ان میں سے کس نے کرونا وائرس کس مقصد کے تحت ایجاد کیا اور پھیلایا۔دونوں ممالک ایک دوسرے پر الزام تھوپ رہے ہیں اور ان ممالک کے حامی یا خیر خواہ اپنے اپنے ممدوح کے حق میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر دلائل پیش کر رہے ہیں۔بعض عالمی تھنک ٹینکس چین اور امریکہ کی اس محاذ آ رائی کو تیسری عالمی جنگ سے تعبیر کر رہے ہیں جو ان کی دانست میں کرونا وائرس کے ذریعے حیاتیاتی حملے کی صورت میں شروع ہو چکی ہے۔اب صرف یہ تعین ہونا باقی ہے کہ یہ حیاتیاتی حملہ امریکہ اور چین میں سے کس نے کیا ہے۔اس کا انجام کیا ہونا ہے، اس کا اندازہ امریکہ کی اس تازہ کارروائی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کے تحت اس نے چین سے کشیدگی کے پیش نظر گوام میں اپنے فضائی اڈے ایندرسن ائرفورس بیس پر اپنے بمبار طیارے اور ائرفورس کے سینکڑوں اہلکار دوبارہ تعینات کر دیئے ہیں۔ان ازسرنو تعینات ہونے والے اہلکاروں میں امریکی 54 بی لانسرز طیارے اور نائینتھ بم سکواڈرن کے 200 کے قریب ہوا باز شامل ہیں جو چین پر ایٹمی حملے کے لئے بس ایک اشارے کے منتظر ہیں۔اس حوالے سے امریکی ائرفورس کے ساتویں بم ونگ کمانڈر کرنل ایڈ سومانگل نے گزشتہ روز پرجوش انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دنیا کو اپنے تئیں باور کرایا کہ ہم لوگ گوام میں واپسی پر بہت پرجوش ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ ہم امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو درپیش کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لئے بمبار فورس کے ساتھ کام جاری رکھیں گے۔مگر حضور کیا خیال ہے، کیا چین ان

امریکی عزائم سے باخبر نہیں ہوگا۔ اس نے بھی تو یقیناً اپنے دفاع کی بھرپور تیاری کر رکھی ہوگی۔ پھر آپ انجام خود ہی سوچ لیں کہ ان دو بڑی ایٹمی طاقتوں کے باہمی ٹکراؤ سے اس کرۂ ارض پر کیا حشر نشر ہوگا۔ ہم تو ویسے ہی ان کے درمیان سینڈوچ بنے ہوئے ہیں اس لئے ممکنہ طور پر پہلا ''حشر'' تو ہمیں ہی بھگتنا پڑے گا۔

اور ہم تو ویسے بھی توپ کے دہانے کے آگے بیٹھے ہیں کیونکہ ہمارے دشمن بھارت کی جنونی مودی سرکار اپنی جنونیت کے عملی اظہار کے لئے امریکہ سے بھی زیادہ جلدی میں نظر آتی ہے۔ اس کی سفاکیت کے آگے کرونا وائرس کی ممکنہ تباہ کاریوں کی فکر بھی بند نہیں باندھ سکی چنانچہ اس نے عساکر پاکستان کو اپنے ملک میں کرونا وائرس کا پھیلاؤ روکنے کی کارروائیوں اور امدادی کاموں میں مصروف دیکھ کر اپنی گندی سوچ کے تابع پاکستان پر چڑھ دوڑنے کی منصوبہ بندی کر لی ہے۔ اس لئے موقع نکالنے کی بھی مودی سرکار خود ہی کوشش کر رہی ہے۔ دنیا تو کرونا وائرس سے بچاؤ کی فکر میں غلطاں ہے اور اس وائرس کے نتیجہ میں بھوک اور بے روزگاری کے عفریت جس طرح منہ کھولے نظر آ رہے ہیں، متاثرہ ممالک کی قیادتیں اور عالمی ادارے لوگوں کو اس سے بچانے کی حکمت عملیوں کے تانے بانے بن رہے ہیں مگر مودی سرکار نے ان نازک لمحات کو بھی پاکستان کے ساتھ کشیدگی بڑھانے اور گزشتہ دس ماہ سے لاک ڈاؤن میں پڑے مظلوم کشمیری عوام کا عرصۂ حیات مزید تنگ کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے۔ اس کی یہ ساری شرارت پاکستان پر چڑھائی کا موقع نکالنے کی گندی سوچ پر ہی مبنی ہے اور اس کے اخذ کردہ نتیجے کے عین مطابق کشمیری مجاہدین نے زچ ہو کر ہندواڑہ میں بھارتی فوجیوں کے خلاف مزاحمت مزید تیز کر دی جس میں بھارتی فوجیوں کا جہنم واصل ہونا بھی نوشتۂ دیوار تھا اور پاکستان پر ملبہ ڈالنے کی یہی تو بھارتی حکمتِ عملی ہے جس کے تحت اب بھارتی وزیراعظم نریندر مودی اور آرمی چیف ایم ایم نروانے یکسو ہو کر پاکستان کے خلاف اپنے سرجیکل سٹرائیک اور بالاکوٹ حملے کے دعوے سے بھی بڑھ چڑھ کر گیدڑ بھبکیوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔

انہی گیدڑ بھبکیوں کو عملی قالب میں ڈھالنے کا متقاضی بھارتی میڈیا پاکستان کے خلاف زہریلے پراپیگنڈے میں آسمان سر پر اٹھا چکا ہے اور ''بدلہ بدلہ'' کے نعرے لگا کر اپنی ''سینا'' کو انگیخت کر رہا ہے۔

تو جناب! آپ کے گزشتہ سال کے بالاکوٹ والے ڈرامے پر اگلے ہی روز آپ کا ''منہ توڑ'' والی عساکر پاکستان اب چوڑیاں پہن کر تو نہیں بیٹھی ہوئیں۔ وہ بے شک کرونا وائرس سے عوام کے بچاؤ کے چیلنج سے بھی عہدہ برا ہو رہی ہیں اور حکومت اور عوام کا امدادی کاموں میں ہاتھ بٹا رہی ہیں مگر کیا خیال ہے۔ وہ دفاع وطن کے تقاضوں سے بھلا غافل ہوں گی؟ آپ گردن نکالیں گے تو وہیں پر آپ کی گردن ناپ لی جائے گی۔ اپنی گزشتہ سال 27- فروری والی ہزیمت سامنے رکھیئے مہاراج۔ اور شائد اس بار آپ کی ہزیمت کی داستان لکھنے والا بھی آپ کے ساتھ ہی ملیامیٹ ہو جائے۔

مگر آپ کو تو جنونیت میں دنیا کی بقاء کی بھی کوئی فکر لاحق نہیں۔ ذرا سوچیئے تو سہی کہ دو ایٹمی طاقتوں پاکستان اور بھارت میں مڈبھیڑ ہو گی تو اس دھرتی پر حشر کا کیا سماں پیدا ہو گا۔ ایک طرف امریکہ چین پر ایٹمی چڑھائی کا بندوبست کئے بیٹھا ہے اور دوسری جانب بھارت اپنے جنون کی آگ بھڑکائے چلا جا رہا ہے۔ تو کیا تصور کر لیا جائے کہ انسانوں ہی کے ہاتھوں اس کرۂ ارض کو روئی کے گالوں کی طرح دھنک کر اڑانے کا قدرت کی طرف سے بندوبست کر دیا گیا ہے۔ اگر ہم سرکش انسانوں کے دلوں میں انسانی لاشوں کے انبار لگانے والے کرونا وائرس نے بھی خوف کی تریڑیاں پیدا نہیں کیں اور ہم اپنی اپنی جاہ و حشمت کی دھاک بٹھانے کی فکر میں ہی غلطاں ہیں تو جناب! خالقِ کائنات کی بھی تو اپنی منشاء اور منصوبہ بندی ہے جس میں سرکش انسانوں کے لئے دراز رسی کھینچے جانے کی اب نوبت آیا ہی چاہتی ہے۔ خدا کی امان میں آ جاؤ۔ اس سے پہلے کہ آپ کے پاس کوئی چارہ، کوئی یارانہ رہے اور یہ دھرتی اتھل پتھل ہو جائے۔

خوف اور حقارت

بات یہ نہیں کہ کسی مہلک بیماری سے بچاؤ کی سرے سے کوئی تدبیر ہی نہ کی جائے' انسان کے بس میں جو ہوتا ہے وہ کسی جان لیوا وائرس سے خود بھی بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جو ایسے کسی وائرس میں مبتلا ہو' اسکی کوشش ہوتی ہے کہ یہ وائرس اسکے ذریعے کسی اور کو منتقل نہ ہو۔ اس کیلئے جو بھی مروجہ احتیاطی تدابیر ہیں وہ بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ کوئی بھی انسان اتنا لاپروا نہیں ہوتا کہ اسے کسی وائرس کے جان لیوا ہونے کا ادراک ہو اور وہ اس سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار نہ کرے مگر اب کی بار تو......

ہوا ہی ایسی چلی ہے کہ جی بحال نہیں
وگرنہ ہم تو بہت کم اداس رہتے ہیں

کرونا وائرس کی ہولناکی کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور اس سے بچنے کے ایسے ایسے احتیاطی اقدامات تجویز کئے اور جبری مسلط کئے گئے کہ ساری انسانی قدریں اور انسانی رشتے ہی ملیامیٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس وائرس کی زد میں آنیوالا انسان گویا انسان ہی نہیں رہتا' نفرت و حقارت کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ اسے چھونا تو کجا' اس سے تین میٹر کے فاصلے پر پھٹکنا بھی شجر ممنوعہ بنا کر اسے قعر مزلت کی جانب دھکیلتے ہوئے اس اشرف المخلوقات کو کسی پرلے درجے کی حقارت آمیز مخلوق بنا دیا جاتا ہے۔ اس کیلئے ''ہٹو بچو'' کی آوازیں اسکے دل و دماغ میں پیوست ہو جاتی ہیں اور وہ اپنی ہی نگاہوں میں گر کر اپنے انسان ہونے پر شرمندگی و تاسف کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا خوف ہے جس نے اچھے بھلے صحت مند انسان کو بھی ذہنی مریض بنا دیا ہے اور بالخصوص ہسپتالوں میں کرونا کے مریضوں اور مشتبہ مریضوں کے ساتھ ''حسن سلوک'' کی جو خبریں پرنٹ' الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے پھیلی ہیں اسکے باعث معمولی یا تیز بخار اور کھانسی نزلہ کا شکار ہونیوالا کوئی بھی شخص حتی الوسع کوشش کرتا ہے کہ اسے ہسپتال نہ جانا پڑے کیونکہ وہاں جاتے

ہی وہ کرونا کا مریض ڈکلیئر ہو جائیگا' چاہے وہ اس مرض میں مبتلا ہو یا نہ ہو' اور پھر دوسرے انسانوں بشمول مسیحاؤں کی جانب سے نفرت وحقارت اس کیلئے کلنک کا ٹیکہ بن جائیگی جو زندہ رہے گا تو بھی اسکے پیاروں عزیزوں سمیت ہر شخص اس سے دور بھاگتا نظر آئیگا اور اسی ذہنی اذیت میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا تو اسے غسل دینے' کفنانے' نماز جنازہ پڑھنے اور دفنانے کیلئے بھی کسی کو آگے بڑھنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ ایسی انسانی بے قدری پہلے نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ موت برحق ہے' اس سے کوئی مبرا ہے نہ کوئی اپنی موت کا متعین وقت ایک پل اور ایک لمحے کیلئے بھی ٹال سکتا ہے۔ اگر کسی کا موت کا بہانہ کرونا وائرس بن رہا ہے تو یہ بھی برحق اور اٹل موت ہے مگر اس موت کا خوف ایسا لاحق ہو گیا ہے کہ موت کا وقت متعین ہونے کا یقین ہونے کے باوجود دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ خدا کرونا والی موت سے محفوظ ہی رکھے۔

پچھلے دنوں پاکستان ریلوے کی ڈائریکٹر جنرل قرۃ العین حیدر موسمی بخار کی زد میں آئیں تو وہ ہسپتال جا کر چیک اپ کرانے کے معاملہ میں محض اس لئے شش وپنج کا شکار رہیں کہ کہیں اسکے مرض کی تشخیص کرونا والی نہ ہو جائے اور اس ناطے سے اسے انسانی نفرت وحقارت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کچھ ایسی ہی دلی کیفیت کا اظہار گزشتہ روز ڈاکٹر صغریٰ صدف نے بھی اپنے کالم میں کیا ہے جن کا ایک بھائی کرونا ٹیسٹ پازیٹو آنے پر ہسپتال میں داخل ہے اور بھتیجا گھر کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں خود کو مقید کئے بیٹھا ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف نے اپنی بھابی کے دکھ کا جس پیرائے میں اظہار کیا وہ انسانی بے بسی اور کسمپرسی کی کربناک منظر کشی تھی کہ ماں اپنے بیٹے میں زندگی کی رمق محسوس کرنے کیلئے اسکے کمرے کے باہر دروازے پر گھنٹوں کھڑی رہتی ہے کہ اسکے بیٹے کی حرکت کرنے کی آواز کسی طریقے سے اسکے کانوں تک پہنچ جائے۔ جس بیٹے کا ماتھا چومنے کو بے تاب ماں کو اسے کھانا دینے کیلئے اسکے کمرے کے اندر جانے کی بھی اجازت نہ ہو۔ اسکے کرب کا اندازہ اسکے سوا بھلا اور کون لگا سکتا ہے۔ اور یہ انسانی کرب آج تقریباً ہر گھر میں موجود ہے جس نے انسانی قدر و قیمت کا شائبہ تک نہیں رہنے دیا۔

یہ سب کچھ اس خوف کا کیا دھرا ہے جو کرونا کے مرض سے کسی انسان کے اچھوت ہونے کا تاثر اجاگر کر کے ہر انسان کے ذہن میں بٹھا دیا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ عالمی صحت کے جس ادارے نے کرونا وائرس کے پھیلاؤ کا خوفناک حد تک پراپیگنڈا کر کے اس سے بچاؤ کے انسانی

حقارت کی بنیاد بننے والے احتیاطی اقدامات (ایس او پیز) وضع کر کے پوری دنیا میں پھیلائے‘ اب اسی عالمی ادارے کی جانب سے مستند ڈاکٹروں کی رپورٹ کی بنیاد پر اس امر کی تصدیق کی گئی ہے کہ کرونا وائرس سے مرنے والے کسی مریض کی نعش کرونا کے پھیلاؤ کا ہرگز باعث نہیں بنتی کیونکہ اسکی سانس بند ہوتے ہی اسکے جسم میں موجود کرونا بھی جسم کے اندر ہی ختم ہو جاتا ہے جس کے جسم سے باہر نکلنے کے کوئی شواہد نہیں ملے۔ پھر بھی خوف اتنا موٴثر ہو چکا ہے کہ لوگ کرونا کے مریض کی میت کو غسل‘ کفن اور کندھا دینے سے بھی بدستور گریز کر رہے ہیں اور اسے دفنانے کیلئے قبر کے اندر منتقل کرنے کی بھی ابھی تک اسکے عزیز رشتہ دار تک ہمت نہیں کر پاتے۔

اب پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن پنجاب کے عہدیداروں نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ دعویٰ کر کے کہ اس وقت صرف لاہور میں کرونا متاثرہ افراد کی تعداد 35 لاکھ اور پنجاب میں دو کروڑ ہے‘ خوف کا ایک نیا جھکڑ چلا دیا ہے۔ وہ مکمل لاک ڈاؤن ہی کرونا کے پھیلاؤ کا واحد حل گردانتے ہیں جبکہ مکمل لاک ڈاؤن سے جس طرح ملک میں بھوک‘ فاقہ کشی‘ غربت اور بے روزگاری ناچتی نظر آئیگی‘ وزیراعظم عمران خان اس کو محسوس کر کے ملک کو مکمل لاک ڈاؤن کی طرف لے جانے پر سرے سے آمادہ ہی نہیں۔ انکے فلسفے سے بے شک ڈاکٹروں اور باوسیلہ طبقات کو اختلاف ہو مگر مکمل لاک ڈاؤن سے مراد خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والی ملک کی اکثریتی آبادی کو فاقہ کشی کے عفریت کے حوالے کر کے قبرستان میں تبدیل کرنا ہے۔ یہ عجیب غیر یقینی کی کیفیت ہے کہ کرونا سے بچاؤ کے تجویز کردہ احتیاطی اقدامات پر عوام شش و پنج میں ہیں اور مکمل لاک ڈاؤن کرنے کے معاملہ میں حکومت شش و پنج میں مبتلا ہے۔ اگر اس شش و پنج اور خوف میں بے وقعت ہو رہی ہے تو وہ ہے اشرف المخلوقات کی تکریم انسانیت......ع

یہ عجب مزاج کا شہر ہے‘ ذرا فاصلے سے ملا کرو

اگر کسی معاشرے میں انسانیت ہی دم توڑ جائے اور صلہ رحمی والے انسانی جذبے ہی عنقا ہو جائیں تو حضور! اسے زندہ انسانی معاشرے کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے۔ ذرا غور فرمایئے جناب کہ ہم نے کرونا کے پیدا کردہ خوف اور اسکے باعث شعار کئے گئے انسانی رویوں سے زندہ معاشرے کو کہیں قبرستان میں تو تبدیل نہیں کر دیا۔ پھر اس قبرستان کا مجاور کون ٹھہرے گا اور ’’شہر خموشاں‘‘ میں بھلا طوطی کی آواز کون سنے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

گوروں کے دیس کا باسی خالص پاکستانی

ستر کی دہائی وہ عرصہ ہے جب ہمارے ملک کے بالخصوص نوجوان طبقات پر اپنا مستقبل اور مقدر سنوارنے کے لئے ملک سے باہر بالخصوص دبئی اور انگلستان جانے کا بھوت سوار ہوا تھا۔ اس دور میں ''دبئی چلو'' کا نعرہ بھی عرفِ عام ہو گیا اور پی ٹی وی کی ایک ڈرامہ سیریل نے اس نعرے کو اتنا مشہور کر دیا کہ دبئی جانا ہمارے کلچر کا حصّہ بن گیا۔ علی اعجاز کی معصومانہ اداکاری کے جوہر بھی اسی ڈرامہ سیریل میں کھلے اور پھر ہر گلی محلے کا ہر نوجوان اٹیچی کیس اٹھائے دبئی کے سفر کا عزم باندھتا نظر آیا۔ کچھ ایسا ہی جنون انگلستان سدھارنے کے لئے بھی اس وقت کی نوجوان نسل پر طاری تھا جس کے لئے اکبرالہ آبادی کا یہ شعر زبانِ زد عام نظر آتا تھا کہ......

سدھاریں شیخ کعبہ کو، ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

نوجوانوں میں انگلستان سدھارنے کا جنون محض سیر و سیاحت کے لئے نہیں بلکہ اپنے اور اپنے خاندان کے آسودہ مستقبل کے لئے آنکھوں میں بسائے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کے لئے طاری ہوتا اور پھر کئی والدین کو اپنی اولاد کے اس شوق کی خاطر اپنے گھروں کے قیمتی اثاثے' جائیدادیں اور زیور تک بیچنا پڑے۔ اس جنون میں دبئی اور انگلستان سدھارنے والے کتنے نوجوانوں نے اپنا اور اپنے خاندانوں کا مستقبل سنوارنے والی منزل حاصل کی اور کتنے تلخیٔ حالات کی نذر ہوئے۔ اس کے لئے تو گہری ریسرچ کی ضرورت ہے تاہم اوورسیز پاکستانیوں کی آج کی تعداد دیکھ کر اور ان کے حالات و معیارات زندگی کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ دبئی اور انگلستان چلو کلچر نے ہمارے کئی خاندانوں کی زندگیاں دنیاوی اعتبار سے آسودہ ضرور کی ہیں۔

طاہر جمیل نورانی بھی یقیناً اسی کلچر سے متاثر ہو کر نوعمری میں ہی سیالکوٹ سے انگلستان سدھارے تھے اور انہوں نے بھی اپنے اور اپنے خاندان کے سہانے اور آسودہ مستقبل کے خواب آنکھوں میں سمو کر رختِ سفر باندھا تھا۔ انہوں نے یقیناً اس حوالے سے اپنی متعینہ منزل حاصل کر لی مگر انہوں نے بدیسی کلچر کا حصّہ بننے کے بجائے اپنے دیس کی مٹی کی خوشبو کو ہی اپنے دل و دماغ میں بسائے اور اپنے مشرقی کلچر کو ہی ہمہ وقت اوڑھے رکھا۔ نورانی صاحب کے ساتھ میرا تعلق خاطر کوئی بارہ سال قبل برادر محترم شعیب بن عزیز صاحب کی وساطت سے استوار ہوا تھا۔ انہوں نے نورانی صاحب کی قلمکاری کی ستائش کی اور اس طرح ان کے کالم ''ولایت نامہ'' کی نوائے وقت میں اشاعت کا سلسلہ چل نکلا۔ پھر ان کے ساتھ ایک تعلق سابق ایم این اے میاں محمد آصف کے حوالے سے بھی استوار ہو گیا جن کے ساتھ میری دیرینہ نیاز مندی ہے۔ نورانی صاحب اپنے ''دورۂ پاکستان'' پر جب بھی لاہور آتے میاں آصف صاحب کے پاس گرین بلڈنگ میں قیام کرتے اور اس طرح ہماری ملاقاتوں کی سبیل بھی نکل آتی۔

نورانی صاحب کا نوائے وقت کیلئے بھجوایا گیا کالم پہلے سرسری طور پر میری نظروں سے گزرتا تھا مگر جب انہوں نے اپنے کالموں کا انتخاب کتاب کی شکل میں منظر عام پر لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس کتاب کی اشاعت کیلئے ان کی معاونت اور کتاب کے کمپوز شدہ مسودے کی پروف ریڈنگ کی ذمہ داری از خود قبول کر لی چنانچہ آج کتابی شکل میں جو ''ولایت نامہ'' آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کا ایک ایک لفظ میری نظروں سے گزرا ہوا ہے اور میرے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ بھی ہو چکا ہے اس لئے میں یہ گواہی دینے کی پوزیشن میں ہوں کہ طاہر جمیل نورانی ایک دردمند خالص پاکستانی ہیں جنہوں نے انگلستان میں رہتے ہوئے بھی پاکستانیت اور پاکستان کے دیسی کلچر کو گزند تک پہنچنے دی اور اب بھی وہ اس کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ وہ انگلستان میں رہ کر ''ہنس'' کی چال چلنے والے کوّے کی طرح ''کاں ڈوڈ'' نہیں بنے اور اپنے جامے میں ہی رہے ہیں۔ وہ اگر انگلستان کی مادی طور پر ترقی سے متاثر ہوتے ہیں تو اس کے ناطے سے وہ پاکستان کو بھی ایسی ہی ترقی کرتا دیکھنا چاہتے ہیں جبکہ انہیں مادر پدر آزادی والے مغربی کلچر میں جو قباحتیں نظر آتی ہیں وہ اس پر ہمیشہ دعاگو نظر آتے ہیں کہ پاکستان کو اس کلچر کی ہوا بھی نہ لگے۔ اس حوالے سے ۲۰۱۱ء کے کالموں میں ان کا تجسس و تفکر گوروں کے دیس کو اپنا مسکن

بنانے کی خواہش رکھنے والی ہماری نوجوان نسلوں اور نام نہاد روشن خیالوں کو اپنی تہذیب وثقافت کی پاسداری ونگہبانی کے لئے فکرمندی کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔اس کے لئے انہوں نے یہ اچھوتا اسلوب اختیار کیا ہے کہ وہ مکالمے کی شکل میں گوروں اور گوریوں کی زبان سے قیام پاکستان کے مقاصد اس کے نظریے اس کے کلچر اور اس کی بنیاد پر اس کی عظمت وعزیمت کے گن گاتے اور لہوولعب اور ناؤنوش میں ڈوبے مغربی کلچر سے بالخصوص انگلستان میں موجود پاکستانی خاندانوں کے نوجوانوں کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کرنے کا سلجھے انداز میں درس دیتے ہیں۔اس ناطے سے طاہر جمیل نورانی نے قلم کی حرمت کی بھی پاسداری کی ہے اور انگلستان میں موجود پاکستان مخالف عناصر کی بدزبانی کا اپنے کالموں کے ذریعے فوری اور مؤثر جواب دینا اور ان کی دریدہ ذہنی کا ''مکو'' ٹھپنا بھی انہوں نے اپنے فرائض کا حصّہ بنا رکھا ہے۔وہ اپنی تحریروں میں جہاں پاکستانیت کو اجاگر کرتے ہیں وہیں وہ شمعِ رسالتؐ کے پروانے کی طرح ڈھال بن کر دین اسلام کا دفاع کرتے بھی نظر آتے ہیں۔الحادیوں کے ہجوم میں رہ کر اپنے دین و وطن کی سربلندی کا نعرہ لگانا طاہر جمیل نورانی صاحب ہی کا خاصہ ہے۔میری دعا ہے کہ خدا ان کے جذبے اور جذبات کو استقامت دیئے رکھے اور بیرون ملک مقیم ہماری نئی نسل تک ان کے الفاظ کی تاثیر مثبت اور مؤثر انداز میں پہنچتی رہے۔

''عمر رواں'' میں عمرِ رفتہ کی یادیں

ڈاکٹر فرید پراچہ کی ''عمر رواں'' میرے ہاتھ آئی تو ''عمر رفتہ'' کے کئی مناظر میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔ 1973ء میں گریجویشن کرنے کے بعد والد صاحب چودھری محمد اکرم مجھے لاہور لے آئے اور پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ڈپٹی کنٹرولر امتحانات نثار صاحب کے حوالے کرتے ہوئے انہیں کہا کہ میرے بیٹے کو لاء کالج میں داخل کرا دیں۔ نثار صاحب میرے والد صاحب کے دیرینہ دوست تھے' انہوں نے اپنے ایک اہلکار کو پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے داخلہ فارم لانے کیلئے کہا۔ لاء کالج کے اور نثار صاحب کے آفس کے مابین صرف سڑک پار کرنے کا ہی فاصلہ تھا چنانچہ اہلکار ''یہ گیا اور وہ آیا'' کے مصداق جھٹ پٹ داخلہ فارم لے کر آ گیا۔ مجھے لاء کی تعلیم کا کوئی شوق نہیں تھا کیونکہ میں اپنی طبیعت کے میلان کے مطابق پوسٹ گریجویشن کی جانب جانا چاہتا تھا تاکہ لیکچرر شپ حاصل کر کے علم و ادب کی خدمت کر سکوں۔ والد صاحب کا اپنی ڈیرہ داری کی بنیاد پر مجھے وکیل بنانے پر اصرار تھا اور انکے آگے چون و چراں کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی اس لئے انکی خواہش اور فرمائش پر میں نے یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لے لیا جس کے تمام مراحل نثار صاحب نے خود ہی طے کرا دیئے۔ میرا ایف ای ایل کے سیکشن سی میں داخلہ ہوا جو اولڈ کیمپس کے گیٹ کے بالکل سامنے تھا اور اسکے تھوڑے فاصلے پر انارکلی بازار کا آغاز ہو جاتا تھا۔ اس کلاس روم کے پچھواڑے اورینٹل کالج اور اس سے ملحقہ لاء کالج کا ہوسٹل تھا۔ سیکشن سی کے اگلے بنچوں پر محمود مقبول باجوہ (سابق جج لاہور ہائیکورٹ)' ذوالقرنین ذوق' عبدالوحید خان' عبدالرشید مرزا اور رؤف طاہر کے ساتھ ہی میری نشست بھی نکل آئی چنانچہ ہم پانچوں کلاس فیلوز کی دوستی بھی پروان چڑھتے چڑھتے اٹوٹ بندھن میں بندھ گئی۔

اس وقت پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات کی گہما گہمی چل رہی تھی اور صدر

کے امیدوار فرید احمد پراچہ یونیورسٹی لاء کالج کے ہی سٹوڈنٹ تھے جو ہم سے ایک سال سینئر تھے۔
اس وقت کے سٹوڈنٹس یونین کے صدر مخدوم جاوید ہاشمی طلبہ کے ہر دلعزیز قائد تھے جن کی جرأت و بہادری کے قصے میں نے گورنمنٹ کالج ساہیوال میں اپنی گریجویشن کی تعلیم کے دوران بھی سن رکھے تھے۔ فرید پراچہ کی انتخابی مہم کے دوران جاوید ہاشمی ہی اس مہم کو لیڈ کرتے رہے اور اسلامی جمعیت طلبہ کے مدمقابل طلبہ تنظیموں کے اتحاد پر اپنی دھاک بٹھاتے رہے۔ فرید پراچہ اس وقت بھی انتہائی سنجیدہ، مدبر اور سلجھی ہوئی شخصیت نظر آتے تھے جو اپنی تقریروں میں ناپ تول کر موزوں الفاظ کا استعمال کرتے اور تقریر کی روانی میں بھی کوئی جھول پیدا نہ ہونے دیتے۔ ہم پانچوں دوست اپنے ذہنی میلان کی بنیاد پر فرید پراچہ کے ہمقدم ہو گئے اور انتخابات میں انہوں نے ریکارڈ لیڈ کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اس وقت امتیاز علی شیخ یونیورسٹی لاء کالج کے پرنسپل تھے جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے منصب جلیلہ پر متمکن ہوئے جبکہ ہمارے اساتذہ میں وائس پرنسپل سردار اقبال مؤکل، خلیل رمدے، میاں آفتاب فرخ، حامد خان، چودھری محمد عارف، ڈاکٹر خالد رانجھا جیسی شخصیات شامل تھیں۔ اسی طرح اس دور میں چودھری اعتزاز احسن بھی یونیورسٹی لاء کالج کے اساتذہ میں شامل تھے۔

انتخابات میں اسلامی جمعیت طلبہ کے پینل کی کامیابی کا جشن منانے کیلئے پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام ہوا جس میں شرکت کے ناطے ہمارا نام بھی اسلامی جمعیت طلبہ کے متفقین کی فہرست میں آ گیا چنانچہ ہمیں ذیلدار پارک اچھرہ میں ابوالاعلیٰ سید مودودی کی اقامت گاہ پر ہونیوالی تربیتی نشستوں میں بھی شرکت اور مولانا مودودی سے اکتساب فیض حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا۔ ہمارے بیچ فیلو ذوالقرنین ذوق (جو راجہ ذوالقرنین کے عرفِ عام کے ساتھ آج بلند پایہ وکلاء میں شمار ہوتے ہیں اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کے منصب پر بھی فائز رہ چکے ہیں) پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم منتخب ہو گئے اور ہمارے دوسرے بیچ فیلو محمود مقبول باجوہ سیکشن سی کے ناظم مقرر ہوئے تو انکی معیت میں ہم بھی اسلامی جمعیت طلبہ کے ہر فنکشن کا حصہ بن گئے۔

یہ ذوالفقار علی بھٹو کا دور حکومت تھا جس کی سوشلزم پر مبنی پالیسیوں کی اسلامی جمعیت طلبہ ہی سب سے بڑی مخالف تھی چنانچہ فرید پراچہ کی قیادت میں سڑکوں پر ہونیوالے حکومت مخالف

مظاہروں میں ہماری بھی شرکت ہوتی رہی۔ اس وقت میں نے ایک طویل نظم بھی لکھی جس کا ایک بند یہاں پیش کر رہا ہوں......

چاہے دیس بھی ہو کنگال
بھٹو جیئے ہزاروں سال
ایک معزز کا فرمان
ہم کو دے گا یہ انسان
روٹی کپڑا اور مکان
یہ منہ اور مسور کی دال
بھٹو جیئے ہزاروں سال

یہ نظم میں نے خالقِ قومی ترانہ حفیظ جالندھری کو بھجوائی جن کے ساتھ میری فریدیہ کالج پاکپتن کے پرنسپل ایم سعید خان کے ناطے سے نیازی مندی تھی کیونکہ سعید خان صاحب جی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور میں حفیظ جالندھری صاحب کے کرایہ دار کی حیثیت سے رہ رہے تھے اور والد صاحب کے ساتھ دوستی کے ناطے سعید خان صاحب مجھے بھی اپنے بیٹوں میں ہی شمار کرتے تھے اس لئے لاہور آنے کے بعد انکی خدمت میں حاضری بھی میرا معمول بن چکا تھا۔ حفیظ جالندھری صاحب نے اپنے چار صفحات پر مشتمل مراسلے میں میری اس نظم کی خوب پذیرائی کی چنانچہ مزاحمتی شاعری کی جانب میرا زیادہ میلان ہوگیا۔

''عمر رواں'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے جہاں ڈاکٹر فرید پراچہ صاحب کے جدوجہد اور کٹھنائیوں والے سفرِ زندگی کے بعض نامعلوم راستوں سے آگاہی ہوئی وہیں یادوں کے چلتے جھکڑ مجھے اپنے طالب علمی کے دور میں واپس لے گئے اور مجھے فرید پراچہ صاحب اور اپنی عملی زندگی کے سفر کی شروعات ایک جیسی ہی لگیں۔

فرید پراچہ صاحب سرگودھا کے دور افتادہ علاقے سے اپنے والد صاحب مولانا گلزار احمد مظاہری کی خواہش کے برعکس لاہور آئے اور یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لیا اور اپنے والد محترم کی یہ بات پلے باندھ لی کہ رہائش و تعلیم کے اخراجات آپ خود ہی اٹھائیں گے۔ فرید پراچہ صاحب کو تو اپنے شاندار تعلیمی کیریئر کے باعث سکالرشپ مل گئی جس سے انکے تعلیمی اخراجات کا بندوبست

ہو گیا جبکہ مجھے اپنی رہائش وتعلیم کے اخراجات پورے کرنے کیلئے روزنامہ وفاق میں جز وقتی ملازمت اختیار کرنا پڑی کیونکہ والد صاحب نے لاء کالج میں داخل کرانے کے بعد تعلیم ورہائش کے اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر ہی ڈال دی تھی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ رؤف طاہر صاحب کا بھی تھا چنانچہ ہم اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی کٹھنائیوں والی عملی زندگی میں داخل ہو گئے تھے۔ ''عمر رواں'' بھی ڈاکٹر فرید پراچہ کی ایسی ہی عملی زندگی کی داستان ہے جو انکی یادداشتوں کو پھیلاتے سمیٹتے چارسو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک کتاب میں ڈھل گئی ہے۔ اس میں درج گئی واقعات کا میں عینی شاہد بھی ہوں جبکہ ایوب خان کے مارشل لائی دور میں سرکلر روڈ لاہور پر پیرمکی کے سامنے اکتوبر 1963ء میں جماعت اسلامی کے چارروزہ سالانہ اجتماع عام کی اس کتاب میں درج دلدوز داستان پڑھ کر مجھے مولانا مودودی کی اپنے مشن کے ساتھ استقامت اور انکی جرأت و بہادری پر رشک آنے لگا۔ غنڈوں نے اس اجتماع پر مسلح حملہ کیا' بے دریغ گولیاں برسائیں مگر مولانا مودودی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے پورے اجتماع کو اپنی اپنی جگہ پر ڈٹ کر بیٹھے رہنے کا حوصلہ دیا۔ میں نے اس اجتماع میں کی گئی مولانا مودودی کی تقریر کی آڈیو کیسٹ پہلے بھی سن رکھی تھی جس میں وہ تڑتڑ برستی گولیوں کے دوران اجتماع کے شرکاء کو ثابت قدم رہنے کیلئے ڈھارس بندھاتے اور یہ کہتے ہوئے اپنے مشن پر جرأتوں کے کوہِ گراں بنے نظر آتے تھے کہ اگر میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا۔ ڈاکٹر فرید پراچہ صاحب بھی جرأتوں کے اسی کوہِ گراں کا حصہ ہیں اور مجھے وہ جس طرح طالب علمی کے دور میں باوقار' مدبر اور سنجیدہ شخصیت نظر آتے تھے' آج بھی انکی مدبرانہ اور سنجیدہ شخصیت ہی انکی زندگی پر حاوی نظر آتی ہے اور انکی شخصیت کا تصور بھی یہ گواہی دیتا ہے کہ......

تیرا خیال بھی تیری طرح مکمل ہے
وہی شباب' وہی دلکشی' وہی انداز

ہمارے مقبول و محبوب پبلشر علامہ عبدالستار عاصم نے قلم فاؤنڈیشن کے زیراہتمام ''عمر رواں'' کی دیدہ زیب فرنٹ اور بیک ٹائٹل کے ساتھ اشاعت کا بلاشبہ حق ادا کر دیا ہے جس سے مجھے بھی اپنی یادداشتیں قلمبند کرنے کا حوصلہ ملا ہے۔

''الٰہی خیر ہو''

نئے سال کیلئے بھی ماہرین ارضیات وموسمیات اور سیاسی پنڈتوں نے دلگیر ونمناک حالات کی ہی پیشین گوئیاں کی تھیں سوان پیشین گوئیوں کے مطابق ہی سال 2021ء کا سورج ہمارے لئے دکھوں اور آلام کے ٹوکرے اٹھائے ہوئے نمودار ہوا اور دنیا کا اتھل پتھل والا نقشہ بنتا ہوا نظر آیا۔ میرے لئے دو ذاتی دکھ میرے دو پیاروں کی یکے بعد دیگرے ازلی جدائی کے تھے۔ برادر رؤف طاہر کے سانحہ ارتحال نے مجھے نڈھال کیا ہوا تھا کہ ہمارے بزرگ یٰسین وٹو بھی چار روز بعد ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ وٹو صاحب تو ہمارے ایک طرح سے فیملی ممبر بن چکے تھے۔ خوشی غمی میں انکی شرکت کے ساتھ ساتھ گھر کے سارے اہم معاملات انکی مشاورت سے ہی طے ہوتے تھے۔ جب بھی کسی سخت گھڑی کا سامنا ہوتا تو یٰسین وٹو صاحب ہمارے گھر میں بیٹھ کر آیات قرآنی کا ورد اور خصوصی دعاؤں کا اہتمام کرتے۔ میری بہو جویریہ شہباز کے ہاتھ کی پکی ہوئی شوربے والی مچھلی بہت رغبت سے تناول کیا کرتے۔ گھر آنے سے پہلے انکی پہلی شرط یہی ہوتی کہ جویریہ سے شوربے والی مچھلی کی ڈش تیار کرالو۔ کسی وقت جویریہ موجود نہ ہوتی تو وٹو صاحب کیلئے مچھلی والی ڈش کی تیاری کا فریضہ میری اہلیہ ثمینہ سعید سرانجام دیتی تو وٹو صاحب اسکی بھی یہ کہہ کر ستائش کرتے کہ یہ تو آپ دونوں کے ہاتھ کا کمال ہے۔ گھر آتے تو تمام اہل خانہ کے ساتھ گھل مل جاتے اور آفات وبلیات سے گھر کو محفوظ رکھنے کے وظائف خود بھی پڑھ کر پھونک مارتے اور میری اہلیہ، بیٹیوں اور بہوؤں کو بھی یہ وظائف پڑھتے رہنے کی تلقین کرتے۔ بہت مجلسی آدمی تھے۔ ایک جہان ان کا گرویدہ تھا۔ علم الاعداد، پامسٹری اور ستارہ شناسی کے ماہر اور انسانی ذہنوں کو پڑھنے پر بھی ملکہ رکھتے تھے۔ چنانچہ سیاست دانوں، بیوروکریٹس، فنکار، دانشوروں میں یکساں مقبول تھے۔ میاں

شہباز شریف اور چودھری پرویز الٰہی ان سے خاص انسیت رکھتے تھے۔ اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان انکی ستارہ شناسی پر صاد کیا کرتے تھے اور ٹی وی اینکرز (میل، فی میل) کی تو گویا وہ جان تھے۔ اس طرح وہ فی الحقیقت جانِ جہان تھے۔ ایسی ہر دلعزیز شخصیت کا اچانک بیٹھے بٹھائے رخصت ہو جانا تو......ع

''عجب اک سانحہ سا ہو گیا''

وٹو صاحب ہمارے وقت ٹی وی چینل کے ابتدائی پروگراموں کا حصہ تھے۔ ''ڈاکٹر زوڈک'' کے ساتھ مل کر ایک لائیو ٹاک شو کا آغاز کیا اور کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اسکے ساتھ ساتھ ان کا ہفتہ وار کالم نوائے وقت کے ادارتی صفحات پر اور ہفتے بھر کی پیشین گوئیوں پر مبنی کالم سنڈے میگزین کی تسلسل کے ساتھ زینت بنتا رہا۔ محترم مجید نظامی انکے ساتھ خصوصی انس رکھتے تھے جن کے ساتھ انکی آفس میں اور گھر پر طویل نشستیں ہوتی رہیں۔ میرا ''پاکپتنی گرائیں'' ہونے کے ناطے بھی انکے ساتھ خصوصی تعلّق رہا۔ انکے پاکپتن کے سیاسی خانوادے مانیکا وٹو فیملی کے ساتھ بھی فیملی جیسے ہی تعلقات استوار تھے اور سیاسی فہم و بصیرت کی بنیاد پر وہ ملک کی سلامتی اور اسکے مستقبل کیلئے فکرمند رہتے تھے۔

یہ ارضِ وطن (خدا اسے تاقیامت سلامت رکھے) بلاشبہ آج انتہائی سنگین خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ دنیا کے آبی ماہرین اور مسلمہ ادارے اگلے پانچ سال تک ہمارے لئے بدترین خشک سالی اور قحط کی گھنٹی بجا چکے ہیں۔ ہمارے زیرزمین پانی کی سطح اس وقت تین ہزار فٹ تک نیچے جا چکی ہے اور بتدریج پانی خشک ہونے کا عمل ہماری زرخیز دھرتی کو بہت تیزی کے ساتھ بے آب و گیاہ ریگستان میں تبدیل کرتا نظر آ رہا ہے۔ اس وقت بھی عالمی مالیاتی ادارے آئی ایم ایف نے پاکستان کا شمار ایتھوپیا سے بھی بدتر قحط زدہ ممالک کی فہرست میں کیا ہے اور 2025ء تک پانی کے قطرے قطرے کو ترسنے والے پاکستان کا نقشہ تو ہمارے آبی ماہرین بھی کھینچ چکے ہیں۔ ہمارے شروع دن کے دشمن بھارت کی تو یہی منشاء ہے کہ وہ اس ملک خداداد کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی سازشوں میں کوئی کسر نہ چھوڑے چنانچہ وہ ہمیں بدترین دہشت گردی کی بھی لپیٹ میں

لا چکا ہے، ہم پر باقاعدہ جنگ مسلط کرنے کی بھی جلدی میں نظر آتا ہے اور ہم پر آبی دہشت گردی کا بھی پورا اہتمام کئے بیٹھا ہے۔ اس سال کا آغاز ہی بھارت نے پاکستان کی سلامتی کمزور کرنے کی سازشوں کو بڑھاوا دے کر کیا ہے۔ بلوچستان کے علاقے مچھ میں ہزارہ برادری کے گیارہ مزدور کان کنوں کا بہیمانہ اجتماعی قتل پاکستان کو دہشت گردی اور فرقہ واریت کی بنیاد پر کمزور کرنے کی گھناؤنی بھارتی سازش ہی کا شاخسانہ ہے اور ایسی بھارتی سازشیں تو اب پوری دنیا پر کھل رہی ہیں اور دنیا کو تباہی سے بچانے کیلئے سفاک بھارتی ہاتھ روکنے کی متقاضی ہیں مگر ہم ہیں کہ ان سنگین حالات میں بھی ایک دوسرے کے گریبانوں میں ہاتھ ڈالنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، ایک دوسرے کو مطعون کر رہے ہیں، ایک دوسرے کی پگڑی اچھال رہے ہیں، ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے ہیں، ''باتدبیر'' حکومتی اکابرین ملک میں در آنے والی ہر خرابی اور ہر برائی کا ملبہ سابق حکمرانوں (موجودہ اپوزیشن) کے سر تھوپنے کو ہی اپنی گورننس اور کارنامہ بنائے بیٹھے ہیں۔ ملک بھر میں بجلی کا اچانک بریک ڈاؤن ہوتا ہے تو اسکی اصل وجوہات کا کھوج لگانے کے بجائے متعلقہ وزیر باتدبیر اسے بھی سابق حکمرانوں کی سسٹم کو درست نہ کرنے والی کوتاہیوں کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں جبکہ اپوزیشن کو ایسے سارے معاملات حکمرانوں کی نااہلیت کا پراپیگنڈہ کرنے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں سو اس باہمی آپا دھاپی کا یہ سال کوئی اچھا منظر بناتا تو نظر نہیں آ رہا۔ خدا خیر ہی کرے......

قوم پر طاری ہوا ہے چھین لینے کا جنوں
اور پاگل پن میں ہے سرکار، الٰہی خیر ہو

رفتگاں کی یادیں' توبہ توبہ

اب کی بار تو لگتا ہے' انسانی زندگیاں پت جھڑ کے موسم کی زد میں آ گئی ہیں۔ کرونا تو بس اک بہانہ بنا ہے مگر بچھڑنے والے دوست احباب کی قطاریں لگ گئی ہیں۔ ایک پل ایک دوست عزیز کے اس جہانِ فانی سے اچانک رخصت ہونے کی خبر ملتی ہے تو دوسرے پل ایک اور سنگی ساتھی ازلی جدائی کا چرکہ لگا جاتا ہے۔ اور کیفیت ایسی بن گئی ہے کہ......

اجے اگلے اٹھرو سکے نہیں
لو ہور جنازے آ گئے نیں

ارے بھائی صاحب! اس گوشت پوست کے انسانی لوتھڑے کی اوقات ہی کیا ہے۔ مسبب الاسباب نے نظامِ کائنات میں جس کا جو اور جتنا کردار رکھا ہے' اس نے کم نہ زیادہ' بعینہ وہی کردار نبھانا ہے اور پھر مشیت ایزدی سے اس نے اگلے سفر کو نکل جانا ہے۔ بس اب یہ چل چلاؤ کچھ زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے اور......

درد ایسا ہے کہ جی چاہے ہے' زندہ رہیئے
زندگی ایسی کہ مر جانے کو جی چاہے ہے

بھئی بے ثبات زندگی میں' جس میں اگلے لمحے کی بھی خبر نہیں' ہم سو برس کی آسودگیوں کا اہتمام کر کے بیٹھے ہوں اور ہذا من فضلِ ربی کی گردان کیے جا رہے ہوں تو رب کی آزمائش کچھ زیادہ ہی جھنجوڑ جاتی ہے۔ ایک ''کُن'' کی مرہونِ منت کائنات کی بھلا ربِ کائنات کے نزدیک کیا اوقات ہے۔ یہ تو زلزلے کا ایک جھٹکا برداشت نہیں کر پاتی اور مٹی کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ آسمانوں پر کڑکتی بجلی اتنا لرزاتی ہے کہ تنفس کا سلسلہ بے ترتیب کر دیتی ہے اور آج کی کرونا جیسی

نامعلوم اور غیر محسوس آفت پلک جھپکتے میں انسانی لاشوں کے کشتوں کے پشتے لگا جاتی ہے۔ پھر بھی ہمارا کروفر ہے کہ کہیں نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا مگر ہماری حیثیت و حقیقت یہی ہے کہ......

پل میں یوں تبدیل سب منظر ہوا
جو یہاں تھے' وہ کہیں کھونے لگے

اسی منظر میں آج میں رفتگاں کی یاد میں کھویا بیٹھا ہوں اور ''کیسے یاد رکھیں' کیسے بھول جائیں'' کے شش و پنج میں پڑا ہوں۔ کیسے کیسے گوہر نایاب ہم نے عہد کرونا کے اب تک کے مختصر عرصے کے دوران کھو دیئے ہیں۔ انکے نام لکھنا شروع کروں تو اس کالم میں مزید کچھ لکھنے کی گنجائش ہی نہیں نکل پائے گی۔ اب کرونا کی دوسری لہر نے باقیماندگان کی چل چلاؤ کی قطاریں لگا دی ہیں' بس محفلوں کی رونقیں ہی اٹھتی چلی جا رہی ہیں اور ستم یہ ہے کہ ایک جاتا ہے تو پچھلے گزرے ہوؤں کی یادوں کی جوت بھی جگا جاتا ہے۔ بالخصوص میری جن احباب کے ساتھ نیازمندی رہی وہ تو بہت تیزی سے اٹھتے جا رہے ہیں سو......

ہوا ہی ایسی چلی ہے کہ جی بحال نہیں
وگرنہ ہم تو بہت کم اداس رہتے ہیں

غیر یقینی کی کیفیت ایسی بن گئی ہے کہ یقین کہیں ٹکتا نظر ہی نہیں آ رہا اور حالت ایسی ہے کہ......

خوف کے یوں بیج ہم بونے لگے
کوئی دستک دے تو گھر رونے لگے

پچھلے دنوں یکے بعد دیگرے اپنے محترمین و احباب ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی' سعود ساحر' انور عزیز چودھری' احمد مختار کے اچانک وداع ہونے کے جھٹکے برداشت کرنا پڑے تو یوں محسوس ہوا جیسے......

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

سو اب تو قرار والا کوئی ماحول ہی نہیں رہا۔ بس رفتگاں کی یاد ہے اور ہم ہیں دوستو۔ تلخ یادوں کے اسی موسم میں ہمارے ''بادشاہ'' جہانگیر بدر کی برسی بھی گزر گئی۔ اور اب بالخصوص سعود ساحر اور چودھری احمد مختار کی زندگیوں کے پت جھڑ کے اس موسم میں بکھر جانے سے ہمارے ایک دیرینہ خوابیدہ دوست فاروق قریشی کی یادیں بھی اچانک تازہ ہو گئی ہیں جن کی دو روز بعد 30 نومبر کو برسی ہے۔

ہم تو واقعی انہیں بھول بھلا بیٹھے تھے مگر انکے داماد سہیل اختر ملک نے اچانک انکی یادوں کی گھنٹی بجا دی اور پھر 80ء کی دہائی کے وہ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے آ کر تلخ و شیریں یادوں کے کچوکے لگانے لگے۔ میری ان سے یاداللہ کا سلسلہ کیمپ جیل لاہور میں شروع ہوا تھا۔ یہ پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کا دور تھا اور ملک کی تمام جیلیں پی این اے کے کارکنوں اور قائدین سے بھر گئی تھیں۔ 23/مارچ 1977ء کو ائر مارشل اصغر خان کے جلوس کی کوریج کیلئے چوک لاہور ہائیکورٹ آیا۔ حکومتی جبر و تسلط کے باعث اس جلوس کی تو نوبت نہ آ سکی البتہ نرم چارہ بنے پی این اے کے کارکن ضرور جلالی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے اور میں خواہ مخواہ میں انکی دھمک اور دھاک کی زد میں آ کر ''اسیر تحریک'' بن گیا۔ راؤ مہروز اختر کا صاحبزادہ مسعود اختر بھی پولیس تشدد سے لہولہان ہو کر میرے ساتھ ہی گرفتار ہوا اور ہمیں پولیس تھانہ سول لائنز میں پہنچا کر قتل، ڈکیتی، بلوے کے 18 سنگین مقدمات کی سلامی دی گئی اور رات بھر پولیس حوالات میں جگائے رکھنے کے بعد ہمیں اگلے روز ڈسٹرکٹ کیمپ جیل لاہور منتقل کر دیا گیا۔ وہیں پر میری ملک محمد قاسم، خان اقبال احمد خان، راؤ مہروز اختر، لیاقت بلوچ، محمد فاروق قریشی اور پی این اے کے دوسرے اسیر قائدین اور کارکنوں سے ملاقاتیں ہوئیں جو گہری دوستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ فاروق قریشی کا 1981ء سے شروع ہونیوالی ایم آر ڈی کی کٹھن تحریک کے دوران بھی نمایاں کردار رہا۔ ان کا ریگل چوک کے سامنے صوبہ خان ٹیلر سے ملحقہ ایک گھر میں ڈیرہ تھا چنانچہ ہائیکورٹ سے ریگل چوک تک ایم آر ڈی کا جو بھی احتجاجی پروگرام ہوتا فاروق قریشی اسکے روح رواں ہوتے۔ شام کو اکثر صوبہ خان ٹیلر کے سامنے ریگل چوک کے فٹ پاتھ پر ہماری نشستیں ہوتیں جہاں فاروق قریشی کرسیاں لگوا

دیتے چنانچہ علامہ احسان الٰہی ظہیر' حبیب جالب' اسلم گورداسپوری' رؤف طاہر' ذوالقرنین' سہیل اختر ملک' اکثر ان نشستوں میں رونق محفل بنا کرتے۔ حبیب جالب سے انکی رومانوی شاعری بھی انہی نشستوں میں سننے کا موقع ملا۔ ضیاء مارشل لاء کی سختیاں اور ایم آر ڈی کی تحریک کا جوش و ولولہ' پھر روزانہ گرفتاریاں دینے کی حکمت عملی نے تو حکومتی تدبیروں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ شفیق و ملنسار فاروق قریشی کی روزانہ کی مہمان نوازی نے ہمیں انکی محبتوں کا اسیر کر دیا۔ آج کے سیاسی کلچر میں تو ایسی رواداری اور ملنساری عنقاء ہو گئی ہے۔......

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی
نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

ارے ہم نے بھی کیا کیا زمانے دیکھے اور بھگت لئے ہیں۔ اور اب کرونا کا عہد ناپرساں ہے' تو یہ توبہ۔ اور اس میں رفتگاں کی یادیں ہیں' توبہ توبہ۔

JALALI BOOKS

دکھوں کی سانجھ۔ میں اور رؤف طاہر

مجھے اپنی قلمکاری کی زندگی میں پہلی بار کالم لکھتے ہوئے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا ہے۔ دو دن تک اس ادھیڑ بن ہی میں رہا کہ اپنے لڑکپن کے بجن رؤف طاہر پر کچھ لکھتے ہوئے آغاز کہاں سے کروں۔ بے شک موت برحق ہے، کسی کی موت پر یقین نہ بھی آئے تو بھی اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ ''کل نفس ذائقہ الموت'' ہمارے ایمان کا حصّہ ہے اور قدرت کی جانب سے یہ بے ثبات زندگی کا اٹل پیغام بھی ہے۔ پھر بھی رؤف طاہر کی ناگہانی رحلت پر اب تک یقین ہی نہیں آ رہا۔ پیر کی صبح سب سے پہلے مجھے ڈاکٹر لبنیٰ ظہیر کا مختصر سا پیغام وٹس اپ پر موصول ہوا، اس وقت میں دفتری کام کا آغاز کر چکا تھا۔ پیغام میں درج لفظ ''رؤف طاہر'' پر نظر پڑی اور اسے روٹین کا پیغام سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر دل کو دھڑکا سا لگ گیا، سو کچھ لمحے کے توقف کے بعد دل نے سارا پیغام پڑھنے پر مجبور کر دیا جس میں برادرم رؤف طاہر کے اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر جانے کی جانکاہ خبر دی گئی تھی۔ دل میں بس اک ہوک سی اٹھی اور میں عملاً بے سدھ ہو گیا۔ جب یقین اور بے یقینی کی کشمکش شروع ہوئی تو ڈاکٹر لبنیٰ ظہیر کو فون کر کے تصدیق چاہی۔ انہوں نے رندھے لہجے میں یہ کہہ کر تصدیق کی کہ رؤف صاحب کے بیٹے نے یہ خبر سوشل میڈیا پر پوسٹ کی ہے۔ میں نے بے یقینی میں رؤف طاہر کے موبائل فون نمبر پر ڈائل کیا، بیٹے آصف رؤف نے کال اٹینڈ کی تو فوری طور پر نہ ان سے بات ہو پائی نہ مجھ سے۔ بس سسکیوں اور آہوں کا تبادلہ ہوا۔ آصف نے رؤف بھائی کے سانحۂ ارتحال کی گگھی بندھی آواز کے ساتھ تصدیق کی مگر اس دلِ بے مہر کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ کالم لکھنے کا ارادہ باندھا تو ایس ایم ظفر کے آفس سے ملحقہ ڈھابے پر جیتا جاگتا قہقہے بکھیرتا رؤف طاہر میرے اور اشرف ممتاز کے ساتھ گپ شپ کرتا نظر آیا۔ ہائے......

تیرا خیال بھی تیری طرح مکمل ہے
وہی شباب' وہی دلکشی' وہی انداز

قلم رکھ دیا' بھئی میں زندہ جاوید رؤف طاہر پر کیا لکھوں' کیونکر لکھوں' پھر ذہن پر سکوت مرگ طاری ہوگیا' کچھ لمحہ توقف کے بعد دوبارہ قلم اٹھایا تو یاروں کا غم خوار رؤف طاہر پھر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ میں نے اپنی بیٹی سمیرا سعید کی پنجاب یونیورسٹی کی جاب کے حوالے سے وائس چانسلر ڈاکٹر نیاز احمد سے مشترکہ ملاقات کا کہا تو وہ کھنچا چلا آیا۔ تصور میں یہی محسوس ہوا کہ وی سی صاحب سے ہماری یہی ملاقات ابھی تک جاری ہے اور ہائیکورٹ کیس کی قانونی موشگافیوں میں سے راستہ نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ قلم پھر جھٹک کر رکھ دیا۔ کیا میں ایک جیتے جاگتے انسان کا نوحہ لکھوں؟ دل مان ہی نہیں رہا تھا کہ یاروں کے ہر دکھ کا دم بھرتا اور ہر خوشی کا حصہ بنتا ہمارا بھائی رؤف طاہر ہم میں نہیں رہا۔ دل سے ہوک سی اٹھی......

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا؟

ہائے ہائے...... "یاری سوچ سمجھ کے لادیں' ایہہ دُکھڑے عمراں دے"۔

رؤف طاہر سے میرا تعلق خاطر 1974ء میں اس وقت قائم ہوا جب میں پاکپتن سے اور وہ ہارون آباد سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے لاہور آئے۔ ہم پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں کلاس فیلو بنے اور چند دوستوں کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نے ہمارا دوستوں کا ایک اٹوٹ گروپ بنا دیا۔ میرے اور رؤف طاہر کے علاوہ عبدالرشید مرزا' عبدالوحید خان' راجا ذوالقرنین ذوق اس گروپ میں اٹوٹ دوستی کے بندھن میں بندھ گئے۔ پیپلز لائرز فورم پنجاب کے سابق صدر اور سپریم کورٹ بار کے سابق سیکرٹری راجا ذوالقرنین اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کے ناظم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات کی مہم چل رہی تھی' فرید پراچہ اسلامی جمعیت کی جانب سے صدر کے امیدوار تھے' ہم راجا ذوالقرنین کے ساتھ انکی انتخابی مہم میں جُت گئے اور اسلامی جمعیت طلبہ کے حلقۂ متفقین میں شامل ہوگئے۔ یہ ہمارے دور طالب علمی کی

سیاست کا بھی آغاز تھا۔ جمعیت کا طوطی بولتا تھا۔ فرید پراچہ سے پہلے جاوید ہاشمی سٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے جن کی بے باکی کے بھٹو آمریت کے سامنے ڈنکے بجتے تھے۔ ہمارا رومانٹسزم اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ انکے ناطے سے ہی شروع ہوا اور پھر ہمارے گروپ نے اسلامی جمعیت کی تربیتی نشستوں اور ذیلدار پاک اچھرہ میں سید مودودی کے لیکچرز میں بھی عاجزانہ حصّہ لینا شروع کر دیا اور ''جماعتیا'' والا لیبل ہم نے بخوشی قبول کر لیا۔ اگلے سال پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے انتخاب میں اسلامی جمعیت کی جانب سے عبدالشکور امیدوار تھے اور ہم انکے ''ڈائی ہارڈ'' سپورٹر۔ سو کامیابی پھر ہمارا مقدر ٹھہری۔

میں نے لاء کی تعلیم کے دوران ہی روزنامہ وفاق میں جزوقتی ملازمت اختیار کر کے پیشہ صحافت کا آغاز کر دیا۔ اسی دوران دل میں سودا سمایا اور میں نے بے سروسامانی کے باوجود طلبہ و طالبات کے نمائندہ جریدے ''سٹوڈنٹ'' کا اجراء کر دیا جس میں عبدالرشید مرزا اور رؤف طاہر میرے ہمقدم ہوئے۔ ہم نے طالب علم رہنماؤں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا تو اسلامی جمعیت کی مخالف طلبہ تنظیموں کے الائنس کے ایک سرکردہ لیڈر سلیمان کھوکھر کا انٹرویو ٹائٹل سٹوری کے طور پر شائع کیا۔ وہ یونیورسٹی لاء کالج میں ہمارے کلاس فیلو بھی تھے۔ ہم درحقیقت ''سٹوڈنٹ'' پر طلبہ کی کسی خاص تنظیم کی چھاپ نہیں لگانا چاہتے تھے اس لئے تمام طلبہ تنظیموں کی سرگرمیوں کی کوریج جریدے کی پالیسی کا حصّہ بنایا۔ اسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے پنجاب یونیورسٹی کے سینیٹ ہال میں سماجی ناہمواریوں کے موضوع پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کی شخصیات میں سے شاہی محلّہ کی ایک نامی گرامی طوائف مس شہزادی کو بھی بلایا گیا۔ اسکی تقریر نے سماں باندھ دیا جو سماجی ناہمواریوں کے باعث کسی شریف زادی کے طوائف بننے کے دلائل سے مزین تھی۔ ہم نے اسکی تقریر لیڈنگ سٹوری کے طور پر ''سٹوڈنٹ'' میں شائع کی اور پھر میں، رشید مرزا اور رؤف طاہر ''سٹوڈنٹ'' کے دس پرچے لے کر مس شہزادی کے ''کوٹھے'' پر آ گئے۔ شائقین و تماشبین تو وہاں نوٹ نچھاور کرنے جاتے تھے مگر ہم نے سٹوڈنٹ کے دس پرچے مس شہزادی کے حوالے کر کے اس سے دس روپے نکلوا لئے کیونکہ ایک روپیہ ایک

پرچے کی قیمت تھی۔

شعبۂ صحافت اختیار کرنے کیلئے میرا اور رؤف طاہر کا ذہنی میلان بھی ایک جیسا تھا۔ چنانچہ میری طرح رؤف طاہر نے بھی اس پیشۂ پیغمبری کو اپنا مسکن بنایا۔ ڈاکٹر اعجاز قریشی کے ہفت روزہ ''زندگی'' میں میں نے رؤف طاہر کے ساتھ کچھ وقت اکٹھے گزارا۔ میں تو وفاق میں واپس آ گیا مگر رؤف طاہر وہیں رہے۔ پھر ان کا صحافتی سفر مجیب الرحمان شامی صاحب کے بادبان سے ہوتا ہوا روزنامہ جسارت تک آ گیا جہاں عبدالکریم عابد صاحب بیورو چیف اور ذوالقرنین انتظامی شعبہ کے ہیڈ تھے۔ رؤف طاہر نے یہاں بطور رپورٹر اپنے صحافتی سفر کو آگے بڑھایا اور پھر عابد صاحب کے انتقال کے بعد وہ لاہور میں جسارت کے بیورو چیف بن گئے جبکہ میں وفاق سے آزادؔ وہاں سے صداقت اور صحافت سے ہوتا ہوا واپس وفاق میں آیا اور جنگ کے لاہور سے اجراء پر اسکی پہلی نیوز ڈیسک ٹیم کا حصّہ بنا مگر چند ہی ہفتوں بعد مجھے نوائے وقت سے بلاوا آیا تو جنگ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نوائے وقت میں آ گیا جو تعمیری نظریاتی صحافت کیلئے میرا خواب تھا۔ اس پیشے میں رؤف طاہر کے ساتھ ہی میری سب سے زیادہ ہم آہنگی رہی۔ ہماری شادی بھی ایک ہی سال 1980ء میں ہوئی۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں سکونت بھی ساتھ ساتھ ہی رہی اور صحافتی ٹریڈ یونین کے معرکے بھی ہم اکٹھے سر کرتے رہے۔ رؤف طاہر ذہناً ضیاء کے مارشل لاء کے حامی تھے مگر جمہوریت کا کیڑا انکے ذہن میں موجود تھا اور کھلبلی پیدا کرتا رہتا تھا۔ ایم آر ڈی کی تحریک کی ہم نے اکٹھے کوریج کی جس میں ہماری نئی دوستیاں بھی بنیں۔ 1984ء میں لاہور پریس کلب کے احیاء کی ڈان بیورو سے تحریک شروع ہوئی تو ہم بھی اس کا سرگرم حصّہ بن گئے اور کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔ پھر پی ایف یو جے برنا اور رشید صدیقی گروپ کے ہم خیال دوستوں نے اس تنظیم کو فعال بنانے اور اسکے آئین کی پاسداری کیلئے پی ایف یو جے دستور گروپ کی بنیاد رکھی تو میں اور رؤف طاہر اسکے پائینیرز میں شامل ہوئے۔ اس پلیٹ فارم پر بھی ہماری بہت معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ رؤف طاہر بلاشبہ ایک سچے، کھرے، خالص دیانتدار اور اصولوں پر ڈٹ جانے والے باکردار صحافی تھے۔ لاہور پریس کلب کی ہمارے دور کی باڈی نے ہی مشترکہ پریس کلب کی

بنیاد رکھی تھی۔ رؤف طاہر 1995ء میں نوائے وقت میں آئے اور رپورٹنگ ٹیم کا حصّہ بنے۔ دفتری سیاست میں وہ ہمیشہ میرا دم بھرتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کی خاطر اردو نیوز جدہ کی ادارت سنبھال لی اور دس سال سعودی عرب میں گزار دیئے مگر اس دوران ہمارا باہمی رابطہ مسلسل برقرار رہا۔ وہ 2008ء میں واپس آئے تو انکی رضامندی کے ساتھ میں نے انکی نوائے وقت گروپ میں واپسی کا راستہ ہموار کیا۔ محترم مجید نظامی سے بات کی جنہوں نے انکے وقت ٹی وی میں بطور پروگرام اینکر اور نوائے وقت میں بطور کالم نگار تقرر کی منظوری دے دی۔ انہوں نے وقت ٹی وی کے ٹاک شو کا آڈیشن بھی دے دیا مگر اسی دوران انہیں وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے میڈیا ایڈوائزر کی پیشکش ہوئی تو وہ ڈی جی پی آر آفس میں جا بیٹھے۔ میں اور اشرف ممتاز ہنسی مذاق میں انہیں کہا کرتے تھے کہ ہمارے دوست نے کلاس تبدیل کر لی ہے۔ مگر انکے ساتھ دوستی کا بندھن انکی آخری سانس تک قائم رہا۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر کالم لکھا تو گویا انہوں نے اپنے دل کا سارا غم اس میں انڈیل دیا۔ کالم پڑھتے ہی میں نے انہیں فون کیا تو میرے آنسو جاری تھے۔ ''رؤف بھائی! آج آپ نے بہت رلایا ہے'' میرے اس لفظ پر رؤف طاہر کا گلا بھی رندھ گیا اور ہم ٹیلی فون پر بغیر بات کئے آنسوؤں کے ذریعے اپنے دکھی جذبات کا اظہار کرتے رہے۔ ایسی دردمندی کا جذبہ اب کہاں سے پاؤں گا۔ میں تو آج عملاً تنہاء مفلوج اور مغلوب ہو گیا ہوں۔ یادوں کے چلتے جھکڑ ایک کالم میں نہیں سما سکتے۔ نوابزادہ نصراللہ خان کے ساتھ ہماری نشستیں تو کمال کی رہی ہیں۔ میاں نواز شریف کے ساتھ رؤف طاہر کی رغبت کی ایک الگ کہانی ہے۔ پی ایف یو جے کے اتحاد کیلئے ہمارے آئی ایچ راشد، چودھری خادم حسین، اورنگزیب اور الطاف ملک کے ساتھ سلسلۂ جنبانی کی ایک الگ داستان ہے۔ اس سلسلۂ تکلم میں عمر بیت جائیگی، داستان ختم نہیں ہوگی۔ رؤف طاہر اگلے جہان سدھارے تو ہم بھی انکے پیچھے پیچھے ہی چل رہے ہیں۔ بس بلاوے کا انتظار ہے۔ کیہہ دم دا بھروسہ یار، دم آوے نہ آوے۔

آہ! ظفر اللہ جمالی، قادر حسن اور ناظم شاہ

ہماری زندگیوں پر طاری پت جھڑ کے موسم کو ابھی تک قرار نہیں آیا سو ہمارے بزرگوں، دوستوں، کرم فرماؤں اور عزیزوں، پیاروں کی اچانک اس جہانِ فانی سے رخصتی کے مناظر نمناک آنکھوں کے سامنے آ کر انسانی بے بسی کے کچوکے لگاتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ اور مجھے اپنے اس شعر کا کرب ہی کھائے جا رہا ہے کہ......

ٹُر دے جاندے نیں کیوں لوک
نہ کوئی جھگڑا نہ کوئی گل

دو روز قبل اپنے محترمین عبدالقادر حسن اور سید ناظم حسین شاہ کی یکے بعد دیگرے وفاتِ جانکاہ نے لہو و لعب میں ڈوبی حیاتِ فانی کی اصل حقیقت کے جھٹکے لگائے تو گزشتہ روز سابق وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی کے سانحہ ارتحال نے مزید جھنجوڑ دیا۔ بھائی صاحب! ہماری اصل کہانی تو یہی ہے کہ......

اپنے پاؤں پہ آتا ہے نہ اپنے پاؤں پہ جاتا ہے
تیری کیا اوقات ہے بندے، جس پہ تو اِتراتا ہے

سو ایسے ہی ہم بے بس انسانوں میں سے ہر ایک نے اپنے متعینہ وقت پر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جانا ہے۔ زندگی پر کسی کا کوئی زور ہے نہ اختیار۔ ایک پل میں سارا منظر تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت اٹل ہے کہ......

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

بس اب چل چلاؤ کچھ شدت اختیار کر گیا ہے۔ ان رخصت ہونے والوں میں کچھ چہرے

ایسے ہوتے ہیں کہ بھلائے نہیں بھول پاتے۔اور یاد وہی رہتے ہیں جن کے ساتھ کسی نہ کسی حوالے سے انسیت اور لگاؤ زیادہ ہوتا ہے اس لئے دنیا میں ایسے رہیئے کہ لوگ آپ سے بے ساختہ محبت کریں اور آپ کے رخصت ہو جانے پر دل میں حقیقی کرب محسوس کریں۔حیاتِ فانی رخصت ہوتے ہوئے کسی کو امر کر جائے تو اسی کو حاصلِ زندگی سمجھ لیجئے......

وارث شاہ اوہ جگ تے سدا رہندے

جنہاں کیتیاں نیک کمایاں نیں

میر ظفر اللہ جمالی ہفتہ پہلے علالت کے باعث راولپنڈی کے کارڈیالوجی ہسپتال میں داخل ہوئے اور وینٹی لیٹر پر چلے گئے' اگلے روز انکی رحلت کی افواہ پھیل گئی مگر انکے رخصت ہونے کا متعینہ وقت کچھ اور تھا سو وہ دو دن مزید اس کارگاہِ حیات میں سانسیں لیتے رہے اور پھر بلاوا آنے پر لبیک کہتے رخصت ہو گئے۔ان کا شمار بلا شک وشبہ شریف النفس اور اچھی قدروں والے سیاست دانوں میں ہوتا تھا۔بلوچستان کی محرومیوں کے ڈھنڈورے والی فضا میں میر ظفر اللہ جمالی ان چند سیاست دانوں میں شامل تھے جو دشمنوں کے بنائے گئے پاکستان مخالف ماحول میں بلوچستان میں پوری توانائی کے ساتھ پاکستان کی وکالت کرتے ہوئے اس کا جھنڈا بلند رکھتے تھے۔بلوچستان کی وزارت اعلیٰ سے وزارت عظمیٰ تک کی انکی کامرانی انکی اقدار والی سیاست کی گواہ ہے۔مجھے انکی وزارت عظمیٰ کے دور میں پی ایف یو جے کے صدر کی حیثیت سے پورے ملک کے نمائندہ صحافیوں کو وزیراعظم ہاؤس اسلام آباد لے جا کر ان سے ملاقات کرانے کا شرف حاصل ہوا۔انکی کابینہ کے رکن میاں خورشید محمود قصوری میرے دیرینہ دوستوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے بطور خاص اس ملاقات کا اہتمام کرایا اور میر ظفر اللہ جمالی اس تپاک سے ملے کہ مہمان نوازی کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔اسکے بعد بھی ان سے جہاں بھی ملاقات کا موقع ملا انہوں نے مجھے میرے نام کے ساتھ پکار کر اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔وہ قومی اسمبلی کے ایوان میں عددی اکثریت کے ساتھ ووٹ لے کر وزیراعظم منتخب ہوئے تھے۔بے شک حکومت جرنیلی آمر مشرف کی ساختہ مسلم لیگ (ق) کی تشکیل پائی تھی مگر وہ منتخب وزیراعظم تو تھے۔پھر بھی انہوں نے اپنی خداداد شرافت کی بنیاد پر اس وقت وزارت عظمیٰ کے منصب سے مستعفی ہونے میں دیر نہ لگائی جب مشرف کو ایک امپورٹڈ شخصیت شوکت عزیز کو وزارت عظمیٰ کے منصب پر لانے کی مجبوری لاحق ہوئی۔اس مرحلے میں بھی

سیاسی قدروں والی ایک دوسری شریف النفس شخصیت چودھری شجاعت حسین نے مشرف کا ہاتھ بٹایا جنہیں میر ظفر اللہ جمالی کے مستعفی ہونے کے بعد قومی اسمبلی کے ہاؤس میں ہی دوٹوں کے ذریعے باقاعدہ وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔اس بنیاد پر وہ بھی چاہتے تو ہاؤس کے اعتماد کے ساتھ اس اسمبلی کی پوری ٹرم تک وزیر اعظم کے منصب پر برقرار رہ سکتے تھے مگر شرافت کی سیاست نے اُف کیا نہ تف۔بس دو ماہ گزارے اور وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو کر میدان شوکت عزیز کیلئے خالی چھوڑ دیا۔آج اس شوکت عزیز کو کون جانتا ہے جبکہ چودھری شجاعت حسین اور میر ظفر اللہ جمالی آج بھی لوگوں کے دلوں میں بستے ہیں۔شوکت عزیز زندہ ہو کر بھی فراموش کردہ ہیں اور میر ظفر اللہ جمالی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو کر بھی اپنی یادوں کے خزانے چھوڑ گئے ہیں۔

ہمارے پیشۂ صحافت میں عبدالقادر حسن بھی اقدار نبھانے والی شخصیت تھے۔وہ کالم نگاری میں ہمیشہ میرے آئیڈیل رہے۔نوائے وقت سے انہوں نے صحافت کا آغاز کیا' رپورٹر کی حیثیت سے لاہور کی ڈائری لکھتے لکھتے وہ پختہ کالم نگاری تک آ گئے۔محترم مجید نظامی کے ساتھ انکی عقیدت اور نیازمندی اس انتہاء کی تھی کہ انہوں نے ندائے ملت نکالا تو وہ نظامی صاحب کی انگلی تھام کر وہاں چلے گئے اور بطور چیف رپورٹر خدمات سرانجام دینے لگے۔میں 1981ء میں نوائے وقت کا حصہ بنا تو کالم نگاروں کی صف میں عبدالقادر حسن کا طوطی بولتا تھا۔1982ء میں جب میں رپورٹنگ سیکشن میں آیا تو مجید نظامی صاحب نے عبدالقادر حسن کو ایڈیٹر رپورٹنگ کی ذمہ داری بھی تفویض کر دی ہوئی تھی۔اس وقت سید سجاد کرمانی نوائے وقت کے چیف رپورٹر تھے تاہم یہ سیٹ اپ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد سید انور قدوائی چیف رپورٹر کے منصب پر واپس آ گئے۔قادر حسن صاحب کا اصل فیلڈ کالم نگاری ہی تھا جس میں وہ اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک پوری شان بان اور عزت و آبرو کے ساتھ نمایاں حیثیت سے موجود رہے۔وہ نوائے وقت کو اپنا گھر اور انکی اہلیہ رفعت آپا نوائے وقت کو اپنا میکہ کہا کرتی تھیں۔

رفعت آپا کو پیشۂ صحافت میں پہلی خاتون رپورٹر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جو اپنی حیات فانی کے آخری لمحے تک نوائے وقت کے ساتھ وابستہ رہیں۔انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سانس تک قادر حسن صاحب کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔میں انہیں جب بھی نوائے وقت کیلئے کچھ لکھنے کی گزارش کرتا تو وہ ہر بار پہلے قادر حسن صاحب کے ساتھ اپنی شادی کی یاد

تازہ کرتیں اور بتاتیں کہ قادر حسن صاحب کے ساتھ میری شادی کیلئے مجید نظامی صاحب نے ہی میرے والدین کو رضامند کیا تھا۔ اس لحاظ سے نوائے وقت میرا میکہ بھی ہے اور سسرال بھی۔ بے شک انہوں نے اس رشتے کو آخر دم تک نبھایا۔ قادر حسن صاحب بھی بے شک نوائے وقت چھوڑ کر امروز، جنگ اور ایکسپریس کے ساتھ وابستہ ہوئے مگر انہوں نے بھی اپنے اندر کے نوائے وقتیئے کو مرنے نہیں دیا۔ مجید نظامی صاحب نے مجھے ایک بار نوائے وقت چھوڑ جانے والے سینئر کالم نگاروں کو واپس لانے کا ٹاسک دیا اور بطور خاص قادر حسن صاحب پر اصرار کیا چنانچہ میں نے اپنی پوری نیازمندی کے ساتھ قادر حسن صاحب سے رابطہ کر کے انہیں مجید نظامی صاحب کی خواہش سے آگاہ کیا جس پر انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھی اپنی زندگی کے باقیماندہ لمحات نوائے وقت کیلئے ہی وقف کرنے کے خواہش مند ہیں۔ میں نے مجید نظامی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ بھی خوش ہوئے اور مجھے انکی واپسی کی ''فارمیلٹیز'' طے کرنے کا کہا چنانچہ سلسلۂ جنبانی شروع ہوا مگر بدقسمتی سے بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ مجید نظامی صاحب کا اصولی موقف تھا کہ جتنا معاوضہ نوائے وقت کے دوسرے باقاعدہ کالم نگار لیتے ہیں، اتنا ہی قادر حسن صاحب کو بھی ملے گا جبکہ قادر حسن صاحب اپنی زندگی کی ضروریات کے ہاتھوں مجبور نظر آئے سو بات بنتے بنتے رہ گئی مگر اس مرحلہ پر بھی وضعداری کا دامن ہر دو جانب سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھا گیا۔ آج ایسی اقدار تو یوں عنقا ہوئی ہیں کہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پائیں گی۔

ملتان کے شیریں مزاج اور رکھ رکھاؤ والے سیاست دان سید ناظم حسین شاہ سے وابستہ یادیں بھی آج امڈی پڑی نظر آ رہی ہیں۔ سید ناظم شاہ ملتان سے دس بارہ کلومیٹر پرے آباد ایک گاؤں کے مکین تھے اور ڈیرے داری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح وہ سیاست میں بھی بے باکی کی ساری حدیں عبور کرتے نظر آتے تھے۔ سیاست میں پیپلز پارٹی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی مگر وہ کٹڑ جیالوں والے جذبے کا کبھی اظہار نہیں کیا کرتے تھے چنانچہ رکھ رکھاؤ والے کلچر کا دامن تھام کر وہ پیپلز پارٹی کے نظریاتی اور سیاسی مخالفین کے ساتھ بھی ذاتی مراسم میں کبھی گرہ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ ہمارے دوست سابق صدر سپریم کورٹ بار محمد اکرم شیخ کے ساتھ ان کا بچپنے کا یارانہ تھا جس میں اکرم شیخ صاحب کے پیپلز پارٹی کے ساتھ نظریاتی فاصلے کے باوجود کبھی ڈنٹ نہ پڑا۔ اکرم شیخ صاحب نے ایم آر ڈی کی تحریک کے کٹھن دور میں لاہور کے اپنے چند دوست صحافیوں کو ملتان کی سیر کرانے کی ٹھانی

اوران دوستوں کیلئے ایک رات کی میزبانی کا شرف سید ناظم حسین شاہ کو بخشا چنانچہ ہمیں سید ناظم شاہ کے رہن سہن کا بھی قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع مل گیا۔ملتان سے چند کوس آگے ڈیرے کی طرز کے سید ناظم شاہ کے مکان میں شب بسری ہوئی۔گرمیوں کے دن تھے اور ملتان کی گرمی کی شدت مثالی ہوتی ہے مگر سید ناظم نے اپنے گھر کے صحن میں ہماری چار پائیاں لگوا کر زمین پر سوندھی سوندھی خوشبو والا پانی کا چھڑکاؤ کرایا اور چار پائیوں کے دونوں کونوں پر واٹر کولر لگوا کر گرمی کی حدت بے اثر کرنے کا ایسا اہتمام کیا کہ ملتان کی گرمی کی ضربِ المثل سوغاتیں بھی شرماتی نظر آئیں۔انکے گھر دوسری بار جانے کا اتفاق ہمیں ملتان میں پی ایف یو جے کے ایک تنظیمی اجلاس کے موقع پر ہوا اور ہم پھر انکے عشائیہ پر انکے مہمان بنے۔وہ پیپلز پارٹی کی جانب سے میاں منظور وٹو کی کابینہ میں صوبائی وزیر نامزد ہوئے تھے چنانچہ اس دور میں انکی شاہراہ قائداعظم والی سرکاری اقامت گاہ پر اکثر نشستیں ہوتی رہیں۔وہ ہر بار کیوڑہ ملے روح افزاء کے شربت سے تواضع کرتے جس کی خوشبو پورے کمرے میں پھیل جاتی اور پھر عمل و آگہی کی کرنیں بکھیرتی انکی گفتگو پیپلز پارٹی کی جیالا کلچر والی سیاست پر حاوی ہو جاتی۔اس دور میں صوبائی اقتدار کے ایوانوں میں ٹکا محمد اقبال اور سید ناظم حسین شاہ کی سیاسی دور بینی کے چرچے تھے۔رکھ رکھاؤ اور اقدار والی اس دور کی سیاست کا آج سیاست کو ذاتی دشمنیوں کے دہکائے گئے میدان میں جھونکنے والے کلچر کے ساتھ موازنہ کرنا بھی سیاست کے زریں اصولوں کو بٹہ لگانے کے مترادف نظر آتا ہے۔اور آج تو......

میرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماشبینوں میں

''ناکردہ گناہ بھی گناہوں میں چلی آئے''

انسانی جانوں پر جیسے پت جھڑ کا موسم آ گیا ہے۔ ہمارے دوست، احباب، عزیزوں، پیاروں اور نامور شخصیات میں سے کسی کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ آج زندہ سلامت ہیں تو کل کو ہوں گے بھی یا نہیں۔ سوشل، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا دھڑا دھڑ ہونے والی اموات کی خبروں سے بھرا پڑا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کے ایسے مناظر کبھی دیکھے نہ تھے، خوف ایسا ہے کہ جسم کے روئیں روئیں میں سرائیت کر چکا ہے۔ آج ایک جیتے جاگتے، ہنستے بستے آدمی سے رابطہ ہوتا ہے اور اگلے دن اس کی موت کی خبر آ جاتی ہے۔ وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ زندہ انسانی معاشرے کے ایسے مناظر بھی بن سکتے ہیں۔ میری ایک دہائی قبل کی ایک غزل کا شعر ہے کہ......

پل میں یوں تبدیل سب منظر ہوئے
جو یہاں تھے، وہ کہیں کھونے لگے
ہائے ہائے، ذرا سی دیر میں کیا ہوگیا زمانے کو
سیانڑ دے ہنجو ہن ویکھے نہیں جاندے
تھل نوں خورے کی ہووے گا، ڈر دا رہناں
ارے موت تو اٹل ہے، برحق ہے، اس سے کسی کو مفر کہاں
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

اس اٹل حقیقت سے بھلا کون انکار کرے گا مگر زندگی کی اتنی بے قدری تو کبھی دیکھی نہ تھی۔ یہ کرونا وائرس کیا ہے بھئی، انسانی جان لینے کا ایک بہانہ ہے یا رعونت میں ڈوبے کروفر والے سرکش انسانوں کیلئے ایک سبق ہے؟

ہمارے ہردلعزیز فنکار و دانشور طارق عزیز کا کل تک سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو پیغام چل رہا تھا جس میں وہ کرونا سے نبرد آزما ڈاکٹروں کی خدمات پر انہیں سلام عقیدت و محبت پیش کرتے ہوئے کرونا کو شکست دینے کے قومی عزم کا اظہار اپنے روایتی پر جوش انداز میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا کر کر رہے تھے اور اگلے ہی روز ان کی موت کی خبر آ گئی۔ مجھے اس لئے بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ ''ساہیوالین'' ہونے کے ناطے اور پھر نوائے وقت میں ان کے ساتھ کچھ عرصہ کی رفاقت کے حوالے سے ان کے ساتھ انسیت بھی تھی۔ وہ پی ٹی وی سے جبری فراغت کے بعد نوائے وقت کے انچارج ''ایوان وقت فورم'' بنے تھے۔ اس عرصہ کی کھٹی میٹھی یادیں آج بھی دل میں گدگدی کرتی ہیں۔ اجل اس بڑے فنکار اور شاعر و دانشور کو بھی پلک جھپکتے میں اپنے ساتھ لے گئی اور پھر سینئر انقلابی صحافی دوست حافظ عبدالودود کی موت کی خبر نے تو انجر پنجر ہلا دیا۔ وہ گزشتہ دو سال سے موت کے ساتھ جنگ لڑ رہے تھے اور موت کا ہر غلبہ و حصار توڑ کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ انہوں نے کرونا کو بھی دو بار شکست دی۔ ان کا کرونا رزلٹ دو بار پازیٹو سے نیگٹو ہوا۔ یار لوگ اس معرکہ میں ان کی کامرانی کے ڈنکے بجا رہے تھے کہ کل اچانک انہیں اجل نے گھیر لیا اور عدم آباد پہنچا کر دم لیا۔ ہمارے عزیز دوست سہیل وڑائچ اور اینکر عمران خاں ماشاءاللہ کرونا سے دو دو ہاتھ کر کے معمول کی زندگی کی جانب واپس لوٹ آئے ہیں۔ ہماری دانشور دوست ڈاکٹر صغریٰ صدف نے بھی کل اپنے بھتیجے راجہ حسن جلیل کے کرونا سے مکمل صحت یاب ہونے کی خوشخبری سنائی۔ خدا کرونا کی لپیٹ میں آئے دیگر تمام احباب و اکابرین کو بھی اپنی حفظ و امان میں رکھے مگر وہ کیا ہے کہ ''لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر، کیا کیجئے'' زندگی کی بے ثباتی کا ہمہ وقت جھاکا ساپڑا رہتا ہے اور کرونا کے ہاتھوں موت، توبہ توبہ، خدا خدا کیجئے۔ اس بے بسی او بے توقیری والی موت سے خدا کی پناہ ہے.....

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

بھئی خوف کی اس تریری بڑی کے انسانی صحت اور نخوت و تکبر والی ذہنیت پر بھلا کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں، ہمیں تو بے ثبات زندگی کے باقی ماندہ ایام اب خدا کے شکرانے میں اور خوف خدا میں ڈوب کر گزارنے چاہئیں۔ اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر کرنی چاہیے۔ تکریم انسانیت کا

درس عام کرنا چاہئے۔ صلہ رحمی کے جذبے کے ساتھ وابستہ ہو جانا چاہئے۔ دنیاوی لوبہ سے کنارہ کشی کر لینی چاہئے، روح کی پالیدگی اور اطمینان قلب کا اہتمام بالالتزام کرنا چاہئے مگر تف ہے ہماری سوچ پر، ہماری زندگی کے چلن پر کہ آج بھی......

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کرونا کے خوف نے اور موت کی بے ثباتی کی بار بار کی، ہزار بار کی منظر کشی نے بھی ہمارے لہجوں، رعونتوں، اناؤں، ریاکاریوں اور آقاؤں، عالیجاؤں والی ذہنیتوں میں کوئی ڈنٹ نہیں ڈالا، حرام کاری ویسی کی ویسی ہے، حصول منصب و جاہ کی بھوک پہلے سے بھی دو چند ہو گئی ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی علت جوں کی توں برقرار ہے۔ استحصالی شکنجے ویسے کے ویسے ہی بے بسوں، بے کسوں پر قیامت ڈھا رہے ہے، چوری سینہ زوری اور ناجائز منافع خوری کا کاروبار اسی طرح بے خوفی کے ساتھ چل رہا ہے۔ انسان مر رہا ہے مگر اس کی ''میں'' کو موت نہیں آ رہی۔ بھئی دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ کہاں عنقا ہو گیا، باہمی بھائی چارے اور رواداری کی لگن کس کونے کھدرے میں جا چھپی اور ریاست مدینہ کے سہانے تصور کو کون گرہن لگا گیا۔ وہی آپا دھاپی کا ماحول، وہی جھوٹی اناؤں کی اوڑھی ہوئی قبائیں، وہی اک چال بے ڈھنگی، جو پہلے تھی سواب بھی ہے۔ ارے ناہنجارو، ذرا سوچو، خدا نے آپ کو کرونا وائرس کے شکنجے سے نکال کر زندگی دی اور آپ کے خون میں پلازمہ کی شکل میں کرونا وائرس کے مریضوں کو بچانے کی برق دوڑا دی مگر آپ نے خدا کی اس نعمت کو بھی کاروبار بنا لیا اور پلازمہ دکھی انسانیت میں زندگی کی رمق دوڑانے کیلئے عطیہ کرنے کے بجائے لاکھوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ہائے ہائے ''کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد'' ارے بھائی صاحب، ہمارا زندگی کا یہی چلن ہے تو پھر ہمیں زندگی سے کیا لینا دینا......

تکمیل ضروری ہے، ادھر ہو کہ ادھر ہو
ناکردہ گناہی بھی گناہوں میں چلی آئے

آسودۂ خاک ہستیاں پیر کبیر شاہ اور رحمت علی رازی

ان کے غلام محمد عربی ﷺ اور خدا کی برگزیدہ ہستی ہونے کی اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوسکتی ہے کہ انہیں اپنی فانی زندگی کے ختم ہونے کے معینہ وقت تک کا علم تھا اس لئے انہوں نے اپنے آسودہ خاک ہونے کی تیاری بھی پہلے سے کر رکھی تھی۔ ایک سال پہلے انہوں نے خیابان چورہ شریف ہنجروال میں اپنے گھر سے ملحقہ مسجد اور مدرسے کے صحن میں اپنی قبر بھی کھدوادی۔ اس قبر کا کتبہ بھی خود ہی تیار کرایا اور اپنے جسد خاکی کے لحد میں اتارے جانے کے انتظامات بھی اپنی زندگی میں کر دیئے۔ ان کی زندگی کی جو بھی مصروفیات ہوتیں اور انہیں جہاں بھی جانا ہوتا، ہمہ وقت وردِ الٰہی میں مصروف رہنا انہوں نے معمولات زندگی کا حصہ بنالیا تھا۔ ان کے حلقۂ ارادت منداں میں بھی ذکر الٰہی اور وردِ درود شریف معمولات زندگی کا حصہ بنا ہوا تھا۔ باریش نورانی چہرے، کشادہ پیشانی اور روشن آنکھوں والے پیر طریقت سید کبیر علی شاہ آف چورہ شریف اپنے قد و قامت کے حساب سے بھی مسحور کن شخصیت تھے اور جب وہ مسند پر بیٹھے خطاب کر رہے ہوتے تو الفاظ تعظیماً ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے۔ اتنی شستگی، روانی اور ترتیب و سلیقے سے بولتے کہ غالب کے اس شعر کی تصویر بن جاتے......

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

جمعرات 11 جون کی رات تک وہ ہشاش بشاش تھے۔ اپنے گھر اہل خانہ کے ساتھ بیٹھے ذکر الٰہی میں مصروف تھے اور درود شریف کا ورد جاری رکھے ہوئے تھے کہ اچانک ساڑھے گیارہ بجے کے قریب انہوں نے اپنی اہلیہ اور بیٹوں سے استفسار کیا کہ بارہ بجنے میں کتنا وقت باقی ہے۔ پھر وہ

خود ہی مخاطب ہوئے کہ خداوند کریم نے انہیں زندگی کی جتنی مہلت دی تھی وہ اب پوری ہو رہی ہے اس لئے میں آپ کو سپرد خدا کر رہا ہوں۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے درود شریف کا ورد بھی جاری رکھا،ان کے چہرے پر کسی تکلیف،نقاہت،خوف یا رنج والم کے کوئی آثار نہیں تھے۔جب جمعرات کی گھڑی مکمل ہوئی اور رات بارہ بجے جمعۃ المبارک کا آغاز ہوا تو انہوں نے درود شریف کے ساتھ ساتھ بلند آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد بھی شروع کر دیا اور اسی دوران ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ اطمینان کے ساتھ ابدی نیند سو گئے۔ایسی ہشاش بشاش آسودہ زندگی اور اتنی آسان موت ان کے خدا کی عزیز ہستی ہونے کی ہی علامت ہے۔ان کی رحلت کی خبر صرف سوشل میڈیا پر موجود تھی،ان کے صاحبزادگان پیر سبطین گیلانی اور مصطفین مجددی نے ان کی نماز جنازہ کیلئے صبح گیارہ بجے کا وقت متعین کر دیا تھا،ان کے بڑے صاحبزادے سید ثقلین حیدر چورا ہی امریکہ میں مقیم ہیں جہاں سے ان کا فوری طور پر ملک واپس آنا ممکن نہیں تھا اس لئے انہوں نے اپنے والد محترم کی نماز جنازہ اور تدفین کے حوالے سے وہیں سے ضروری ہدایات جاری کیں اور ہفت آسمان نے دیکھا کہ کرونا وباء کے خوف کے اس عالم میں بھی پیر سید کبیر شاہ کے مریدین اور عقیدت مند ہزاروں کی تعداد میں نم آنکھوں کے ساتھ درود شریف کا ورد کرتے ہوئے ان کے جنازے میں شریک ہو گئے۔ان کے ساتھ ایسی ہی عقیدت و محبت کے نظارے اتوار 14 جون کو ان کی رسم قل کے موقع پر نظر آئے۔آج جبکہ کرونا کے خوف نے کسی کی میت لحد میں اتارنا بھی ان کے عزیزوں،پیاروں تک کیلئے مشکل بنا دیا ہے۔پیر کبیر علی شاہ کے جنازے،ان کی تدفین کی رسومات اور پھر رسم قل میں ہزاروں لوگوں کا شریک ہونا ان کے اللہ کے خاص بندے اور حضور پاک ﷺ کے خاص امتی ہونے کی ہی گواہی ہے۔

وہ امام صحافت مجید نظامی کے خصوصی حلقہ احباب میں شامل تھے اور اس ناطے سے میرا بھی ان کے ساتھ تعلق خاطر استوار ہوا تاہم محترم مجید نظامی کے انتقال کے بعد میرے ساتھ ان کی شفقت و محبت دوچند ہو گئی،کبھی بیرون شہر سے واپس لوٹتے تو موٹر وے سے اترتے ہی اپنی گاڑی کا رخ میرے گھر کی جانب کر لیتے۔کچھ لمحات میرے ساتھ گزارتے،محترم مجید نظامی کی یادیں تازہ کرتے

اور پھر اپنے گھر روانہ ہوتے۔ پھر کبھی ملنے کو بے تاب ہوتے تو گاڑی بھجوا کر مجھے اپنے پاس بلوا لیتے۔ میرے پوتے سانول کے ساتھ ان کی خاص رغبت ہو گئی تھی اور میری اہلیہ ثمینہ کو انہوں نے اپنی بہن کا درجہ دے رکھا تھا۔ کبھی ملاقات میں لمبا وقفہ پڑ جاتا تو میری اہلیہ سے شکوے بھرے لہجے میں مخاطب ہوتے ''بہن انہیں کہیں کہ میل جول رکھا کریں، مجھے ان میں اپنے دوست مجید نظامی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک بار ہماری پوری فیملی پیر صاحب کے گھر مدعو تھی، انہوں نے رخصتی کے وقت اپنی اہلیہ کو پیغام بھیجا کہ میری بہن کیلئے وہ شہد بھجوا دو جو میرے مرید خاص رات کشمیر سے میرے لئے لائے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت شہد کی دو بوتلیں آ گئیں۔ میرے چھوٹے بھائی رفیق زیدی کا پاکپتن میں انتقال ہوا تو انہوں نے میری لاہور واپسی پر خیابان چورہ شریف میں ایک خصوصی دعائیہ نشست کا اہتمام کیا اور پھر اس کے چہلم کی تقریب میں لاہور سے اپنے مریدین کے جلو میں پاکپتن تشریف لائے اور راستے بھر مخصوص انداز میں درود شریف کا ورد جاری رکھا۔ ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ خلوص و اپنائیت کا رشتہ محترم مجید نظامی صاحب کے ساتھ تعلق خاطر کی نسبت اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال سے صرف دو روز قبل میرا ان سے ٹیلی فونک رابطہ ہوا اور میں نے اتوار کو ان کے پاس حاضری کا وعدہ کیا۔ یہ حاضری ضرور ہوئی مگر حاضری کی یہ سعادت ان کی رسم قل میں شرکت کی تھی، ان کی دینی اور سماجی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کی چار دانگ عالم میں پھیلی چادر اوڑھ تحریک نے باحجاب معاشرے کی بنیاد مستحکم کی۔ ٹاؤن شپ لاہور میں انہوں نے بے آسرا خواتین کی کفالت کیلئے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جو ان کے خدمت انسانیت کے جذبے کا پرتو تھا۔ خدا اپنے اس خاص بندے اور سچے عاشق رسولﷺ کی لحد کو اپنے نور سے منور رکھے اور ان کی بیوہ اور بیٹوں کو دکھی انسانیت کی خدمت کیلئے جاری ان کے نیک مشن کو انہی کے جذبے کے ساتھ برقرار رکھنے کی ہمت و توفیق دے......

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

آج میرے عزیز دوست رحمت علی رازی کو بھی اس جہان فانی سے گزرے ایک سال بیت گیا اور جیسے مجھے ان کی موت کا آج تک یقین نہیں آیا ویسے ہی مجھے آج یہ یقین بھی نہیں آ رہا کہ

ہمارے اس پیارے دوست کو ہم سے ازلی بچھڑے آج پورا ایک سال بیت گیا ہے۔ ویسے تو موت اٹل ہے، اس کا ذائقہ ہر ذی روح نے چکھنا ہے اور آج کرونا وائرس کے عہد میں تو زندگی کا کوئی اعتبار ہی نہیں رہا اور میرے اس شعر والی کیفیت بنی ہوئی ہے کہ......

کل نوں خورے کیہہ ہووے گا، ڈر دا رہناں

پل نوں خورے کہہ ہووے گا، ڈردا رہناں

پھر بھی بعض ایسی شخصیات ہوتی ہیں جن کا کردار و عمل زندگی کو معتبر بنا دیتا ہے۔ ہمارے بھائی، دوست اور سجن رحمت علی رازی بھی ایسی ہی شخصیات میں شامل تھے جنہوں نے زندگی کو باوقار بنایا اور نفسا نفسی کے دور میں باوقار زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا۔ میری اور رحمت علی رازی کی رفاقت تقریباً 45 سال پر محیط ہے۔ اس دوران ہم نے پیشہ، صحافت میں اکٹھے کئی معرکے مارے اور سود و زیاں کے کئی مراحل طے کیے۔ وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ ایسی ہشاش بشاش مجلسی شخصیت پلک جھپکتے میں ہم سے جدا ہو جائے گی۔ وہ آج بھی میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہوتے ہیں تو مجھے آن بان اور ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ اپنے آفس میں بیٹھے اور میرے ساتھ انکھیلیاں کرتے ہی نظر آتے ہیں مگر جب حقیقت کا سامنا ہوتا ہے تو ان کی یاد کچوکے لگاتی بے ثبات زندگی کا انمٹ اور گہرا احساس دلا جاتی ہے۔ خدا اس جنت مکانی کو ابدی آسودگی کے خاص مقام پر سرفراز فرمائے اور حیات بعد از ممات میں بھی ہم ایک دوسرے کے سنگ سنگ ہی رہیں۔

لے او یار حوالے رب دے، میلے چار دناں دے

اوہ دن عید مبارک ہوسی، جس دن فیر ملاں گے

اسے بہت جلدی تھی

اسے بہت جلدی تھی۔ شائداسے زندگی کی بے ثباتی کا کچھ زیادہ ہی احساس تھا اس لئے ہر کام نمٹانے کی جلدی میں تھا۔ فصیح الرحمان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بچپن سے جوانی تک کا عرصہ اس نے والدین کے ساتھ دبئی میں گزارا۔ وہیں پر تعلیم حاصل کی اور پھر اس کے والد ملک محمد ارشد ملک واپس آ گئے تو فصیح الرحمان بھی اپنے مستقبل کے سہانے سپنے لئے والد صاحب کے ہمراہ لاہور آ گیا۔ سبزہ زار ڈی بلاک لاہوران کا نیا مسکن بنا۔ میں بھی ان دنوں سبزہ زار ڈی بلاک میں گھر بنا کر اس میں منتقل ہو چکا تھا۔ بس اکا دکا گھر تھے اور مسائل بے پناہ۔ سلاٹر ہاؤس کا تعفن اور پھر ہفتہ وار منڈی مویشیاں ہمارے گھروں کے سامنے خالی پلاٹوں پر ہی لگا کرتی۔ زندگی عاجز آ گئی۔ ماحولیاتی آلودگی اور گندگی کے ڈھیروں نے کھلی فضا میں سانس لینا مشکل بنا دیا۔ میں نے ملک ارشد، لطیف بٹ، افضل خاں صاحب اور ڈی بلاک کے دیگر معدودے چند مکینوں سے مشاورت کی اور آلودگی کے گڑھ سلاٹر ہاؤس اور منڈی مویشیاں کو لاہور سے باہر منتقل کرانے کے لئے کمر باندھ لی۔ ملک ارشد اس حوالے سے بہت جذباتی تھے اور علاقے کے مکینوں سے بھی اُلجھ پڑا کرتے تھے۔ ہم نے سبزہ زار ویلفیئر سوسائٹی تشکیل دی، اسے رجسٹرڈ کرایا اور پھر اس کے پلیٹ فارم پر احتجاجی مظاہروں، جلسوں، جلوسوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مدمقابل ایک بہت بڑا مافیا تھا، بہت رکاوٹیں بھی پیدا ہوئیں۔ زندگی کو خطرات بھی لاحق ہوئے مگر اپنے عزم میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ میں نے دادرسی کے لئے لاہور ہائیکورٹ سے بھی رجوع کر لیا۔ تاریخوں پر تاریخیں مگر اس وقت کی بیوروکریسی، سیاستدانوں اور سلاٹر ہاؤس سے وابستہ مافیا نے عدالتوں کو بھی چکرائے رکھا۔ اس جدوجہد میں ہم بہت کٹھن مراحل سے گزرے مگر

علاقے کو صاف کرنے کا بے لوث جذبہ ہم سب کی ہمت بندھاتا رہا۔ہم نے دس سال تک لاہور ہائیکورٹ میں عدالتی جنگ لڑی، مافیا کی آئے روز کی دھمکیاں برداشت کرتے رہے اور پھر اس جدوجہد میں لاہور بچاؤ تحریک کی عمرانہ ٹوانہ اور انسانی حقوق کی بعض دیگر تنظیموں کی بھی ہمیں معاونت حاصل ہوگئی اور بالآخر عدالتی جنگ میں مافیا کو مات کھانا پڑی اور عدالتِ عالیہ کے حکم پر 2006ء میں سلاٹر ہاؤس اور کیٹل مارکیٹ کی سبزہ زار ڈی بلاک کوٹ کمبوہ سے شاہ پور کانجراں منتقلی ہوگئی۔ یہ انسانی حقوق کی جدوجہد کا بلاشبہ ایک طویل سفر تھا جس میں سبزہ زار سکیم کے مکینوں نے اپنا جذبہ کبھی کم نہ ہونے دیا اور اس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھی اخوت و اپنائیت کے بندھنوں میں بندھ گئے۔ یہ علاقہ ہمارے لئے ایک خاندان بن گیا جس میں دکھ سکھ کی سانجھ بھی پختہ ہوتی رہی۔

ان دنوں ملک ارشد اکثر اوقات میرے ساتھ فصیح الرحمان کے مستقبل کے حوالے سے بات کیا کرتے تھے۔اس پر نوعمری میں ہی سنجیدہ پن طاری تھا۔اس دور میں ہمایوں اختر خاں نے تجارتی سرگرمیوں کی کوریج کے لئے ایک انگلش ہفتہ وار رسالہ نکالا تھا۔سابق وفاقی وزیر اقبال احمد خاں اور اپوزیشن اتحاد ایم آر ڈی کے صوبائی کنوینئر میجر اعجاز احمد خاں فصیح الرحمان کا ننھیال تھے۔ اقبال احمد خاں نے فصیح کو ہمایوں اختر خاں کے پرچے کے ساتھ منسلک کرا دیا مگر فصیح مطمئن نہیں تھا۔وہ اپنے ابو پر زور دیتا رہا کہ انکل آسی سے کہہ کر مجھے کسی انگریزی اخبار میں رکھوا دیں۔ملک ارشد صاحب نے اس بارے میں مجھ سے بات کی اور میں نے اپنے ادارے کے انگریزی اخبار ''دی نیشن'' میں بطور ٹرینی رپورٹر اس کے لئے گنجائش نکلوا دی چنانچہ فصیح نے 1997ء میں ''نیشن'' کے پلیٹ فارم پر باقاعدہ طور پر پیشۂ صحافت اختیار کرلیا۔ملک ارشد صاحب بھی اس کے مستقبل سے مطمئن ہوگئے۔ فصیح بلاشبہ بہت باصلاحیت تھا۔اس نے جلد ہی اس پیشے میں اپنی پہچان اور اپنا مقام بنالیا وہ یقیناً ترقی کی منازل کو جلدی جلدی طے کرنا چاہتا تھا۔چنانچہ اسے ایک دوسرے انگریزی اخبار ''دی نیوز'' میں جانے کا موقع ملا تو اس نے فیصلہ کرنے میں ہرگز دیر نہ لگائی۔بس میرے پاس آیا' آفر کا بتایا اور پھر میری آشیرباد لیکر دوسرے پلیٹ فارم پر چلا گیا۔اس

کے دی نیوز جوائن کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ٹی وی چینلز کا دور شروع ہو گیا اور فصیح الرحمٰن ''جیو'' کی پہلی ٹیم کا حصّہ بن گیا جس کیلئے بہر صورت اسے لاہور کو خیر باد کہنا پڑا۔ چنانچہ اس نے اگلا پڑاؤ اسلام آباد میں ڈال لیا۔ اس کی اضطراری طبیعت کو قرار نہیں تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے اچھے سے اچھے مواقع کی تلاش میں رہا اور اس طرح وہ ٹی وی چینلز کی بہار میں جیو سے دنیا اور پھر ایکسپریس کا ہو گیا۔ اسلام آباد میں کرائے کا گھر لیا اور والدین کو بھی لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہمارے بھائی ملک ارشد اور بہن شمیم کو مجبوراً اپنے اکلوتے بیٹے کا فیصلہ تسلیم کرنا پڑا اور سبزہ زار ڈی بلاک کا مکان فروخت کر کے وہ بھی فصیح کے ساتھ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔

فصیح نے آگے بڑھنے کی لگن میں کئی بار بیروزگاری بھی بھگتی مگر اپنے پاؤں کبھی ڈگمگانے نہ دیئے البتہ ہمارے باہمی رابطے ضرور ٹوٹ گئے۔ بس کبھی ہمارا اسلام آباد جانا ہوتا یا ان کا لاہور آنا ہوتا تو میل ملاقات کی چند ساعتیں نکل آتیں۔

کچھ عرصہ قبل فصیح الرحمٰن نے ''دی نیشن اسلام آباد'' کو بطور ریذیڈنٹ ایڈیٹر جوائن کیا تو پھر دفتری حوالوں سے بھی ہمارے رابطے قائم ہو گئے مگر یہ روابط بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکے اور فصیح کو ''نیشن'' سے سبکدوش ہونے کے بعد کچھ عرصہ بیروزگاری کا گزارنا پڑا مگر اس نے اپنی متحرک زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ مختلف ٹی وی چینلز کے ٹاک شوز میں شریک ہو کر اپنے ہونے کا احساس دلاتے رہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی اس نے ڈیلی ٹائم کو جوائن کیا تھا اور اس عرصے میں وہ یکے بعد دیگرے اپنے والد اور والدہ کے انتقال کا صدمہ برداشت کر چکا تھا جن کی میتیں اٹھا کر وہ لاہور لایا اور آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا۔ دو سال قبل اس کی بڑی بہن انیقہ بھی ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے گئی، اس کی تدفین کی رسومات کے موقع پر فصیح سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت لاغر دکھائی دیا۔ ذیابیطس کے مرض نے اسے نچوڑ دیا تھا مگر وہ اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے اچھے مستقبل کیلئے کام پر جُتا رہا۔ اس دوران ہماری میڈیا انڈسٹری شدید اقتصادی بحران سے دوچار ہوئی تو فصیح کیلئے کارزارِ حیات اور بھی مشکل ہو گئی۔ آج یہی چیلنج میڈیا سے وابستہ افراد کیلئے جان لیوا ثابت ہو رہا ہے جس نے میرے بیٹوں جیسے دوست فصیح الرحمٰن کو بھی گزشتہ روز نگل

لیا ہے۔ بدھ کی صبح اسے گھر میں ہی اچانک دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال پہنچنے تک اس کی زندگی نے اس کے جسد خاکی کے ساتھ اپنا بندھن توڑ دیا اور آج وہ لاہور میں اپنے والدین کے پہلو میں آسودہ خاک ہو چکا ہے۔ بس یہی زندگی کی ساری حقیقت ہے، ہم لہوولعب میں ڈوبے آسودہ زندگی کے بڑے بڑے منصوبے بنا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ دنیاداری کے بکھیڑوں میں خود کو الجھائے رکھتے ہیں مگر سانس نکلتے ہی سب کچھ مٹی کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ہمارے دوست ملک ارشد کے خاندان میں آج صرف ان کی ایک بیٹی زندہ ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے مگر والدین، بہن اور بھائی کی وفات کے صدمات اسے زندگی کی آسودگیوں سے بھلا کہاں ہمکنار ہونے دیں گے۔ میری اور میری اہلیہ ثمینہ سعید کی تمام تر دعائیں ملک ارشد مرحوم کی سب سے چھوٹی بیٹی فریحہ کی زندگی کی خوشیوں کی متمنی ہیں۔ خدا ہمیں دنیاوی لوبھ سے ہٹا کر مٹی کی محبت کے ساتھ وابستہ کر دے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ الوداع فصیح، الوداع۔۔۔۔۔

چوکھٹے قبر کے خالی ہیں انہیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے

سعید اظہر سے تعلّقِ خاطر کی چار دہائیاں

اگر چہ وہ خود بھی اپنے نام کے ساتھ لفظ ''مولوی'' ہی لکھا کرتے تھے مگر میں نے انہیں کبھی اس لفظ کے ساتھ نہیں پکارا۔ اس سے مولوی کے لفظ کی بے توقیری قطعاً مقصود نہیں۔ بھٹو کو پھانسی دینے والے لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس بھی اپنا نام مولوی مشتاق حسین ہی لکھے اور پکارے جانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور اسی زمانے میں انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر بھی خود کو مولوی محمد سعید لکھتے تھے۔ مجھے سعید اظہر صاحب مولوی کے لفظ کے ساتھ جچتے ہی نہیں تھے۔ میرا ان کے ساتھ پہلا تعارف نیلا گنبد انارکلی کے قریب موجود پندرہ روزہ گیت کے دفتر میں ہوا۔ سال 1975ء تھا اور رحمت علی رازی مجھے اس آفس میں اپنے ہمراہ لائے تھے جو یہاں بطور فیچر رائٹر کام کر رہے تھے۔ محمد سعید اظہر گیت کے ایڈیٹر تھے۔ بالکل سادہ سی شخصیت، گفتگو کا آغاز ہوا تو ان کی زبان میں تھوڑی سی لکنت آ گئی مگر انہوں نے اپنی اس کمزوری پر فوری قابو پایا اور پھر بڑے پُر مغز الفاظ کے ساتھ مجھے پیشۂ صحافت پر لیکچر دے ڈالا۔ میں اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں ایل ایل بی کا طالب علم تھا اور ساتھ ہی روزنامہ وفاق میں جز وقتی سب ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کر رہا تھا۔ رحمت علی رازی وہاں بھی بطور فیچر رائٹر ہی کام کرتے تھے جن کے ساتھ میری دوستی کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی چنانچہ وہ ''گیت'' کے آفس میں جاتے تو مجھے بھی ہمراہ لے جاتے۔ اس طرح سعید اظہر صاحب سے بھی میرا نیازمندی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتے کہ میں آپ کو مستقبل کے ایک بڑے صحافی کے طور پر دیکھ رہا ہوں۔ ان کی اس بات پر میری آنکھیں تعظیماً جھک جاتیں۔

فروری 1977ء میں میرا لاء گریجویشن کا رزلٹ آ گیا مگر میرا دل پیشۂ وکالت اختیار کرنے کی جانب مائل نہ ہوا اس لئے میں وفاق کے ساتھ ہی وابستہ رہا جس کے مالک و ایڈیٹر مصطفیٰ

صادق صاحب بہت دبنگ شخصیت کے مالک تھے۔ قاضی جمیل اطہر صاحب وفاق کے ایگزیکٹو ایڈیٹر تھے اور سنجیدہ شخصیت ہونے کے باوجود بذلہ سنجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پیشۂ صحافت میں ان کی حیثیت میرے پہلے استاد کی ہے جبکہ صحافی کارکنوں میں رحمت علی رازی میرے ابتدائی دوستوں میں شامل ہیں۔ انہی کے ناطے سعید اظہر صاحب سے تعلق خاطر قائم ہوا جو ان کے انتقال تک نیاز مندی کی حد میں رہتے ہوئے برقرار رہا۔

میں جولائی 1977ء میں روزنامہ آزاد کے ساتھ وابستہ ہو گیا جو تحریک استقلال کا ترجمان اخبار تھا۔ اس وقت پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) کی تحریک نظام مصطفیٰؐ عروج پر تھی جس کے دوران میں 23-مارچ 1977ء کو چوک لاہور ہائیکورٹ سے شروع ہونے والے ائر مارشل اصغر خاں کے جلوس میں پولیس کے ہتھے چڑھ کر خود بھی گرفتار ہو گیا۔ اصغر خاں پی این اے کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے اور میری پی این اے کے ساتھ اس وقت نظریاتی اور جذباتی ہم آہنگی تھی۔ اس وقت روزنامہ وفاق پی این اے کا واحد ترجمان اخبار تھا جس کی اشاعت عملاً لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ جب اصغر خاں نے اپنے پارٹی کے ترجمان اخبار کے طور پر روزنامہ آزاد کے حقوق حاصل کر کے اس کا از سر نو اجراء کیا تو اصغر خاں سے ذہنی ہم آہنگی ہونے کے ناطے میرے ذہن میں اس اخبار کو جوائن کرنے کا جنون پیدا ہو گیا۔ عباس اطہر صاحب اس کے ایڈیٹر تھے جن کی وفاق میں میرے سینئر کولیگ قربان انجم صاحب کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی چنانچہ میں ان سے عباس اطہر صاحب کے نام سفارشی مراسلہ لے کر آزاد کے دفتر آ گیا اور عباس اطہر صاحب نے اسی وقت میرے بطور ہائیکورٹ رپورٹر تقرر کے آرڈر جاری کرا دیئے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے آغاز کا وہ دور مارشل لاء مخالف سیاسی کارکنوں کے علاوہ پیشۂ صحافت کے لئے بھی بہت کٹھن دور تھا۔ بھٹو کے خلاف لاہور ہائیکورٹ کے پانچ رکنی فل بنچ میں نواب محمد احمد خاں کے قتل کے مقدمہ کی سماعت کا آغاز ہوا تو روزنامہ آزاد میں اس کی کوریج کی ذمہ داری بھی مجھ پر آن پڑی۔ اس کے ساتھ ساتھ عباس اطہر صاحب نے ادارتی صفحہ پر روزانہ کی بنیاد پر میرا کالم ''سرگوشیاں'' بھی شروع کرا دیا جس کا ''لوگو'' بطور خاص انہوں نے آزاد کے کارٹونسٹ خالد سعید بٹ سے تیار کرایا۔ یہ اخبار درحقیقت بھٹو مخالف جذبات کا ترجمان اخبار تھا اس لئے اس میں بھٹو کیس کی خبریں اور جھلکیاں بھی بھٹو کی کردار کشی کے تاثر پر مبنی ہوتیں جن کے ساتھ بھٹو کا چہرہ بگاڑ کر تیار کیا

گیا بھٹو کا خاکہ شائع کیا جاتا جو خالد سعید بٹ بڑی مہارت کے ساتھ تیار کیا کرتے تھے۔

یہ دلچسپ صورت حال تھی کہ آزاد کے ایڈیٹر عباس اطہر، نیوز ایڈیٹر مظفر الحسن، شفٹ انچارج اظہر زمان، صادق جعفری اور ایڈیٹوریل انچارج سہیل ظفر ذہناً ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کے حامی تھے مگر ''آزاد'' کی پالیسی کے مطابق وہ اس اخبار کے پلیٹ فارم پر بھٹو کی کردار کشی کی مہم چلا رہے تھے۔ بھٹو مرحوم نے کوٹ لکھپت جیل سے اپنے پر آشوب دور کے حوالے سے ایک کتابچہ IF I AM ASSESINATED (اگر مجھے قتل کیا گیا) لکھ کر کسی طریقے سے عباس اطہر کو بھجوادیا۔ انہوں نے مظفر الحسن کے پرنٹنگ پریس سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا جس کی تقسیم کے دوران مارشل لاء انتظامیہ کو اسکی بھنک پڑ گئی چنانچہ پرنٹنگ پریس پر مارشل لاء ٹیم کا چھاپہ پڑ گیا۔ شائع کئے گئے کتابچہ کی کاپیوں سمیت پرنٹنگ پریس ضبط کرلیا گیا اور عباس اطہر اور مظفر الحسن گرفتار کر لئے گئے جن کے خلاف غداری کا مقدمہ درج کر کے فوجی عدالت منتقل کر دیا گیا۔ عباس اطہر کی گرفتاری کے کوئی ایک ہفتے بعد سعید اظہر صاحب اخبار کے نئے ایڈیٹر مقرر ہو گئے چنانچہ میرا ان کے ساتھ تعلق خاطر اور بھی بڑھ گیا۔ کرنل مظفر اخبار کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے جو انڈس ہوٹل کے عقب میں موجود آبادی وکٹوریہ پارک کے ایک حویلی نما گھر میں مقیم تھے۔ سعید اظہر صاحب ایک قابل اعتماد ساتھی کی حیثیت میں مجھے ایڈیٹوریل میٹنگ کے لئے اپنے ساتھ ان کے گھر لے جایا کرتے۔ ہم دونوں آفتاب چیمبر میں ''آزاد'' کے دفتر سے نکلتے اور پیدل چلتے ہوئے کرنل مظفر کے گھر جاتے۔ سعید اظہر صاحب اکثر مجھے کہا کرتے کہ آپ کا اصل مقام نوائے وقت ہے۔ آپ وہاں جانے کی کوشش کریں۔ اس دوران وہ نوائے وقت کی صحافت کے حوالے سے اپنے تجربات بھی میرے ساتھ شیئر کرتے۔ بھٹو مرحوم کے ساتھ ان کی ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی عباس اطہر سے بھی زیادہ تھی چنانچہ انہوں نے اپنی ادارت میں بھٹو کی کردار کشی والے کارٹون شائع نہ ہونے دیئے۔ اسرار بخاری اس وقت نیوز ایڈیٹر تھے جنہوں نے عباس اطہر کی بنائی گئی اچھوتی ہیڈ لائنز کی طرح ضیاء حکومت کی مخالفت کا تاثر دینے والی ہیڈ لائنز لگانا شروع کر دیں جیسے ''اندھیرا پھیل گیا'' ''تاریکی چھا گئی'' عباس اطہر کا تو یہ کمال تھا کہ انہوں نے جسٹس کے ایم اے صمدانی کی عدالت سے بھٹو مرحوم کی ضمانت پر رہائی کی خبر پر صرف یک لفظی سرخی ''جا'' نکالی اور صحافتی حلقوں میں داد سمیٹی۔ اس کے برعکس اسرار بخاری صاحب کی نکالی گئی سرخیوں سے

اخبار کا زوال شروع ہو گیا اور آصف فصیح الدین وردگ ''آزاد'' کے مینجنگ ڈائریکٹر کا چارج سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد ہی ضیاء حکومت کے دباؤ پر اخبار وائنڈ اپ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سعید اظہر صاحب نے مجھے قائل کر کے نوائے وقت بھجوایا مجید نظامی صاحب نے میری درخواست پر مجھے ٹیسٹ کے لئے نیوز ایڈیٹر وحید قیصر کے پاس بھیج دیا جنہوں نے مجھے دیکھتے ہی ماتھے پر تیوڑیاں ڈالتے ہوئے یہ فقرہ چست کیا کہ آپ کبھی صحافی نہیں بن سکتے پھر انہوں نے اپنے اسی مائینڈ سیٹ کے باعث مجھے ٹیسٹ میں بھی فیل قرار دے دیا میں نے سعید اظہر صاحب کو روداد سنائی تو انہوں نے وحید قیصر صاحب کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ان پر تبرہ کسا اور مجھے ہمت نہ ہارنے کا درس دیا۔ میں نے آزاد کے بعد روزنامہ صداقت جوائن کر لیا اور وہاں سے پھر وفاق میں آ گیا۔ 1981ء میں روزنامہ جنگ کا لاہور سے اجراء ہوا تو وفاق کا پورا نیوز ڈیسک نیوز ایڈیٹر ایم ارشد، منصور حیدر اور میرے سمیت جنگ میں آ گیا اور اس اخبار کی پہلی ڈمی ہم نے ہی تیار کی۔ جنگ جوائین کرنے کے دس پندرہ روز بعد ہی مجھے نوائے وقت سے ٹیسٹ کے لئے بلاوا آ گیا۔ میں نے سعید اظہر صاحب کو آگاہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے جنگ کو خیر باد کہا اور ٹیسٹ دینے نوائے وقت آ گیا۔ اس بار محترم مجید نظامی نے نیویارک ٹائمز کا ایک مضمون مجھے ترجمہ کرنے کے لئے دیا اور اور توصیف احمد خاں صاحب کے پاس بھجوا دیا جنہوں نے میرے ترجمے کی بنیاد پر میرے بطور سب ایڈیٹر تقرر کی سفارش کی اور اس طرح نوائے وقت کے ساتھ وابستگی کا میرا خواب پورا ہو گیا جس کی مجھ سے بھی زیادہ سعید اظہر صاحب کو خوشی ہوئی۔ وہ جس کے ساتھ تعلق خاطر رکھتے، بے پناہ رکھتے تھے اور اپنے سے زیادہ ان کے مستقبل کے لئے فکر مند ہوتے تھے۔ کافی عرصے سے کینسر کے موذی مرض کا سامنا کر رہے تھے اور بالآخر انہوں نے اس موذی مرض کا مقابلہ کرتے کرتے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ وہ بلاشبہ بہت بلند پایہ صحافی تھے مگر اپنی سادہ مزاجی کے باعث تنگدستی کی زندگی گزاری اور اسی پر قناعت کئے رکھی۔ انہوں نے کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی اپنے نظریۂ انسانیت کو کبھی کمزور نہ ہونے دیا ''ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم''۔ واہ سعید اظہر واہ:

جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ڈاکٹر مبشر حسن اور یادوں کے کھلتے در

میں ڈاکٹر مبشر حسن کی وفات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے ناگہانی وفات تو ہرگز نہیں کہوں گا، ماشاءاللہ 98 برس تک بھرپور زندگی جئے اور اپنے ڈھب کی زندگی جئے۔ 2 سال اور جی لیتے تو زندگی کی سنچری مکمل کر لیتے مگر موت کا جو وقت متعین ہے اور دست قدرت میں ہے، اسے کوئی لحہ بھر کیلئے بھی نہیں ٹال سکتا۔ آج کرونا وائرس کی شوراشوری میں زندگیاں بچانے کے جتن ہو رہے ہیں اور پوری دنیا پر ہو کا عالم طاری ہے۔ کاروبار حیات اور کارزار حیات سب کچھ ٹھپ ہے، لوگوں نے اپنے آپ کو خود ہی ایک دوسرے کیلئے شودر بنا لیا ہے۔ ایک درسرے کے سائے سے بھی ڈر رہے ہیں۔ بس ایک ہی فکر میں غلطاں ہیں کہ کہیں کرونا وائرس کے چپکنے سے وہ مر نہ جائیں مگر قدرت نے جتنی زندگی کسی کی متعین کر رکھی ہے، وہ کرونا وائرس سے یا کسی اور بہانے سے مر ہی رہے ہیں۔ بس یہی زندگی کی تلخ حقیقت ہے کہ اسے ہر صورت ختم ہونا ہے۔

زندگی تیرے تعاقب میں لوگ
اتنا چلتے ہیں کہ مر جاتے ہیں

کوئی یادگار زندگی گزارتے ہیں اور اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے بھی بلاشبہ یادگار زندگی گزاری اور صاحب اختیار و استطاعت ہونے کے باوجود اپنے اصولوں پر جئے۔ انجینئرنگ کی خشک تعلیم نے انہیں سماجی مساوات کا راستہ دکھایا اور وہ پروفیسری سے وزارت وسیاست تک اسی راستے پر گامزن رہے جس کے دوران انہوں نے شاہراہ انقلاب کشید کی۔ شاید ذوالفقار علی بھٹو انہیں سماجی مساوات کا استعارہ نظر آئے تھے، اس لئے ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیا۔ ان کے نئے سیاسی سفر کیلئے دامے درمے سخنے ان کے ساتھ چل دیئے اور اپنے گھر

گلبرگ لاہور میں بھٹو صاحب اور اپنے نظریاتی ساتھیوں کو مدعو کر کے 30 اکتوبر 1967ء کو نظریاتی فیتہ لگا کر اور سماجی مساوات کا اینٹ گارا جوڑ کر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ اپنے لئے لاہور کی سیکرٹری جنرل شپ قبول کی اور بھٹو صاحب کے سر پر چیئرمین شپ کا تاج رکھ دیا۔ جے اے رحیم اس پارٹی کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے۔ ان سے بھٹو صاحب کے اختلافات ہوئے تو سیکرٹری جنرل کا منصب ڈاکٹر مبشر حسن کے پاس آ گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی بھی سماجی مساوات کے تصور کے مطابق بسر کی اور پارٹی کو بھی سماجی مساوات کے اصولوں پر چلایا۔ 1970ء کے انتخابات پر وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر لاہور کے مزدوروں والے حلقے سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ان انتخابات کی بنیاد پر پیپلز پارٹی پہلی بار اقتدار میں آئی تو ڈاکٹر مبشر حسن وفاقی وزیر خزانہ کے طور پر پیپلز پارٹی کی حکومتی ٹیم میں شامل ہوئے مگر بھٹو صاحب کو سماجی مساوات کے راستے سے ڈگمگاتا دیکھا تو 1974ء میں حکومت کے عین عروج میں وزارت چھوڑ کر گھر واپس آ گئے اور پھر سیکرٹری جنرل کی حیثیت پر پارٹی کے تنظیمی معاملات کی درستی پر جت گئے۔ 1977ء میں جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں بھٹو صاحب کی حکومت ٹوپل ہوئی تو ڈاکٹر مبشر حسن کو بھی طویل قید و بند کاٹنا پڑی۔

ڈاکٹر صاحب سے میری یاد اللہ ضیاء آمریت کے دوران تشکیل پانے والے اپوزیشن اتحاد ایم آر ڈی کی بطور بیٹ رپورٹر کوریج کرتے ہوئے شروع ہوئی اور پھر ان کے ساتھ انسانیت کا سلسلہ جڑ گیا۔ ان کا اصول تھا کہ وہ پریس کانفرنس کیلئے صحافیوں کو مدعو کرتے تو چائے اور بسکٹوں کی دو پلیٹیں پہلے ہی رکھوا دیتے اور عین مقررہ وقت پر پریس کانفرنس کا آغاز کر دیتے، چنانچہ بعد میں آنے والے صحافی چائے اور بسکٹ سے بھی محروم رہ جاتے اور یہی ان کیلئے ڈاکٹر صاحب کی جانب سے وقت کی پابندی کا سبق ہوتا۔ مجھے آج تک اس فلسفے کی سمجھ نہیں آ سکی کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ اتنی طویل نظریاتی وابستگی اور اس پارٹی کا بنیادی رکن ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے نئے سیاسی سفر کیلئے غنویٰ بھٹو کے ہاتھ پر کیوں بیعت کر لی اور میر مرتضیٰ بھٹو کے ستمبر 1996ء میں قتل کے بعد انہوں نے پیپلز پارٹی کے اندر سے غنویٰ بھٹو کے ہاتھوں کیوں پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ

(پیپلز پارٹی ایس بی) کا ڈھانچہ کھڑا کرایا۔ اس راز درون خانہ کا یقیناً ان کے نظریاتی ساتھی فرخ سہیل گوئندی کو علم ہوگا۔ وہ پیپلز پارٹی (ایس بی) کے بھی سیکرٹری جنرل بنے اور پھر انہوں نے راستہ نہیں بدلا۔ سیاست میں غیر فعال ضرور ہوئے مگر وابستہ غنویٰ بھٹو کے ساتھ ہی رہے۔

آج ان کی یادیں ذہن کے پردے پر امڈ آئی ہیں تو مجھے میر مرتضیٰ بھٹو کی پہلی برسی کے موقع پر صحافتی لیجنڈ عباس اطہر مرحوم کے ساتھ پڑا گھمسان کا قلمی رن بھی یاد آ گیا ہے۔ برسی کی اس تقریب میں لاہور سے صحافی برادری کی شرکت اور نوڈیرو لے جانے کیلئے ڈاکٹر مبشر حسن اور فرخ سہیل گوئندی نے میرے اور حامد میر کے نام قرعہ فال نکالا۔ چنانچہ ہم 4 افراد ڈاکٹر مبشر حسن، فرخ سہیل گوئندی، حامد میر اور میں نے رخت سفر باندھا۔ لاہور سے پی آئی اے کی پرواز کے ذریعے سکھر پہنچے اور وہاں سے ایک عام مسافر ویگن کے ذریعے لاڑکانہ آئے جہاں ایک عام سے ہوٹل میں ہم 4 افراد کیلئے 2 کمرے بک تھے۔ ایک کمرے میں میں اور حامد میر اور دوسرے میں ڈاکٹر مبشر حسن اور فرخ سہیل گوئندی ٹھہرے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کی برسی کا اہتمام نوڈیرو میں بھٹو مرحوم کی قبر سے ملحقہ ان کی قبر پر وسیع انتظامات کے ساتھ کیا گیا تھا۔ برسی کے اس اجتماع میں جوش وخروش کے ساتھ 15 سے 20 ہزار افراد شریک ہوئے تھے جن میں پیپلز پارٹی (ایس بی) کے علاوہ پیپلز پارٹی کے کارکن بھی شامل تھے۔ مجھے اس تقریب کے جوش وولولہ سے پیپلز پارٹی (ایس بی) کی بنیاد مضبوط ہوتی نظر آئی جس کے حوالے سے میں نے ڈاکٹر مبشر حسن کو بھی خاصا پرجوش پایا۔ اگلے روز ہمیں غنویٰ بھٹو المرتضیٰ لاڑکانہ میں لے آئیں جو اب انہی کی تحویل میں تھا۔ غنویٰ بھٹو کی ہونہار بیٹی فاطمہ بھٹو سے بھی ہماری وہیں پر ملاقات ہوئی۔ غنویٰ بھٹو نے ہمیں ایک ایک کونے اور ایک ایک کمرے میں لے جا کر ان کی تفصیلات بتائیں جن میں بھٹو مرحوم اور ان کے بیٹوں، بیٹیوں بینظیر بھٹو، صنم بھٹو، مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کیلئے مخصوص بیڈ روم بھی شامل تھے۔ یہیں پر ہمیں فاطمہ بھٹو کی انگریزی شاعری سننے کا بھی موقع ملا اور میں نے فی البدیہہ تبصرہ کیا کہ یہ سیاست میں متحرک ہوں تو اپنی پھوپھو بینظیر بھٹو کے پائے کی سیاستدان بن سکتی ہیں۔ لاہور واپس آ کر مرتضیٰ بھٹو کی پہلی برسی کی تقریب اور غنویٰ و فاطمہ کی اپنے ساتھ ہونے والی بات چیت پر اپنے

تاثرات پر مبنی کالم لکھ کر مجید نظامی صاحب کو بھجوا دیا۔ عباس اطہر صاحب اس وقت نوائے وقت کے ڈپٹی ایڈیٹر (نیوز) تھے۔ جب کالم نظامی صاحب سے اپرود ہو کر عباس اطہر صاحب کے پاس آیا تو انہوں پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنے ''رومانٹسزم'' کی بنیاد پر اس کالم کے ذریعے پیپلز پارٹی کی صفوں میں نقب لگتی ہوئی محسوس کی، چنانچہ انہوں نے یہ کالم روک لیا اور مجید نظامی صاحب سے بات کر کے اس کالم کے مندرجات کو ایک خبر کی صورت میں میری کریڈٹ لائن کے ساتھ شائع کر دیا اور پھر اس خبر کی بنیاد پر اگلے روز میرے خلاف کالم لکھ مارا جس میں انہوں نے روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والی حامد میر کی خبر کو فوکس کر کے مجھ پر پھبتی کسی کہ پیپلز پارٹی (ایس بی) کے لاڑکانہ نوڈیرو والے جلسے میں جو جوش و خروش سعید آسی کو نظر آیا ہے وہ حامد میر کو کیوں نظر نہیں آیا۔ عباس اطہر صاحب کے اس کالم کا لب لباب مجھے پیپلز پارٹی کا نظریاتی دشمن ظاہر کرنا تھا۔ ظاہر ہے کالم اور خبر میں نمایاں فرق ہوتا ہے کیونکہ خبر میں واقعات کی من و عن عکاسی کی جاتی اور کالم میں لکھنے والے کی کسی واقعہ پر اپنی سوچ بھی شامل ہوتی ہے۔ عباس اطہر صاحب نے صحافتی اصولوں اور اخلاقیات کے تقاضوں کے منافی ایک تو میرے کالم کو خبر کی صورت میں شائع کیا اور پھر اس خبر کی بنیاد پر اپنے کالم میں مجھ پر پیپلز پارٹی کا مخالف ہونے کا لیبل لگا دیا جبکہ پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کا ''رومانٹسزم'' کی جھلک میں 1977ء میں تحریک استقلال کی جانب سے نکالے گئے ان کی ادارت میں روزنامہ آزاد میں دیکھ چکا تھا جس میں بھٹو کیس کی کوریج کے دوران وہ کارٹونسٹ خالد سعید بٹ سے بھٹو مرحوم کی بگاڑی ہوئی شکل کے کیری کیچر بنواتے اور بھٹو کیس میں فائل ہونے والی میری خبروں کے ساتھ لگوانے کا بطور خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عباس اطہر صاحب کے کالم کے جواب میں میں نے بھی کالم لکھ دیا جو مجید نظامی صاحب کی منظوری کے ساتھ شائع ہو گیا۔ اس پر صحافتی حلقوں میں بھونچال کی کیفیت پیدا ہو گئی اور دوسرے اخبارات میں بھی اس جواب الجواب پر حاشیہ آرائی ہونے لگی۔ عباس اطہر صاحب نے میرے کالم کے جواب میں پھر کالم لکھ دیا جس میں وہ ذاتیات کی حد کو پہنچتے نظر آئے، چنانچہ مجھے ان کے اس کالم پر بھی بادل نخواستہ جوابی کالم لکھنا پڑا۔ اس پر عباس اطہر صاحب پیچ و تاب کھاتے اگلا جوابی کالم لکھنے کی تیاری

کرر ہے تھے کہ مجید نظامی صاحب نے چٹ بھجوا کر ہم دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف مزید کالم لکھنے سے روک دیا اور عباس اطہر صاحب نے میرے خلاف مزید کلام نہ لکھ پانے کی حسرت اپنے دل میں بٹھائے رکھی۔ان کا بے شک میرے استاد کا مقام تھا اور میں ادب آداب کا ہمیشہ قائل رہا ہوں مگر

چپ رہیں گے حیا سے وہ کب تک
غصہ الزام سے تو آئے گا

کے مصداق عباس اطہر صاحب نے مجھے زچ کیا تو مجبوراً مجھے بھی جواب دینا پڑا جس پر ڈاکٹر مبشر حسن بھی جواب الجواب کے پس منظر کی بنیاد پر خاصے محظوظ ہوئے۔ڈاکٹر مبشر حسن سے وابستہ یادوں کے حوالے سے یہ بھی محض ایک یاد تھی جس کا تذکرہ ہو گیا ہے ورنہ عباس اطہر صاحب ہمیشہ میرے محترم رہے ہیں اور ان کی پیشہ صحافت میں کارکن نوازی کا بھی میں ہمیشہ قائل رہا ہوں جس طرح میں ڈاکٹر مبشر حسن کی انسانیت دوستی کا قائل ہوں۔ان کے حوالے سے امڈی ہوئی یادیں تو بے شمار ہیں مگر سب کا ایک کالم میں احاطہ ممکن نہیں۔فی الوقت اس شعر پر ہی اکتفا کرتا ہوں کہ

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

مجید نظامی اور میری نیاز مندی

وہ لمحہ آج بھی میری آنکھوں کے آگے گھوم رہا ہے۔ الحمراء ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، محترم مجید نظامی رونق محفل تھے۔ نوائے وقت میں ان کی ادارت کے 50 سال مکمل ہونے پر ان کی پذیرائی کی جا رہی تھی۔ ہر مقرر فرط جذبات میں ڈوب کر ان کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ مادر وطن کی نظریاتی اساس کے تحفظ کیلئے ان کی بے پایاں خدمات اور میدان صحافت میں ان کی جرأت و بے باکی کے تذکرے جاری تھے اور محترم مجید نظامی کے چہرے کی دمک ان کی رعنائی خیال کی گواہی دے رہی تھی۔ ہر جید مقرر ان کی درازی عمر کیلئے دعا گو تھا۔ میں نے اسی تقریب میں انہیں امام صحافت کا خطاب دیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ مسلسل 3 گھنٹے تک جاری رہنے والی اس باوقار تقریب میں مجید نظامی بلا تکان شریک محفل رہے اور کسی ایک بھی لمحے ان کے چہرے پر ضعیف العمری والا تاثر اجاگر نہ ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے وہ اپنے تاثرات کے اظہار کیلئے ڈائس پر آئے تو ان پر نچھاور ہوئی پھولوں کی پتیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ پھول درحقیقت ان کی قدم بوسی کر رہے تھے۔ سٹیج پر بیٹھی شخصیات میں سے کسی نے بلند آہنگ کے ساتھ ان کیلئے دعا کی کہ اللہ انہیں کرسی ادارت پر اپنی عمر کی کم از کم ایک سنچری مکمل کرنے کا ضرور موقع عطاء فرمائے۔ مجید نظامی اس دعا پر زیر لب مسکرائے اور پھر سٹیج پر براجمان اپنے دیرینہ دوست کرنل سید امجد حسین کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوئے کہ میری جتنی بھی باقی عمر ہے، میری تمنا ہے کہ ان جیسی صحت کے ساتھ بسر ہو۔ سید امجد حسین اس وقت اپنی عمر کے 90 سال عبور کر چکے تھے اور ان کی جسمانی و دماغی صحت پر پیرانہ سالی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے مگر اللہ نے انہیں بھی اپنی عمر کی سنچری مکمل کرنے کی مہلت نہ دی اور وہ اس تقریب کے چند سال بعد ہی اپنی زندہ دلی کے ساتھ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

نوائے وقت میں میرے تقریباً 33 برس محترم مجید نظامی کے ساتھ نیاز مندی اور عقیدت مندی میں گزرے، وہ پیشہ صحافت میں فی الواقع میرے آئیڈیل تھے۔ اس لئے 1981ء میں نوائے وقت کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد میں نے پیشہ صحافت میں اسی کے ساتھ اپنے پڑاؤ کا پورا عرصہ بسر کرنے کا عزم باندھ لیا۔ اس دوران میرے لئے کئی کٹھن مراحل بھی آئے مگر میں نے محترم مجید نظامی کے ساتھ اپنی عقیدت میں کبھی ہلکی سی بھی کمی پیدا نہ ہونے دی۔ میں نے ان کی موجودگی میں عہد کیا کہ جس دن مجھے نوائے وقت کو خیر باد کہنا پڑا، وہ دن نوائے وقت میں ہی نہیں۔ پیشہ صحافت میں بھی میرا آخری دن ہوگا۔ میں آج بھی اس عہد پر کار بند ہوں۔ اس پیشہ پیغمبری میں کلمہ حق ادا کرتے رہنے کی جو درخشاں روایت محترم مجید نظامی نے قائم کی، نوائے وقت گروپ آج بھی اسی بنیاد پر ثابت قدمی سے کھڑا ہے اور محترمہ رمیزہ نظامی نے قوم میں پاکستانیت کا جذبہ مضبوط بنانے والی ان کی پالیسی کو کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی کبھی کمپرومائز نہیں ہونے دیا۔ وہ آخری لمحے تک باوقار ادارت کے تندہی کے ساتھ فرائض سرانجام دیتے ہوئے 26 جولائی 2014ء کو لیلۃ القدر کی برکتیں سمیٹتے ہوئے اپنے خالق حقیقی کو جا ملے اور اپنی بھرپور زندگی کو یادگار اور دوسروں کیلئے مثال بنا گئے۔ آج 3 اپریل ان کی سالگرہ کا دن ہے، وہ حیات ہوتے تو آج 92 برس کے ہوتے اور اپنی تمنا کے مطابق اپنے رفیق کرنل سید امجد حسین جیسی قابل رشک صحت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ انہوں نے بطور مسلمان، بطور پاکستانی اور بطور انسان جن زریں اصولوں اور اقدار کی آبیاری کی وہ بلاشبہ انہیں رہتی دنیا تک زندہ جاوید رکھیں گی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اپنائیت اور ادب و احترام کے ایسے جذبے سے ملتے تھے کہ اسے اپنے ساتھ ان کے خصوصی تعلق خاطر کا گمان ہونے لگتا تھا۔ نوائے وقت گروپ کو انہوں نے عملاً اپنے گھر اور اس کے ساتھ وابستہ ہر کارکن کو اپنے خاندان کے فرد کا درجہ دیا اور بلا تامل ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے رہے۔ وہ حق بات پر اپنے کارکن کے ساتھ ہی ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس حوالے سے میری ہڈبیتیاں بھی یادگار ہیں۔ میں نے 1986ء میں اے این پی کے سربراہ خان عبدالولی خان کے گاندھی خاندان کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے ایک کالم لکھا، جس کی اشاعت کے بعد ولی خان نے پشاور کی سول کورٹ میں نوائے وقت کے خلاف 10 کروڑ روپے کا ہرجانے کا دعویٰ دائر

کر دیا۔ یہ اس وقت ہماری صحافت کی تاریخ میں سب سے بڑی رقم والا ہرجانے کا دعویٰ تھا۔ عدالتی نوٹس موصول ہونے کے بعد نظامی صاحب نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ آپ نے ولی خان کے بارے میں کوئی غلط بات لکھی ہوتی تو میں معافی نامہ چھاپ کر ان سے گلوخلاصی کرا لیتا مگر آپ نے کالم میں اصل حقائق کو اجاگر کیا ہے، اس لئے میں نے ولی خان کے اس دعوے کو کورٹ آف لاء میں کونٹسٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب آپ نے بھی ثابت قدم ہی رہنا ہے پھر وہ اس کیس میں چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ پشاور کی سول کورٹ چونکہ ولی خان کے زیر اثر تھی، اس لئے اس نے نوائے وقت کے خلاف ڈگری جاری کر دی اور پھر نوائے وقت کی اپیل پر پشاور کی سیشن کورٹ نے بھی سول کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھا مگر مجال ہے محترم مجید نظامی کے چہرے پر کبھی تشویش کے آثار پیدا ہوئے ہوں یا انہوں نے کبھی میرے ساتھ خفگی کا اظہار کیا ہو کہ آپ نے ہمیں کہاں الجھا دیا ہے۔ انہوں نے پشاور ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی جہاں ولی خان ہی محترم مجید نظامی کے ساتھ مفاہمت کرنے اور اپنے کیس سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اپنے کارکنوں کی حق بات پر ان کے ساتھ کھڑا ہونے کی ایسی ہی شاندار مثال انہوں نے لاہور ہائیکورٹ میں بھی قائم کی۔ جب غلام مصطفیٰ جتوئی کی نگران حکومت کے دور میں صدر کے اسمبلی توڑنے والے صوابدیدی اختیار کے خلاف دائر رٹ درخواست کی عدالتی کارروائی کی رپورٹنگ کے حوالے سے چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ محمد رفیق تارڑ کی سربراہی میں عدالت عالیہ کے 5 رکنی فل بنچ نے نوائے وقت، جنگ اور ڈان سمیت 6 قومی اخبارات کے مدیران، پرنٹر، پبلشرز اور میرے سمیت متعلقہ رپورٹروں کو توہین عدالت کے نوٹس جاری کئے۔ مجید نظامی صاحب میرے ساتھ خود عدالت میں پیش ہو گئے۔ دوسرے تمام اخبارات کے مدیران عدالت سے غیر مشروط معافی مانگنے پر آمادہ تھے مگر محترم مجید نظامی ڈٹ گئے اور انہوں نے فاضل عدالت سے بے باک انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے ایسا جاندار فقرہ ادا کیا کہ عدالت کو چیف جسٹس کے ریٹائرنگ روم میں ایک گھنٹہ سوچ بچار کے بعد اپنا نوٹس واپس لینا پڑا۔ اسی طرح ''امن کی آشا'' کے حوالے سے نوائے وقت میں شائع ہونے والے میرے ایک کالم پر جنگ کے ایڈیٹر انچیف میر شکیل الرحمٰن نے بھی نوائے وقت کے خلاف کراچی کی عدالت میں کروڑوں روپے کا ہرجانے کا دعویٰ دائر کیا جو محترم مجید نظامی نے کونٹسٹ کیا

اور ''امن کی آشا'' کے خلاف اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ آج کل اراضی کے جس کیس میں میر شکیل الرحمٰن نیب کے شکنجے میں ہیں، اس کے بارے میں بھی نوائے وقت میں اس اراضی کی خریداری کے وقت ایک خبر شائع ہونے پر میر شکیل الرحمٰن نے نوائے وقت کو ہرجانے کا نوٹس بھجوایا۔ محترم مجید نظامی نے ادارے کے قانونی مشیروں سے مشاورت کے بعد مجھ سے بھی رائے طلب کی اور کیس کی فائل میرے حوالے کر دی۔ میں نے اس فائل کی مکمل چھان بین کے بعد محترم مجید نظامی کو تحریری طور پر عرض گزاری کہ اس کیس میں میر شکیل الرحمٰن کے خلاف حکومت سے رعایت لینے کا الزام ثابت نہیں ہو سکے گا، اس لئے بہتر ہوگا کہ متعلقہ خبر کی اشاعت پر معذرت کر لی جائے۔ محترم مجید نظامی نے میری رائے پر صاد کیا اور ادارے کے قانونی مشیروں کی رائے کے برعکس متذکرہ خبر کی اشاعت پر نوائے وقت میں ''اعتذار'' شائع کر دیا۔ ان کے اصولوں پر ڈٹے رہنے اور سچ کو سچ تسلیم کرنے کے بے شمار واقعات آج مجھے بے ساختہ یاد آ رہے ہیں۔ وہ اپنی سالگرہ منانے سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے مگر نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے سیکرٹری شاہد رشید نے ان کی سالگرہ کی تقریب کا اہتمام شروع کر دیا اور انہیں یہ کہہ کر اس تقریب میں شریک ہونے پر بھی قائل کر لیا کہ بانیان پاکستان علامہ اقبال اور قائداعظم کی سالگرہ بھی تزک و احتشام کے ساتھ ہی منائی جاتی ہے۔ آپ بھی قومی مشاہیر میں شامل ہیں، اس لئے عوام کو آپ کے جنم دن کا بھی علم ہونا چاہئے۔ 3 اپریل 2014ء کو اپنی وفات سے صرف تین ماہ قبل وہ نظریہ پاکستان ٹرسٹ میں منعقدہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں بھرپور انداز میں شریک ہوئے اور اس تقریب کو یادگار بنا گئے۔ آج کرونا وائرس کے پیدا کردہ سنگین حالات کے باعث بھرپور تقریب کی صورت میں ان کی سالگرہ کا اہتمام نہیں ہو رہا مگر ان کی دلوں کو منور کرنے والی یادیں ہمیشہ تازہ رہیں گی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

نوائے وقت کے 81 سال

بے باک اور نظریاتی صحافت کے علمبردار نوائے وقت کے آبرومندی والے صحافتی سفر کے 81 سال مکمل ہوئے ہیں اور آج 23- مارچ کو ملک کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ و امین اس اخبار نے اپنے سفر کے 82 ویں سال میں قدم رکھا ہے تو اس کی ہم سفری میں گزرے میرے 40 سال بھی میرے لئے استقامت اور فخر و انبساط کا باعث بنے نظر آ رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی حجاب نہیں کہ نوائے وقت میرا شعور، میرا وجدان، میرا مان، میرا ارمان اور میرا خاندان ہے۔ اپنے صحافتی سفر کے اب تک 46 برس میں سے 40 برس نوائے وقت کے تناور درخت کے سائے میں گزر گئے، کتنی آندھیاں گزریں، کتنے تھپیڑے آئے، کتنے جھکڑ چلے، کتنی مارا ماری ہوئی، کتنی آہ وزاری ہوئی، عزم ٹوٹا نہیں، ساتھ چھوٹا نہیں، نظریے کو مارنے کی تمنا رکھنے والوں نے سو جتن کئے، اصول کو بے اصولی میں ڈھالنے والوں نے لاکھ ترغیبات دیں، نوائے وقت کے پائے استقلال میں کوئی لغزش پیدا نہ کر سکا۔ میرا یہ خاندان باوقار رہا۔ اس کا بھرم برقرار رہا۔ کیوں؟ اس لئے کہ خاندان کی سربراہی زمانے کی اونچ نیچ میں عزت و وقار کے ساتھ سر اٹھا کر چلنے اور اپنے خاندان کی آبرومندی قائم و برقرار رکھنے کی خداداد صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔ اس لئے کہ قائداعظم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تحریک پاکستان کے نامور کارکن اور طالب علم رہنما حمید نظامی نے 23. مارچ 1940ء کو جس جذبے کے ساتھ پاکستان کا ترجمان اخبار نکالنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور صحافتی اقدار اور اصولوں کی جو راہیں متعین کی تھیں، مرتے دم تک وہ خود بھی اس پر کاربند رہے اور پھر اس خاندان کی سربراہی کی ذمہ داری اپنے باوقار برادر خورد مجید نظامی کو سونپتے ہوئے اپنی متعین کردہ صحافتی اقدار اور اصولوں کو بھی بطور ورثہ انہیں منتقل کر دیا۔ 25 فروری 1962ء سے 26. جولائی

2014ء کو اپنی وفات کے دن تک جناب مجید نظامی نے جس جذبے، جس لگن اور جس دیانت کے ساتھ اپنے برادر بزرگ کے ودیعت کردہ ورثے کی حفاظت کی، اسے پروان چڑھایا، مستحکم بنایا اور پھر اس کے ساتھ وابستہ اپنے خاندان، ہی نہیں، ملک وملت کیلئے بھی اسے ایک تناور شجر سایہ دار بنایا، یہ انہی کا کارنامہ ہے۔ مسابقت کی دوڑ میں اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے، جھکڑوں، طوفانوں کا سامنا اور مقابلہ کرتے ہوئے سرخروئی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھنا کوئی معمول کی اور معمولی بات نہیں۔ انہی کے دیئے ہوئے عزم نے ان کی بیٹی رمیزہ مجید نظامی کے دل میں بھی اس عزت وآبرو والے صحافتی سفر کو مزید مضبوط اور مزید مربوط بنانے کی لگن پیدا کی چنانچہ نوائے وقت گروپ کا باوقار صحافتی سفر آج بھی اسی آن، بان، شان سے جاری وساری ہے اور ملک کے سرکشوں اور نظریاتی دشمنوں کے سینوں پر مونگ دلتا رہے گا۔

آج اس جہدِ مسلسل والے کٹھن سفر کے 81 سال پورے ہوئے ہیں تو اپنی ہم سفری کے 40 سال کا جائزہ لیتے ہوئے میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ میں جو سوچ کر میدان صحافت میں آیا تھا، نوائے وقت کے شریکِ سفر نہ ہوتا تو اصولوں کی پاسداری کا شعور، شعار اور چلن کبھی نہ سیکھ پاتا اور اس خاندانِ نوائے وقت کی سربراہی جناب مجید نظامی کے پاس نہ ہوتی تو اصولوں کی پاسداری کہیں ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہی ہوتی۔

طالب علمی کے زمانے میں ہی ادب وصحافت کی خدمت کا کیڑا دماغ میں سما گیا تھا۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال سے گریجویشن کے بعد 1974ء میں لاہور آیا اور والد مرحوم کی خواہش کے مطابق وکالت کیلئے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لے لیا تو بھی ادب وصحافت کی خدمت کا جذبہ ماند نہ پڑا۔ 1975ء میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ روزنامہ وفاق میں بطور سب ایڈیٹر کام کرنیکا موقع بھی مل گیا۔ وفاق کا دفتر مال روڈ کی شاہ دین بلڈنگ میں قائم تھا جہاں پہلے نوائے وقت کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اولین خواہش نوائے وقت کے پلیٹ فارم پر ہی ادب و صحافت کی خدمت کرنے کی تھی چنانچہ شاہ دین بلڈنگ میں روزنامہ وفاق میں کام کرنے کا موقع ملا تو یہ سوچ کر ہی دل کی تسکین کا اہتمام ہو گیا کہ اس بلڈنگ میں میرا صحافتی آئیڈیل نوائے وقت بھی

آسمان صحافت پر جگمگاتا رہا ہے۔ اسی عرصے کے دوران ایک رات خواب ہی خواب میں خود کو نوائے وقت کا کالم نگار پایا۔ صبح اٹھا تو حوصلہ مندی اور عزم سے سرشار تھا۔ 1977ء میں نوائے وقت میں شمولیت کی اولین کوشش ناکام ہوگئی کہ بشیر احمد ارشد صاحب جو ہفت روزہ استقلال کی ایڈیٹری سے ہوتے ہوئے نوائے وقت کے ڈپٹی ایڈیٹر کے منصب پر فائز ہوئے تھے، وفاق میں میرے ساتھ بزرگانہ شفقت کے باوجود نوائے وقت میں شمولیت کیلئے میرے کچھ کام نہ آ سکے اور پھر 1977ء ہی میں پی این اے کی تحریک کے دوران تحریک استقلال کے ترجمان کے طور پر دوبارہ جنم لینے والے روزنامہ آزاد نے مجھے ہائیکورٹ رپورٹر کے ساتھ ساتھ کالم نگار بھی بنا دیا چنانچہ میرا کالم نگار بننے کا خواب 1977ء میں ہی پورا ہوگیا اور وہ بھی ادارتی صفحے پر لیڈنگ کالم نگار کی حیثیت سے۔ "آزاد" سے "صداقت"۔ پھر وفاق میں واپسی اور پھر 1981ء میں جنگ کے لاہور سے اجراء کے ساتھ ہی ایم ارشد کی قیادت میں وفاق نیوز ڈیسک کی پوری ٹیم کے ساتھ جنگ سے وابستگی تک صحافتی سفر کے چھ سال بیت گئے۔ نوائے وقت میں پہلے ہی درخواست گزاری ہوئی تھی۔ جنگ سے وابستگی کے دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ نوائے وقت سے تحریری بلاوا آ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے بھٹکتے راہی کو منزل مل گئی ہو۔ کنواں خود ہی پیاسے کے پاس آ گیا ہو۔ فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ اپنا استعفیٰ نیوز ایڈیٹر ایم ارشد کے حوالے کیا اور علامہ اقبال روڈ پر عارضی طور پر قائم کئے گئے جنگ کے دفتر سے باہر نکل کر سیدھا نوائے وقت کے آفس میں آ کر دم لیا۔ 6 ستمبر 1981ء کا وہ دن اور آج 23 مارچ 2021ء کا دن میرے اس عزم کی صداقت کی گواہی دے رہا ہے جو میں نے نوائے وقت کی ہمسفری میں ادب وصحافت کی خدمت کیلئے باندھا تھا۔ دل میں یہی طے کیا تھا کہ صحافت کرنی ہے تو صرف نوائے وقت کے ساتھ۔ خداوند کریم کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ مجھے اپنے اس عہد کے ساتھ کھڑے رہنے کی استقامت دیئے رکھے۔ صحافت کے اس خاندان کے ساتھ وابستہ رہ کر مجھے جو عزت ملی ہے۔ وہی میری زندگی کا اصل اثاثہ ہے اور آج کا دن میرے لئے فخر وسربلندی کا پیغام ہے کہ عظمت وعزیمت کی علامت نوائے وقت کے 82ویں سال کے سفر میں مجھے بھی 40 سالہ ہمسفری کا اعزاز حاصل ہوگیا ہے۔

ان 40 برسوں پر محیط یادیں اتنی ڈھیر ساری ہیں کہ سمٹنے کیلئے چند صفحات کا نہیں، پوری ایک کتاب کا تقاضہ کر رہی ہیں۔ بشرط زندگی یہ تقاضہ بھی ضرور پورا کروں گا۔ فی الحال صرف یہ گواہی دے رہا ہوں کہ دنیائے صحافت میں جناب مجید نظامی کے پائے کا کوئی صحافی کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ صحافتی امپائر کے مالک ہی نہیں، ایک مکمل اور بھرپور ایڈیٹر بھی تھے۔ اصولوں کے پاسدار ہی نہیں، اپنے ساتھ وابستہ خاندان کی کفالت کیلئے کاروباری اسرار و رموز سے بھی مکمل آگاہ رہے۔ وہ فی الواقع آبروئے صحافت اور امام صحافت تھے۔ قول کے پکے اور ملک وملت کے ساتھ خالص اور سچے۔ اپنے کام کے ساتھ ان کے اخلاص اور ذمہ دارانہ استواری کا اندازہ اس سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ اپنی عمرِ عزیز کی آٹھ دہائیاں گزار کر بھی، دل کے تین بائی پاس کرا کر بھی اور ملک وقوم کے استحکام و بقاء کیلئے مسلسل فکرمندی سے دوچار رہ کر بھی وہ باغ میں کھلے، خوشبو دیتے پھول کی طرح تروتازہ رہے۔ کبھی تکان کا احساس نہ ہونے دیا۔ نوائے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھوں سے لگائے پودوں نیشن، ندائے ملت، فیملی، پھول اور وقت نیوز کی بھی ہمہ وقت پرورش و نگرانی کرتے رہے اور انہیں تناور درخت بنایا۔ اپنی امپائر کے کسی ادارے کی کوئی خامی ان سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے ان کی نگرانی میں اصلاح کا عمل بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔

نوائے وقت کے ادارتی اور نیوز کے صفحات پر شائع ہونے والے اکثر مضامین اور کالموں کی وہ روزانہ خود ایڈیٹنگ کرتے اور کم وبیش ہر کالم اور مضمون میں کوئی لفظ یا فقرہ ایسا ڈال دیتے کہ وہی ''حاصلِ غزل'' بن جاتا۔ ان کی تحریر و تقریر میں بذلہ سنجی چھلکتی اور پھڑکتی نظر آتی۔ اداریہ اور شذرات کیلئے روزانہ گائیڈ لائین دینا اور پھر پروف کی غلطیوں کی نشاندہی سمیت ان کی ایڈیٹنگ کرنا بھی انہوں نے اپنے روزانہ کے فرائض منصبی کا حصہ بنایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایوان کارکنان تحریک پاکستان میں کم وبیش روزانہ منعقد ہونے والی تقریبات میں شمولیت اور اس ادارے کی سرپرستی بھی ان کے روزمرہ کے معمولات کا حصہ بن گئی، پھر بھی شاید ہی کوئی دن ایسا ہو گا جب شعبۂ ادارت کی روزانہ کی میٹنگ کی انہیں فرصت نہ ملی ہو۔ میٹنگ کے وقت کسی اور جگہ مصروف ہوتے تو دفتر سے گزرتے ہوئے بھی اداریہ اور شذرات کیلئے گائیڈ لائن دے جاتے یا کم

از کم ٹیلی فون پر تو ضرور رابطہ رکھتے۔ لاہور سے باہر جاتے تو بھی ہیڈ آفس میں ان کی موجودگی کا احساس برقرار رہتا۔ شعبۂ ادارت ہی نہیں، نیوز ڈیسک، رپورٹنگ اور میگزین سے لے کر شعبۂ اکاؤنٹس، سرکولیشن، اشتہارات اور پریس کی بھی خود نگرانی کرتے جو شعبۂ صحافت کے ہر فیلڈ میں ان کی مشاقی و مہارت کا بین ثبوت ہے۔ ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں کسی معاشرے کی آبرومندی کی ضمانت اور علامت ہوا کرتی ہیں اور آبرومندی سے لبریز نوائے وقت کے 81 برس میں حمید نظامی کے سانحۂ ارتحال کے بعد 25. فروری 1962ء سے 26 جولائی 2014ء ان کی رحلت تک اور اس سے پہلے چھ سات سال لندن میں اپنے اخبار کی بھرپور نمائندگی اور اس سے پہلے 1950ء سے 1954ء تک اپنے بھائی حمید نظامی مرحوم کی نگرانی میں سرراہے کا کالم اور اس سے بھی پہلے نوائے وقت جب ہفتہ وار تھا اس کی ''انتظامیہ'' میں شمولیت مجید نظامی کی صحافت کے کٹھن و خوشگوار ادوار کی کھلی گواہی ہے۔ ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں۔ آج کا 23. مارچ جہاں ہم سے قراردادِ لاہور کی روشنی میں قیام پاکستان کے اصل مقاصد اجاگر کرنے کا متقاضی ہے وہیں اس قرارداد کے ساتھ ہی جنم لینے والے اخبار نوائے وقت کی پیشۂ صحافت میں استقامت اور سربلندی کے لئے بھی ہمیں دعا گو رہنا ہے۔

’’معاملہ ہی کیا ہوا گر زیاں کے لیے‘‘

ابھی آفس میں پہنچا ہی تھا کہ ریسیپشن سے کال آ گئی۔ ’’مظفر گڑھ سے کوئی منصور صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔‘‘ فوری طور پر میرے ذہن میں کچھ نہ آیا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ میں نے ریسپشنسٹ سے کہا کہ ان سے میری بات کرا دیں۔ خاتون نے ٹیلی فون کا ریسیور انہیں تھما دیا۔ ’’آسی صاحب میں نوابزادہ منصور علی خاں ہوں۔ آپ سے ملاقات کرنی ہے۔‘‘ زہے نصیب۔ آپ تشریف لائیے۔‘‘ میں نے نوابزادہ صاحب کو تشریف لانے کو کہا تو ساتھ ہی بابائے جمہوریت اور اقدار والی سیاست کے امین نوابزادہ نصر اللہ خاں سے وابستہ یادوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ نوابزادہ منصور کے آنے تک نوابزادہ صاحب کے اسلوب سیاست اور ان کی مرنجاں مرنج شخصیت کے حوالے سے بہت سی یادیں تازہ ہو چکی تھیں۔ ان کے صاحبزادے نوابزادہ منصور علی خاں نے اچانک میرے پاس تشریف لا کر اپنی گم گشتہ سیاسی زندگی کی بھی کئی پرتیں کھول دیں اور نوابزادہ نصر اللہ خاں کی بحالی جمہوریت کی تاریخی جدوجہد میں ان کے ہاتھوں ٹوٹتے بنتے اتحادوں اور ایم آر ڈی سے اے آر ڈی تک کی جمہوری جدوجہد میں پیش آنے والی کٹھنائیوں کے کئی مناظر آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔ مجھے نوابزادہ منصور کے گمشدہ ہونے پر بھی ان کے ساتھ بے شمار شکوے تھے اور جس طرح انہوں نے اپنے والد بزرگوار کی سیاسی میراث پاکستان جمہوری پارٹی کو 2012ء میں پلیٹ میں رکھ کر عمران خاں کو دان کر دیا تھا اس پر بھی مجھے اور نوابزادہ صاحب کے دوسرے نیاز مندوں بشمول سید منظور علی گیلانی کو سخت دھچکا لگا تھا اور میں نے تو اپنے ایک کالم میں ان کے خوب لتے لئے تھے۔ آج انہوں نے پی ڈی پی کے پی ٹی آئی میں انضمام کی اصل کہانی بھی کھول کر بیان کر دی۔ میں نے ان سے استفسار کیا کہ آیا انہوں نے نوابزادہ نصر اللہ صاحب کی سیاسی میراث کا کچھ حصہ سنبھال کر بھی رکھا ہے یا سب کچھ دریا برد کر دیا

ہے۔انہوں نے یہ بتا کر میری حیرت میں مزید اضافہ کر دیا کہ وہ خانگڑھ میں نوابزادہ مرحوم کی سیاست ہی کے امین ہیں اور عوام کے ساتھ اسی طرح رابطہ رکھتے ہیں۔انہوں نے 2018ء کا انتخاب پی ٹی آئی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کی نشست کے لیے لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ مجھے فی الواقع علم نہیں تھا کہ نوابزادہ منصور اپنی سابقہ دور والی پنجاب اسمبلی کی نشست برقرار رکھے ہوئے ہیں مگر پھر بھی گمنام ہیں اور کبھی پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں بھی ان کی آواز گونجتی سنائی نہیں دیتی۔ اگر پی ٹی آئی قیادت کو سیاسی قدروں کی پاسداری ہوتی تو سیاسی اتحادوں کی بانی پی ڈی پی کو بن مول پی ٹی آئی میں ضم کرنے والے نوابزادہ منصور علی خاں کی تھوڑی سی تو عزت افزائی کر لی جاتی اور انہیں کسی وزارت کا قلمدان دے دیا گیا ہوتا۔

میں نوابزادہ منصور کے بارے میں یہ تو ہرگز نہیں کہوں گا کہ ''پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا نہیں''، مگر مجھے قومی سیاسی تاریخ کی حامل جمہوری پارٹی کے ان کے ہاتھوں دفن ہونے کا بہت دکھ ہے۔میں نے انہیں کریدا کہ انہیں اپنے والد کے سیاسی ورثہ کو پی ٹی آئی کے سیلاب میں بہانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔انہوں نے نوابزادہ نصراللہ صاحب جیسی متانت اپنے چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا کہ وہ تو اپنے والد کی جمہوری اقدار کا ہی دامن سنبھالے ہوئے ہیں۔2012ء میں جب عمران خاں رابطۂ عوام مہم پر نکلے ہوئے تھے اور مخدوم جاوید ہاشمی سمیت قدآور سیاسی شخصیات ان کی ہمسفر ہو رہی تھیں تو انہوں نے بھی پی ڈی پی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس بلا کر رائے طلب کی۔اس اجلاس میں متفقہ طور پر پی ڈی پی کو تحریک انصاف میں ضم کرنے کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ انہوں نے اپنے والد مرحوم کی قائم کردہ جمہوری اقدار کے عین مطابق اپنی پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کیا۔''کیا اس پر کوئی پچھتاوا'' نوابزادہ منصور نے میرے اچانک سوال پر کچھ لمحے توقف کیا، پھر گفتنی، ناگفتنی والی ساری آف دی ریکارڈ باتیں ہوئیں۔مگر میرا تجسس برقرار رہا کہ اگر انہوں نے نوابزادہ نصراللہ خاں مرحوم کی سیاسی میراث کو سنبھال کر رکھا ہوتا تو قومی سیاست میں نوابزادہ مرحوم کے تذکرے بھی چلتے رہتے اور ان کی وضع کی گئی سیاسی اقدار کی بھی کچھ نہ کچھ پاسداری ضرور ہو رہی ہوتی۔

ان کی سیاسی میراث تو 32۔نکلسن روڈ لاہور والا ان کا سیاسی ڈیرہ بھی تھا جو بیک وقت جمہوری پارٹی کا مرکزی دفتر بھی تھا اور نوابزادہ صاحب کی رہائش گاہ بھی بن چکا تھا۔اسی جگہ پردہ

جرنیلی اور سول آمروں کے خلاف سیاسی جدوجہد کے تانے بانے بنا کرتے تھے۔ سیاسی اتحادوں کی بنیاد رکھی جاتی تھی اور اس ناطے سے بھی 32 نکلسن روڈ قومی سیاسی قائدین کی آمدورفت کا مرکز بنا رہتا تھا۔ میری آنکھوں نے اسی 32 نکلسن روڈ والے سیاسی ڈیرے میں خان عبدالولی خاں، میر غوث بخش بزنجو، شیر باز خاں مزاری، ائیر مارشل اصغر خاں، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا فضل الرحمان، ملک غلام مصطفیٰ کھر، علامہ طاہر القادری، غلام مصطفیٰ جتوئی، نواب اکبر بگتی، خواجہ خیر الدین، ملک محمد قاسم، قاضی حسین احمد، پروفیسر غفور احمد، بیگم کلثوم نواز، میاں شہباز شریف اور بے شمار دوسرے قدآور قومی سیاسی قائدین کو نوابزادہ نصر اللہ خاں کی قدم بوسی اور ان سے راز و نیاز کرتے دیکھا اور پھر محترمہ بے نظیر بھٹو ایم آر ڈی کی قائد کے علاوہ وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے بھی 32۔ نکلسن روڈ پر نوابزادہ صاحب کے پاس حاضری دینے میں فخر محسوس کرتی رہیں۔ اس ناطے سے اگر 32- نکلسن کو قومی سیاست کا مرکز و محور قرار دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں مگر سیاسی اقدار کا امین یہ مقام آج صفحۂ ہستی سے ہی مٹ چکا ہے۔ مجھے نوابزادہ منصور سے اس کا بھی شکوہ رہا کہ وہ کم از کم نوابزادہ مرحوم کی سیاسی میراث اس مقام کو ہی محفوظ کر لیتے۔ انہوں نے جواباً پوری تفصیل کھول کر بیان کر دی، کہنے لگے 32۔ نکلسن روڈ کا آفس نوابزادہ مرحوم نے کرائے پر حاصل کیا تھا اور اس کا مالک ان کی زندگی میں بھی کئی بار انہیں یہ جگہ خالی کرنے کا کہہ چکا تھا، جب نوابزادہ صاحب کا 26 ستمبر 2003ء کو انتقال ہوا تو میں نے نوابزادہ صاحب کے چہلم کے بعد 32 نکلسن روڈ کے مالک سے رابطہ کیا اور ان سے یہ جگہ خریدنے کی خواہش ظاہر کی جس پر اس نے بتایا کہ وہ تو پہلے ہی یہ جگہ کسی کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔ اس طرح ہم نوابزادہ صاحب کے اس سیاسی ڈیرے سے محروم ہو گئے اور میں نے پی ڈی پی کا آفس ماڈل ٹاؤن منتقل کر دیا۔

''ہمارے ساتھ ایک اور المیہ بھی تو ہوا ہے'' یہ کہتے ہوئے نوابزادہ منصور کی آواز بھرا گئی۔ ''وہ کیا'' میرے استفسار پر انہوں نے ایک دوسری المناک داستان بھی سنا ڈالی۔ کہنے لگے ہم نے نکلسن روڈ کو نوابزادہ نصر اللہ خاں کے نام سے منسوب کرنے کی مہم چلائی تھی جس پر چودھری پرویز الٰہی کی وزارت اعلیٰ کے دور میں پنجاب اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک قرارداد بھی منظور کر لی، مگر بیوروکریسی کا سرخ فیتہ آڑے آیا اور اسمبلی کی منظور کردہ اس قرارداد پر عملدرآمد کی آج تک نوبت

نہیں آ سکی۔نوابزادہ منصور کے بقول میاں شہباز شریف نے بھی اپنی وزارت اعلیٰ کے دور میں پنجاب اسمبلی کی اس قرارداد کی بنیاد پر 32- نکلسن روڈ کو نوابزادہ نصراللہ خاں سے منسوب کرنے کا آفس آرڈر نکالا تھا مگر یہ محض کاغذی کارروائی تھی کیونکہ ان کی اطلاع کے مطابق شہباز شریف نے اس آفس آرڈر پر عملدرآمد بھی خود ہی رکوا دیا تھا۔ ''شہباز شریف صاحب کو آخر ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی'' نوابزادہ منصور نے میرے استفسار پر بلاتوقف جواب دیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ میاں محمد شریف کا اتفاق فونڈری کا مرکزی دفتر نکلسن روڈ پر ہی تھا اور بے نظیر بھٹو صاحبہ کے دور حکومت میں میاں محمد شریف کو اسی آفس میں ہتھکڑیاں ڈال کر حراست میں لیا گیا تھا۔ غالباً میاں شہباز شریف کے ذہن میں یہ تلخی موجود تھی کیونکہ نوابزادہ نصراللہ خاں اس وقت بے نظیر بھٹو کے حکومتی اتحادی تھے۔شائد اسی پس منظر میں انہوں نے نکلسن روڈ کو نوابزادہ صاحب کے نام سے منسوب کرنے کی اجازت نہیں دی ہوگی۔ سیاست کی بے رحمی کا ایسا رخ بھی ہو سکتا ہے۔نوابزادہ منصور کا قیاس درست ہے تو اس پر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ ''مگر اب تو آپ کی اپنی حکومت ہے۔اب ہی آپ پنجاب اسمبلی کی قرارداد کو عملی جامہ پہنوالیں'' یہ کہتے ہوئے میں اپنے لہجے کی تلخی کو نہ چھپا سکا۔نوابزادہ منصور نے بتایا کہ انہوں نے اس کے لیے وزیر اعلیٰ پنجاب سردار عثمان بزدار کو متحرک کیا ہے اور امید ہے کہ اب نکلسن روڈ نوابزادہ نصراللہ خاں کے نام سے منسوب ہو جائے گی، اللہ کرے کہ ان کے ''اپنے'' دور میں ان کی یہ امید بر آئے۔ مجھے تو 32 نکلسن روڈ پر نوابزادہ نصراللہ خاں سے ہونے والی آخری ملاقات کبھی نہیں بھول سکتی جب انہوں نے لندن روانگی سے ایک روز قبل اپنے چیدہ چیدہ صحافی اور دانشور دوستوں کے لیے دعوتِ ''آم'' سجائی اور اپنے ہاتھوں سے آم ''پولے'' کر کے ہمیں کھلاتے رہے۔آج نوابزادہ منصور بھی آموں کے تحفے کی شکل میں ان کی یاد سمیٹ کر لائے ہیں تو نوابزادہ مرحوم کا اکثر سنایا جانے والا یہ شعر فضاؤں میں ان کی یادیں بکھیرنے لگا ہے ......

مجھے خبر ہے کہ اس راہ میں ہے جی کا زیاں
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لیے

آہ نوابزادہ صاحب۔آج تم یاد بے شمار آئے۔

پی آئی سی واقعہ۔انا کی تسکین یا محرومیوں کا غصہ؟

قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے بھی کچھ عرصہ وکالت کی ہے اس لیے پی آئی سی کے واقعہ پر خود مجھے بھی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔70ء کی دہائی تک ملک میں صرف تین لاء کالج تھے، ان میں سب سے معتبر پنجاب یونیورسٹی لاء کالج تھا۔اس کے علاوہ لاہور ہی میں نجی سطح پر حمایت اسلام لاء کالج اور کراچی میں اردو سندھ لاء کالج قائم تھا۔پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں داخلے کے لئے مقررہ میرٹ کی سختی سے پاسداری کی جاتی چنانچہ جو طلبہ اس کالج میں داخلے سے محروم رہتے وہ حمایت اسلام لاء کالج سے رجوع کرتے اور پھر اردو سندھ لاء کالج کی باری آتی۔ اس طرح پیشۂ وکالت میں وکلاء کا جمِ غفیر بننے کی نوبت نہیں آتی تھی۔میرے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کے 76-1974ء والے سیشن میں امتیاز علی شیخ پرنسپل تھے جو بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے جبکہ نامور قانون دان عابد حسن منٹو ڈاکٹر خالد رانجھا، بیرسٹر اعتزاز احسن، حامد خاں، چودھری محمد عارف (سابق جج سپریم کورٹ) عامر رضا اے خاں، خلیل رمدے، سردار اقبال موکل اور میاں آفتاب فرخ ہمارے اساتذہ میں شامل تھے۔ان سب اساتذہ کے ساتھ نیاز مندی والا تعلق استوار ہوا اور پھر دوستی کے دائرے میں بھی داخل ہوا مگر اس تعلق میں ادب آداب والا عنصر ہمیشہ غالب رہا۔یہ تعلق ہائیکورٹ، سپریم کورٹ اور وکلاء تنظیموں میں پیشہ ورانہ صحافتی فرائض سرانجام دینے کے دوران مزید گہرا ہوا۔انہی اساتذہ میں سے بعض وکلاء ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ بار کے اہم مناصب اور پنجاب و پاکستان بار کونسل کی رکنیت اور وائس چیئرمینی کے لیے بھی منتخب ہوتے رہے جبکہ کئی محترم اساتذہ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے جج کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔

وکالت کا پیشہ اس لئے بھی معزز اور معتبر پیشوں میں شمار ہوتا تھا کہ بانیان پاکستان قائداعظم

اور علامہ اقبال بھی اسی معزز پیشہ کے ساتھ وابستہ تھے جبکہ اس پیشہ کو ملک میں آئین وقانون کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری کا ضامن پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ کالے کوٹ والوں نے 70ء اور 80ء کی دہائی میں آئین وقانون کی حکمرانی اور عدلیہ کی آزادی کے لیے بے مثال جدوجہد کی۔ انہوں نے بھٹو کی سول آمریت کا بھی سامنا کیا اور ضیاء کی جرنیلی آمریت کے جبر وتشدد کے آگے بھی آئین وقانون کی حکمرانی کے لیے ڈٹے رہے۔ ضیاء آمریت کی سختیاں تو انتہائی درجے کی تھیں اور وکلاء تنظیموں اور اس کے قائدین نے آئین وقانون کی حکمرانی کی خاطر جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد بھی اپنی جدوجہد میں شامل کر لی تھی جس کے دوران ایم آر ڈی کے کارکنوں ہی کی طرح وکلاء کی بھی ریاستی جبر میں دھنائی ہوا کرتی تھی مگر وکلاء برادری میں کسی کی بھی جانب سے قانون ہاتھ میں لینے، توڑ پھوڑ کرنے اور سرکاری ونجی املاک کو نقصان پہنچانے کا کبھی سوچا بھی نہیں جاتا تھا۔ وکلاء کے سرخیل عابد حسن منٹو، سید افضل حیدر، چودھری خالد محمود، ملک سعید حسن، چودھری اعتزاز احسن ہائیکورٹ سے ریگل چوک اور اسمبلی ہال تک اور کبھی گورنر ہاؤس تک وکلاء کے جلوسوں کی قیادت کرتے اور آئین وقانون کی حکمرانی کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کے عہد کا اعادہ کرتے۔ اس دوران وکلاء اور ان کے قائدین پابند سلاسل بھی ہوتے رہے مگر کسی ردعمل میں قانون ہاتھ میں لینے اور شرف انسانیت کے تقاضے فراموش کرنے والا کوئی اقدام اٹھانے کا پیشہ وکالت میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر اسی وکلاء برادری نے 2007ء میں مشرف کی جرنیلی آمریت کے دوران سول سوسائٹی کی معاونت سے عدلیہ بحالی کی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں بالآخر مشرف آمریت کے ماتحت قائم ہونے والی پیپلز پارٹی کی سول حکومت مشرف ہاتھوں گھر بھجوائی گئی اعلیٰ عدلیہ کو بحال کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس تحریک کے دوران بے مثال مارچ اور لانگ مارچ ہوئے جو کئی دنوں تک مسلسل جاری رہے مگر اس کے دوران وکلاء برادری کے ہاتھوں کہیں پر گملہ تک ٹوٹنے کی نوبت نہ آئی۔ چودھری اعتزاز احسن وکلاء کی اس پرامن جدوجہد پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں اور گزشتہ روز پی آئی سی میں وکلاء کے دھاوے پر سب سے زیادہ افسوس اور شرمندگی کا اظہار بھی انہوں نے ہی کیا۔

جناب آج یہی صورتحال سنجیدہ غور وفکر کی متقاضی ہے کہ ایسے کیا حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ آج قانون کے محافظ اس طبقے نے پی آئی سی کے واقعہ میں نہ صرف قانون ہاتھ میں لیا بلکہ شرف

انسانیت کے تمام تقاضے بھی فراموش کر دیئے۔ ایک حساس ترین ہسپتال پر حملہ آور ہونا ویسے ہی انتہائی شرمناک اقدام ہے کہ دو ممالک کی جنگ کے دوران بھی ہسپتالوں پر دشمن کے حملے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تو انہوں نے لٹیا ہی ڈبو دی اور اس غنڈہ گردی کے مظاہرے میں جو بھی سامنے آیا اور جو بھی ہاتھ آیا اسے دبوچنے‘ نوچنے اور تشدد کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی حتیٰ کہ پی آئی سی کی ایمرجنسی میں انتہائی نازک حالت میں موجود مریضوں کو بھی نہ بخشا گیا اور ان کے ماسک تک کھینچ کر اتار لئے گئے۔ کئی وکلاء ہاتھ میں پستول لہراتے اور ہوائی فائرنگ کرتے بھی نظر آئے۔ پھر ہسپتال کا جو حشر کیا گیا وہ سوشل میڈیا کے ذریعے پوری دنیا کی نظروں میں آ کر ہماری سماجی اور اخلاقی قدروں کے ’’ڈنکے‘‘ بجا رہا ہے۔ بیرسٹر علی ظفر بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ایسے کسی واقعہ پر وکلاء گردی کی اصطلاح استعمال نہ کی جائے کیونکہ یہ پوری وکلاء برادری پر لیبل لگ جاتا ہے مگر جناب! وکلاء برادری کو اس لیبل سے بچانا بھی تو وکلاء قائدین کی ذمہ داری ہے جس کیلئے چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس آصف سعید کھوسہ کچھ عرصہ قبل وکلاء تنظیموں کو یہ درس دے چکے ہیں کہ اب عدلیہ بحالی تحریک جیسی وکلاء عزت بحالی کی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ سو پی آئی سی کے واقعہ کا جو بھی پس منظر ہے‘ وکلاء کا ایک قومی ادارے پر حملہ آور ہونا اس مقدس پیشے میں در آنے والی سماجی اور اخلاقی گراوٹ ہی کا عکاس ہے۔ ذرا سر جوڑ کر اس گراوٹ کی وجوہات کا بھی کھوج لگا لیں۔ کہیں وکلاء برادری میں یہ ہتھ چھٹ کلچر اپنوں کی خصوصی رعایت اور نوجوان وکلاء کے جم غفیر میں پیدا ہونے والے اقتصادی مسائل کے باعث تو پروان نہیں چڑھا۔

گزشتہ روز چودھری اعتزاز احسن بھی اس حقیقت کا اعتراف کر رہے تھے کے وکلاء میں موجود لابیز کے پس منظر میں وکلاء کے کسی غیر قانونی اقدام پر انہیں قانونی اور عدالتی رعایت مل جاتی ہے۔ اس طرح وہ کڑے احتساب اور سزا کے خوف کو خود پر طاری نہیں ہونے دیتے۔ میں پہلے بھی کئی بار ان سطور میں اس امر کی نشاندہی کر چکا ہوں کے وکلاء برادری بالخصوص نوجوان وکلاء نے عدلیہ بحالی تحریک سے اپنے لئے بہت سی توقعات وابستہ کر لی تھیں چنانچہ جب یہ تحریک عدلیہ کی بحالی کی صورت میں کامیاب ہوئی تو وکلاء نے ہر جائز ناجائز کیس میں قانون و انصاف کے اداروں سے ریلیف حاصل کرنا اپنا حق سمجھ لیا اور جہاں بھی انہیں اپنے اس حق پر زد پڑتی نظر آئی تو

انہوں نے پولیس، سائلین اور ججوں تک پر حملہ آور ہونے سے گریز نہیں کیا۔ایک خاتون سول جج کو کمرے میں محبوس کر کے باہر تالا لگانے کا واقعہ بھی اسی حق کو جتانے کیلئے رونما ہوا تھا اور پھر کمرہ عدالت میں ایک وکیل کی جانب سے مجسٹریٹ کو کرسی دے مارنے کا واقعہ بھی اسی حق کا شاخسانہ تھا۔ابھی گزشتہ روز ہی جب لاہور میں وکلاء پی آئی سی پر حملہ آور تھے' مظفر گڑھ میں وکلاء ایک عدالت کے عملے کی مار پیٹ میں بھی مصروف تھے۔ یہ دراصل وکلاء برادری کی اکثریت کے اقتصادی محرومیوں کا شکار ہونے کا ردعمل ہے۔وکلاء کے مخصوص گروپ تو بار پولیٹیکس کے حوالے سے نامور وکلاء کے چیمبرز اور ججز چیمبرز سے منسلک ہوکر بڑی بڑی فیسوں والے کیس حاصل کر لیتے ہیں جن میں انہیں آسانی کے ساتھ ریلیف بھی مل جاتا ہے مگر نوجوان وکلاء کی اکثریت بریف لیس ہونے کے ناطے اپنی محرومیوں کا غصہ قانون ہاتھ میں لیکر اتارتی ہے جس کا منفی تاثر بہر صورت پورے پیشہ وکالت پر مرتب ہوتا ہے۔بالخصوص بار کے انتخابات کے موقع پر نوجوان وکلاء کو مطمئن کرنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے ان کے غیر قانونی اقدامات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔پی آئی سی کا گزشتہ روز کا واقعہ بھی انہی حالات کا پیدا کردہ ہے جن میں لاہور بار ایسوسی ایشن اور لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے آنے والے انتخابات میں انتخابی امیدواروں اور ان کے گروپوں کی جانب سے نوجوان وکلاء کو ہلہ شیری دیئے رکھنا متعلقین کی مجبوری بن گیا تھا۔

آج تو ویسے ہی اقتصادی حالات کی سختیوں کے باعث پوری قوم میں اضطراب کی کیفیت ہے اور حکومت ان سختیوں میں عوام کو کسی قسم کا ریلیف دینے پر بھی آمادہ نہیں اس لئے کوئی ہلکی سی چنگاری بھی سب کو جلا کر خاکستر کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔تو جناب پی آئی سی والے واقعہ سے ہی کچھ عبرت حاصل کر لیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کو ایسی خانہ جنگی کی نوبت آ جائے جسے کسی حکومتی گورننس کیلئے بھی سنبھالنا مشکل ہو جائے اور طاقت و اختیار والوں کو بھی اپنی جان کے لالے پڑتے نظر آئیں۔

میں علامہ صاحب کیلئے دعا گو ہوں

ڈاکٹر طاہر القادری صاحب سے میری یاد اللہ کوئی 40 سال پر محیط ہے۔ مجھے سب سے پہلے 1981ء میں جناح ہال لاہور میں انکی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ اس سے پہلے میں مرحوم شورش کاشمیری کے جوش بیان، الفاظ کی بُنت اور ادائیگی کے سلیقے پر ان کا گرویدہ ہوا تھا۔ وہ 70ء کی دہائی کی تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران پاکپتن آئے۔ جوش خطابت میں پوری رات گزار دی۔ مجال ہے کوئی ایک سامع بھی انکی محفل سے اٹھ کر گیا ہو۔ الفاظ ان پر الہام ہوتے نظر آتے تھے۔ میں اس وقت انٹر کا طالب علم تھا۔ انکے الفاظ سے الفاظ نکالنے کے سحر میں ڈوبا رہا۔ پھر انکی نثر و شاعری کی ساری کتابیں کھنگال ڈالیں۔ احسان دانش، مرزا ادیب اور پھر احمد ندیم قاسمی کی کتب کا بھی شورش ہی کے حوالے سے مطالعہ کیا۔ میری ان سے کبھی بالمشافہ ملاقات تو نہ ہو سکی مگر میں از خود اپنے آپ کو انکے شاگردان عزیز کے درجے پر فائز کر چکا تھا۔ انکے انتقال کے وقت میں یونیورسٹی لاء کالج میں زیر تعلیم تھا، پنجاب یونیورسٹی کی گراؤنڈ میں ان کی نماز جنازہ ہوئی۔ یوں محسوس ہوا لاہور کا کوئی شہری انکی نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ گراؤنڈ میں ہزاروں کا اجتماع اور گراؤنڈ سے باہر سڑک پر بھی لوگوں کا جم غفیر۔ یہ ان کیلئے اسلامیان پاکستان کے دلوں میں احترام کا بین ثبوت تھا۔ میں نے اسکی رپورتاژ لکھ کر چٹان میں بھجوا دی جو نمایاں طور پر شائع ہوگئی۔ غالباً میرا عملی صحافت کا آغاز بھی اسی رپورتاژ سے ہوا تھا۔ مرحوم شورش کاشمیری کے فرزندگان سے اس وقت سے استوار ہوا تعلق خاطر آج تک قائم ہے اور شورش کا وجد طاری کرنے والا وعظ آج بھی دل کے نہاں خانوں میں محفوظ ہے۔

میں نے 1981ء میں ڈاکٹر طاہر القادری کی تقریر سنی تو مجھے ان میں بھی شورش کاشمیری کی جھلک نظر آئی۔ اس وقت وہ اتفاق مسجد کے امام و خطیب تھے اور ایک مذہبی سکالر کے طور پر

معروف ہورہے تھے۔ میرے دل سے ان کے لیے دعا نکلی کہ انہیں زمانے کی ہوا نہ لگے اور یہ خود کو تبلیغ دین کیلئے وقف کیے رکھیں مگر انکے دماغ میں شائد سیاست کا کیڑا پرورش پا رہا تھا۔

1986ء میں جب میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب تھے، علامہ طاہر القادری نے دھماکہ کر دیا۔ شریف فیملی پر الزامات کا طومار باندھا، اپنے گھر پر فائرنگ کرانے کے الزامات لگائے۔ گھر کی دیواروں پر خون کے چھینٹے بھی دکھا دیئے اور ان کیخلاف پرچہ کٹانے چل نکلے۔ غالباً انہیں کسی نے پٹی پڑھائی ہوگی کہ سٹنگ وزیر اعلیٰ کے خلاف پریس کانفرنس کر کے الزامات لگاؤ گے تو آپ کی سیاست کا اچھا آغاز ہو جائیگا سو انہوں نے یہ معرکہ انجام دے ڈالا۔ وزیر اعلیٰ کی درخواست پر انکے الزامات کی تحقیقات کیلئے لاہور ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس فضل کریم کی سربراہی میں ایک جوڈیشل کمشن تشکیل دے دیا گیا جس کی کوریج کے دوران علامہ صاحب سے روزانہ کی ملاقات بھی ہمارا معمول بن گیا، یہ انکوائری علامہ صاحب کیلئے بہت تلخ ثابت ہوئی اور سارے حقائق ان کیخلاف گواہی بن گئے۔ خون کے چھینٹے بھی کسی جانور کے خون کے چھینٹے ثابت ہوئے اور فاضل جج نے اپنی انکوائری رپورٹ میں علامہ صاحب کے کردار اور انکی اخلاقیات کے حوالے سے مایوسی اور افسوس کا اظہار کیا مگر وہ تو سیاست کے میدان میں کود چکے تھے جس کیلئے انہوں نے عوامی تحریک کے نام سے پارٹی بھی بنالی اور پھر وہ شریف فیملی کے مخالفین کے ہاتھوں میں خوب کھیلے۔ چونکہ انکی پارٹی بھی میری بیٹ میں شامل تھی اس لیے انکے ساتھ تعلق خاطر دوستی کی حدوں کو چھونے لگا، ماڈل ٹاؤن ان کی اقامت گاہ پر اکثر ان سے ملاقاتیں رہتیں، میں نے ان کے بارے میں اپنا پہلے دن کا تاثر انکے ساتھ شیئر کیا اور مؤدبانہ درخواست کی کہ وہ سیاست کی خاردار وادی سے خود کو باہر نکال کر ایک مبلغ دین کا فریضہ ادا کریں تو نیک نامی بھی کمائیں گے اور اپنی آخرت بھی سنوار لیں گے۔ مگر انکے دل میں جو سودا سمایا تھا وہ خاصے کا تھا سو چھٹتی نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگی ہوئی کے مصداق وہ خود کو دنیاداری والی سیاست کے اسیر بناتے چلے گئے۔ ان دنوں انکے کچھ خوابوں کے چرچے بھی ہونے لگے تھے۔ ہم نے پی ایف یو جے دستور کی ایف ای سی کا اجلاس لاہور میں بلایا ہوا تھا۔ علامہ طاہر القادری نے ایف ای سی کے ارکان کو رات کے کھانے پر مدعو کیا اور اپنے خوابوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ سعود ساحر صاحب کو شرارت سوجھی، انہوں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور علامہ صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ اس نوٹ

کوایک لاکھ روپے کی کرنسی میں تبدیل کر دیں تو میں آپ کی بزرگی کا قائل ہو جاؤں گا۔ علامہ صاحب کے پاس سوائے غصّے کے اظہار کے اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مسعود ساحر صاحب نے دس روپے کے نوٹ پر انکے دستخط کرائے اور کہا کہ یہ نوٹ میں فریم کرا کے اپنے ڈرائنگ روم میں لگا دوں گا۔ علامہ صاحب اس پر خوش ہو گئے۔

اسی طرح ایک اور واقع رونما ہوا، علامہ صاحب 90ء کی دہائی کے آغاز میں غالباً پہلی بار کینیڈا کے دورے پر گئے۔ ہمارے پیارے دوست رومان احسان بھی انکے ہمراہ تھے، واپسی پر انہوں نے اپنے چیدہ چیدہ صحافی دوستوں کے ساتھ نشست کا اہتمام کیا۔ نشست کے اختتام پر وہ اچانک اٹھ کر گھر کے اندر چلے گئے اور کچھ ہی لمحے بعد ایک پوٹلی اٹھائے واپس آ گئے۔ انہوں نے تمام صحافی دوستوں پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ انکی تعداد گن رہے ہوں۔ پھر بڑی احتیاط کے ساتھ انہوں نے پوٹلی میں سے پرفیوم کی ایک شیشی نکالی اور ایک دوست کو دے دی اس طرح وہ باری باری سب دوستوں میں پرفیوم کی شیشی تقسیم کرتے گئے۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو انہوں نے معنی خیز لہجے میں حاضرین نشست سے مخاطب ہوئے کہا کہ یہ بھی قدرت کا معجزہ ہے۔ میں کینیڈا سے پرفیوم کی صرف چھ شیشیاں لے کر آیا تھا۔ ڈر رہا تا کہ یہ چھ شیشیاں تقسیم کروں گا تو اس سے محروم رہنے والے دوست مجھے کوسیں گے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر تقسیم کرنا شروع کیں تو آپ سب دوستوں میں پوری ہو گئیں، اس نشست کے شرکاء کی تعداد پندرہ کے قریب تھی اور ہر ایک کے ہاتھ میں پرفیوم کی شیشی تھی۔ رومان احسان میرے پاس ہی بیٹھے تھے، انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی، ''حضرت نے میری موجودگی میں ٹورنٹو سے پرفیوم کی پچاس شیشیاں خریدی تھیں'' میں نے اگلے روز علامہ صاحب کے اس ''معجزے'' کی خبر نوائے وقت میں لگا دی جس پر پروفیسر سلیم صاحب نے ''سرراہے'' کا ایک ٹکڑا بھی لکھ مارا۔ علامہ صاحب کا شکوے بھرا فون آیا ''مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی'' بہرحال ہونی تو ہو چکی تھی۔

علامہ صاحب نے محترمہ بے نظیر بھٹو اور مسرت شاہین کو وقفے وقفے سے اپنے گھر مدعو کر کے دونوں کو اپنی بہن کا درجہ دیا۔ اس وقت میاں نواز شریف کی حکومت کیخلاف اپوزیشن اتحاد اے آر ڈی تشکیل پا چکا تھا۔ ایم آر ڈی کی طرح اے آر ڈی کی کنوینر شپ بھی حروف تہجی کے حساب سے اے آر ڈی کی ہر جماعت کو دینے کا فیصلہ ہوا۔ علامہ طاہر القادری بھی اے آر ڈی کا حصّہ بن

چکے تھے۔ اسکی پہلی کنویئنر شپ کا معاملہ چل رہا تھا جس کیلئے محترمہ بے نظیر بھٹو سمیت اے آر ڈی کے تمام قائدین نوابزادہ نصر اللہ خاں کی اقامت گاہ 32- نکلسن روڈ پر جمع تھے۔ علامہ طاہر القادری نے اصرار کیا کہ پہلی کنوینر شپ انہیں دی جائے، محترمہ بے نظیر بھٹو نے یہ سوچ کر انکی تائید کی کہ ہمیں اے آر ڈی کی تحریک کیلئے منظم کارکنوں کی ضرورت ہوگی جو تحریک منہاج القرآن کی صورت میں علامہ صاحب کے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ انہیں اے آر ڈی کا کنوینئر بنانے پر اتفاق ہوگیا تو انہوں نے کنوینئر شپ کا دورانیہ ایک سال کا کرنے کی شرط لگا دی۔ یہ شرط بھی قبول ہوگئی اور علامہ صاحب کی قیادت میں اے آر ڈی کی تحریک کا آغاز ہوگیا جس میں علامہ صاحب سب سے زیادہ اپنی ذات کو اجاگر کرتے۔ انکی قیادت کا ایک سال کا عرصہ مکمل ہوا تو انہوں نے کنوینئر شپ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ جب اصرار ہوا تو وہ کود کر اے آر ڈی کی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ 12۔ اکتوبر 99ء کو مشرف نے میاں نواز شریف کی حکومت کو ٹوپل کر کے اپنی حکمرانی قائم کی تو پہلے ہی روز نئے لائحہ عمل کیلئے اے آر ڈی کی بھی 32- نکلسن روڈ پر تشکیل نو کی گئی۔ علامہ صاحب بھی وہاں آ دھمکے۔

مجھے یہ بات خود نوابزادہ نصر اللہ صاحب نے بتائی تھی کہ میٹنگ کے دوران علامہ طاہر القادری بار بار اٹھ کر باہر جاتے رہے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ جنرل پرویز مشرف انکے ساتھ رابطہ کر رہے ہیں۔ یہ رابطہ بھی شائد کسی معجزے کے تحت ہی ہوا ہوگا کیونکہ اس وقت وہاں ٹیلی فون سمیت رابطے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ علامہ صاحب نے پہلے اور آخری انتخابات 2002ء کی اسمبلی کے لڑے اور اپنی پوری پارٹی اور پورے ادارہ منہاج القرآن کو جھونک کر صرف اپنی ایک نشست نکالنے میں کامیاب ہوئے مگر اسمبلی کی عین آدھی میعاد پوری کر کے انہوں نے پارلیمان پر دو حرف بھیجے، اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دیا اور مستقل طور پر کینیڈا جا آباد ہوئے۔ وہاں سے انہوں نے 2010ء میں انقلاب ''کشید'' کیا اور ملک واپس آ کر قومی سیاست میں اتھل پتھل کا فیصلہ کیا، اس کیلئے انہوں نے کینیڈا سے صحافی دوستوں کے ساتھ ٹیلی فونک مشاورتی نشست کا اہتمام کیا۔ میں نے اس وقت بھی ان سے یہی عرض کی کہ بطور دینی مبلغ کے ان کا بہت بڑا مقام ہے اس لیے وہ دینی مبلغ کا کردار ہی ادا کرتے رہیں مگر وہ آ دھمکے اور پیپلز پارٹی کی حکومت کیخلاف لانگ مارچ کا اہتمام کر ڈالا۔ کنٹینر میں انکے پیپلز پارٹی کے وزراء کے

ساتھ جو راز و نیاز ہوئے وہ پوری قوم نے لائیو دیکھے، پھر 2013ء کے انتخابات میں انکے کاغذات نامزدگی انکی کینیڈین شہریت کے باعث چیلنج ہوگئے۔ وہ سپریم کورٹ میں خود پیش ہوتے رہے مگر عدالت عظمیٰ نے انکے موقف سے اتفاق نہ کیا اور انکے کاغذات نامزدگی مسترد کرنے کا الیکشن کمشن کا فیصلہ برقرار رکھا۔ اس پر وہ مروجہ سیاسی نظام پر پھر دو حرف بھیج کر واپس کینیڈا چلے گئے۔ اگر وہ اپنے سیاسی کردار کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے تو کینیڈا کی شہریت چھوڑ کر ملک و قوم کی خدمت پر جت جاتے مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ"۔ میرے ناقص علم کے مطابق علامہ طاہر القادری پہلے بھی تین بار سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کر کے اپنے کارکنوں کو آزمائش میں ڈال چکے ہیں اور پھر انکے پر زور اصرار پر انہیں کینیڈین شہری کی حیثیت سے پاکستان میں اپنا سیاسی کردار برقرار رکھنا پڑا ہے۔ انکے اسی سیاسی کردار کی برکت سے عمران خاں کے اقتدار کی راہ ہموار ہوئی مگر انکے اقتدار کا ایک سال گزرنے پر ہی علامہ صاحب نے سیاست سے تائب ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔ اللہ کرے ان کا یہ فیصلہ اب انکے پاؤں میں کوئی لغزش پیدا نہ ہونے دے۔ قوم کو آج بھی ان جیسے نابغۂ روزگار دینی مبلغ کی ضرورت ہے۔ وہ اس میں ثابت قدم رہیں گے تو انکی ساری سیاسی لغزشیں بھی دھل جائیں گی۔ میں بہرصورت انکی بطور دینی مبلغ ثابت قدمی کیلئے دعا گو ہوں۔

پریس کلب کا مقبوضہ پلاٹ اور میری یادیں

ہمارے محترم سینئر کالم نگار اسد اللہ غالب صاحب نے سابق ڈائریکٹر پنجاب پبلک ریلیشنز چودھری انوار الحق مرحوم کے حوالے سے اپنی جانب سے تو یقیناً پورے خلوص دل کے ساتھ ماضی کے کچھ معاملات پر روشنی ڈالی ہے مگر ڈی جی پی آر سے ملحقہ لاہور پریس کلب کے 2 کنال کے پلاٹ پر پیر غائب علی شاہ کا مزار تعمیر کرانے کا ''کارنامہ'' چودھری انوار الحق کے کھاتے میں ڈال کر انہوں نے ایسی بحث کے دروازے کھول دیئے ہیں جو مرحوم کی شخصیت کے موضوع بحث بننے کا باعث بن سکتی ہے۔ غالب صاحب کے اس کالم پر شعیب بن عزیز نے بھی میرے ساتھ یقیناً اسی ناطے سے شکوہ کیا ہے کہ اس سے مرحوم کی بیوہ کو اذیت پہنچی ہے۔ چودھری انوار الحق کی پہچان ماروی سرمد کے حوالے سے ہرگز نہیں، ان کا اپنا تشخص، اپنی شناخت اور اپنا مقام تھا اور ایک دیندار کی حیثیت سے ان کا منفرد مقام تھا۔ میں نے ماروی سرمد کیلئے ان کی شفقت پدری کا عملی مظاہرہ اس وقت دیکھا جب 90ء کی دہائی میں ماروی کو میرٹ میں چند نمبر کم ہونے کے باعث ایم بی بی ایس کیلئے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں مل سکا۔ چودھری صاحب اپنی صاحبزادی کو ساتھ لیکر میڈیکل کی میرٹ پالیسی کو چیلنج کرنے کیلئے لاہور ہائیکورٹ آ پہنچے تھے، اس وقت ماروی سہمی سہمی، دھان پان سی، شرمیلی سی بچی تھی۔ چودھری صاحب نے پی آر او ہائیکورٹ کے آفس میں موجود ہائیکورٹ رپورٹرز سے اپنی صاحبزادی کا تعارف کرایا اور میڈیکل میں داخلے کیلئے متعینہ میرٹ پالیسی کو کوستے ہوئے اپنی بیٹی کا داخلہ نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ اپنی بیٹی کی اس محرومی پر افسردہ ایک شفیق باپ نظر آ رہے تھے اور طالب دعا تھے کہ ان کی بیٹی لاہور ہائیکورٹ میں سرخرو ہو جائے مگر لاہور ہائیکورٹ نے میڈیکل کی میرٹ پالیسی پر ہی صاد کیا۔ چنانچہ ماروی کی میڈیکل کی تعلیم کیلئے مرحوم چودھری انوار الحق کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ماروی کے مستقبل کا کیا تعین ہوا، چودھری صاحب سے نیازمندی والے تعلقات کے باوجود میں اس

سے یکسر لاعلم تھا۔ اس کا نام بھی پہلے ماروی نہیں تھا۔

ایک دن ایک ٹی وی ٹاک شو میں ماروی سرمد کو میں نے حافظ حمد اللہ کے ساتھ الجھتے دیکھا، جس پر حافظ حمد اللہ کا ردعمل انتہائی خوفناک تھا۔ نوبت گالم گلوچ تک جا پہنچی تھی۔ اگلے روز رؤف طاہر کے ساتھ گپ شپ کے دوران اس ٹاک شو کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ماروی سرمد چودھری انوارالحق کی صاحبزادی ہیں۔ اس وقت ہائیکورٹ والا سارا منظر میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگا۔ رؤف طاہر کی تصدیق غیر یقینی سی لگی پھر دل کو تکلیف بھی محسوس ہوئی۔ جس ٹاک شو کے ناطے سے اسد اللہ غالب صاحب کو کالم لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ خواتین کے حقوق کے حوالے سے ماروی سرمد اور فلم وڈرامہ نویس خلیل الرحمٰن قمر کے مابین ہوئی گالم گلوچ کے حوالے سے تھا اور غالب صاحب کا خیال ہے، جس کا انہوں نے اپنے کالم میں اظہار بھی کیا کہ ماروی سرمد کو گالی دے کر خلیل الرحمٰن قمر چودھری انوارالحق کی موت کا باعث بنے ہیں۔ اس حوالے سے چودھری انوارالحق جیسے شفیق باپ کی اذیت کا اندازہ یقیناً کوئی اور نہیں لگا سکتا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ وہ یقیناً ایک بخشی ہوئی روح ہیں۔ ہمیں کسی بھی حوالے سے ان کے معاملہ میں کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہئے جو خلط مبحث میں ان کی ذات کو متنازعہ بنانے پر منتج ہو سکتی ہو۔

لاہور پریس کلب کے پلاٹ پر قبضے کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا جسے چودھری انوارالحق کے ساتھ منسوب کر کے یقیناً نادانستگی میں انکی شخصیت پر سوال اٹھانے کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ میں چونکہ خود بھی اس پلاٹ کے معاملہ میں ایک فریق رہا ہوں، اس لئے پلاٹ پر قبضے کا ''کارنامہ'' چودھری انوارالحق کے ساتھ منسوب ہونے پر مجھے بھی خاصی حیرت ہوئی۔ چونکہ برادر مکرم چودھری خادم حسین نے اس پلاٹ کے پریس کلب کیلئے حصول اور اس پر قبضہ کیلئے پیر غائب علی شاہ کا مزار راتوں رات تعمیر ہونے کے اصل واقعہ کی پوری تفصیل اپنے قسط وار کالم میں بیان کر دی ہے، اس لئے اس پر مزید کوئی بات کرنے یا گرہ لگانے کی گنجائش نہیں۔ یہ پلاٹ پنجاب حکومت نے غالباً 1975ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں لاہور پریس کلب کیلئے مختص کیا تھا، اس وقت سید عباس اطہر لاہور پریس کلب کے صدر اور طارق وارثی سیکرٹری تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اگلے سال 1976ء میں خود اس پلاٹ پر پریس کلب کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا، غالباً اس وقت ضیاءالاسلام انصاری پریس کلب کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ اگر کوئی صاحب اس کی تصدیق یا تردید کر دیں تو بہتر ہوگا۔ میں اس وقت پیشہ صحافت میں نووارد تھا، اس لئے مجھے ان

تفصیلات کا قطعاً علم نہیں تھا جو چودھری خادم حسین نے اپنے کالم میں بیان کی ہیں۔اس پلاٹ پر قبضے کا میں 1984ء میں فریق بنا، جب میں لاہور پریس کلب کا سیکرٹری منتخب ہوا۔کلب کی نومنتخب گورننگ باڈی کے پہلے اجلاس میں ہی قبضہ گروپ کیخلاف مقدمہ درج کرانے اور پلاٹ واگزار کرانے کی جدوجہد شروع کرنے کی منظوری دی گئی چنانچہ میں نے سیکرٹری پریس کلب کی حیثیت سے اس وقت کے معروف لیبر لیڈر ملک آفتاب ربانی اور قبضہ گروپ کے دوسرے ارکان کیخلاف پولیس تھانہ سول لائن میں اندراج مقدمہ کی درخواست داخل کرائی، جس پر رپٹ تو درج ہوگئی مگر ملزمان کے اثرورسوخ اور انہیں ضیائی مارشل لاء کی آشیرباد حاصل ہونے کے باعث تفتیش آگے ہی نہ بڑھ سکی۔اس ایف آئی آر میں چودھری انوارالحق یا ڈی جی پی آر کے کسی کردار کا کوئی تذکرہ نہیں تھا، اس میں پیر غائب علی شاہ کے فرضی نام سے پلاٹ پر تعمیر کئے گئے جعلی مزار کو مسمار کرنے کی استدعا بھی کی گئی تھی مگر قبضہ گروپ کی ''ہنرمندی'' کی تاثیر کا اندازہ اس سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مزار اب عقیدت مندوں کیلئے مرادیں برآنے کا مرکز بن چکا ہے۔

اس پلاٹ کے ساتھ چونکہ لاہور پریس کلب کی پوری تاریخ وابستہ ہے، جس کی چودھری خادم حسین صاحب نے بھی کچھ ورق گردانی کی ہے اور مزید ورق گردانی کیلئے مجھے بھی اکسایا ہے، اس لئے میں اپنا فرض گردانتے ہوئے لاہور پریس کلب کے نشیب وفراز کی اس داستان کی کچھ پرتیں کھول رہا ہوں جو یقیناً آج کی صحافی برادری کے غالب حصّے کے علم وآگاہی سے دور ہے۔یہ داستان ضیاء الحق کے 1977ء کے مارشل لاء کے نفاذ سے شروع ہوتی ہے، جب پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی۔اس سے پہلے تک صحافی برادری میں دائیں بائیں والے نظریاتی اور مفاداتی اختلافات کے باوجود ایک ہی پی ایف یو جے، ایک ہی پی یو جے اور ایک ہی پریس کلب ہوتا تھا۔دیال سنگھ مینشن والا فلیٹ پی یو جے کو لیز پر ملا تھا جو پی یو جے اور لاہور پریس کلب دونوں کے تصرف میں رہا۔ضیاء الحق کے مارشل لاء سے پہلے پی ایف یو جے کے انتخاب میں رشید صدیقی منہاج برنا سے چند ووٹوں سے ہارے تھے جنہوں نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی تھی، چنانچہ ضیاء الحق کا مارشل لاء نافذ ہوتے ہی وہ اس غیرآئینی حکومت کے پلڑے میں آگئے جن کی ضیاء الحق نے بھی اپنے مفادات کے تحت سرپرستی شروع کردی۔انہوں نے اپنے نام کے ساتھ پی ایف یو جے کا گروپ تشکیل دیا اور صحافیوں کی سیاست اور پریس کلب سمیت ان کے پلیٹ فارمز پر مکمل قابض ہوگئے۔اس ناطے سے وہ پی یو جے اور پریس کلب کی ڈمی تنظیمیں

خود ہی بناتے رہے۔ اس وقت مارشل لاء کا جبر ایسا تھا کہ کلمہ حق کہنے پر قید، کوڑے اور قلعہ بندی معمول بن چکی تھی۔ چنانچہ ہماری کمیونٹی میں منہاج برنا کا گروپ جس کے کچھ ارکان کو قید اور کوڑوں کی سزا بھی مل چکی تھی، مصلحتاً خاموش ہو کر غیر مؤثر ہو گیا اور تنظیموں کے انتخابات سے بھی گریز کیا جانے لگا۔ رشید صدیقی نے مجھے بھی پی یو جے کا غالباً جوائنٹ سیکرٹری نامزد کیا تھا مگر میں اس گروپ میں کبھی متحرک نہیں رہا۔

جبر کی اسی فضا میں لاہور پریس کلب کی بحالی کیلئے کچھ صحافی دوستوں نے 1983ء میں ایک تحریک کا آغاز کیا جس کا مرکز مال روڈ لاہور والا روزنامہ ڈان کا بیورو آفس تھا۔ اس تحریک کے محرک انجم رشید، محمود زمان، صادق جعفری اور اظہر جعفری تھے جنہوں نے کلب کے احیاء کیلئے دستخطی مہم شروع کی جس کی ساری پلاننگ نثار عثمانی صاحب کی سرپرستی میں ''ڈان'' کے آفس میں ہی کی گئی۔ میں اس وقت ''نوائے وقت'' میں ہائیکورٹ رپورٹر اور اپوزیشن اتحاد ایم آر ڈی کا بیٹ رپورٹر تھا اور ''ڈان'' میں یہی بیٹ سید ممتاز احمد کے پاس تھی اسی طرح ڈان کے دوسرے ارکان اشرف ممتاز، طارق ذہین اور عارف بھائی کیساتھ بھی میرے روابط تھے جن کی بدولت نثار عثمانی صاحب سے بھی نیازمندی والے تعلقات بن گئے تھے چنانچہ ہائیکورٹ سے نکلتے ہوئے میں اکثر سید ممتاز احمد کے ساتھ ''ڈان'' کے آفس آ جاتا جو میرے آفس سے چند قدم ہی آگے تھا۔ اس طرح میں بھی اس دستخطی مہم کا حصہ بنا اور جب مختلف اخبارات کے 200 کے قریب ارکان نے اپنے دستخطوں کیساتھ پریس کلب کے احیاء کی تائید کر دی تو تحریک چلانے والے دوستوں نے ہی مدیر سرراہے ''نوائے وقت'' بابا وقار انبالوی کو بھی اس تحریک کی سرپرستی پر قائل کر لیا جن کی سربراہی میں الیکشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ سید امجد حسین اور احمد بشیر اس کمیٹی میں بطور رکن شامل ہوئے۔

اس وقت رشید صدیقی گروپ سے دیال سنگھ مینشن والے لاہور پریس کلب کا قبضہ چھڑانا ناممکنات میں شامل تھا، چنانچہ احیائے پریس کلب کی تحریک میں سرگرم کامرس رپورٹروں نے سید محسن رضا بخاری سے جو اس وقت لاہور سٹاک ایکسچینج کے صدر تھے اور بعد ازاں وہ لاہور چیمبرز آف کامرس کے صدر بھی بنے، پریس کلب کیلئے جگہ فراہم کرنے کی درخواست کی جس پر وہ بخوشی آمادہ ہو گئے اور 87 مال روڈ پر اپنے آفس کے سامنے خالی پڑی اپنی ایک عمارت ہمارے حوالے کر دی۔ کلب کے احیاء کی مہم میں دستخط کرنے والے صحافی ہی اس کلب کے ممبر بنے جن پر مبنی ووٹرز لسٹ کی بنیاد پر جون 1983ء میں پریس کلب کے انتخابات ہوئے، جس میں امتیاز راشد

(جنگ) صدر اور قدرت اللہ چودھری (نوائے وقت) سیکرٹری منتخب ہوئے جبکہ گورننگ باڈی کی 4 نشستوں پر انجم رشید، محمود زمان، صادق جعفری اور اظہر جعفری کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس طرح بے سروسامانی میں مارشل لاء کی لٹکتی ہوئی تلوار کے نیچے صحافی برادری نے کٹھن کے دور سے نکل کر لاہور پریس کلب کی شکل میں اپنا ایک ٹھکانہ بنالیا جبکہ رشید صدیقی گروپ کا پریس کلب دیال سنگھ مینشن میں ہی موجود تھا جہاں سے ہمارے خلاف مزاحمت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کلب کی پہلی تنظیم 6 ماہ کیلئے منتخب ہوئی تھی۔ چنانچہ 30 دسمبر 1983ء کو نئی گورننگ باڈی کے انتخابات کرائے گئے۔ اس میں اتفاق رائے سے عزیز مظہر صاحب کو بلا مقابلہ صدر منتخب کر لیا گیا جو مارشل لاء کے جبر میں این پی ٹی کے اخبار ''مشرق'' سے نکالے جا چکے تھے، چنانچہ انتخابات میں ووٹنگ صرف سیکرٹری اور گورننگ باڈی کی 4 نشستوں پر ہوئی۔ میں خاور نعیم ہاشمی کے مقابلے میں سیکرٹری کا امیدوار تھا اور کوڑے کھانے والے اس دور کے بھی معروف صحافی خاور نعیم ہاشمی کا مقابلہ کرنا میرے لئے بہت کٹھن مرحلہ تھا کیونکہ ''جنگ'' کے نیوز ایڈیٹر اطہر مسعود خم ٹھونک کر خاور نعیم ہاشمی کی حمایت کیلئے میدان میں آ چکے تھے اور پورے ''جنگ'' گروپ کو متحرک کر چکے تھے۔ مجھے ''نوائے وقت'' کے ساتھ ''ڈان'' گروپ کی بھی حمایت حاصل تھی اور نثار عثمانی صاحب، صفدر میر اور ''امروز'' کے شفقت تنویر مرزا میری سرپرستی کر رہے تھے، چنانچہ الیکشن میں برج الٹ گیا اور سیکرٹری کی نشست پر کامیابی میرا اعزاز ٹھہری۔ وہ اچھی قدروں والا دور تھا، اس لئے الیکشن کے بعد خاور نعیم ہاشمی کے ساتھ مثالی دوستی کا رشتہ استوار رہا جو سیاسی، نظریاتی بُعد کے باوجود آج کے دن تک قائم ہے۔ گورننگ باڈی میں شاہین قریشی، عبدالرب صدیقی، فاروق علی اعوان اور ''نوائے وقت'' کے اس وقت کے ڈسٹرکٹ نیوز ایڈیٹر ممتاز گیلانی صاحب منتخب ہوئے۔ کلب کو چلانے کیلئے کن کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا اور ''تجزیہ'' پروگرام پر جس میں مارشل لاء مخالف اپوزیشن اتحاد ایم آر ڈی کے لیڈران کو مدعو کیا جاتا تھا، مارشل لاء حکومت کی جانب سے بالخصوص مجھے سنگین نتائج کی کیسی کیسی دھمکیاں ملتی رہیں۔ یہ ایک الگ داستان ہے جو کسی دوسرے وقت پر ادھار رکھتا ہوں۔ سید محسن رضا بخاری نے بھی اس ناطے سے جرنیلی آمریت کا بہت دباؤ برداشت کیا مگر وہ بھی ہمارے دم قدم رہے۔ ''نوائے وقت'' سے میری وابستگی کے ناطے محترم مجید نظامی کو بھی خاصے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا انہوں نے مجھ سے تذکرہ بھی کیا مگر انہوں نے مجھے کلب کی سیاست سے دستبردار ہونے کا کبھی نہ کہا۔

1985ء کے کلب کے انتخابات میں میں نے اپنے بجائے جواد نظیر کو سیکرٹری کا امیدوار بنایا۔ عزیز مظہر صاحب اس وقت بھی بلامقابلہ صدر منتخب کر لئے گئے تھے۔ ہماری بھرپور مہم سے جواد نظیر سیکرٹری منتخب ہو گئے جن کے مدمقابل عبدالرب صدیقی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جواد نظیر نے منتخب ہوتے ہی اپنی انفرادیت قائم کرنے کیلئے ایک بچگانہ حرکت کی اور پریس کلب کو حمید نظامی روڈ پر ''لاہور پیلس'' کے سامنے والی گلی میں اپنے ایک دوست کے گھر منتقل کر دیا جن کے ساتھ ان کی جلد ہی اَن بن ہو گئی تو پریس کلب کے پھر سے بے ٹھکانہ ہونے کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس موقع پر چودھری خادم حسین اور چند دوسرے سینئر ساتھیوں کا فہم و تدبر کام آیا اور ان کی کوششوں سے کلب کو ایبٹ روڈ پر پرنس سینما سے ملحقہ پلازہ میں فرسٹ فلور پر ٹھکانہ مل گیا۔ 1986ء کی باڈی کیلئے پریس کلب کا انتخاب اسی جگہ پر عمل میں آیا۔ چودھری خادم حسین اور ''ڈان'' گروپ کے ساتھی مجھے دوبارہ سیکرٹری کیلئے انتخاب لڑنے پر مجبور کر چکے تھے جس کیلئے انہوں نے محترم مجید نظامی سے بھی بطور خاص اجازت لے لی تھی، اس لئے میں دوبارہ انتخابی میدان میں آ گیا اور جواد نظیر نے میرے اچھے دوست شاہین قریشی کو میرے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ اس بار حسین نقی صاحب کو بلامقابلہ صدر منتخب کیا گیا۔ چنانچہ سیکرٹری کی نشست پر گھمسان کا رن پڑا اور میں پہلے سے بھی زیادہ مارجن کے ساتھ سرخرو ہوا۔ گورننگ باڈی میں رؤف طاہر، جمیل چشتی، فیاض چودھری اور امتیاز اعوان منتخب ہوئے۔ اس وقت تک کلب کو چلانے کیلئے انتہا درجے کی مالی دشواریاں حائل ہو چکی تھیں اور ہمارے پاس کچن چلانے اور ملازمین کو تنخواہ تک ادا کرنے کے پیسے بھی موجود نہیں تھے۔ ہم نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور جیسے تیسے آدھا ٹینور پورا کر لیا مگر پھر حسین نقی صاحب نے عملاً ہاتھ کھڑے کر دیئے اور گورننگ باڈی کے اجلاس میں کلب کو وائنڈ اَپ کرنے کی تجویز دے دی، میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور اجلاس کے بعد رؤف طاہر صاحب کو ساتھ لیکر اپنے دوست شیخ روحیل اصغر کے پاس آ گیا جنہوں نے ملازمین کی تنخواہ اور کچن چلانے کیلئے کلب کو معقول گرانٹ دے دی، اس طرح ہم سے پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ اسی دوران فیاض چودھری صاحب نے گورننگ باڈی کے ایک اجلاس میں بتایا کہ رشید صدیقی گروپ کا پریس کلب ہمارے ساتھ مفاہمت کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت دیال سنگھ مینشن والے لاہور پریس کلب کے صدر ظفیر ندوی اور سیکرٹری تسلیم احمد تصور تھے۔ حسین نقی صاحب نے ان کے ساتھ سلسلۂ جنبانی شروع کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ اس میں فیاض چودھری میرے رفیق کار تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ

جونیجو حکومت کے قائم ہونے کے بعد رشید صدیقی گروپ کو صحافی برادری میں اپنے غیر مؤثر ہونے کا ادراک ہو گیا تھا، اس لئے وہ کمیونٹی میں مزید لعن طعن سے بچنے کیلئے ہمارے ساتھ مفاہمت کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے لئے ویسے ہی مالی حالات پریشان کن ہو چکے تھے، اس لئے عملاً دوطرفہ برف پگھلی اور ہمارے دوطرفہ مذاکرات اپنی اپنی باڈی ختم کر کے مشترکہ پریس کلب تشکیل دینے پر منتج ہوئے، جس کی دونوں تنظیموں نے اپنی اپنی گورننگ باڈی سے منظوری لی اور پھر دونوں تنظیموں کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا، چنانچہ ہم نے اپنا سارا سامان اٹھا کر دیال سنگھ مینشن منتقل کر دیا۔ کلب کی مشترکہ ووٹرز لسٹوں کی تیاری اور نئے انتخابات کیلئے بھی مشترکہ طور پر 2 رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جو میرے اور ظفیر ندوی پر مشتمل تھی۔ اس عبوری عرصہ میں پریس کلب کا کوئی وجود نہیں رہا تھا اور 2 رکنی کمیٹی ہی سارے انتظامی معاملات چلا رہی تھی۔ ہم نے دونوں کلبوں کی ووٹرز لسٹیں اپنے سامنے رکھیں اور پھر اخباری دفاتر میں باقاعدہ سروے کر کے مشترکہ ووٹرز لسٹ تیار کی جو تقریباً 450 ممبران پر مشتمل تھی۔ یہ فہرست میرے اور ظفیر ندوی کے مشترکہ دستخطوں کے ساتھ جاری ہوگئی، جس کی بنیاد پر ہم نے مشترکہ پریس کلب کے انتخابات کا شیڈول جاری کر دیا۔ اسی دوران رشید صدیقی کی نیت میں پھر فتور آ گیا اور انہوں نے پہلے ہی کی طرح لاہور پریس کلب کی پھر ایک ڈمی تنظیم کھڑی کر دی جس میں طارق اسماعیل (پاجی) کو صدر اور سید محمود جعفری کو انہوں نے سیکرٹری قرار دے دیا۔ اس ڈمی تنظیم نے پہلا کام ہمارے جاری کردہ انتخابات کے شیڈول کو سول کورٹ میں چیلنج کرنے کا کیا اور وہاں سے کلب کے انتخابات کے خلاف حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ یہ کیس تقریباً 2 سال تک چلتا رہا جس کی سماعتوں کے دوران کمرۂ عدالت میں متعدد بار میرے اور سید محمود جعفری کے مابین تلخ کلامی بھی ہوئی۔

اسی دوران 1987ء میں برنا گروپ اور رشید صدیقی گروپ کے باہمی اختلافات سے عاجز آئے ارکان نے پروفیشنل ٹریڈ یونین کو سرگرم کرنے کیلئے پی ایف یو جے (دستور گروپ) تشکیل دے دیا، جس میں میں بھی شامل ہو گیا۔ رؤف طاہر اور طارق اسماعیل بھی اسی گروپ کا حصہ بن گئے، چنانچہ رشید صدیقی گروپ عملاً منظر سے غائب ہو گیا جو پہلے ہی اس کے لئے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ 1989ء میں سول کورٹ سے حکم امتناعی خارج ہوا تو ہم نے اسی مشترکہ ووٹرز لسٹ پر دوبارہ انتخابی شیڈول جاری کر دیا۔ اس وقت دستور گروپ تشکیل پانے کے باعث پریس کلب کے انتخابات کی فضا کچھ اور ہی رنگ اختیار کر چکی تھی اور دونوں گروپوں میں محاذ آرائی عروج پر

تھی۔ہم نے دستور گروپ کے پلیٹ فارم سے ہی پریس کلب کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور پروفیشنل گروپ تشکیل دے کر اپنے پینل کا اعلان کر دیا جس میں رؤف طاہر صدر اور میں سیکرٹری کا امیدوار تھا جبکہ جلیل الرحمان، حامد ریاض ڈوگر اور رائے حسنین طاہر گورننگ باڈی کیلئے ہمارے پینل کا حصہ بنے اور انتخابی مہم میں جان ڈال دی۔کلب کی سیاست میں میری سابقہ کامیابیوں کے باعث برنا گروپ کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں دستور گروپ کے ہاتھوں ناکامی اس کے کھاتے میں نہ آ جائے، چنانچہ اس میں شامل میرے دوستوں نے میرے ساتھ مفاہمت کا راستہ نکالنے کی کوشش کی۔اورنگ زیب، الطاف ملک اور بعض دوسرے دوست میرے پاس یہ پیشکش لے کر آئے کہ ہم پہلی مشترکہ باڈی کیلئے عہدیدار بلا مقابلہ منتخب کر لیتے ہیں، اس کیلئے انہوں نے چودھری خادم حسین کو صدر اور مجھے بلا مقابلہ سیکرٹری منتخب کرانے کی تجویز پیش کی، جس پر میں نے اس لئے معذرت کر لی کہ اول تو میں بلا مقابلہ انتخابات کے حق میں ہی نہیں تھا اور دوسرا دستور گروپ کیلئے بھی انتخابی میدان میں یہ پہلا چیلنج تھا۔چنانچہ میں دستور گروپ کے پینل کے ساتھ ہی انتخابی میدان میں اترا، جس کے بعد برنا گروپ نے اپنا پینل تشکیل دیا اور ناصر نقوی کو صدر اور فیاض چودھری کو سیکرٹری کا امیدوار بنایا۔کلب کی سیاست میں یہ پہلا موقع تھا کہ دوطرفہ انتخابی مہم پورے زور وشور سے چلی اور صحافیوں کے تقریباً تمام گروپ اَنا کا مسئلہ بنا کر دستور گروپ کو مات دینے کیلئے میدان میں آ گئے۔چنانچہ اس انتخاب میں غیر یقینی طور پر ہمارے پورے پینل کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔رائے حسنین طاہر کے تجزیے کے مطابق اس میں ''جھرلو'' کا بھی خاصا عمل دخل تھا۔وہ بعض ٹھوس شواہد کی بنیاد پر بیلٹ بکس اٹھا لے جانے کا سوچ رہے تھے مگر ہم نے انہیں انتخابی عمل میں رخنہ ڈالنے سے روک دیا۔اس انتخاب میں ایک اہم واقعہ یہ بھی ہوا کہ سید محمود جعفری نے یقیناً رشید صدیقی کی شہ پر عین پولنگ والے دن دیال سنگھ مینشن والے پریس کلب کو تالہ لگا دیا جہاں پولنگ کا انعقاد ہونا تھا۔اس مشکل صورتحال میں لیبر لیڈر اور صحافی احسان اللہ خان ہمارے کام آئے جن کا دیال سنگھ مینشن ہی میں اپنا فلیٹ تھا۔چنانچہ الیکشن کمیٹی کو وہاں بٹھا کر پولنگ کو ممکن بنایا گیا۔اس طرح ہماری مرتب کردہ ووٹرز لسٹ کی بنیاد پر مشترکہ پریس کلب کا پہلا انتخاب ممکن ہو پایا۔اگرچہ ہمارا پینل اس انتخاب میں کامیاب نہ ہوسکا مگر اس سے مشترکہ پریس کلب کی بنیاد ضرور پڑ گئی اور پھر دیال سنگھ مینشن والے پریس کلب کے دروازے بھی اس کیلئے کھل گئے۔

1990ء کے انتخاب کے نتیجہ میں غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ پنجاب منتخب ہوئے جن کے صحافی برادری کے ساتھ اپنائیت والے مراسم تھے، چنانچہ صحافی برادری کی جانب سے ان سے پہلا مطالبہ لاہور پریس کلب کیلئے جگہ کے حصول کا ہی آیا۔ اس حوالے سے میں بطور خاص سید انور قدوائی، افتخار (فتنہ) احمد اور لیاقت قریشی مرحوم کا ذکر کروں گا جو غلام حیدر وائیں سے پریس کلب کی جگہ کا وعدہ لئے بغیر ان کی پریس کانفرنس یا پریس ٹاک آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ وائیں مرحوم نے متعلقہ محکموں سے مشاورت کر کے لاہور پریس کلب کیلئے باغ جناح میں موجود لیڈز کلب کا انتخاب کر لیا جو اس وقت عملاً ویران پڑا ہوا تھا، جب ان کی جانب سے اس کا اعلان ہوا اور سروے بھی ہو گیا تو خواتین تنظیموں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ چنانچہ وائیں مرحوم کو اپنے فیصلہ سے رجوع کرنا پڑا اور پھر ان کی نظر انتخاب شملہ پہاڑی پر موجود واسا کے دفتر پر پڑی۔ یہ جگہ انہوں نے نہ صرف لاہور پریس کلب کیلئے مختص کی بلکہ اس پر کروڑوں روپے کی لاگت سے عمارت بھی تعمیر کرا دی۔ ان کے اس فیصلہ پر واسا لیبر یونین نے بھی خاصا احتجاج کیا تھا جس پر پریس کلب کے سامنے پہلے سے موجود واسا کے دفتر کو اس کیلئے ہی مختص رہنے دیا گیا۔ بعد ازاں یہ دفتر شملہ پہاڑی پریس کلب کے پچھواڑے منتقل ہوا اور اب پوری شملہ پہاڑی پر پریس کلب ہی کا حصہ بن چکی ہے۔ آج جس پریس کلب اور اس کے ماتحت جرنلسٹس ہاؤسنگ فاؤنڈیشن پر بھی کلب کے ہر انتخاب کے موقع پر سیاست کا بازار گرم ہوتا ہے اور کروڑوں روپے کا کھیل کھیلا جاتا ہے، ان دونوں کی بنیادیں رکھنے میں میری کاوشوں کا ہی عمل دخل ہے مگر پریس کلب کے عہدیداروں کی آویزاں تختی پر 1984ء سے 1986ء تک کے پریس کلب کے عہدیداروں کے نام یہ جواز بنا کر نہیں لکھوائے گئے کہ وہ مشترکہ پریس کلب کے زمرے میں نہیں آتے۔ اگر یہ جواز تسلیم کر لیا جائے تو پھر 1990ء والا پریس کلب بھی متفقہ پریس کلب نہیں تھا کیونکہ رشید صدیقی گروپ کا ڈمی پریس کلب اس وقت بھی موجود تھا، اس لئے کلب کے عہدیداروں کی تختی پر ہمارے نام لکھوانا کسی کی محض اَنا کی تسکین ہی ہو سکتا ہے۔ اس اَنا کی تسکین کا ہر اس موقع پر اہتمام کیا جاتا تھا جب پی ایف یو جے (دستور) اپنا پینل بنا کر انتخابی میدان میں اترتی تھی۔ اس ناطے سے کلب کا ایک انتخاب تو دستور گروپ کے ساتھ نفرت کی انتہا تک پہنچا۔ اس انتخاب میں ہمارے پینل سے خالد کاشمیری صدر اور میں سیکرٹری کا امیدوار تھا اور ہماری کامیابی کی فضا اس طرح ہموار ہو چکی تھی کہ کلب کے سالانہ چندے کی مقررہ وقت تک عدم ادائیگی

کے باعث روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ انتخابی فہرست سے مکمل آؤٹ ہو گیا تھا۔ 60 کے قریب یہ سارے ووٹ برنا گروپ کے تھے، چنانچہ ایک سازش تیار کی گئی اور پولنگ والے دن کلب کا منیجر سرمد گل ووٹرز لسٹ لیکر غائب ہو گیا۔ چنانچہ یہ افسوسناک واقعہ بھی کلب کی تاریخ کے المناک ابواب میں شامل ہوا کہ پولنگ والے دن کلب کے انتخابات ہی منعقد نہ ہو پائے اور پھر اگلے دن ووٹرز لسٹ میں ''فرنٹیئر پوسٹ'' کے ارکان کے نام شامل کر کے انتخاب کرایا گیا۔ پھر بھی مجھے صرف 29 ووٹوں سے شکست ہوئی جو عملاً شکست فاتحانہ تھی۔

اب پنجاب جرنلسٹس ہاؤسنگ سوسائٹی کے قیام کا ذکر بھی سن لیجئے۔ 2004ء میں میں پی ایف یو جے (دستور) کا صدر تھا۔ میں نے وزیراعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی سے پی ایف یو جے کے وفد اور لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور ملتان پریس کلب کے صدور کی مشترکہ ملاقات کا اہتمام کیا جس کا بنیادی ایجنڈا ہی پنجاب میں جرنلسٹس کالونیوں کی بنیاد رکھوانا تھا۔ راولپنڈی، اسلام آباد پریس کلب کے صدر حاجی نواز رضا اور ملتان پریس کلب کے صدر راؤ شمیم اصغر اس اجلاس میں شریک ہوگئے اور لاہور پریس کلب کے صدر ارشد انصاری بھی اجلاس میں شرکت کیلئے کلب سے روانہ ہو گئے مگر برنا گروپ کا تعصب آڑے آیا اور اس کی قیادت کے ٹیلی فونک دباؤ پر وہ راستے سے ہی واپس لوٹ گئے۔ اس اجلاس میں ہی وزیراعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے پنجاب جرنلسٹس ہاؤسنگ فاؤنڈیشن کا اعلان کیا، جس کی مینجنگ کمیٹی کے بنیادی ارکان میں بطور صدر پی ایف یو جے میرا اور بطور صدر پی یو جے سید انور قدوائی کا نام بھی شامل تھا، اسی طرح برنا گروپ کو بھی مینجنگ کمیٹی میں نمائندگی دی گئی اور اسی بنیاد پر جرنلسٹس ہاؤسنگ فاؤنڈیشن کے ماتحت لاہور، اسلام آباد، ملتان اور فیصل آباد میں صحافی کالونیوں کی بنیاد رکھی گئی مگر اللہ کی پناہ۔ تعصب ایسا ہے کہ ہمارا کوئی بھی کریڈٹ کسی کھاتے پر چڑھنے ہی نہیں دیا جاتا اور برنا گروپ کے کئی اچھے دوست بھی اس تعصب کے زیر اثر آ جاتے ہیں۔

واقعات سمیٹتے سمیٹتے بھی کافی پھیل گئے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو اپنی آپ بیتی میں سارے تذکرے کروں گا۔ ہمارے ساتھ روا رکھے جانے والے تعصب کا صرف ایک نمونہ آپ کو دکھانا چاہوں گا جو پنجاب اسمبلی پریس گیلری کمیٹی کے 1995ء کے انتخاب کا ہے، اس انتخاب میں صدر کیلئے چودھری خادم حسین نے بالاصرار مجھے آمادہ کیا اور جب پولنگ کا دن آیا تو وہ اپنے ہی انتخاب کی پاسداری کئے بغیر صدر کیلئے میرے مدمقابل آ گئے، تاہم اللہ کے فضل اور مخلص دوستوں

کے بے لوث تعاون سے اس انتخاب میں بھی خاصے مارجن کے ساتھ مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔
چودھری خادم حسین کا میرے مدمقابل آنا بھی ان پر برنا گروپ کی قیادت کے دباؤ کا ہی شاخسانہ تھا۔اگلے سال برنا گروپ کی جانب سے صدر کیلئے ظہیر شہزاد کو میرے مدمقابل لایا گیا اور اللہ نے پھر میری عزت رکھی۔اس سے اگلے سال رؤف طاہر دستور گروپ کے امیدوار بنے اور کامیاب ہوئے۔وہ سعودی عرب جا مقیم ہوئے تو پریس گیلری کمیٹی کے 1999ء کے انتخاب میں بھی مجھے میدان میں آنا پڑا۔نجم ولی خان صدر کیلئے میرے مدمقابل آئے اور یہ مقابلہ میرے لئے بہت ٹف ثابت ہوا کیونکہ نجم ولی خان ہمارے ہی گروپ کا حصّہ تھے اور رؤف طاہر کے ساتھ سیکرٹری منتخب ہو چکے تھے۔ مجھے اس انتخاب میں سخت مقابلے کے ساتھ 2 ووٹوں سے کامیابی حاصل ہوئی مگر معاف کیجئے،محاذ آرائی اور تعصبات کی اس سیاست میں ہماری کمیونٹی کا کوئی بھلا نہیں ہوا۔ہم نے پی ایف یو جے کو یکجا کرنے کی بھی سرتوڑ کوششیں کیں۔ برنا گروپ کی جانب سے چودھری خادم حسین، اورنگزیب اور عطاء المصور بھی پیش پیش رہے اور پھر پی ایف یو جے (برنا) کے صدر آئی ایچ راشد بھی ان کاوشوں میں شریک ہوئے۔ایک سٹیج پر پی ایف یو جے کے دونوں گروپوں کی مشترکہ ایف ای سی کرانے پر بھی اتفاق ہو گیا مگر عین موقع پر گرہ توڑ دی گئی۔چودھری خادم حسین کو پی ایف یو جے برنا گروپ کے اس وقت کے صدر آئی ایچ راشد مرحوم کے یہ الفاظ یقیناً یاد ہونگے کہ ہمارے ''مکے'' نے کام خراب کیا ہے۔ان کا اشارہ یقیناً عبدالحمید چھاپڑہ کی جانب تھا۔اگر اس وقت صحافی برادری پی ایف یو جے کے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جاتی تو آج پی ایف یو جے کے 5،4 گروپوں کی دکانداریوں کی نوبت نہ آتی۔ یہ معاملاتِ سود و زیاں ہیں۔اگر چودھری خادم حسین صاحب مزید گرہ کھولیں گے تو میری کتاب جلد مرتب ہو جائے گی۔

''ایہہ گلّاں ہُن کرن دیاں نئیں''

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جس نے سالہا سال اقتدار کے مزے لوٹے ہوں اور حکومتی انتظامی مشینری کو اپنے گھر کی باندی بنا کر رکھا ہو' اقتدار سے محرومی کے بعد اپنے ملک کے کسی ہسپتال کو اس قابل بھی نہ سمجھے کہ وہاں اس کا علاج معالجہ ممکن ہو سکے تو ملک میں علاج معالجہ کی سہولتوں کی اس محرومی کا تھپڑ اسے اپنے منہ پر مار لینا چاہیے۔ یا پھر وہ خود کو اتنا نازک مزاج نہ بنائے کہ ملک میں موجود علاج معالجہ کی سہولتوں سے استفادے کا وہ روادار ہی نہ ہو۔ سلطانی جمہور میں دعویٰ تو جمہور کی حکمرانی کا کیا جاتا ہے مگر اس سلطانی میں جمہور کو صحت' تعلیم اور روزگار کی جو اور جیسی کیسی سہولتیں دستیاب ہوتی ہیں' سلطان خود اور اپنی اولاد و عزیز و اقارب کو ان سہولتوں کے قریب پھٹکنے دینا بھی اپنی توہین سمجھے تو سلطانی جمہور کے تصور کو اپنے ہاتھوں رگیدنے کے ہی مترادف ہے۔

اگر آپ جمہور (عام آدمی) کو یہ چکمہ دیکر اس کا ووٹ لیتے اور اپنے اقتدار کا مینڈیٹ حاصل کرتے ہیں کہ سلطانی جمہور کے اصل اور تمام ثمرات اسی کو ملیں گے تو پھر سلطان کا اپنا چلن بھی جمہور کے ہمقدم ہونا چاہیے۔ اگر وہ جمہور کو صحت' تعلیم' روزگار کی اچھی سہولتیں نہ دے پائے تو جمہور کیلئے جو دستیاب سہولتیں ہیں' سلطان اور اسکے خاندان و عزیز و اقارب کو بھی انہی سہولتوں سے مستفید ہونا چاہیے۔ نہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے بیرون ملک علاج معالجہ کو اپنا حق سمجھنا چاہیے' نہ اعلیٰ تعلیم کیلئے اپنے بچوں کو بیرون ملک بھجوانا چاہیے اور نہ ہی ملک سے باہر اپنے اور اپنے اہل خانہ کے روزگار کا کوئی وسیلہ بنانا چاہیے۔ آپ اپنی آسائشوں کو اپنے ملک اور عوام پر قربان کرینگے تو ملک کی دھرتی کے ساتھ آپکی وابستگی اور بھی پختہ ہو گی اور اس ملک کے وسائل کو عوام کیلئے مختص کرنے کا جذبہ آپ میں اور بھی اجاگر ہو گا۔ اس طرح آپ کا جینا مرنا اپنے ملک اور عوام کے

ساتھ ہی وابستہ ہوگا۔ مگر ہمارے کلچر میں تو حکمران اشرافیہ طبقات میں ایسے جذبات و احساسات کبھی پنپ ہی نہیں پائے۔ سو اقتدار کے مزے یہاں لوٹتے جاتے ہیں' قومی وسائل کو یہاں رہ کر دوران اقتدار شیر مادر سمجھ کر نچوڑا اور چھوڑا جاتا ہے اور اقتدار سے محرومی کے بعد کمر میں اٹھنے والی ہلکی سی ٹیس بھی بیرون ملک علاج معالجہ کی ترغیب دیتی نظر آتی ہے۔

بھائی صاحب! اپنے اقتدار کے دوران اپنے ملک کے ہسپتالوں میں بھی ایسی سہولتیں مہیا کر دیا کریں کہ عوام تو کجا' خود آپ کو بھی علاج معالجہ کیلئے ملک سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اپنے ملک کا معیار تعلیم بھی اتنا بلند کر دیں کہ بیرون ملک کے کسی تعلیمی ادارے کی کوئی ڈگری آپ کے' آپ کے بچوں کے اور عوام کیلئے بھی کوئی اعزاز نہ بن سکے اور ملک کے اندر ہی روزگار کے ایسے مواقع بنا دیئے جائیں کہ اچھی ملازمت کیلئے ملک سے باہر جانے میں کوئی کشش ہی نہ رہے۔ آپ خود تو سالہا سال اقتدار کے مزے لوٹیں' اپنے اپنے اقتدار کی باریاں لگائیں اور اس اقتدار و اختیار کو جمہور کی فلاح کیلئے بروئے کار لانے کی بجائے اسے راندۂ درگاہ اور اپنا مطمح بنانے کیلئے بے دریغ استعمال کریں تو سرکار! آپ اقتدار سے محرومی کے بعد ملک سے باہر اپنا مسکن بنائیں گے اور ملکی پھلکی بیماری کا علاج بھی ملک سے باہر کرانا اپنی مجبوری بنالیں گے تو آپ کے چلن پر انگلیاں تو اٹھیں گی......

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

میاں نواز شریف کے بعد اب میاں شہباز شریف کو بھی علاج معالجہ کیلئے لاہور ہائیکورٹ نے ملک سے باہر جانے کی اجازت دی ہے تو عوام اشرافیہ کے اس ''استحقاق'' پر انگلیاں اٹھانے میں حق بجانب ہیں۔ آپ قومی لیڈر کی حیثیت سے عوام کے ساتھ جینے مرنے کے جذبے سے عاری اور سونے کا نوالہ کھانے کے عادی ہونگے تو ملک اور عوام کی خاطر پھانسی کے پھندے پر جھولنے والے مصر کے مرسی اور خود ہمارے ملک کے بھٹو جیسے قومی قائد کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔ آپ اقتدار سے محرومی کے بعد بھی اپنی آسائشات کی فکر اور زندگی کی کٹھنائیوں والے دن

ملک سے باہر گزارنے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں تو عوام کے دلوں میں موجود اپنے لئے اندھی عقیدت کو نکال پھینکنے کے اہتمام کا باعث بھی آپ خود ہی بنتے ہیں۔ جناب! آپ کے دل میں عوام کا درد ہے تو اس درد کو لے کر آپ ملک سے باہر کیوں جاتے ہیں' عوام آپ کو اپنی دھرتی پر ہی سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ آپ خود سے وابستہ عوام کی عقیدت اور وارفتگی کو اپنے پاؤں کی زنجیر بنالیں تو عوام سے دور ہونے کا آپ کبھی تصور بھی نہیں کر پائیں گے مگر ہمارا تو سارا سیاسی کلچر ہی سلطانی جمہور کو اپنی سلطانی مستحکم بنانے کیلئے استعمال کرنے والا بن گیا ہے جس میں بس......
''درویشی بھی عیاری ہے' سلطانی بھی عیاری''۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ سلطانی جمہور کے نام پر منصب سلطانی پر فائز ہونیوالا ہمارا ہر حکمران اسی کلچر میں لتھڑا ہوتا ہے۔ اس کلچر میں بس سابقین ہی معتوب اور گردن زدنی ٹھہرتے ہیں اور اپنے سابقہ ہونے پر ایسے ہی عتاب سے گزرنے کا حکمرانوں کو احساس ہی نہیں ہو پاتا۔ سو بلیم گیم کا یہ گھن چکر آج پورے سیاسی ماحول کو گدلا چکا ہے جس میں تحمل' برداشت اور رواداری کا جذبہ فروغ پانے کے راستے ہی کہیں گم ہو گئے ہیں۔ اس ماحول میں حکمران طبقات کے معتوبین کو کہیں سے عدالتی انصاف ملتا ہے' چاہے وہ انصاف و قانون کے تقاضوں کے مطابق ہی کیوں نہ ہو' تو رواداری کو کند چھری کے ساتھ ذبح کرنے والے کلچر میں بلیم گیم والا سارا گند عدلیہ کی طرف اچھالنے کا بے رحم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آج سوشل میڈیا کے ذریعے پھینکے جانے والے اس گند نے ہماری ساری فضا متعفن بنا دی ہے جس میں عدلیہ کیلئے ایسے ایسے القاب سننے اور ایسے ایسے مظاہر دیکھنے کو مل رہے ہیں کہ قانون کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری بے بسی کی تصویر بنے دانت پیستی نظر آتی ہے۔ جس معاشرے میں ذاتیات پر اتر کر انصاف کی عملداری کی بھد اڑائی جائے وہاں انصاف کی فصل میٹھا پھل دینے سے پہلے ہی اجڑ جاتی ہے۔ ہمارے اقتدار میں موجود اور اقتدار سے محروم سارے حکمران طبقات اپنے اپنے رویوں سے انصاف کی فصل اجاڑنے کا اہتمام ہی تو کر رہے ہیں سو......

کس دا دوش اے' کس دا نئیں اے
ایہہ گلاں ہن کرن دیاں نئیں

عوامی مقبولیت کے زعم سے لگی رونقیں

اپنی عوامی مقبولیت کے زعم میں ایسی غلطی ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دوسرے دورِ حکومت میں کی تھی۔ انہیں بلاشبہ ایسی مقبولیت حاصل تھی کہ 1970ء کے انتخابات میں انہوں نے جاگیردار کی چارپائی کی پائنتی کے پاس زمین پر بیٹھنے والے اسکے مزارعہ کو پارٹی ٹکٹ دیا تو اس نے اتھل پتھل کی قدرت رکھنے والے اس جاگیردار کو ہی انتخابات میں چاروں شانے چت کر دیا چنانچہ بھٹو کی مقبولیت کی یہ ضرب المثل بن گئی کہ وہ کسی کھمبے کو بھی امیدوار بنائیں تو وہ بھی وراثتی سیاست میں موجود کسی بُرج کو الٹا دے، اور قوم نے 70ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے مفلس و لاچار امیدواروں کے مقابلے میں بڑے بڑے برج الٹتے دیکھے بھی۔ اپنے اقتدار کی دوسری ٹرم کیلئے بھی بھٹو کا عوامی مقبولیت والا زعم انکے ذہنِ رسا کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا رہا چنانچہ انہیں اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ اپنے ''روٹی، کپڑا، مکان'' کے مقبول نعرے کو عملی جامہ نہ پہنا کر انہوں نے عوام میں اپنی طلسماتی شخصیت کا سحر خود ہی توڑ دیا ہے۔ مگر انہیں اقتدار کے نشے میں اس حقیقت کا ادراک نہ ہو پایا اور انہوں نے عوامی مقبولیت کے زعم ہی میں قبل از وقت عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا چنانچہ عوام کی کھسر پھسر پر کان دھرنے والے انکے مخالف سیاست دانوں نے جھٹ پٹ ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر پیپلز پارٹی کے مقابل انتخابی اتحاد تشکیل دے دیا جسے ''9 ستاروں'' کے ساتھ پاکستان قومی اتحاد کا نام دیا گیا۔ اس اتحاد میں وہ سارے سیاسی بزرجمہر شامل تھے جنہوں نے 70ء کے انتخابات میں بھٹو کے بے وسیلہ امیدواروں کے ہاتھوں عبرتناک شکست کھائی تھی۔ اس انتخابی اتحاد نے تحریک نظام مصطفیٰؐ کا لیبل لگا کر عوام میں بھٹو کی سیاست کے ایسے بخیئے ادھیڑے کہ انکی عوامی مقبولیت فضاؤں میں تحلیل ہوتی نظر آئی۔ چنانچہ بھٹو کو انتخابی نتائج الٹانے کیلئے ''دھرلو'' کا سہارا لینا پڑا۔ اسکی بنیاد پر بھٹو مرحوم کو قومی اسمبلی میں 80 فیصد کے قریب

نشستیں حاصل ہوگئیں۔ پی این اے نے دو روز بعد ہونیوالے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا چنانچہ پولنگ والے روز پولنگ سٹیشنوں پر الو بولتے اور بس ''فرشتے'' ہی ووٹ ڈالتے نظر آئے جس سے قومی اسمبلی کے انتخابی نتائج کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی۔

بس پھر کیا تھا۔ قومی اتحاد کی سیاست نے نئی انگڑائی لی اور بھٹو حکومت کیخلاف پر تشدد تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس تحریک کے دوران دونوں جانب سے جتنی خونریزی ہوئی وہ ہماری انتخابی سیاست کے ایک المناک باب کی صورت میں تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہو چکی ہے جبکہ بھٹو مرحوم کا عوامی مقبولیت کا زعم انہیں بالآخر اقتدار سے محرومی اور تختۂ دار تک لے گیا۔ یہی بھٹو پیپلز پارٹی کی سیاست میں ابھی تک زندہ ہے اور خوشاب کی صوبائی نشست کے ضمنی انتخاب میں انکی پارٹی کا امیدوار محض 230 ووٹوں کے ساتھ اپنی ضمانت ضبط کرا کے اپنے قائد کی ''عوامی مقبولیت'' کو کیش کرا رہا ہے۔

یہ ساری تمہید مجھے اس لئے باندھنی پڑی کہ گزشتہ ہفتے پی ٹی آئی حکومت کے ایک اہم رکن اسد عمر نے وزیراعظم عمران خان سے منسوب کر کے یہ فقرہ فضا میں اچھالا تھا کہ وزیراعظم کسی بھی وقت اسمبلیاں توڑ کر نئے انتخابات کرا سکتے تھے۔ اس فقرے کے ذریعے اصل پیغام عوام کو یہ دیا جا رہا تھا کہ عمران خان کو نئے پاکستان کیلئے انکے متعین کردہ ایجنڈے پر کام نہیں کرنے دیا جا رہا۔ بلاشبہ قبل از وقت نئے انتخابات کیلئے وہی حکومت جاتی ہے جسے اپنے تئیں یہ یقین ہو کہ عوامی مقبولیت کی بنیاد پر وہ انتخابات میں پہلے سے بھی زیادہ اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ اسد عمر صاحب نے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے یہ نعرہ بھی ایجاد کر لیا ہے کہ ہمیں تو آپ کی خدمت کیلئے کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اب آپ کو ہمیں دو تہائی اکثریت کے ساتھ اقتدار میں بھجوانا ہوگا تاکہ ہم آپ کی فلاح پر مبنی پارٹی ایجنڈے کو بلا روک ٹوک پایۂ تکمیل کو پہنچا سکیں۔

ارے! اس عوامی مقبولیت والے زعم کا اندازہ آپ اب تک ہونیوالے 12 ضمنی انتخابات کے نتائج سے کیوں نہیں لگاتے۔ اس سے تو آپ کے چودہ طبق روشن ہو سکتے ہیں کہ ضمنی انتخابات والی بارہ قومی اور صوبائی نشستوں میں سے گیارہ نشستوں پر حکومتی مشینری پر اپنا کنٹرول ہونے کے باوجود آپ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے اس لئے ان نتائج میں تو آپ کی عوامی مقبولیت کا سفر تیزی کے ساتھ مراجعت کی جانب گامزن ہوتا نظر آ رہا ہے جس کی اصل وجہ یہی ہے کہ آپ عوام پر

سابق حکمرانوں کے ڈالے گئے روٹی، روزگار اور غربت مہنگائی کے مسائل کے بوجھ کو کم کرنے کے بجائے اس میں اتنے زیادہ اضافے کا باعث بنے ہیں کہ اسے اٹھاتے اٹھاتے راندۂ درگاہ عوام عملاً زندہ درگور ہونے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اس طرح آپکی عوامی مقبولیت کو تو مضطرب عوام کے ہاتھوں ریورس گیئر لگ چکا ہے جس کا ثبوت انہوں نے حالیہ ضمنی انتخابات کے نتائج کے پیش بھی کر دیا ہے۔ مگر عوامی مقبولیت کے زعم والا کیڑا اصل حقائق کے ساتھ آنکھیں چار ہونے ہی نہیں دیتا سو عوامی مقبولیت کا زعم بدستور غالب ہے اور اسی زعم میں سوچا جا رہا ہے کہ نئے انتخابات کی جانب بڑھ کر الیکٹرانک ووٹنگ کے طریق کار سے گنتی میں آنیوالے سارے ووٹ حکومتی امیدواروں کے پلڑے میں ڈالنے کا آسان راستہ نکال لیا جائے جیسا ڈسکہ کے پہلے ضمنی انتخاب میں ایسا کرشمہ دکھا کر اپنے ہارتے امیدوار کو وکٹری سٹینڈ پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس مقصد کو آسان بنانے کیلئے الیکٹرانک ووٹنگ کے طریق کار سے متعلق صدارتی آرڈی ننس بھی وفاقی کابینہ کے اجلاس میں جھٹ پٹ منظور کرا لیا گیا جس کی بنیاد پر اب اپنے لئے "ستے خیراں" والا اطمینان قلب حاصل کر لیا گیا ہے مگر حضور! آئینی اور قانونی تقاضوں کے برعکس شو آف ہینڈز کے لائے گئے آپ کے انتخابی طریق کار کو عملی قالب میں ڈھالنا آپ کیلئے ممکن نہیں ہو سکا اور عدالت عظمٰی نے آئین کی دفعہ 226 کو ڈھال بنا کر آپ کے لاگو کردہ صدارتی آرڈی ننس کا چھلکا اڑا دیا ہے تو اب الیکٹرانک ووٹنگ والے آپ کے مجوزہ صدارتی آرڈی ننس کو بھلا کیسے عوامی اور عدالتی پذیرائی حاصل ہو پائے گی۔ آپ عوامی مقبولیت کے زعم والی سیڑھیاں چڑھ کر قبل از وقت انتخابات کی جانب جاتے ہوئے اپنی مستقبل کی سیاست کیلئے محض خجل خواری کا اہتمام ہی کرینگے۔ اور اگر عوامی تحریک پی این اے جیسی بن گئی تو اسکے انجام پر مبنی ہماری تاریخ کے سیاہ ابواب کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ مجھے یا کسی اور کو مزید کسی قسم کا قیافہ لگانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ کیونکہ......

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

سیاست اور موسم کا تغیّر و تبدل

گزشتہ روز مارگلہ ہائی وے کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں وزیراعظم عمران خان تو دنیا میں گرم موسم کا دورانیہ بڑھنے پر متفکر نظر آتے تھے مگر ہم آج اپریل کے تیسرے ہفتے میں بھی سرد موسم کے مزے لے رہے ہیں اور گیزر کے گرم پانی کے بغیر نہانا مشکل نظر آتا ہے۔ اگر اس کائنات کے موسموں میں تغیّر و تبدل ہو رہا ہے تو اس میں بھی یقیناً خالق کائنات کی کوئی حکمت کارفرما ہوگی اور اس دھرتی کے سرکش انسانوں کیلئے کوئی آزمائش مقصود ہوگی اس لئے انگڑائی لے کر جو بن دکھاتے موسمیاتی ماحول پر ہمیں انسانی بقاء کے حوالے سے ضرور متفکر ہونا چاہیے۔ وزیراعظم کے بقول ماحولیات کے تحفظ کی بات صرف انکی حکومت نے کی ہے اور بدلتے موسموں کے مضمرات سے عوام کو بچانے کی فکر بھی انکی حکومت کو ہی لاحق ہے مگر آج تو حکومت کو سیاسی آلودگی اور مذہبی پیچیدگیوں سے عہدہ براٗ ہونے کے چیلنج بھی درپیش ہیں۔ بے شک اس چیلنج کو بھی قبول کریں مگر سیاسی آلودگی والے ماحول کو لحہ بھر کو جھٹک کر ماحولیاتی آلودگی کے مضمرات کے بارے میں بھی سنجیدگی سے غور کر لینا چاہیۓ کہ کہیں ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب سے ہمارے اعمال کی سزاؤں کا نقشہ تو نہیں بنایا جا رہا۔

ہمارے بعض روشن خیال حلقوں کو تو اس بات سے ہی چڑ ہے کہ طوفانوں، سیلابوں اور زلزلوں کی شکل میں رونما ہونے والی قدرتی آفات کے اسباب میں خالقِ کائنات خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے انسانوں کے لئے آزمائش اور گناہوں کی سزا کا تذکرہ کیوں کیا جاتا ہے۔ اس دھرتی کو جھنجوڑنے والے اور انسانی اوسان خطا کرنے والے زلزلوں پر مَیں نے اپنے ایک کالم میں اجتماعی توبہ کے لئے ربِّ کائنات سے رجوع کرنے اور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے

کی اپیل کی تو کئی ''روشن خیال'' احباب نے اسے میری دقیانوسی سوچ کے کھاتے میں ڈال دیا۔ انہیں زیرِ زمین پلیٹوں کے اپنے مقام سے سرکنے کے عمل سے تو زلزلے کے اسباب بنتے نظر آ جاتے ہیں مگر پلیٹس کس کے دستِ قدرت میں ہیں اور ان کے اوپر زمین کو کھڑا کس نے کیا ہے، ان کی روشن خیالی اس بحث کو دنیاوی سائنسی علوم کی ضد سمجھتے ہوئے انہیں اس کی تضحیک کے شوق میں مبتلا کر دیتی ہے۔ نظام کائنات کے بارے میں خالقِ کائنات سے بہتر بھلا اور کسی کو ادارک ہو سکتا ہے؟ اس کرۂ ارض پر تخلیق وتباہی کے سارے اسباب اسی ذاتِ باری تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہیں جس تک ناقص انسانی سوچ کی رسائی ممکن ہی نہیں، اگر ربّ کائنات نے خود اپنی کتابِ ہدایت، صحیفۂ آسمانی قرآن مجید میں زلزلوں اور دوسری قدرتی آفات کے ذریعے سرکش انسانوں کو آزمائش میں ڈالنے اور اپنے گناہوں سے معافی مانگ کر راہِ ہدایت اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور زلزلوں کے ذریعے اس کرۂ ارض کے جھنجوڑے جانے اور پہاڑوں سمیت اس دھرتی پر موجود ہر چیز کے پُرزے پُرزے ہو کر روئی کے گالوں کی طرح اُڑانے کے عمل کا قیامت کی نشانیوں کے طور پر تذکرہ فرمایا ہے تو اس کو رد کرنے کے لئے ناقص انسانی عقل کے تحت کسی منطق اور استدلال کی بنیاد پر بحث وتمحیص کی گنجائش بھلا کہاں نکلتی ہے۔ نظامِ کائنات بہر صورت ربِّ کائنات ہی کے دستِ قدرت میں ہے۔ چنانچہ اس نظام کے حوالے سے کسی تغیّر وتبدل پر ہمیں ربِّ کائنات سے ہی رجوع کرنا ہے جس میں کسی بحث اور دلیل کی قطعاً گنجائش نہیں۔

ذرا اسی تناظر میں پوری دنیا پر حاوی ہوئے کرونا وائرس اور ہمارے آج کے پل پل تبدیل ہوتے موسم کا جائزہ لیں تو اس کے پیش آمدہ مسائل ہم سے تفکر وتدبر کا ہی تقاضہ کرتے ہیں۔ ہم گزشتہ چار پانچ سال سے گرد وغبار والے سموگ کی بھی زد میں ہیں جس سے انسانوں کیلئے آنکھوں اور پھیپھڑوں کے کئی عوارض پیدا ہوئے ہیں۔ یہ گرد وغبار فوگ سے ہوتا ہوا سموگ تک آ پہنچا ہے' کئی دوست احباب اسے دُھند کا نام دیتے رہے ہیں حالانکہ دُھند میں نمی ہوتی ہے اور وہ کبھی کبھار بارش کی طرح برستی بھی نظر آتی ہے مگر ہماری فضاؤں پر چھائے گرد وغبار کو کسی صورت دُھند کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں نمی کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور یہ خزاں آلود

موسم کی طرح انسانی ذہنوں پر قنوطیت والے اثرات غالب کرتا ہے۔ اکثر لوگ یہ شکایت کرتے بھی نظر آئے کہ اس گرد و غبار کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں جلن شروع ہو جاتی ہے اور ان کے لئے سانس لینا بھی محال ہونے لگتا ہے۔ یقیناً یہ گرد و غبار ہر ذی روح میں زندگی کی علامت بن کر داخل ہوتی آکسیجن کو بھی اپنی جانب کھینچ لیتا ہے، جس کے نتیجہ میں فضاؤں میں آکسیجن کی کمی واقع ہو رہی ہے اور انسانوں کے لئے سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔ آپ اس ایک خیال سے ہی اندازہ لگا لیں کہ ہم کرّ و فر اور نخوت و تکبر کے سانچے میں ڈھلے انسان قدرت کی جولانیوں کے آگے کتنے بے بس ہیں۔ ذرا تصور کیجئے آج ایک لمحے کو کرۂ ارض پر آکسیجن ناپید ہو جائے تو یہاں کہیں بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آئیں گے۔ پھر نظامِ کائنات چلانے کی ربّ کائنات کی حکمت کے آگے بھلا کوئی پَر مار سکتا ہے؟ بھئی ہم یہ قیافے تو لگا سکتے ہیں، ٹامک ٹوئیاں تو مار سکتے ہیں کہ ارضِ وطن پر چھائی سموگ اور موسموں کے تغیّر و تبدل کا سبب ہماری جانب سے تیزی سے پھیلائی گئی ماحولیاتی آلودگی بھی ہو سکتی ہے۔ آج انسانی آبادیاں صنعتوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں، سڑکوں پر گاڑیوں کے جمِ غفیر سے نکلتے زہریلے دھوئیں نے بھی ماحولیاتی آلودگی کے اسباب پیدا کئے ہیں اور ہماری جانب سے درختوں کو بے دریغ کاٹنے کے عمل سے بھی موسموں میں ردوبدل ہو رہا ہے جو ماحولیاتی آلودگی میں اضافے کا باعث بن رہا ہے تو لازماً انسانی بے تدبیریوں کے نتیجہ میں ہی ہماری فضائیں مکدر ہو رہی ہیں۔ سو ہماری فضاؤں پر طاری آج کا گرد و غبار انہی انسانی بے تدبیریوں کا شاخسانہ ہو سکتا ہے۔ گزشتہ روز وزیراعظم عمران خان یقیناً اسی تناظر میں بڑھتی ہوئی ماحولیاتی آلودگی پر تفکر کا اظہار کر رہے تھے۔ بھارت میں تو آلودگی کے باعث سالانہ ایک لاکھ بچوں کی ہلاکتیں ہو رہی ہیں جبکہ وزیراعظم کے موازنے کے مطابق آلودگی میں ہماری حالت بھی قابل رحم ہے۔ ماہرین ارضیات اسی حوالے سے گزشتہ کئی برس سے چیخ و پکار کر رہے ہیں کہ ہم نے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ کر کے موسمی تغیّر و تبدل کے اسباب پیدا کر دیئے ہیں جو بالآخر اس کرۂ ارض پر انسانی تباہی پر منتج ہوں گے۔ مگر اس پر نہ تو متعلقہ ادارے فکر مند ہیں، نہ حکومتوں کے کانوں پر جوں رینگتی نظر آتی ہے اور نہ ہم انسانوں نے انفرادی طور پر ماحولیاتی آلودگی کم کرنے میں اپنا حصّہ ڈالنے کا کبھی سوچا ہے۔ گرد

وغبار سے بچاؤ کے لئے وقتی طور پر تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ اپنے گھروں، دفاتر اور گاڑیوں کے دروازے اور کھڑکیاں مکمل بند رکھی جائیں تا کہ اس گرد وغبار کی کوئی لہر اندر داخل نہ ہو سکے، اگر باہر نکلنا ہے تو مخصوص ماسک پہنے بغیر نہ نکلیں اور آکسیجن کی کمی محسوس ہونے کی صورت میں فوراً قریبی ہسپتالوں کا رُخ کیا جائے۔ آنکھوں میں جلن محسوس ہونے پر عرق گلاب کے چھینٹے ماریں مگر قدرت کی منشا کے آگے سر جھکانے اور راضی برضا ہونے کی سوچ کہیں پیدا ہوتی نظر نہیں آتی۔ آج تو پورے ماحول پر ناصر کاظمی کے اس شعر جیسی کیفیت طاری ہوتی نظر آ رہی ہے کہ......

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

اب تو کرونا وائرس نے ساری انسانی قدریں ہی تبدیل کر دی ہیں اور بے جان معمولی مادے کے آگے پورا کرۂ ارض اور اس پر آباد پوری انسانیت بے بس ہو چکی ہے۔ روس اور چین کی کرونا ویکسین آنے کے باوجود یہ وائرس پھیلتا چلا جا رہا ہے، کہیں رکنے، توقف کرنے کا نام ہی نہیں لے رہا اور یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی باقیماندہ زندگی اس وائرس کے ساتھ ہی بسر کرنی ہے۔ تو ہم نفسو! کوئی چارہ کر لو، خالقِ کائنات کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ، سرکشی سے باہر نکل آؤ اور راہِ ہدایت کے لئے کتابِ ہدایت کو رہنما بنا لو، مظاہر قدرت کا مذاق نہ اڑاؤ اور موسم بدل رہے ہیں تو خود بھی بدل جاؤ ورنہ قدرت کے اسباب تو ''ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں'' والا ماحول بنا رہے ہیں۔ حضور! اب سیاسی آلودگی پھیلانے سے بھی کچھ گریز کیجئے کیونکہ ماحولیاتی آلودگی کے انسانی صحت پر مرتب ہونیوالے مضر اثرات کی طرح سیاسی آلودگی کے مضمرات پورے سسٹم کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ آج کا چھینا جھپٹی والا ماحول ہمارے مقتدر ایوانوں سے کوئی اچھی خبر تو نہیں لا رہا۔

ماہِ مقدس اور تکریمِ انسانیت

اہلِ اسلام کیلئے رحمتوں، فضیلتوں، بخششوں والے مقدس مہینے رمضان کریم کا آغاز ہونے میں بس ایک دن کا وقفہ ہی رہ گیا ہے۔ ہمارے سائنس وٹیکنالوجی کے ہونہار وزیر باتدبیر چودھری فواد حسین نے ایک ماہ پہلے ہی ماہِ رمضان المبارک کے 14 راپریل سے آغاز کی "تکنیکی" پیش گوئی فرمادی تھی اور چیئرمین رویت ہلال کمیٹی مولانا عبدالخبیر آزاد صاحب بھی پرعزم ہیں کہ پورے ملک میں ایک ہی دن رمضان اور شوال کا چاند نظر آئیگا اس لئے قوم خاطر جمع رکھے کہ ماہِ رمضان المبارک کے دوران تاجروں، دکانداروں، خوانچہ فروشوں کا اس ماہِ مقدس کو اپنے مالی اور اقتصادی استحکام کیلئے ماضی کی طرح منفعت بخش نہ بنانے، گھٹیا مال اور گلے سڑے پھل فروٹ فروخت نہ کرنے، اشیاء کی مصنوعی قلت پیدا کرکے ناجائز منافع نہ کمانے اور اپنی دیانت داری کا ڈھنڈورہ پیٹنے کیلئے اللہ، رسولؐ کی قسمیں اٹھانے پر چاہے اتفاق ہو نہ ہو، ہم 14 راپریل سے رمضان کریم کا آغاز کرنے پر ضرور متفق ہو چکے ہیں۔ اور دُور کے چندا ماموں کی ہمارے دوربین شاہکاروں کے آج 13 راپریل کی شام اپنی جھلک دکھانے کیلئے اٹل فیصلہ سے اختلاف کی بھلا کیا مجال ہوسکتی ہے۔ سو آج شام کا چاند ماہ صیام کے آغاز کی نوید بن کر ابھرے گا جس کے بارے میں سوشل میڈیا پر رونق لگی ہوئی ہے کہ اس بابرکت مہینے کا آغاز ہونے والا ہے، جس کے دوران خوانچہ فروش گلے سڑے پھل فروٹ اور ناقص سبزی اپنے گاہکوں کو من مانے نرخوں پر فروخت کرکے جلدی سے مسجد کی جانب بھاگے گا کہ کہیں باجماعت نماز کی ادائیگی سے محروم نہ ہوجائے۔

حضور یہ تو ہمارا عمومی اجتماعی کلچر بن چکا ہے۔ ہم ماہ مقدس کے روزے رکھنے کا دینی فریضہ بھی عقیدت واحترام سے سرانجام دینگے۔ بالخصوص اس مہینے کے دوران باجماعت نماز پنجگانہ ادا کرنے کی بھی خشوع وخضوع کے ساتھ کوشش کرینگے۔ سحری، افطاری کے اہتمام کیلئے اپنے

دسترخوان بھی انواع واقسام سے ضرور سجائیں گے' پاس پڑوس میں افطاری سے پہلے اپنے کچن میں تیار ہونیوالے پکوڑے' سموسے' دہی بھلے' فروٹ چاٹ ٹرے میں ڈال کر پہنچانے کے انتظام میں بھی کوئی کوتاہی نہیں ہونے دینگے اور اس مقدس مہینے کے دوران ناجائز منافع کمانے کی اگلی پچھلی کسریں نکالنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے کیونکہ ہمارے کلچر میں رمضان کریم کا تصور سال بھر کی ساری ضرورتیں پوری کرنے کیلئے جیسے تیسے روپیہ کمانے اور بنانے والے مہینے والا بن چکا ہے۔اس کلچر میں اگر درگت بنتی ہے تو اس بے چارے مایوس مقہور انسانی لاشے کی جو بے کاری' بے روزگاری' کم وسائل' معمولی تنخواہ اور اسکی بھی بروقت ادائیگی نہ ہونے کے باعث اپنے وسیع خاندان کا بھاری بوجھ اٹھانے کی تگ ودو میں پہلے ہی عملاً زندہ درگور ہو چکا ہوتا ہے۔سو جس کے پاس پہلے ہی اپنی روزانہ ضرورت کی اشیاء خریدنے کی سکت نہیں ہوتی۔ ماہ رمضان المبارک کے دوران پل پل اٹھتے مہنگائی کے سونامیوں کے آگے تو وہ ڈھیر ہو جاتا ہے۔

دنیا بھر میں پھیلی کورونا کی وبانے ویسے ہی ہماری معیشتوں کا انجر پنجر ہلا دیا ہے' بیروزگاری اور مہنگائی کے عفریت کو انسانی جانوں کو نگلنے کیلئے موٹا تازہ کر دیا ہے اور کمزور معیشتوں والے پسماندہ ممالک کے حکمرانوں تک کو بھکاری بنا دیا ہے جبکہ اس مارا ماری میں لہو لگا کر ہم بھی شہیدوں میں شامل ہو چکے ہیں اس لئے ماہ رمضان کے دوران ہاتھ آئے لوٹ مار کے مواقع کو ہاتھ سے جانے دینے کا گناہ بھلا کون اپنے سر چڑھائے گا۔سو......

ساقیا' باہن اے مینوں بھوئیں تے
ایہہ میز کرسیاں چا لے
جیہڑی پئی آ' اور ہاں لئی آ
تے کجھ باہروں وی منگوا لے

سرکشی کو باندھ کر بے خودی کے سمندر میں غوطے لگانا ہی تو ہم نے ماہ مقدس والے اپنے کلچر کا حصہ بنالیا ہے۔حکومت مہنگائی کم کرنے کے رسمی دعوے کرتی رہے گی' مصنوعی قلت پیدا کر کے اشیاء کے منہ مانگے دام وصول کرنیوالے مافیاز کو لگام ڈالنے کیلئے انتظامی مشینری کو متحرک کرنے کے اعلانات دلپذیر بھی جاری رکھے گی' چینی کے نرخ 85 روپے فی کلو مقرر کر کے بازاروں میں ان نرخوں کے بینر بھی آویزاں کرا دیگی۔وزیراعظم اس ماہ کے دوران نرخوں کی خودنگرانی کرنے کا

کریڈٹ بھی ضرور لے لیں گے مگر لوٹ مار کا کاروبار اسی طرح چلتا رہے گا اور ماہ رمضان کیلئے اپنائے گئے ناجائز منافع خوری کے کلچر کو فروغ ملتا ہی رہے گا۔ آپ خود ہی جائزہ لے کر اندازہ لگا لیجئے' رائے قائم کر لیجئے کہ ماہ رمضان آتے آتے حکومت کی زیر پرستی چلنے والے یوٹیلٹی سٹورز تک میں مہنگائی جستیں بھرتی کہاں تک جا پہنچی ہے' ضروری استعمال کی اشیاء غائب کر کے مصنوعی مہنگائی اور اسکے ذریعے ناجائز منافع کا کس تزک واحتشام کے ساتھ اہتمام کیا گیا ہے۔ آپ ذرا عام بازاروں اور خصوصی رمضان بازاروں میں گھوم پھر کر فروخت کی جانیوالی اشیاء اور انکے نرخوں کا جائزہ لے کر تو دیکھیں' آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائینگے' اس لئے حضور! وزیر اعظم کے کچن ٹرک ملک بھر میں پھیلانے کے عزم پر صاد کریں' ہاتھ پھیلائیں اور یہ خیرات بانٹنے والوں کے ساتھ اپنے افسردہ تھکے چہروں کی تصاویر کھنچوا کر انکی نمود ونمائش کا اہتمام کریں تا کہ انہیں کچن ٹرک ہر چوک' ہر بازار' ہر گلی کوچے میں کھڑا کر کے کسی فرد کو بھوکا نہ سونے دینے کی توفیق حاصل ہوتی رہے اور کمپنی کی مشہوری کے ساتھ ماہ رمضان ہی نہیں' سال بھر کیلئے پھیلے ہاتھوں کو راشن سے فیض یاب کرنے کی سبیل نکلتی رہے۔ بھئی! اس کلچر میں اشرافیاؤں کے ہی تو وارے نیارے ہیں۔ ریاست مدینہ کا تصور عملی قالب میں ڈھالنے کا عزم باندھنے والوں کی ہی تو دکانداری چمک رہی ہے اور انکے ہاتھوں راندۂ درگاہ عوام کا بھرکس نکلنا ہی تو انکے مقدرات کا حصہ بن چکا ہے......

مقدرات کی تقسیم جب ہوئی عابد
جو غم دیئے نہ گئے تھے' وہ میں نے جا کے لئے

آپ ماہ مقدس میں نمود ونمائش والی خیرات بانٹ کر نیکیاں کمائیں' گھٹ گھٹ کر مرنے کا مقدر رکھنے والے عوام آپ کی ان نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتے رہیں گے مگر سوچ رکھیے اور جان رکھیے کہ رب کائنات نے شرف انسانیت اور تکریم انسانیت کو باوقار انسانی معاشروں کی بنیاد بنایا ہے۔ تکریم انسانیت کا تقاضا ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو بھی اپنے پاس بلا کر زکوٰۃ نہ دی جائے بلکہ اسکے پاس' اسکے گھر جا کر اتنی رازداری میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا فرض نبھایا جائے کہ اسکے پڑوسی کو بھی اسکی خبر نہ ہونے پائے۔ کیا اس بار ہم رمضان کریم کے ماہ مقدس کو تکریم انسانیت کا کلچر فروغ دینے کیلئے بروئے کار نہیں لا سکتے۔ حضور! تجربہ کر کے تو دیکھئے۔ بارگاہِ ایزدی میں عبادات کی قبولیت آپ کا انعام بن جائیگی۔

''میری بھینس کوڈنڈا کیوں مارا''

اپوزیشن جماعتوں کا مطمحِ نظر اگر تحریک انصاف کو اقتدار سے دور رکھنے یا اسکی حکومت کی بساط لپیٹنے کا ہوتا تو اس کیلئے انکے پاس 2018ء کے انتخابات سے اب تک بے شمار مواقع موجود تھے مگر پیپلز پارٹی سینٹ میں سید یوسف رضا گیلانی کی اپوزیشن لیڈری پر ہی مطمئن ہے تو جناب کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ انکی سرخوشی کا معاملہ تو کچھ ایسا بنا نظر آتا ہے کہ......

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

یہ ''قناعت'' پیپلز پارٹی کی سیاست میں ہی جلوہ گر نہیں ہوئی، خیر سے مسلم لیگ (ن) بھی پنجاب میں اپنے چھ سینیٹروں کے بلا مقابلہ انتخاب کا ''معرکہ'' سر کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ چکی ہے۔ ان دونوں اپوزیشن جماعتوں کی جانب سے اس ''قناعت'' کا مظاہرہ اس وقت کیا گیا جب یہ اپوزیشن اتحاد پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم پر ہینگ لگے نہ پھٹکڑی کے مصداق حکومت کو ناقابل تلافی ڈنٹ ڈالنے کی اطمینان بخش پوزیشن میں تھیں۔ اگر قوم کیلئے حکومت کا ''صبح گیا یا شام گیا'' والا منظر بنانے کے بعد ان اپوزیشن جماعتوں نے پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم پر ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کا دلدوز منظر اجاگر کیا ہے تو حکومت گرانے کا ایجنڈا رکھنے والی ان اپوزیشن جماعتوں کے اصل ایجنڈا کا کھوج لگانا پڑیگا۔ میری دانست میں تو ان کا ایجنڈا سیاست میں اپنی اپنی اناؤں کی تسکین کا ایجنڈا ہے۔ بس ''میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا'' جیسا بہانہ چاہیے۔

جب انکے مابین حالات سازگار تھے اور ان میں گاڑھی چھن رہی تھی تو اس وقت بھی ان کا باہمی معاملہ کچھ ایسا ہی رہا ہوگا کہ......

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

شاید انکے مابین ''نازک خم'' کا ہی سارا جھگڑا ہے ورنہ مثالی اتحاد کی فضا تو 2018ء کے انتخابات کے نتائج نے ہی ہموار کر دی تھی۔ وفاق میں بھی پی ٹی آئی کو تنہاء حکومت سازی کیلئے عددی اکثریت حاصل نہ ہو پائی جس کیلئے عمران خان قوم کو باور کراتے رہے کہ اگر انہیں تنہاء حکومت سازی کیلئے عددی اکثریت حاصل نہ ہو پائی تو وہ اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنا قبول کرلیں گے مگر کسی کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہونگے۔ پنجاب میں تو مسلم لیگ (ن) حکومت بنانے کی پوزیشن میں آ چکی تھی اور بلوچستان میں ''باپ'' کے راج کی فضا مکمل ہموار تھی۔ سندھ ویسے ہی پیپلز پارٹی کی جھولی میں شیرینی کی طرح آ چکا تھا۔ بس خیبر پی کے میں پی ٹی آئی کو گرین سگنل ملا تھا' اگر اس پوزیشن پر آ کر بھی پی ٹی آئی کیلئے وفاق اور تین صوبوں میں حکومت تشکیل دینا چٹکی بجانے کا کھیل بن گیا تو حضور! ''دامن کو ذرا دیکھ' ذرا بند قبا دیکھ''۔

یہ اصولی سیاست تھی یا وصولی سیاست' اب اسکی گرہیں کھلتی نظر آ رہی ہیں۔ اگر اتفاق میں برکت والا اپوزیشن اتحاد 2018ء کے انتخابات کے فوری بعد تشکیل پا جاتا جس کیلئے ذہنی ہم آہنگی کی فضا ہموار بھی ہو چکی تھی تو آج اقتدار کے ایوانوں میں صدر' وزیراعظم' چیئرمین سینٹ' سپیکرز قومی وصوبائی اسمبلیز اور وزراء اعلیٰ سمیت اقتدار کی راہداریوں میں موجود ہر نشست پر اسی اتحاد کے بندے بیٹھے ہوتے اور انہیں اپنے کڑے احتساب کا بھی کوئی دھڑکا لاحق نہ رہا ہوتا۔ مگر انکی سیاست عمران خان کے اقتدار کیلئے سدِ راہ بننے کی سیاست تھی ہی نہیں۔ بلوچستان میں پیپلز پارٹی عمران خان کو ساتھ ملا کر مقاصد حاصل کرنے کا پہلے ہی کامیاب تجربہ کر چکی تھی جس سے ان دونوں کے مابین نظریاتی منافرت کی گنجائش ختم ہوئی جبکہ مفاداتی سیاست میں سب چلتا ہے۔

ارے' اب تک سب یہی کچھ تو چل رہا ہے' اور آج پی ڈی ایم کیلئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ.....

قسمت کی خوبی دیکھئے' ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

اندازہ لگایئے پی ڈی ایم کی جارحانہ سیاست میں گزشتہ دو ماہ کے دوران حکومتی کشتی کیسے ہچکولے کھاتی نظر آئی اور مثالی اتحاد کی فضا ایسی بنی کہ مریم اور بلاول آئندہ کی قومی سیاست میں بھی ایک دوسرے کا دم بھرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ ماضی کی طرح برسرِ پیکار نہ ہونے کے عہد و پیماں کرتے نظر آئے۔ بے نظیر اور نواز شریف کے مابین بہن بھائی والے پیار پر دونوں

خاندانوں کے ہونہار بچے مہر تصدیق لگاتے نظر آئے۔ ایسا ایکا بن گیا کہ سینٹ انتخابات میں اپوزیشن کیلئے میدان صاف نظر آنے لگا۔ اکثریت نہ ہونے کے باوجود یوسف رضا گیلانی نے میدان مارلیا۔ اس صاف میدان میں ان کیلئے چیئر مین سینٹ بننا بھی بھلا کیا مشکل تھا مگر یکا یک پینترا بدل گیا اور چیئر مین سینٹ بننے کا یقین رکھنے والے حضرت اپوزیشن لیڈر بننے پر ہی خوشی سے سرشار نظر آنے لگے۔ مریم نواز نے کراچی کے جلسے میں حکومتی حلقوں پر پھبتی کستے ہوئے طنز کا تیر مارا تھا ''ہاہاہا' پی ڈی ایم ٹوٹ گئی'' یہ تیر الٹا آن لگا اور یہ پھبتی خود مریم نواز کے گلے پڑ گئی ''ہاہاہا...... 'پی ڈی ایم ٹوٹ گئی''۔ بھئی یہ خواب تو نہیں' برسر زمین یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ قومی اسمبلی اور سینٹ میں حکومت کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک کامیاب بنانے کی پوزیشن پر آنیوالے اپوزیشن اتحاد کے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک چکی ہے۔ اے این پی اعلانیہ پی ڈی ایم کو خیر باد کہہ چکی ہے اور باقی جماعتوں میں ایک دوسرے کو مطعون کرنے کا سلسلہ شدومد کے ساتھ جاری ہے جس نے طول پکڑا تو 90ء کی دہائی والی منافرتوں بھری سیاسی محاذ آرائی کا منظر نامہ پھر اجاگر ہو سکتا ہے۔ ایسے میں جہانگیر ترین کی جانب سے حکومتی پارٹی میں نقب لگانے سے اقتدار کے ایوانوں میں تبدیلی کا پپیہا پی پی کرتا نظر آ رہا ہے مگر ان تلوں میں تو اب تیل ہی نہیں رہا جو اس ممکنہ تبدیلی کے محرک کو ساتھ ملا کر پانسہ پلٹنے کی پوزیشن میں ہو سکتے تھے۔ پیپلز پارٹی جہانگیر ترین کے زور پر بھلا پنجاب میں کیا تبدیلی لا پائے گی جہاں اسکی نشستیں بس ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ مسلم لیگ (ن) کیلئے پھر بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے مگر اسکی قیادت نے تو اپنی اتحادی پیپلز پارٹی کی جانب سے چودھری پرویز الٰہی کو وزیر اعلیٰ پنجاب بنانے کی تجویز کو ہی انا پرستی کے خول میں بند کر دیا سو جہانگیر ترین بھی اسی تجویز کے ساتھ آئینگے تو مسلم لیگ (ن) تبدیلی کے اس موقع کو بھی لات مارے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ انا پرستی کی اس سیاست میں عوام کے ہاتھ پلّے نہ پہلے کچھ آیا نہ اب کچھ آئیگا۔ آپ ''میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا'' کہتے ہوئے ایک دوسرے کیخلاف ''کڑ'' نکالتے رہیں۔ آپ کے کرموں سے ''سٹیٹس کو'' نے نہ ٹوٹنا ہے نہ ٹوٹے گا کیونکہ......

سارے اس کے ہمجولی تھے
کرتا کون بغاوت یارا

جتن سے پکائی کھیر پر فاتحہ

ہم سسٹم کی اصلاح کیلئے جتنے فکر مند ہوتے ہیں، اس سسٹم سے وابستہ ہمارے قومی سیاسی قائدین اتنا ہی جتنیں بھر کر سسٹم کی مزید خرابی کا اہتمام کر دیتے ہیں۔ شاید اصل ایجنڈا ہی کسی اچھے سسٹم سے عوام کو فائدہ نہ پہنچنے دینے کا ہے۔ سینٹ کے انتخابات نے اس حوالے سے بہت کچھ بے نقاب کر دیا ہے۔ ہم بحث کرتے رہے کہ ملک میں دو جماعتی طرز کا پارلیمانی جمہوری نظام آزما لیا جائے تو شاید ہماری سیاست میں مفاداتی کرپشن کلچر کا عمل دخل کچھ کم ہو جائے اور مویشی منڈی والے کاروبار میں کہیں نہ کہیں بریک لگ جائے مگر اب تو جماعتوں کے اندر بھی اصلاح احوال کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کیونکہ اب سیاسی جماعتوں میں نظریاتی اور اصولی سیاست کا تو عملاً جنازہ اٹھ چکا ہے۔ بس اپنے مفادات اور اپنی اناؤں کی بنیاد پر سیاست ہو رہی ہے۔ ملک اور قوم کے مفادات تو ہماری آج کی سیاست سے کوئی علاقہ ہی نہیں رکھتے چنانچہ اپوزیشن جماعتیں آج پھر اس پوزیشن پر واپس آ گئی ہیں جہاں وہ 2018ء کے انتخابات کے بعد ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونے کی صورت میں وفاق اور صوبوں میں حکومت سازی کی پوزیشن پر آنے کے باوجود اپنی اپنی مفاداتی سیاست کے تابع اکٹھی نہ ہو پائیں اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں ایک کے بعد دوسرا الیکشن ہارتی چلی گئیں۔ اس طرح پلیٹ میں رکھا ہوا اقتدار انہوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے جتن میں خود ہی اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا۔

آج پونے تین سال بعد جب اپوزیشن جماعتوں کے ایک پلیٹ فارم پی ڈی ایم پر متحد ہونے کے بعد انکے ارکان پارلیمنٹ اجتماعی قوت کے طور پر ابھر کر پانسہ پلٹنے کی پوزیشن میں آ چکے تھے تو ہماری قومی سیاسی قیادتوں نے اس نادر موقع کو بھی اپنی انا پرستی کی بھینٹ چڑھا دیا اور جتن سے پکائی گئی کھیر دوسروں کے ہتھے چڑھ گئی۔

انکی اناؤں کا جائزہ لیں تو بالکل بچوں والی ضدیں نظر آتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بلاوجہ کی بدگمانیوں کے دروازے کھلے رکھ کر تو اتفاق میں برکت نہیں ڈالی جاسکتی۔ ایک دوسرے کو دھوبی پٹڑا لگانے کا سفاک سیاسی کھیل 80ء کی دہائی سے جاری وساری ہے۔ کبھی گاڑھی چھننے لگتی ہے تو کبھی ایک دوسرے کے پرزے اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ چنانچہ ''سیاست میں کچھ بھی حرف آخر نہیں'' والا سٹرفکیٹ آج سکۂ رائج الوقت کی طرح چل رہا ہے۔ 90ء کی دہائی والی بدترین محاذ آرائی سے یہ احساس ہوا کہ ہم نے تو باہم لڑکر ان قوتوں کو ہی تقویت پہنچائی ہے جن سے خلاصی کیلئے ہمیں پھر ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر طویل جدوجہد کرنا پڑتی ہے تو اس احساس زیاں نے میثاق جمہوریت تک پہنچا دیا۔ عہد باندھا گیا کہ اب ہم کسی کے ماورائے آئین اقتدار کیلئے اپنے کندھے فراہم نہیں کرینگے۔ اپنی اپنی جلاوطنیوں نے ایک دوسرے کیلئے ریشہ خطمی ماحول بنادیا' سوقوت پرواز نے زور پکڑا اور ملک واپسی ہونے لگی۔ بیچ میں عمران خان کو ساتھ ملا کر اے پی ڈی ایم کے پھندے سے اے آر ڈی کا گلا بھی گھونٹ دیا گیا مگر جان کنی کی اس کیفیت میں بھی میثاق جمہوریت کو نئی سانس مل گئی اور محترمہ بی بی کی شہادت نے اس سفاک سیاست میں بھائی بہن کے جذبے کو اجاگر کر دیا۔ میاں نواز شریف مغموم جیالوں کے دکھ بانٹنے انکے پاس جا پہنچے۔ بی بی کی شہادت پر ہمدردی کے ووٹ نے پیپلز پارٹی کے اقتدار کا راستہ ہموار کیا تو میاں نواز شریف میثاق جمہوریت کی پاسداری میں فرینڈلی اپوزیشن بن گئے اور پھر میموگیٹ در آیا تو میاں صاحب کا ضمیر پھر جاگ اٹھا اور وہ کالا کوٹ پہن کر سپریم کورٹ میں میثاق جمہوریت کو آنکھیں دکھانے لگے۔ اسی آنکھ مچولی اور چھینا جھپٹی میں 2013ء کا انتخابی معرکہ میاں صاحب کی پارٹی نے سر کرلیا تو میموگیٹ والی تلخی اپوزیشن کی سیاست میں سر چڑھ کر بولنے لگی مگر عمران خان کی دھرنا سیاست نے میثاق جمہوریت والوں کو پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران پانامہ لیکس در آئیں تو مفاداتی سیاست نے ایک بار پھر شہادت گہہ الفت کو شعبدہ بازی بنادیا۔ میاں صاحب شکوہ سنج ہوئے کہ......

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا' گلہ نہ ہوا

مگر مفاداتی سیاست میں یہ آہ وفغاں بے سود ثابت ہوئی اور میثاق جمہوریت والے نے

بلوچستان اسمبلی میں دھوبی پٹڑا لگا کر سارا منظرنامہ ہی تبدیل کر دیا۔ آج بھی اسی منظرنامہ کو الٹ پھیر کر کے بار بار دکھایا جا رہا ہے۔ مہرے بھی وہی' چال بھی وہی' مقاصد بھی وہی اور نتیجہ بھی وہی۔ فرق صرف اتنا آیا ہے کہ میاں صاحب بھی چالاک ہو گئے ہیں اور دھوبی پٹڑا لگانے میں مشاق ہو گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو جھاکا دیتے ہیں تو سسٹم کے ثمرات کا تصور اسکے ہاتھوں راندۂ درگاہ ہوئے عوام کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا نظر آتا ہے۔

بھئی باہمی ضدیں کیا ہیں۔ ہم سے اسلام آباد کی نشست پر یوسف رضا گیلانی کیلئے ووٹ لے لئے اور ہماری خاتون امیدوار کو ووٹ نہ دے کر ہروا دیا۔ پھر ایسے کو تیسا۔ چیئرمین سینٹ کیلئے تو پی ڈی ایم کا بھرم قائم رکھا مگر ڈپٹی چیئرمین کیلئے مسلم لیگ (ن) کی صفوں میں سے حکمران اتحاد کا امیدوار سامنے آ گیا تو اسکی بھاری اکثریت سے کامیابی یقینی بنا دی گئی۔ اب انہوں نے اسی حکمران اتحاد کی مدد سے آپ کو ٹھِتی مار کر سینٹ کی اپوزیشن لیڈری حاصل کر لی ہے تو حضور! یہ باہمی ضدیں ہی تو پالی جا رہی ہیں۔ آپ پنجاب میں اپنے حلیفوں کو جھاکا دے کر جس کے ساتھ اتفاق رائے سے اپنے سینیٹر بلامقابلہ منتخب کرا لیتے ہیں تو پنجاب میں ممکنہ ان ہاؤس تبدیلی کی صورت میں اپنے میثاق جمہوریت والے ساتھی کی جانب سے اسی شخصیت کا نام بطور وزیراعلیٰ لائے جانے پر آپ اپنی انا کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ اتفاق رائے تبدیلی کا منظرنامہ بنا دیتا تو اس میں آپ ہی کا فائدہ تھا مگر آپ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں سنسار بٹ گیا۔ آپ اعظم نذیر تارڑ پر اپنی ضد پالتے رہے اور وہ بوٹی لے آڑے' سو جتن سے پکائی پی ڈی ایم کی کھیر پر فاتحہ پڑھنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ حضور! اس ساری ایکسر سائز میں عوام کو کتنے نفلوں کا ثواب ہوا۔ وہ ہر مفاداتی طبقے کی جانب سے بطور ایندھن استعمال ہو رہے اور سلطانیٔ جمہور کا تماشا لگا ہوا ہے۔ بھئی ہم بھر پائے آپ کی سیاسی شعبدہ بازیوں سے۔ آپ کو اپنے مفادات عزیز ہیں' اپنی اناؤں سے سروکار ہے اور اپنی ضدوں کا ہی تماشا لگانا ہے تو اس سسٹم سے ہم عوام کا کیا لینا دینا اور اس وطن عزیز کیلئے کیا حاصل حصول۔ آپ اپنے اپنے تماشے لگائے رکھیں۔ عوام سے جو بن پڑے گا' وہ بھی کر گزریں گے۔

ریاست، آئین اور عوام کی درگت

ہمیں آئین کی پاسداری اور عوام کی فلاح عزیز ہوتی تو کسی کیلئے اپنے دورِ حکومت میں اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کی تشکیل کا تردد کرنے اور پھر اس کا کریڈٹ لینے کی گنجائش ہی نہ نکل پاتی۔ ہمارا آئین تو خود اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس کا بنیادی انسانی حقوق کا چیپٹر جو مجموعی 20 دفعات (8 تا 28) اور پالیسی کے اصولوں سے متعلق چیپٹر جو مجموعی 12 دفعات (29 تا 40) پر مشتمل ہے، شہری آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے، اظہار رائے اور تحریر و تقریر کی آزادی کا حق بھی دیتا ہے، شرف انسانیت کو مقدم رکھنے کی تلقین بھی کرتا ہے اور ہر شہری کیلئے تعلیم، صحت، روزگار کی سہولتوں کی بلا امتیاز فراہمی ریاست کی ذمہ داری گردانتا ہے۔ سماجی انصاف ہمارے آئین کی دفعہ 37 کا مطمح نظر ہے اور دفعہ 38 کے تحت عوام کی سماجی اور اقتصادی بھلائی بھی ریاست کی ذمہ داری ٹھہرائی گئی ہے۔

آپ خود ہی تصور کر لیجئے کہ آئین پاکستان کے صرف ان دو ابواب کی انکی روح کے مطابق پاسداری ہو جائے تو اس ملک خداداد کو اسلامی جمہوری فلاحی مملکت کے قالب میں ڈھلنے سے بھلا کوئی روک سکتا ہے جو بانیانِ پاکستان علامہ اقبال اور قائداعظم کا مطمح نظر بھی تھا، مگر بھائی صاحب! ہم نے تو بس الٹ پھیر میں مہارت تامہ حاصل کر رکھی ہے.....

اقبال بڑا اپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی تو یہ بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اور ہمارے گفتار کے غازی ہیں بھی ایسے کہ.....ع

پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

اب سے پہلے والے سارے چور ڈاکو اس ارضِ وطن کو شیرِ مادر کی طرح چوس گئے' چھوڑ کر کھا گئے' قائد و اقبال کے خواب گہنا گئے' عوام کے دل محض بہلا گئے اور ہر عذاب وثواب کا انہی کو ذمہ دار ٹھہرا گئے' فلاحی جمہوری مملکت کے بس دعوے ہوتے رہے' وعدے وعید چلتے رہے' آئین پاکستان کی متعلقہ شقیں عملدرآمد کی متقاضی رہیں۔ آئین کی شارح ہماری اعلیٰ عدالتیں دفعہ 199' اور دفعہ 184 کے تحت ''کووارنٹو'' احکام صادر کرتی رہیں مگر ہمارے حکمران اشرافیہ طبقات کے ہاتھوں اس ارضِ وطن کا فلاحی مملکت میں ڈھلنا لکھا ہی نہیں تھا کیونکہ انہوں نے ملکی اور قومی دولت اور وسائل کی لوٹ مار اپنا حق گردان لیا تھا' جھنڈا اسلطانی جمہور کا بلند رکھا گیا اور جمہور کی سلطانی کو کبھی قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ چنانچہ جتنی بھی خرابیاں کسی انسانی معاشرے میں ممکن ہو سکتی تھیں' انہیں ''قصر شاہی میں غریبوں کا بسر کیا معنی'' کا تصور باندھ کر درآنے کی کھلی چھوٹ دی جاتی رہی۔

چلیں یہ تو سارے ساہوکار' دنیادار' ریاکار اپنے مطلب کے بندے تھے جنہوں نے اسلامی جمہوری فلاحی ریاست کے تصور والی آئینی شقوں کو عضوِ معطل بنائے رکھا مگر ہمارے موجودہ حکمران تو ''سٹیٹس کو'' توڑنے کا نعرہ لگا کر میدان عمل میں اترے ہیں' تبدیلی' انقلاب اور نئے پاکستان کے سہانے خواب کے ٹیکے لگا کر انہوں نے عوام کو اپنے سحر میں مبتلا کیا ہے' کرپشن فری سوسائٹی کی تشکیل اپنا منشور بنایا ہے اور وزیراعظم عمران خان کے دل میں تو اس ارضِ وطن کو ریاست مدینہ کے قالب میں ڈھالنے کی تڑپ بدرجہ اتم موجود ہے جس میں فرات کے کنارے کسی کتے کے بھوکا سونے کی ذمہ داری بھی امیرالمومنین کی ٹھہرائی گئی ہے جو انکے اسی بنیاد پر احتساب کی متقاضی ہوتی ہے مگر انکی حقیقت تو نہلے پہ دہلے والی بن گئی ہے۔ پہلے والے بنیادی انسانی حقوق سے متعلق آئینی شقوں اور فلاحی جمہوری ریاست کے آئینی تقاضوں کو اپنی نظرِ عنایت سے محروم رکھتے تھے مگر ان سے دانستاً روگردانی کی گستاخی کے مرتکب ہونے سے بہرصورت گریز کرتے تھے مگر اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ شدومد کے ساتھ دعویٰ فلاحی مملکت کی تشکیل کا کیا جاتا ہے' ریاست مدینہ کو اپنا ماٹو بنایا جاتا ہے مگر ریاست کے شہریوں کو حسِ لطافت

سے دور لے جانیوالی مفلسی کی جانب دھکیلنے میں نہ صرف کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی بلکہ اسکے راستے بھی خود ہی ہموار کیے جاتے ہیں۔ اقتدار میں آنے سے قبل غالباً ایک کروڑ نوکریاں دینے کے اعلانات کیے گئے مگر اقتدار میں آتے ہی نہ صرف بے روزگاروں کی لائنیں لگا دی گئیں بلکہ ایک وزیر موصوف فواد چودھری نے یہ در فنطنی بھی چھوڑ دی کہ شہریوں کو روزگار فراہم کرنا ریاست کی ہرگز ذمہ داری نہیں، سو شہریوں کے روزگار کی ذمہ داری ریاست پر ڈالنے والی آئینی شقیں اور بنیادی انسانی حقوق کا چیپٹر گیا بھاڑ میں۔ شہریوں کیلئے سماجی اور اقتصادی انصاف کی ضامن آئین کی شقیں بھلا ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں جنہوں نے شہریوں ہی کا سب کچھ بگاڑنے کی ٹھان رکھی ہو۔

تو جناب! اب تو پورا سنسار ہی بگڑ گیا ہے۔ مہنگائی کا عفریت لاتیں مار مار کر ریاست مدینہ کے کم ظرف شہریوں کو نڈھال اور بدحال کر چکا ہے۔ وہ چلتے تنفس کے ساتھ زندہ ہیں مگر زندہ درگور ہیں......

درد ایسا ہے کہ جی چاہے ہے' زندہ رہیئے
زندگی ایسی کہ مر جانے کو جی چاہے ہے

کیا خوب تماشا ہے کہ ریاست مدینہ کے شہریوں کی بڑھتی بھوک' بے روزگاری اور غربت و افلاس کا ذمہ دار امور حکومت و مملکت پر مسلط کیے گئے آئی ایم ایف کے نمائندے عبدالحفیظ شیخ کو گردانا گیا جنہوں نے اپنی فراغت سے پہلے عوام کو مہنگائی کے سونامیوں کی نذر کرنے کے راستے نکالنے والی آئی ایم ایف کی تمام شرائط آئی ایم ایف سے رجوع نہ کرنے کی داعی اس حکومت سے تسلیم کرائیں اور سٹیٹ بنک کی خودمختاری کا آرڈی ننس جاری کرا کے اسے آئی ایم ایف کی ہر ڈکٹیشن پر عملدرآمد کرانے والے اسکے ذیلی ادارے کے قالب میں ڈھال دیا۔ انہیں انکے منصب سے ہٹانے کا کریڈٹ شبلی فراز صاحب نے یہ کہہ کر وزیراعظم عمران خان کو دیا کہ وزیراعظم عوام کی بگڑتی معاشی حالت پر فکرمند ہیں اور حفیظ شیخ کی مسلط کردہ مہنگائی سے انکی خلاصی کرانا چاہتے ہیں مگر انکی جگہ وزیر خزانہ بننے والے نوجوان وزیر مملکت حماد اظہر نے یہ قلمدان سنبھالتے ہی دکھی عوام کو یہ ''مژدۂ جانفزاء'' سنایا کہ مہنگائی کو کنٹرول کرنے کی اصل ذمہ داری تو سٹیٹ بنک کی ہے۔

ارے واہ.......

میر کیا سادہ ہیں، بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

آئین پاکستان نے تو شہریوں کیلئے تعلیم، صحت، روزگار اور سماجی و اقتصادی انصاف کی ذمہ داری ریاست پر عائد کی ہے مگر آپ یہ ذمہ داری ان پر ڈال رہے ہیں جو بذات خود شہریوں کو خط غربت سے نیچے قعر مذلت میں دھکیلنے کی ذمہ داری بحسن وخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔اس سسٹم میں حفیظ شیخ کی جگہ حماد اظہر کے آجانے سے ہمارے لئے من وسلویٰ تو برسنا شروع نہیں ہو جائیگا اور دودھ و شہد کی نہریں تو نہیں بہنے لگیں گی، سوراندۂ درگاہ عوام بیرونی آقاؤں کے غلاموں کی شکل میں موجود اشرافیاؤں کے ہاتھوں کچلے، مسلے جاتے رہیں گے اور یہ سوچ کر اپنی قسمت پر شاکی ہونگے کہ.......

تھی جو قسمت میں سیاہی وہ کہاں ٹلتی ہے
کھیر بھی آئی میرے سامنے دلیہ ہو کر

ٹامک ٹوئیاں

اگر ہم آئین اور قانون کے ضوابط اور تقاضوں کے مطابق کام کر رہے ہوں تو اس میں کسی ابہام، تشکیک اور توجیح کی گنجائش نہیں نکل سکتی مگر محسوس یہی ہوتا ہے کہ اپنی معاشرت اور اس میں آئین، قانون، انصاف کی عملداری کے معاملات میں ہم وطن عزیز کی تشکیل کے 74 سال گزرنے کے بعد بھی بس ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے ہیں۔ ہم نے 81 واں یوم پاکستان کرونا وائرس کے دوران بھی روایتی جوش وجذبے سے منالیا مگر ہماری اخلاقیات اور سیاسی قدریں ابھی تک مستحکم نہیں ہو پائیں چنانچہ سیاسی میدان میں پوائنٹ سکورنگ اور بلیم گیم کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے تو ادارہ جاتی سطح پر بھی یہی گھن چکر نمایاں نظر آتا ہے۔

سینیٹ کے حالیہ انتخابات نے سٹیٹس کو والے ہمارے فرسودہ نظام کی جو بھد اُڑائی اس سے کم از کم اس مفاداتی اور طبقاتی تقسیم کے شاہکار سسٹم سے خلاصی کا شعور تو عام آدمی کے ذہن میں اُجاگر ہوا ہے۔ اس لئے اگر اب ادارہ جاتی معاملات میں بھی اس پہلو پر بحث مباحثہ کے دروازے کھلتے ہیں تو اس پر کسی کو ناک بھوں چڑھانا چاہئے نہ اپنی نازک انا کا کوئی مسئلہ بنانا چاہئے، ایسے بحث مباحثہ سے یقیناً آئندہ کے لئے سسٹم کی بہتری اور آئین وقانون کی حقیقی معنوں میں عملداری کی گنجائش نکلتی چلی جائے گی۔

سینیٹ انتخابات کے معاملہ میں انفرادی اور ادارہ جاتی سطح پر بعض آئینی شقوں کی اپنی من مرضی کی تشریح وتوجیح سے ہمارے اب تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے تاثر کو ہی تقویت ملی ہے۔ ایسی تشریحات وتوجیہات یقیناً بلا مقصد نہیں ہوتیں، کہیں ایک دوسرے کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں اور کہیں ایک دوسرے کے خلاف روایتی محاذ آرائی من مرضی کے نتائج کے راستوں پر چلائے رکھتی ہے۔ اسی تناظر میں حکومت کے گورننس کے معاملات میں سینیٹ انتخابات شوآف ہینڈز کے ذریعے کرانے کا سودا سمایا چنانچہ پارلیمنٹ کی آئینی برتری تو کجا، اس کی

آئینی حیثیت ہی کو یکسر نظر انداز کر کے اس سے وابستہ حکمران طبقات ایک صدارتی ریفرنس بنا کر سپریم کورٹ چلے گئے۔ ''کمال'' کرنے کے جذبہ نے مزید مہمیز لگائی تو سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت ریفرنس کے دوران ہی شو آف ہینڈز کے طریق کار کے لئے صدارتی آرڈی ننس بھی جاری کرا دیا گیا۔ آئین کی دفعہ 226 نے تو واضح پابندی لگائی ہوئی ہے کہ وزیر اعظم اور وزراء اعلیٰ کے سوا ملک کے تمام اور ہر سطح کے انتخابات خفیہ رائے شماری کے تحت ہوں گے مگر اس واضح آئینی دفعہ کے باوجود مفاداتی کش مکش میں سینیٹ انتخابات کے لئے شو آف ہینڈز کا راستہ اختیار کر لیا گیا اس طرح دانستہ طور پر پارلیمنٹ اور آئین کی بے توقیری کی گئی اور پھر سپریم کورٹ میں ریفرنس لے جا کر اسے بھی آزمائش میں ڈال دیا گیا۔

آئین کی دفعہ 226 کی موجودگی میں سپریم کورٹ کے پاس بادی النظر میں اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں تھا کہ صدارتی ریفرنس حکومت کو واپس لوٹا کر اسے دفعہ 226 کی عملداری اور شو آف ہینڈز کی خاطر اس آئینی دفعہ میں مروجہ طریق کار کے تحت ترمیم کے لئے پارلیمنٹ سے رجوع کرنے کا کہا جاتا مگر ریفرنس کی سماعت کے دوران آئین کی تشریح کے اختیارات کا سہارا لے کر معاملات اُلٹانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ بھلا واضح آئینی شق میں سے کسی کو فائدہ پہنچانے والی کوئی توجیح نکالی جا سکتی تھی؟ مگر سسٹم کے لئے ٹامک ٹوئیاں مارتے ہمارے ذہنوں نے ایسی توجیح کی گنجائش بھی نکال لی۔ سینیٹ انتخابات کو دفعہ 226 کے تحت خفیہ رائے شماری کے طریق کار کا پابند بھی کر دیا اور ساتھ یہ پخ بھی لگا دی کہ خفیہ رائے شماری سے ڈالے گئے ووٹ کی ضرورت پڑنے پر شناخت کا بھی کوئی الیکٹرانک طریق کار نکال لیا جائے چنانچہ اس نکتے پر پہلے ہی گھمبیر ہوتی سیاسی محاذ آرائی کی فضا میں ایک دوسرے پر مزید پوائنٹ سکورنگ کی گنجائش بھی نکل آئی۔ اس عمل میں آئین کی تشریح کے مجاز ادارے کے ہاتھوں آئین کی دفعہ 226 کی جو درگت بنی وہ آئین و قانون کی عملداری کو جھٹکے لگانے کے لئے کافی ہے۔

معاملہ پارلیمنٹ کی کورٹ کی جانب دھکیلا گیا جہاں پہلے ہی جوتیوں میں دال بٹنے کے مناظر سسٹم کے استحکام کے حوالے سے دل و جگر میں ٹیسیں پیدا کرنے کا اہتمام کئے ہوئے تھے۔ جناب! معاملہ پارلیمنٹ ہی نے طے کرنا ہے اور یقیناً پارلیمنٹ ہی نے طے کرنا ہے تو اس کے اختیارات کو ووٹ کی شناخت والے کسی جبر کے ساتھ باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔

اب معاملہ چیئرمین سینیٹ کے لئے خفیہ رائے شماری سے پڑنے والے یوسف رضا گیلانی کے سات ووٹوں کو پریذائیڈنگ افسر کی جانب سے تکنیکی بنیادوں پر مسترد کئے جانے پر آئین کی وضاحت کا درپیش آیا ہے تو اس کے لئے آئین کی دفعہ 69 کی پابندی دوٹوک الفاظ میں باور کرا دی گئی ہے کہ اس کے تحت پارلیمنٹ کی کسی کارروائی کو کسی بے ضابطگی کے نام پر کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ چلیں اس سے ایک آئینی ادارے کی برتری تو تسلیم ہوئی مگر یوسف رضا گیلانی کے وکیل تو چیئرمین سینیٹ کے انتخاب کی کارروائی کو سینیٹ کی ضابطے والی روٹین کی کارروائی میں شامل ہی نہیں سمجھتے جن کے بقول انتخاب کا عمل کسی بے ضابطگی کی بنیاد پر کسی بھی عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اس پر دیکھیں اعلیٰ عدالتی فورم پر اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگر اس فورم پر بھی آئین کی دفعہ 69 کو ڈھال بنایا گیا اور پارلیمنٹ کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کی گئی تو جناب! اس سے کم از کم آئینی ریاستی اداروں کے اپنی اپنی حدود و قیود میں رہنے اور اپنے اپنے آئینی اختیارات ہی استعمال کرنے کے متعینہ راستے کی تو نشاندہی ہو جائے گی۔ گویا......

برسوں آنکھوں میں رہے، آنکھوں سے چل کر دل میں آئے
راہ سیدھی تھی مگر پہنچے بڑے چکر سے آپ

اگر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے اس چکر اور گھن چکر نے ہمیں سات آٹھ دہائیوں بعد بھی آئین و قانون کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری کا راستہ سمجھا دیا اور اس سے ریاستی ادارہ جاتی نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کی سوچ پروان چڑھ گئی تو یقین مانئے ہمیں ''فرسودہ'' نظام کی تبدیلی کے لئے کسی انقلاب یا لمبے چوڑے تردد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چیئرمین سینیٹ کے الیکشن کے حوالے سے اسلام آباد ہائیکورٹ کے فیصلہ کی یہ میری اپنی توجیح ہے جو بے شک میری رجائیت پسندی پر مبنی ہے مگر اسے آئین کی عملداری اور پارلیمنٹ کی برتری کے لئے مہر تصدیق بنا لیں تو ہم سسٹم کے حوالے سے سالہا سال سے ماری جانے والی ٹامک ٹوئیوں سے بچ جائیں گے، پھر ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا''۔

''عذاب وثواب'' کا اسی پر فیصلہ کر لیں اور بچ بچا کے دھیمے سُروں میں یہ گنگناتے ہُوئے فلاح پائیں کہ

محتسب کی خیر، اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رِند کا، ساقی کا، خُم کا، مے کا، پیمانے کا نام

اصلاحِ احوال۔تنقید وتجاویز

حالیہ سینٹ انتخابات میں جو''جمہوری'' کھیل تماشا ہوا اس نے ہمارے مروجہ سسٹم کے حوالے سے بحث وتمیص کے کئی دروازے کھولے ہیں۔بے شک سسٹم وہی اچھا ہوتا ہے جو ملک کی ترقی' خوشحالی اور بقاء واستحکام کا ضامن ہو اور جس کے ثمرات سے عوام براہ راست مستفید ہو رہے ہوں۔میں اس حوالے سے ان صفحات پر اکثر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہتا ہوں جس پر مثبت' منفی تنقید کے دروازے بھی کھلے رہتے ہیں تاہم مقصود صرف سسٹم کی اصلاح ہوتا ہے۔ہمیں یہ سوچنے اور جائزہ لینے کا حق تو حاصل ہے ناں کہ سلطانیٔ جمہور کے نام پر جمہور کو راندۂ درگاہ بنانے والے مروجہ سسٹم ہی کا دامن تھامے رکھا جائے یا اسکی جگہ کسی دوسرے نظام کا تجربہ کر لیا جائے۔اس معاملہ میں ہمارے راستے میں آئینی اور قانونی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔مروجہ پالیمانی جمہوری نظام کو صدارتی جمہوری یا متناسب نمائندگی والے منتخب جمہوری نظام میں تبدیل کرنا مقصود ہو تو اس کیلئے ہمیں آئین کا سارا ڈھانچہ تبدیل کرنا یعنی نیا آئین تشکیل دینا ہوگا جبکہ مروجہ سسٹم میں مطلوبہ اصلاحات اسی آئین میں بعض ترامیم یا مروجہ قوانین بشمول عوامی نمائندگی ایکٹ' پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترمیم کر کے الیکشن کمیشن کو انتخابی اصلاحات کے حوالے سے حاصل اسکے اختیارات کا دائرہ مزید وسیع کر کے کی جا سکتی ہیں مگر اس کیلئے حکومتی اور اپوزیشن بنچوں کے مابین افہام وتفہیم کی مثالی فضا درکار ہوگی جس کا ہمارے آج کے سیاسی چلن میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

میں جب اس صورتحال کا یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ ہمارے قومی سیاسی قائدین اپنے چال چلن کے باعث ہی ماورائے آئین اقدامات کی راہ ہموار کرتے اور جمہوریت کا جنازہ نکالتے ہیں تو میرے بعض کرم فرماؤں کی جبینِ نیاز شکن آلود ہو جاتی ہے جو ماورائے آئین اقدامات کے معاملہ

میں سیاست دانوں کو بے قصور گردانتے ہیں اور سارا ملبہ ایسے اقدامات والوں پر ہی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بے شک 1958ء والے مارشل لاء تک ایسا ہی معاملہ ہوگا مگر میری دانست میں اس کیلئے فضا بھی قیام پاکستان سے پہلے والا ''سٹیٹس کو'' برقرار رکھنے کے خواہشمند سیاست دانوں نے ہی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ہموار کی تھی۔ اسکے بعد تو ہماری سیاسی نرسریوں میں زیادہ تر ''پودوں'' نے فوجی آمریت کی چھتری کے نیچے ہی پرورش پائی اس لئے میرے کرم فرماؤں کو اپنی شکن آلود جبینِ نیاز کے ساتھ کچھ اپنا کتھارسس بھی کر لینا چاہیے۔ آج کی سیاست پر تو اسی چھتری کے نیچے پروان چڑھنے والے سیاست دانوں کا غلبہ ہے اس لئے اصل ''سٹیٹس کو'' توڑے بغیر حقیقی تبدیلی کا تصور کیسے پنپ پائے گا۔

ان دنوں سوشل میڈیا پر بالخصوص مختلف وٹس ایپ گروپوں میں سسٹم کی تبدیلی اور اصلاح کے حوالے سے گرما گرم بحث چل رہی ہے۔ جو دوست ان گروپوں میں شامل نہیں وہ وٹس ایپ کے ذریعے انفرادی رابطوں کے ساتھ اس بحث کا حصہ بنے ہوئے ہیں جس نے سینٹ کے حالیہ انتخابات میں کسی ''چھومنتر'' اور دھن دھونس کے استعمال کے باعث گدلی ہونیوالی سیاسی فضا میں تقویت حاصل کی ہے۔ ہمارے دیرینہ دوست اور بائیں نظریات کے حامل معتبر بزرگ سیاست دان پرویز صالح نے ''سٹیپس فار اے بیٹر پاکستان'' کے نام سے ایک وٹس ایپ گروپ بنایا ہوا ہے جس میں ہر مکتبۂ فکر اور ہر مکتبۂ زندگی کے لوگ شامل ہیں' اس گروپ میں سسٹم کی اصلاح کے حوالے سے بحث مباحثہ ہمہ وقت چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہمارے دیرینہ دوست اور نوائے وقت کے سینئر کالم نگار اسداللہ غالب صاحب نے ''پی سی آئی اے نیو'' کے نام سے ایک وٹس ایپ گروپ تشکیل دے رکھا ہے جس میں دانشوروں' سیاست دانوں اور ریٹائرڈ بیوروکریٹس سمیت ہر مکتبۂ زندگی کے لوگ سسٹم کی اصلاح کے معاملہ میں اپنی اپنی آراء کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ بحث کسی منظم طریقے سے قومی سطح پر شروع ہو تو یقیناً نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

اس میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ آج کی سیاست میں حکمران طبقات ہوں یا انکے سیاسی مخالفین' سب کے سب ہمارے روایتی اور مروجہ کرپشن کلچر میں سر کے بال سے انگلی کے ناخن تک

مکمل لتھڑے ہوئے ہیں۔ایک دوسرے کومور دِالزام ٹھہراتے ہیں مگر اصلاح کے عملی اقدامات کی طرف آنے کی بجائے ایک دوسرے کے گریبانوں کی خبر لیتے رہنے میں ہی راحت محسوس کرتے ہیں۔ پھر جذباتی ہوئے بغیر سوچ بچار کرنے میں کیا مضائقہ ہے اور ہمارے آج کے سیاسی چال چلن کا یہ نتیجہ نکالنے میں کیا دِقت ہوسکتی ہے کہ یہ سب باہم مل کر جمہوریت کا مردہ خراب کرنے کے جتن میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی سیاسی ماحول کے تناظر میں میں نے اپنے گزشتہ کالم ''ہماری جمہوریت کا مینوفیکچرنگ فالٹ'' میں سینٹ انتخابات کے مراحل میں ''چھومنتر'' کے عمل دخل کا تذکرہ کیا جس پر سوشل میڈیا پر گرما گرم بحث ہوئی۔ رانا اکرم ربانی زیرک سیاست دان ہیں' انہوں نے اپنے تبصرے کے ساتھ بعض انتخابی اصلاحات بھی تجویز کی ہیں اور ایک تصویر شیئر کر کے معنی خیز کیپشن لگایا۔ اس تصویر میں دائیں جانب سپیکر قومی اسمبلی اسد قیصر' درمیان میں چیئرمین سینٹ صادق سنجرانی اور بائیں جانب آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ تشریف رکھتے ہیں۔ رانا صاحب نے اس کا کیپشن لگایا کہ ''ایوان زیریں' ایوان بالا اور ایوان بلند و بالا''۔ سسٹم کی اصلاح کیلئے انہوں نے تجویز پیش کی کہ اسمبلیوں کے انتخابات میں موجودہ انتخابی مہم کا طریق کار تبدیل کر دیا جائے۔ ڈور ٹو ڈور انتخابی مہم کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ کچھ پوائنٹس متعین کر لئے جائیں جہاں جلسہ عام کا اہتمام کیا جائے' ہر امیدوار اپنا تعارف اور اپنی پارٹی کا منشور واضح کرے۔ پھر عوام کو سوال کرنے کا حق حاصل ہو۔ محدود مخصوص تعداد میں فلیکس' پوسٹر الیکشن کمیشن بنوائے جس پر نعرے امیدوار کی مرضی سے تحریر کئے جائیں۔ ہر امیدوار زرضمانت کے علاوہ اخراجات کی متعین کردہ حد الیکشن کمیشن میں جمع کرائے اور پیسے کا استعمال جو ٹکٹ جاری کئے جانے سے شروع ہو کر ووٹنگ کے دوران بھی جاری رہتا ہے' کم کیا جائے۔ چھومنتر کا عمل دخل کم نہیں' ختم کرنا بھی ضروری ہے۔

انکی اس تجویز کی تائید کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی تجویز کی گرہ لگائی کہ ملک میں امریکہ اور برطانیہ کی طرز پر دو یا تین جماعتوں کے مابین انتخابی مقابلہ ہونا چاہیے۔ کسی کو بطور آزاد امیدوار کھڑا ہونے کی اجازت نہ ہو۔ پولنگ سے چند روز قبل صرف پارٹی ہیڈز کو الیکٹرانک اور پرنٹ

میڈیا پر اپنا پارٹی منشور پیش کرنے کی اجازت دی جائے اور کوئی امیدوار ازخود اپنی انتخابی مہم چلانے کا مجاز نہ ہو۔ امیدواروں کی نامزدگی کا اختیار صرف پارٹی ہیڈ کو حاصل نہ ہو بلکہ اس کیلئے پارٹی کا ایک بااختیار بورڈ تشکیل دیا جائے۔ اس سے ہمارے انتخابی نظام کو "الیکٹیبلز" والی مجبوری سے بھی خلاصی مل جائیگی۔ کروڑوں کے انتخابی خرچے بھی بچ جائیں گے اور ہارس ٹریڈنگ کی لعنت سے بھی نجات مل جائیگی۔ سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ اور سابق چیف الیکشن کمشنر محترم ارشاد حسن خان نے میری اس تجویز سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے باور کرایا کہ یہ تجویز آئینی ترمیم کے بغیر روبہ عمل نہیں آسکتی۔ آئین کی دفعہ 62 ملک کے ہر شہری کو انتخاب میں حصہ لینے کا اہل قرار دیتی ہے۔ ماسوائے اسکے کہ وہ آئین کی دفعہ 63 کی کسی شق کے تحت نااہل نہ ہو۔ اسی طرح انتخابی قوانین آئین کی دفعہ 222 کے ماتحت ہیں جبکہ پارلیمنٹ آئین سے متصادم کوئی قانون وضع کرنے کی مجاز نہیں۔ ان آراء کی روشنی میں میرا یہی تجسس اور موقف ہے کہ سسٹم میں اصلاح مقصود ہے تو قانون اور آئین میں جو بھی ترمیم ضروری ہے وہ کرلی جائے اور اگر نئے آئین کی ضرورت ہو تو وہ بیڑا بھی اٹھالیا جائے۔

ہماری جمہوریت کا ''مینوفیکچرنگ فالٹ''

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہم نے جس جمہوریت کو اوڑھ رکھا ہے' اس میں کوئی ''مینوفیکچرنگ فالٹ'' موجود ہے کہ جہاں سے یہ جمہوریت آئی ہے' نہ وہاں کی جمہوری اقدار ہماری جمہوریت میں پنپ پائی ہیں اور نہ ہی سلطانی جمہور کے تصور کے مطابق جمہوریت کے ثمرات سے عوام مستفید ہو پائے ہیں۔ جمہوریت کی اقدار یہ ہیں کہ ایک دوسرے کے مینڈیٹ کا لازمی تقاضے کے طور پر احترام کیا جائے۔ برطانیہ میں وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کو محض ایک ووٹ کی برتری حاصل ہوئی اور انہوں نے اس ایک ووٹ کی عددی اکثریت کے بل بوتے پر ہی اپنے اقتدار کے متعینہ پانچ سال خوش اسلوبی سے گزار لئے۔ اگر جمہوری اقدار میں مینڈیٹ کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو صرف ایک ووٹ کو دوسری طرف کھسکانے میں کتنی دیر لگتی۔ امریکی صدارتی نظام والی جمہوریت میں بھی ایک دوسرے کے مینڈیٹ کا بہرصورت احترام کیا جاتا ہے۔ وہاں ویسے ہی خالصتاً دو جماعتی نظام رائج ہے جس میں ہر پارٹی اپنا امیدوار نامزد کرنے کیلئے بھی عوامی رائے حاصل کرتی ہے اور کسی پارٹی قائد کو از خود امیدوار نامزد کرنے کا قطعاً اختیار نہیں ہوتا اور امریکی عوام نے ری پبلکنز اور ڈیموکریٹس میں سے ہر ایک کو اقتدار کی دو دو ٹرمیں دینے کی روایت مستحکم کی ہوئی ہے۔ وہاں 2000ء میں ڈیموکریٹ الگور اور ری پبلکن بش جونیئر کے مابین صدارتی انتخاب کا مقابلہ ضرور متنازعہ ہوا تھا اور الگور اسے امریکی سپریم کورٹ میں لے گئے تاہم جب امریکی عوام کے بعد سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی بش کے حق میں آیا تو انہوں نے اپنے اقتدار کے نہ صرف پہلے چار سال سکون واطمینان سے گزارے بلکہ اگلی چار سالہ ٹرم بھی انہی کے حصے میں آئی۔

اب ڈونلڈ ٹرمپ نے امریکی جمہوریت اور جمہوری اقدار کو نقب لگانے کی کوشش کی تو امریکی عوام نے انہیں الٹا کر رکھ دیا اور ایک پارٹی کے اقتدار کی دو ٹرموں والی قائم کی گئی اپنی روایت بھی توڑ ڈالی۔ ٹرمپ نے اپنے شرارتی ذہن کیمطابق ڈیموکریٹ جو بائیڈن کی کامیابی کو

بھی چیلنج کیا اور اپنے مدمقابل صدر کی حلف برداری میں شریک نہ ہونے کی بری روایت بھی پہلی بار قائم کی مگر بالآخرری پبلکن پارٹی نے ٹرمپ کی شرارتی سوچ کے برعکس انکی شکست تسلیم کی اور ڈیموکریٹس کا مینڈیٹ قبول کیا۔ اب ٹرمپ بھی سرکشی اختیار کرتے کرتے ''کینڈے'' میں آ چکے ہیں اور امریکہ میں جمہوریت کی گاڑی بدستور رواں دواں ہے۔

جمہوریت اوڑھاتے وقت ہماری گھٹی میں نہ جانے کیا ڈال دیا گیا کہ ہم شروع دن سے ہی اس کا مردہ خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کسی کا اقتدار کا مینڈیٹ ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کسی کو اقتدار سے محروم کر کے کسی دوسرے کو اقتدار میں لانا مقصود ہوتا ہے تو پوری پارٹی میں نقب لگانا بھی چنداں مشکل نظر نہیں آتا۔ اول تو کسی پارٹی کے ''سنگل مجارٹی'' والے قطعی اکثریتی مینڈیٹ کی نوبت ہی نہیں آنے دی جاتی اور اگر شومئی قسمت یا خوش بختی سے کسی کو قطعی اکثریت والا مینڈیٹ حاصل ہو جائے تو اسے پلٹانے کیلئے اسکی پارٹی کے اندر سے باغی گروپ نکالنا دائیں ہاتھ کا کھیل بن جاتا ہے۔ قطعی اکثریت نہ ہونے کے باوجود اقتدار کی منزل کے قریب پہنچنے والی کسی پارٹی کیلئے اقتدار کی منزل حاصل کرنا فی الواقع جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ مراحل طے کرنے کیلئے ہی ہماری جمہوریت میں ہارس ٹریڈنگ کو گھسیڑا گیا جس نے سیاسی، اخلاقی، قانونی، آئینی روایات سمیت ہر سیاسی قدر کو دھوبی پٹڑا مار دیا۔ اس گندے کھیل کے باعث جمہوریت کی گاڑی کو ٹریک سے اتارنا آسان عمل بنا رہا ہے اور عوام بھی ماورائے آئین اقدامات کو یہ سوچ کر قبول کرتے رہے ہیں کہ......

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

موجودہ اقتداری قیادت نے زہر کو تریاق سمجھ کر پینے سے عوام کو روکنے کیلئے ہی اور اقتدار کی موروثی سیاست کو نکیل ڈالنے کے عزم کے تحت ہی اقتدار کی سیاست میں قدم رکھا تھا چنانچہ جمہوریت کو بدچلنی کے راستے پر ڈالنے والے سیاست کاروں کو راندۂ درگاہ بنانے کا جذبہ اپنے پلّو سے باندھ کر عوام نے ''گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو'' والا کردار ادا کیا۔ مگر بھائی صاحب! اس عمل کے اندر سے بھی تو اسی روایتی سیاست نے جنم لیا جو شروع دن سے ہی ہمارے مقدر کا حصّہ بن چکی تھی۔ عوام کے پسندیدہ قائد عمران خان صاحب 2018ء کے انتخابات کی مہم میں یہ اعلانیہ عہد کرتے رہے کہ اگر انہیں قطعی اکثریت والا مینڈیٹ حاصل نہ ہوا تو وہ اپوزیشن میں

بیٹھنا قبول کرلیں گے مگر اقتدار کی خاطر کسی بلیک میلنگ میں نہیں آئیں گے۔ انہیں انتخابات میں خیبر پی کے اسمبلی کے سوا قطعی اکثریت والا مینڈیٹ کہیں پر بھی حاصل نہ ہوسکا اور پھر قوم نے دیکھا کہ انہوں نے اقتدار کی خاطر بلیک میل نہ ہونے کا عہد کہاں تک نبھایا۔ پنجاب میں تو انکی پارٹی اقتدار کی دوڑ میں پہلی رو میں بھی شامل نہیں تھی' اگر انہوں نے روایتی کلچر کے عین مطابق مرکز اور تین صوبوں میں مسندِ اقتدار تک رسائی حاصل کی تو جناب! سٹیٹس کو توڑنے اور بزرجمہروں کے قائم اور استوار کئے گئے سیاست کے روایتی اٹھائی گیر کلچر کو توڑنے کی ان سے کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ سو اس عہد اقتدار میں بھی سیاست کا وہی بے ڈھنگا کلچر ہی حاوی ہے جس میں ہارس ٹریڈنگ کی پھلتی پھولتی لعنتی روایت میں لتھڑے سیاست کاروں کیلئے کسی کا ضمیر خریدنا بس انگلی کے موہوم سے اشارے کا مرہون منت ہوکر رہ گیا ہے۔

سینٹ کے حالیہ انتخابات اور اب آج کے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین سینٹ کے انتخاب کے موقع پر ہماری جمہوریت ہر دو جانب سے یہی پکار رہی ہے کہ......

اس شہر میں ہر شخص کا ایمان بکا ہے
قیمت مجھے معلوم ہے' تم نام بتاؤ

بھئی اس کا تخمینہ لگانا ہو تو محترم شبلی فراز کے دو روز قبل کے ٹی وی انٹرویو اور انکے اگلے روز کے ٹویٹر پیغام سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس میں وہ دوٹوک اعلان کر رہے ہیں کہ صادق سنجرانی کو چیئرمین سینٹ بنوانے کیلئے ہم ہر سیاسی' جمہوری اور قانونی حربہ اختیار کرینگے۔ اگر وہ یہ باور کرا رہے ہیں کہ ''یہ نہیں ہوسکتا' اپوزیشن قانون کی خلاف ورزی کرے اور ہم قانون کے مطابق چلیں'' تو سینٹ چیئرمین کے آج کے انتخاب کے نتائج بھی دیوار پر لکھے نظر آرہے ہیں۔ اپوزیشن کے عددی اکثریت والے سات میں سے بس چار ووٹوں پر ہی تو محنت کرنی ہے جو شبلی فراز صاحب کے بیان کی روشنی میں اب تک ہوچکی ہوگی۔ گویا......

تکمیل ضروری ہے' اِدھر ہو کہ اُدھر ہو
ناکردہ گناہی بھی گناہوں میں چلی آئے

پھر ہمیں اپنی جمہوریت کے مینوفیکچرنگ فالٹ کے ساتھ ہی گزارا کرنا ہوگا کیونکہ......

کس دا دوش اے' کس دا نہیں اے
ایہہ گلاں ہُن کرن دیاں نہیں

سینٹ انتخابات کے اسباق

سینٹ انتخابات کی شوراشوری میں کئی معاملات زورازوری ہو گئے ہیں جو ارباب اختیار و اقتدار کے ساتھ ساتھ اربابِ حزب اختلاف' سلطانی جمہور سے منسلک تمام فریقین' اربابِ عقل و دانش اور مجموعی طور پر پوری قوم کیلئے سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کے متقاضی ہیں۔اسی طرح سینٹ انتخابات سے جو فوری طور پر اور آئندہ کی سیاست میں اثر پذیر ہونیوالے نتائج اخذ ہوئے ہیں' ان کا بھی سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔آج ان سطور میں اسی حوالے سے میں خامہ فرسائی کی کوشش کروں گا۔

ان انتخابات کے نتائج سے جو تاثر فوری طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ سیٹ اپ میں اپوزیشن کو حکومت پر اخلاقی برتری حاصل ہوگئی ہے۔بے شک قومی اسمبلی میں حکومتی پارٹی اور اتحاد میں ڈنٹ پڑنے کے باوجود سرکاری بنچوں کے پاس عددی اکثریت موجود ہے اور کل کو وزیراعظم عمران خان کیلئے اعتماد کا ووٹ لینے کی نوبت آتی ہے جس کا وہ اعلان بھی کر چکے ہیں اور اسی طرح ہاؤس میں وزیراعظم کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوتی ہے تو سینٹ میں سید یوسف رضا گیلانی کو جتوانے جیسے نتائج حاصل کرنا اپوزیشن کیلئے خاصہ مشکل ہوگا۔البتہ حکومت کیلئے یہ لمحۂ فکریہ ضرور ہے کہ قومی اسمبلی میں سرکاری بنچوں کی 181 والی عددی اکثریت کم ہو کر 174 تک آ گئی ہے کیونکہ اسلام آباد سے سینٹ کی خاتون نشست پر حکومتی خاتون امیدوار کو اپوزیشن کے 161 ووٹوں کے مقابلے میں 174 ووٹ ملے ہیں۔اسکے برعکس اپوزیشن بنچوں کی ہاؤس کے اندر پوزیشن مستحکم ہوگئی ہے کیونکہ اسلام آباد کی جنرل نشست پر اسکے امیدوار سید یوسف رضا گیلانی نے اپوزیشن بنچوں کی مجموعی تعداد 161 سے آٹھ ووٹ زیادہ حاصل کیے ہیں جو لامحالہ سرکاری بنچوں سے آئے ہیں۔ان میں حکمران پی ٹی آئی کے ارکان بھی شامل ہو سکتے ہیں اور

حکومتی اتحادیوں کے بھی۔ حکومت کی جانب سے سات ووٹ مسترد ہونے کا ڈھنڈورا تو زیادہ پیٹا جارہا ہے مگر اس جانب توجہ نہیں دی جارہی کہ حکومتی امیدوار حفیظ شیخ کے مقابل اپوزیشن امیدوار سید یوسف رضا گیلانی نے اپوزیشن بنچوں کے مجموعی ووٹوں سے بھی آٹھ ووٹ زیادہ لے لئے ہیں جو سرکاری بنچوں سے نہ کھسکتے تو حکومتی امیدوار کی جیت یقینی تھی جس کیلئے حکومتی اکابرین بشمول وزیراعظم کی جانب سے حفیظ شیخ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے اور حکومتی صفوں میں مثالی اتحاد کے نقشے کھینچتے ہوئے دعوے کئے جارہے تھے۔ اگر کل کو وزیراعظم پر اعتماد یا عدم اعتماد کے معاملہ میں بھی سرکاری بنچوں سے کھسکنے والے ارکان کی یہ سوچ برقرار رہی کہ......

جو بھی آوے، تیرے پہلو میں جگہ پاوے ہے

میں کہاں تک تیرے پہلو سے کھسکتا جاؤں

تو حضور! ہاؤس میں عددی اکثریت کے باوجود سید یوسف رضا گیلانی والے نتیجے کی طرح آپ کو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ آپ ووٹوں کی خرید و فروخت کا معاملہ تو ایک طرف رکھیئے کہ اس میں بھی آپ ہی کیلئے سبکی کا اہتمام ہے کیونکہ ووٹ فروخت کرنیوالے ''مقدس جانوروں'' میں زیادہ تر آپ کے اپنے لوگ ہی شامل ہیں۔ اگر آپ کی صفوں میں سے کسی نے ووٹ فروخت کرنے کے برعکس حکومتی پالیسیوں سے عاجز آئے اور زندہ درگور ہوئے عوام الناس کے دکھ درد کا احساس کرتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز پر حکومتی امیدوار کو ووٹ دینے سے گریز کیا ہے تو ووٹ فروخت کرنیوالے ضمیر فروشوں کو مطعون کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کی آواز پر حکومت مخالف ووٹ دینے والوں کی سوچ کا ملک میں مہنگائی، بے روزگاری کی فراوانی کرنیوالی حکومتی پالیسیوں کے ساتھ موازنہ کر کے اصلاحِ احوال کی کوئی صورت پیدا کریں۔

اگر اس فضا میں آپ اپنی مقبولیت کے زعم میں اعتماد کا ووٹ لینے کی خوش گمانی کی طرح اسمبلیاں توڑ کر نئے انتخابات کیلئے عوام کے پاس جانے کا سوچیں گے جس کا بعض حکومتی حلقوں کی جانب سے عندیہ بھی مل رہا ہے تو حضور! حالیہ ضمنی انتخابات کے نتائج سے بھی برے نتائج آپ کا استقبال کرتے نظر آئیں گے۔

اب گزشتہ روز کے سینٹ انتخابات کے نتائج کے تناظر میں سینٹ کی موجودہ پوزیشن کا جائزہ لیتے ہیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ ان انتخابات کے نتائج اسے سینٹ میں بھی اپنی مرضی کی

قانون سازی کے قابل بنادیں گے مگر سینٹ میں اپوزیشن کی عددی اکثریت میں ڈنٹ پڑنے کے باوجود اسے توڑا نہیں جاسکا اور اس وقت بھی سینٹ میں اپوزیشن کے پاس 54' اور سرکاری بنچوں کی 47 نشستیں ہیں جبکہ سینٹ میں موجود چھ آزاد ارکان بھی ہوا کا رخ دیکھ کر ہی فیصلہ کرینگے۔ چنانچہ سینٹ کے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کیلئے اپنے بندے منتخب کرانا اپوزیشن کیلئے کوئی جان جوکھوں والا کام نہیں ہوگا کیونکہ اس وقت چیئرمین سینٹ کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک ناکام بنانے والا ڈیڑھ سال قبل کا چھومنتر کارگر ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ اگر یہ چھومنتر اس وقت بھی اثر پذیر ہوتا تو مضبوط سرکاری امیدوار عبدالحفیظ شیخ کو سینٹ انتخابات میں ناکامی و نامرادی کا سامنا ہرگز نہ کرنا پڑتا۔

پھر آپ تصور کیجئے کہ ایوان بالا میں اپوزیشن بنچوں کی عددی اکثریت ہوگی اور چیئرمین کی نشست پر سید یوسف رضا گیلانی اور اسی طرح ڈپٹی چیئرمین کی نشست پر بھی اپوزیشن اتحاد میں سے کوئی بندہ منتخب ہو کر بیٹھا ہوگا تو آپ کی کوئی زور زبردستی بھلا کہاں کام آئیگی۔

بے شک سینٹ انتخابات کے موجودہ عمل میں ہارس ٹریڈنگ میں لتھڑے کئی مقدس چہرے بے نقاب ہوئے ہیں مگر ان میں کئی اپنے ضمیر کی قید سے بھاگے ہوئے بھی شامل ہیں۔ آپ کو مارکیٹ میں آنیوالی ان ''اجناس'' میں امتیاز تو بہر صورت پیدا کرنا ہوگا۔ آئین کے تحت وہ رکن اسمبلی ہی ڈیفیکشن کی زد میں آئیگا جو وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کے انتخاب میں یا حکومت کے پیش کردہ کسی منی بل میں اپنی پارٹی کے فیصلہ کیخلاف ووٹ دیگا۔ سینٹ کے انتخاب میں ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے یا نوٹوں بھرا بیگ تھامتے ہوئے کوئی حکومتی رکن حکومت مخالف امیدوار کو ووٹ دیگا تو پہلے تو اسے شناخت کرنا ہی مشکل ہوگا۔ اگر کسی ذریعے سے پارٹی قیادت کو ان کا علم ہو بھی جائے تو یہ پارٹی قیادت پر منحصر ہوگا کہ اسکے خلاف کیا تادیبی کارروائی کی جاتی ہے۔ آپ اولین اقدام کے تحت ان لوگوں کو پارٹی سے نکالیں اور ہارس ٹریڈنگ میں ملوث لوگوں کو باقاعدہ سزا دلوانے کیلئے مجاز فورموں پر باقاعدہ مقدمات درج اور دائر کرائیں۔ اب اس کلچر سے باہر نکلیں کہ عدلیہ اور الیکشن کمیشن کی جانب سے اپنے حق میں فیصلہ آئے تو ٹھیک اور اپنے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے تو متعلقہ ادارے کی آپ کے ہاتھوں مٹی پلید۔ بھئی تبدیلی کے آثار اور اثرات کہیں پر تو نظر آنے چاہئیں۔

اور سب سے آخر میں عوام کیلئے غور وفکر یہ ہے کہ وہ اپنے منتخب نمائندوں کا کڑا احتساب کرنے کی روایت ڈالیں۔ان کا منتخب کردہ جو نمائندہ ووٹوں کی خرید وفروخت میں ملوث پایا جائے اسے اپنے حلقے میں گھسنے نہ دیا جائے۔ آپ سندھ اسمبلی میں مارکٹائی والے مناظر سے ہٹ کر متعلقین کو راندۂ درگاہ بنانے کی کوئی اچھی مثال بھی قائم کر سکتے ہیں۔ سینٹ انتخابات کے نتائج کو آپ اسی پیرائے میں دیکھیں اور مستقبل کی اچھی سیاست کے راستے نکالیں ورنہ سلطانی جمہور کو دھکا دینے والے راستے تو اپنی جگہ پر موجود اور قائم ہیں۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

سیکرٹ بیلٹ۔ کہیں ہپ، کہیں تھو

ایک دوسرے پر سیاسی پوائنٹ سکورنگ کے سینٹ انتخابات اور وزیراعظم کے اعتماد کے ووٹ کے مراحل سے گزرنے کے بعد اب فریقین کے مابین چیئرمین سینٹ اور وائس چیئرمین سینٹ کے انتخاب کیلئے پوائنٹ سکورنگ کا بازار گرم ہو چکا ہے۔ 12 مارچ فیصلے کا دن ہے۔ اس سے پہلے پہلے سارے مقاماتِ سودوزیاں کھل چکے ہونگے مگر چیئرمین سینٹ کیلئے باضابطہ فیصلے سے پہلے ہی حکومت اور اپوزیشن نے اپنے اپنے پتے تو شو کردیئے تھے۔ موجودہ چیئرمین سینٹ صادق سنجرانی تو سینٹ انتخابات کے انعقاد سے بھی پہلے دوبارہ اس منصب کیلئے متحرک ہو گئے تھے اور انہوں نے حکومتی اور اپوزیشن جماعتوں سے رابطے شروع کردیئے تھے۔ اسی طرح اپوزیشن کی صفوں میں سے یوسف رضا گیلانی کے سینیٹر منتخب ہونے کے بعد اگرچہ پیپلز پارٹی کی قیادت نے اعلان کیا کہ چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین سینٹ کے امیدوار کا فیصلہ اپوزیشن اتحاد پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم پر کیا جائیگا۔ اس کیلئے پی ڈی ایم کی مرکزی قیادت کا اجلاس بھی 8 مارچ کو طلب کرلیا گیا جس کے فیصلے یہ سطور شائع ہونے تک منظر عام پر آ چکے ہونگے تاہم پیپلز پارٹی کی قیادت نے پی ڈی ایم کے اجلاس اور اسکے فیصلے سے پہلے ہی چیئرمین سینٹ کیلئے سید یوسف رضا گیلانی کی لابنگ شروع کردی اور مسلم لیگ (ق) کی قیادت سمیت مختلف جماعتوں بشمول مسلم لیگ (ن) کے قائدین سے ملاقاتوں میں ان سے سید یوسف رضا گیلانی کیلئے ووٹ مانگنا شروع کردیا۔

چیئرمین سینٹ کیلئے حکومتی امیدوار کا معاملہ تو اور بھی دلچسپ رہا ہے کیونکہ صادق سنجرانی حکومتی اتحاد کے کسی فیصلے سے پہلے ہی خود ہی امیدوار بنے اور اپنے حق میں لابنگ شروع کی جس کے بعد حکمران پی ٹی آئی نے انہیں اپنی پارٹی میں یا اپنے اتحادیوں کے ساتھ کسی مشاورت کے

بغیر ہی حکومتی امیدوار نامزد کر دیا۔ اس طرح ہر دو فریقین کی جانب سے صادق سنجرانی اور سید یوسف رضا گیلانی کو چیئرمین سینٹ کیلئے اپنا اپنا امیدوار بنانے کی محض رسمی کارروائی کی گئی ہے جبکہ انکے بارے میں فیصلے سینٹ انتخابات سے بھی قبل پہلے ہی ہو چکے تھے۔ یہ فیصلے کہاں پر اور کس کے اشارے پر ہوئے' یہ ''اوپن سیکرٹ'' ہے۔ بس ان فیصلوں کے ساتھ چلنے کے حکم کی تعمیل فریقین کی مجبوری بنی ہے۔

جناب! صادق سنجرانی تو پی ٹی آئی میں شامل بھی نہیں' وہ خود کو آج بھی بلوچستان اتحاد ''باپ'' کا حصہ قرار دیتے ہیں اور بلوچستان سے سینٹ کی نشستوں پر ''باپ'' کی کامیابی کو اپنی ہی کامیابی گردانتے ہیں۔ پھر ان کا بلاتوقف اور بغیر کسی تردد کے حکمران پی ٹی آئی کا امیدوار نامزد ہونا کسی ''پردہ داری'' کے زمرے میں تو نہیں آسکتا۔ پی ٹی آئی قائد عمران خان تو اپنی پارٹی کے بندے سے ہٹ کر پنجاب اور خیبر پی کے میں اپنی کسی اتحادی جماعت کو وزارت اعلیٰ یا کوئی دوسرا بڑا حکومتی منصب دینے کے روادار نہیں ہوئے اور وہ آج بھی پنجاب میں اپنے وسیم اکرم پلس کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں اور کسی ممکنہ تبدیلی کی صورت میں بھی پنجاب کی وزارت اعلیٰ اپنی پارٹی میں ہی رکھنا چاہیں گے تو وہ چیئرمین سینٹ کیلئے صادق سنجرانی پر اتنے ریشہ خطمی کیسے ہو گئے کہ انہوں نے اس کیلئے اپنی پارٹی اور اتحادیوں کی سطح پر کسی سے مشاورت کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اگر سنجرانی خود ہی امیدوار بننے کے بعد حکومتی امیدوار بھی نامزد ہوئے ہیں تو بھائی صاحب!......

نہ تم سمجھے' نہ ہم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیئے اپنی جبیں سے

اس فضا میں ''چھیڑ خوباں'' سے گریز ہی بہتر ہے۔ جنہیں آج سینٹ کے انتخاب کیلئے اوپن بیلٹ کا غم کھائے جا رہا ہے اور وہ اوپن بیلٹ نہ ہونے پر الیکشن کمیشن کو رگیدنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے' انہی کو اب چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین سینٹ کے انتخاب میں سیکرٹ بیلٹ فیوض و برکات پر مبنی نظر آئیگا کیونکہ سینٹ میں اپوزیشن بنچوں کی 54' اور حکومتی بنچوں کی 47

نشستوں کی موجودگی میں اوپن بیلٹ کے ذریعے انتخاب حکومت کی ناکامی کی علامت بن جائیگا۔
اگر اس انتخاب میں حکومتی امیدواروں نے کامیاب ہونا ہے، جس کے حکومتی اکابرین کی جانب سے دعوے بھی کئے جا رہے ہیں تو وہ خفیہ رائے شماری میں کسی ''چھومنتر'' کے استعمال سے ہی ممکن ہو سکتا ہے جیسا کہ ڈیڑھ سال قبل خفیہ رائے شماری میں چھومنتر کے زور پر سنجرانی کیخلاف اپوزیشن بنچوں کی عدم اعتماد کی تحریک ناکام بنائی گئی تھی۔ اس وقت تو اپوزیشن بنچوں کی برتری بھی 17, 18 ووٹوں کی تھی جبکہ اب تو محض سات ووٹوں کا فرض ہے۔ 12 / مارچ کو چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین کے انتخاب میں اپوزیشن کی یہ عددی برتری ٹوٹے گی تو ہارس ٹریڈنگ کا الزام کس کے سر جائیگا۔ حضور! یہ ایسی اصولی سیاست ہے کہ نتیجہ اپنے حق میں آئے تو ہارس ٹریڈنگ کی لعنت ''ہپ ہپ'' اور اپنے خلاف آئے تو ''تھو تھو''۔

آج شاید اپوزیشن والے سینٹ الیکشن کیلئے شو آف ہینڈز کی ضرورت محسوس کر رہے ہوں اور 12 / مارچ کو سینٹ میں اپنے امیدواروں کی شکست کی صورت میں انہیں سیکرٹ بیلٹ حکمران پی ٹی آئی کے موقف سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر لعنت اور جمہوریت کو نقصان پہنچانے والا نظر آئے۔ پھر باہم جھگڑا کیا ہے۔ مسئلہ تو سارا چھومنتر کا ہے۔ جب تک سیاست کو اسکے اثرات سے نہیں نکالا جائیگا، جمہوریت کی حقیقی عملداری اور آئین و قانون کی سچی کھری حکمرانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اصولوں کی لفاظی کو اوڑھ کر خود کو ''پوتر'' سمجھنا سسٹم کی اصلاح کے خواب کی تعبیر تو نہیں بن سکتا۔ اس ''معطر'' فضا میں سوشل میڈیا پر چلنے والی ایک غزل حسبِ حال ہے۔ پس پڑھیئے، سر دُھنیئے مگر لب نہ کھولئے......

سب گناہ و حرام چلنے دو
کہہ رہے ہیں نظام چلنے دو
ضد ہے کیا وقت کو بدلنے کی
یونہی سب بے لگام چلنے دو
بے کسی، بھوک اور مصیبت کا
خوب ہے اہتمام، چلنے دو

اہلیّت کیا ہے میری، چھوڑ اسے
نام کافی ہے، نام چلنے دو
مفت مرتا نہیں تو راہوں میں
تجھ کو دیتے ہیں دام، چلنے دو
تم ہو زاہد تو جاؤ، گھر پہ ٹکو
مے کدے میں تو جام چلنے دو
تیسرے اجداد کے تھے آقا ہم
خود کو بھی زیرِ دام چلنے دو
حق کو چھوڑو، کتاب کو چھوڑو
حکم حاکم سے کام چلنے دو
ہم جو اترے تو پھر، اندھیرا ہے
سو یہی غم کی شام چلنے دو
شاہ جائے گا، شاہ آئے گا
تم رہو گے غلام، چلنے دو

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

ضرورت ہے ''فرمانِ امروز'' کی

ہماری سیاست وعدالت میں اس وقت جو انہونیاں ہو رہی ہیں وہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ نظر آ رہی ہیں۔ خدا خیر کرے مگر خیر والا کوئی معاملہ بنتا نظر نہیں آ رہا۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر جسٹس گلزار احمد کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ کا فل بنچ سینٹ کے انتخابات شو آف ہینڈز کے ذریعے کرانے کیلئے حکومت کے دائر کردہ ریفرنس کی سماعت کر رہا ہے اور وفاق اور صوبوں کے نمائندگان کے علاوہ پاکستان الیکشن کمیشن بھی کٹہرے میں کھڑا ہے۔ یقیناً آئندہ چند روز تک اس کیس کا فیصلہ صادر ہو جائیگا بصورت دیگر آئندہ ماہ مارچ کے پہلے ہفتے میں ہونیوالے سینٹ انتخابات پر اس فیصلے کا اطلاق نہیں ہو پائیگا۔ حکومت اپنے تئیں صدارتی آرڈی ننس کے ذریعے شو آف ہینڈز کے ذریعے سینٹ انتخابات کا اہتمام کر چکی ہے تاہم اس آرڈی ننس کا اطلاق عدالتِ عظمیٰ کے فیصلہ کے ساتھ مشروط ہے۔ حکومت شو آف ہینڈز کا طریقہ انتخاب ان انتخابات میں ووٹوں کی خرید وفروخت روکنے کی نیت سے رائج کرنا چاہتی ہے مگر صرف سینٹ کے موجودہ انتخابات ہی کو اس لعنت سے بچانا چاہتی ہے۔ جس کیلئے صدارتی آرڈی ننس میں طے کر دیا گیا ہے کہ اس آرڈی ننس کا اطلاق سینٹ کے صرف مارچ کے حالیہ انتخابات پر ہو گا۔

عدالت عظمیٰ کے روبرو اس معاملہ پر بہت لے دے ہو رہی ہے اور فاضل ججوں کے ریمارکس سے سینٹ انتخابات میں جو ممکنہ پابندی عائد ہوتی نظر آ رہی ہے وہ الیکشن کمیشن کو اس امر کا پابند بنانے کی ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جس جماعت کی جتنی نشستیں ہیں انکے مطابق متناسب نمائندگی کی بنیاد پر سینٹ کی نشستیں یقینی بنائی جائیں اور کسی جماعت کی زیادہ یا کم نشستیں ہوں تو یہ ہارس ٹریڈنگ کا شاخسانہ ہو گا جس کیلئے الیکشن کمیشن جوابدہ ہو گا۔

سینٹ کی حد تک متناسب نمائندگی کا طریق انتخاب تو آئین کی دفعہ 59 شق دو میں متعین ہے جس میں واضح طور پر قرار دیا گیا ہے کہ سینٹ کی خالی نشستوں کے انتخابات سنگل ٹرانسفر ایبل ووٹ کے تحت متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہونگے۔ فاضل عدالت عظمیٰ بھی یقیناً اسی تناظر میں سینٹ انتخابات متناسب نمائندگی کے تحت یقینی بنانے پر زور دے رہی ہے اور اس حوالے سے عدالت عظمیٰ کے روبرو یہ سوال پیدا ہوا ہے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ متناسب نمائندگی والے طریق کار کے تحت انتخابات کا تردد کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اسمبلیوں میں جس جماعت کی جتنی نشستیں موجود ہیں، انکے تناسب سے ان پارٹیوں میں سینٹ کی نشستیں دے دی جائیں۔ اس طرح شو آف ہینڈز کے طریقہ کار کے تحت ارکان اسمبلی کی آزمائش کی نوبت بھی نہیں آئیگی اور خفیہ رائے شماری کے تحت بیلٹ بکس کے سامنے کسی رکن کا "ضمیر" بھی نہیں جاگے گا۔ بس پارٹی ہیڈ کے پاس سیاہ وسفید کا اختیار ہوگا کہ وہ سینٹ میں متعینہ اپنی پارٹی کی نشستوں پر کسے نامزد کر کے ایوان بالا میں بھجواتا ہے۔

ویسے تو اس بحث کے تناظر میں عوامی حلقوں میں یہ بحث بھی چل رہی ہے کہ سینٹ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس میں کون سا عوام کی فلاح کے کام ہوتے ہیں۔ بس اس ادارے کیلئے منتخب ارکان اسمبلی کی منڈیاں لگی ہوئی ہیں جن سے ووٹ خرید کر سینیٹر بننے والے ساہوکار عوام کی خدمت تھوڑی کرینگے۔ وہ تو بس اپنی لاگت بمعہ سود نکالنے میں ہی مگن رہیں گے۔ اسی طرح ایک سوچ ملک کے تمام انتخابات متناسب نمائندگی کے تحت کرانے کی پنپ رہی ہے جس کیلئے بہر صورت آئین میں ترمیم کرنا پڑیگی۔ مگر حضور والا! متناسب نمائندگی کا طریق انتخاب تو پارٹی ہیڈ کو کلی اختیارات کا مالک بنا دیتا ہے۔ جس پارٹی کے حق میں جتنے مجموعی ووٹ آئینگے، اسکے تناسب سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستیں پارٹی ہیڈ کے ہاتھ میں آ جائیں گی۔ اور ہمارے موجودہ کلچر میں جہاں انتخابی ٹکٹیں بھی پارٹی فنڈ کے نام پر لاکھوں میں فروخت کی جاتی ہیں اور یہ پارٹی فنڈ پارٹی ہیڈ کے ہی دست قدرت میں ہوتا ہے، آپ بھلا توقع کر سکتے ہیں کہ پارٹی ہیڈ ے ہاتھ میں موجود قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستیں بغیر بھاؤ تاؤ کے محض میرٹ کی بنیاد پر دی جائیں گی۔ سو

متناسب نمائندگی کیلئے پہلے آئینی ترمیم اور پھر پارٹی ہیڈ کے لامتناہی اختیارات پر کٹ لگانے کیلئے بھی آئینی ترمیم اور پھر اس کا اطلاق۔ یہ تو غالب کے اس شعر والا ہی معاملہ ہے کہ......

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ مگر کرنا ہو تو فاضل چیف جسٹس کے ذہنِ رسا نے شو آف ہینڈ کے طریق انتخاب کیلئے یہ منطق بھی ڈھونڈ نکالی ہے کہ سینٹ کا احاطہ کرنیوالی آئین کی دفعہ 59 کی کسی شق میں بھلا کہاں درج ہے کہ یہ انتخابات خفیہ رائے شماری کے تحت ہونگے۔ حضور ہم یہ سوال اٹھانے کی جرأت کہاں سے لائیں کہ اس آئینی دفعہ کی کسی شق میں کیا شو آف ہینڈز کے طریق انتخاب کا کہیں ذکر ہے۔ جب آئین کی دفعہ 226 میں واضح طور پر متعین کر دیا گیا ہے کہ وزیراعظم اور وزراء اعلیٰ کے سوا ملک میں تمام انتخابات خفیہ رائے شماری کے تحت ہونگے تو سینٹ کے انتخابات اس سے مبرا تو نہیں۔ متذکرہ ریفرنس کی سماعت کے دوران تو عدالت عظمیٰ میں فاضل بنچ کی جانب سے یہ سوال بھی اٹھا دیا گیا کہ آئین کی دفعہ 63 کے تحت نااہلیت کا اطلاق سینٹ کیلئے نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں مجھے اپنی ناقص عقل پر ہی غصہ آئیگا جب میں دفعہ 63 کی یہ دوٹوک عبارت پڑھوں گا کہ ہر وہ شخص مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کا رکن بننے کا نااہل ہوگا جو اس دفعہ کی کسی بھی شق کی زد میں آئیگا۔ اگر پارلیمنٹ قومی اسمبلی اور سینٹ کا مجموعہ ہے تو سینٹ کو اس آئینی دفعہ سے کسی بھی توجیہہ کی بنیاد پر کیسے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ آئین کی دفعہ 63 کی ذیلی دفعہ سی ون اور اسی طرح اسکی دوسری تمام شقوں کا اطلاق سینٹ کی رکنیت کیلئے بھی ہوتا ہے۔ آئین کو موم کی ناک بنا کر تو اسکی تشریح نہیں ہوسکتی۔

اگر ہمارے انتخابی طریق کار میں سارا معاملہ ''غتر بود'' کا ہی ہے تو پھر سینٹ ہی کیا' قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی اور انکے انتخابات کرانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ ڈسکہ کے ضمنی انتخاب میں وضع کئے گئے طریق انتخاب کی نادر مثال ہمارے سامنے آ چکی ہے اس لئے ووٹروں کو زحمت کیا دینی کہ وہ بعد میں ''ووٹ کو عزت دو'' کی شیطانی پر اتر آتے ہیں۔ آپ پولنگ سٹیشن اور

پولنگ بوتھ بنانے کی زحمت سے بھی اور اس پر اٹھنے والے اخراجات سے بھی بچیں۔اور آپ کو اپنی مرضی کے نتائج کیلئے ووٹوں کے تھیلوں سمیت انتخابی عملہ کو اٹھا کر لے جانے کی زحمت سے بھی دو چار نہیں ہونا پڑیگا۔ بس ہر حلقہ کا انتخابی عملہ متعین کر دیں۔ اسکے ہاتھ میں انتخابی فہرستیں اور ووٹوں کی پرچیاں تھما دیں۔ بس اتنا بتا دیں کہ ڈالے گئے ووٹوں کی شرح (ٹرن آؤٹ) کیا ظاہر کرنی ہے۔ اسکے حساب سے انتخابی عملہ خود ہی ووٹوں کی پرچی پر متعلقہ امیدوار کے حق میں مہر لگاتا اور اسے بیلٹ بکس میں ڈالتا رہے گا۔ اسے سخت دھند میں پولنگ بیگ سمیت گن پوائنٹ پر کسی کے ساتھ جانے اور غائب ہونے کا کوئی بے ہودہ عذر تراشنے کی مشقت سے بھی نہیں گزرنا پڑیگا اور الیکشن کمیشن کیلئے بھی ایسے کسی معاملہ پر خفگی کا اظہار کرنے اور اسکے باعث کوئی پریشانی اٹھانے کی نوبت نہیں آئیگی۔ جب ساری قدریں ہی بدلنے کا معاملہ چل رہا ہے تو ریاستی' ادارہ جاتی معاملات میں کوئی ''فرمانِ امروز'' تو جاری ہونا چاہیے۔ وماعلینا الا البلاغ۔

خرابی کے در

یہی تو میرا شروع دن کا تجسس تھا کہ آئین کی دفعہ 226 کی موجودگی میں اس میں ترمیم کیے بغیر سینٹ کے انتخابات کیلئے شو آف ہینڈز کی گنجائش کیسے نکالی جا سکتی ہے۔ اس آئینی دفعہ میں تو صراحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کے انتخاب کے سوا تمام انتخابات خفیہ رائے شماری کے تحت ہونگے۔ چنانچہ اس آئینی دفعہ کی موجودگی میں اس وقت تک سینٹ کے انتخابات کیلئے شو آف ہینڈز کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی جب تک پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت کے ساتھ ترمیم منظور کرا کے دفعہ 226 میں یہ متعین نہ کیا جائے کہ وزیراعظم، وزراء اعلیٰ اور سینٹ کے سوا تمام انتخابات خفیہ رائے شماری سے ہونگے۔ میرا نہیں خیال کہ اہل اقتدار کے عالی دماغوں کو آئین کی دفعہ 226 کا ادراک نہیں ہوگا یا یہ دفعہ انکے ذہنوں سے محو ہو گئی ہوگی۔ شو آف ہینڈز کے طریقہ انتخاب کیلئے جو دلائل وزیراعظم عمران خان اور انکی پارٹی کے دوسرے اکابرین پیش کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ بجا ہیں۔ اگر ہم نے ہارس ٹریڈنگ کی مجوزہ مروجہ لعنت سے نجات حاصل کرنی ہے اور انتخابی عمل کو شفاف بنانا ہے تو ہمیں شو آف ہینڈز سمیت تمام ممکنہ عملی اصلاحات کی جانب جانا ہوگا تاہم پارلیمنٹ ہی اس کیلئے مناسب، موزوں اور مجاز فورم ہے کیونکہ اس وقت ملک میں رائج پارلیمانی جمہوری نظام آئین کے ماتحت ہے۔ یہ نظام ہماری ضروریات پر پورا نہیں اتر رہا اور اس نظام پر اس حوالے سے میرے اپنے بھی تحفظات ہیں کہ سلطانی جمہور کے ثمرات حقیقی معنوں میں عوام (جمہور) تک پہنچ ہی نہیں پاتے اور جن کے نام پر سلطانی کی جاتی ہے انہیں اس نظام میں عملاً راندۂ درگاہ بنائے رکھا جاتا ہے اور بقول اقبال ''درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری'' اس نظام میں سلطان کی منافقت ہی غالب رہتی ہے

جو جمہور کے ساتھ ''پیتے ہیں لہو' دیتے ہیں تعلیم مساوات'' والا رویہ اختیار کئے رکھتے ہیں۔ اگر سلطانی جمہور میں جمہور راندۂ درگاہ ہے تو پھر کسی ایسے نظام کا کیوں نہ تجربہ کرلیا جائے جس میں فی الواقع جمہور کی سلطانی نظر آئے۔ اس حوالے سے تھنک ٹینکس اور دانشوروں کے حلقوں میں اکثر امریکی طرز کا صدارتی نظام یا متناسب نمائندگی کا نظام موضوع بحث رہتا ہے۔ انکے محاسن ونقائص پر بھی بات ہوتی ہے اور عمران خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ملک کو ریاست مدینہ کے قالب میں ڈھالنے کا عزم ظاہر کیا تو اس سے اسلام کے زریں دور کے نظام خلافت اور شورائی نظام کی جانب بھی توجہ جانے لگی اور دل لگتی کہیئے تو یہی نظام ہمیں عوام الناس کے دکھوں کے مداوا کیلئے زیادہ صائب نظر آتا ہے مگر بھائی صاحب! جو کچھ بھی ہونا ہے' قاعدے قانون کے تحت ہی ہونا ہے۔ ورنہ تو سرزمین بے آئین کا معاملہ ہوگا جو ہم وقفے وقفے سے 34 سال تک بھگت چکے ہیں۔ یا پھر ''شاہِ معظم کی سواری آتی ہے'' والا رعب ودبدبہ ہوگا اور یہ بھی اس ارضِ وطن پر غیر منقسم ہندوستان کے دوران ایک ہزار سال تک بھگتا اور نبھایا جا چکا ہے۔ اس نظام کی جگہ انگریز کے کالونیل سسٹم نے لی جس نے شاہِ معظم والے برتری کے تصور سے اس خطے کے مسلمانوں کو نکالنے کیلئے ان پر ہندو ساہوکار کو غالب کر دیا۔ اسی جبر وتسلط کے ردعمل میں مسلمانوں کیلئے الگ مملکت کی سوچ پیدا ہوئی تھی جسے شاعر مشرق علامہ اقبال نے پروان چڑھایا اور قائداعظم نے اسے حقیقت کے قالب میں ڈھال کر دکھایا مگر اس میں پارلیمانی جمہوری نظام ''سلطانی جمہور'' کا تصور پیش کر کے قائداعظم نے شہنشاہ معظم والی شخصی حکمرانی کا راستہ روک دیا تھا۔ بے شک انکی وفات تک ملک اپنے آئین سے سرفراز نہیں ہوا تھا مگر جمہور کی رائے سے تشکیل پانے والے پاکستان کی بنیاد انہوں نے سلطانی جمہور پر ہی استوار کی تھی۔ آج 73ء کا آئین پارلیمانی جمہوری نظام کا ہی مجموعہ ہے جس میں بے شک بہت سی قباحتیں موجود ہیں مگر اس آئین کی عملداری میں کسی دوسرے نظام کی ماورائے آئین گنجائش ہرگز نہیں نکالی جا سکتی۔ ایسا کیا جائیگا تو وہ صرف ''دھکا'' ہوگا جو اس ارضِ وطن کو چار بار لگ چکا ہے۔

اگر حکومت سسٹم کے حوالے سے گومگو کا شکار ہے تو اس کیلئے پارلیمنٹ ہی بحث مباحثہ کا

مجاز فورم ہے۔ آپ نے سسٹم کو پارلیمانی کی بجائے کسی دوسرے قالب میں ڈھالنا ہے تو اس کیلئے آپ کو نیا آئین تشکیل دینا ہوگا جس کیلئے آئین ساز اسمبلی کا انتخاب کرانے کی ضرورت ہوگی۔ موجودہ اسمبلی میں بہرحال آئین میں ترمیم تو کی جاسکتی ہے۔ اگر پارلیمنٹ سے بالا بالا کوئی تبدیلی لانے کی خواہش ہے جیسا کہ شو آف ہینڈز والی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کیلئے سپریم کورٹ میں ریفرنس دائر کیا گیا اور پھر صدارتی آرڈی ننس جاری کیا گیا تو یہ عام فہم سوچ کے تحت بھی پارلیمنٹ کی نفی کرنے کے مصداق تھا۔ اگر آپ اپوزیشن کو مطعون کررہے ہیں کہ اس نے اے آر ڈی کے پلیٹ فارم پر میثاق جمہوریت کر کے اس میں خود سینٹ کے انتخابات شو آف ہینڈز سے کرانے کی شق رکھی تھی تو آپ اسی بنیاد پر شو آف ہینڈز کیلئے اسمبلی میں آئینی ترمیم لا کر اپوزیشن کو آزمائش میں ڈال سکتے تھے مگر آپ نے یہ راستہ اختیار کرنا مناسب ہی نہ سمجھا۔

اب سپریم کورٹ آپ کے ریفرنس کی سماعت کے دوران خود باور کرا رہی ہے کہ ہم پارلیمان کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے اور آئین سینٹ انتخابات خفیہ ووٹنگ کے ذریعے کرانے کا کہتا ہے تو پھر آئین ہی کی عملداری ہوگی۔ فاضل چیف جسٹس سپریم کورٹ نے تو گزشتہ روز یہ بھی باور کرا دیا کہ ہر ادارے کو اپنا کام اپنی آئینی حدود میں رہ کر ہی کرنا چاہیے اس لئے جناب! آپ اپنے ادارے پارلیمنٹ کی اپنے ہاتھوں تحقیر نہ کریں۔ یہ آئینی جمہوری فورم سسٹم کو آپ کی خواہشات کے مطابق چلانے کیلئے موجود ہے۔ آپ شو آف ہینڈز کا طریقہ انتخاب چاہتے ہیں تو اس کیلئے پارلیمنٹ میں ترمیم لے آئیں۔ آپ جن کو پارلیمنٹ سے بالا بالا بے نقاب کررہے ہیں، وہ اس ترمیم میں آپ کا ساتھ نہیں دینگے تو آپ کو انہیں بے نقاب کرنے کا باضابطہ موقع مل جائیگا۔ مگر خدارا اپنے کسی اقدام یا سوچ سے شہنشاہ معظم والا تشخص پیدا نہ ہونے دیں کیونکہ خرابی کا ایک دروازہ کھلے گا تو اس سے سو مزید دروازے کھلنے کی راہ ہموار ہو جائیگی۔

چودھری شجاعت کی تڑپ

کسی اچھی بات کے حوالے سے مثال دی جاتی ہے کہ یہ نہ دیکھیں کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھیں کہ کیا کہہ رہا ہے۔ یعنی کوئی اچھی بات چاہے کوئی چور' ڈاکو بھی کہہ رہا ہو تو جس کو سمجھانے کیلئے وہ بات کی جارہی ہو' اسے سمجھنا ضرور چاہیے ورنہ ''مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر'' والا معاملہ ہی بن جاتا ہے۔ یہاں تو بات بھی دل لگتی اور معتبر ہے اور کہنے والا بھی معتبر ہے اس لئے اب یہی تصور کیا جائیگا کہ ''جو نہ سمجھے' وہ اناڑی ہے''۔

مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین حکومتی اتحادی ہونے کے ساتھ ساتھ سابق وزیراعظم اور ایک زیرک سیاست دان بھی ہیں جو اپنے بھرپور سیاسی خاندانی پس منظر میں قومی سیاست کے اسرار و رموز سے واقف بھی ہیں اور ان پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔ حکومتی اتحادی ہونے کے ناطے وہ سیاست کے روایتی چلن کی بنیاد پر محض تنقید برائے تنقید تو نہیں کر سکتے۔ اگر وہ امورِ حکومت میں کسی خرابی کی نشاندہی کرتے ہیں تو خلوص نیت کے ساتھ ان کا مقصد حکومتی گورننس میں اصلاح کا ہوتا ہے۔ بے شک انکے چچازاد بھائی چودھری پرویز الٰہی سپیکر پنجاب اسمبلی کے منصب پر فائز ہیں اور ہاؤس کا کسٹوڈین ہونے کے علاوہ حکومتی اتحادی ہونے کے ناطے انہوں نے ہاؤس میں حکومت کیلئے پریشانی کا باعث بننے والے کسی معاملہ پر فہم و فراست کے ساتھ سرکاری بنچوں کیلئے سازگار ماحول پیدا کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے جو وہ اب تک ادا کر رہے ہیں مگر سلطانی جمہور میں حکومت خود ہی جمہور کو راندۂ درگاہ بنانے پر تلی بیٹھی ہو تو چودھری برادران جیسے حکومتی اتحادی اصلاحِ احوال کا ہی مشورہ دینگے۔ وہ محض حکومت کا دم بھرنے کیلئے خود کو عوام سے کاٹ کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔ سو چودھری شجاعت حسین نے حکومتی پالیسیوں کے نتیجہ میں عوام کی غربت' مہنگائی' بے روزگاری کے ہاتھوں درگت بنتی دیکھی ہے تو اس پر عوام کے ممکنہ ردعمل سے

حکومت کو بچانے کی خاطر ہی باور کرایا ہے کہ پنجاب میں روزگار چھننے پر لوگوں کی اموات ہوئی ہیں' آپ غریبوں کی حالتِ زار پر رحم کریں' غریب دکاندار کے بچے کون پالے گا۔

حضور! یہ محض پوائنٹ سکورنگ والا کوئی سیاسی بیان نہیں ہے بلکہ ''کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا'' کی عکاسی اور بے کس و بے بس عوام کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ عوام بھوک سے مر رہے ہیں' آپ سے روٹی کے متقاضی ہیں اور آپ انہیں لیکچر دیتے ہیں کہ پچھلے چور ڈاکو ملک لوٹ کر کھا گئے ہیں' لوگوں کے روزگار چھن رہے ہیں اور نئے روزگار کے راستے مسدود ہیں' وہ واویلا کرتے سڑکوں پر آتے ہیں اور حکومتی مخالفین کو عوام کے یہ برہم جذبات اپنے حق میں کیش کرانے کا نادر موقع مل رہا ہے تو آپ عوام کیلئے روزگار کی آسانیاں پیدا کرنے کی بجائے انہیں ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیتے ہیں اور پھر باور کراتے ہیں کہ یہ سب کچھ تو سابقین کا کیا دھرا ہے۔ ہمیں تو اجڑی ہوئی معیشت ورثے میں ملی ہے۔ حضور! ڈِھڈ نہ پیّاں روٹیاں تے سبّھے گلاں کھوٹیاں۔ سابقین والی گردان سے عوام کا پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔ انہیں اپنے حال اور اپنے بچوں کے مستقبل کیلئے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئیگا تو کیا وہ سابقین کی لوٹ مار کے سیاپے پر خوشی خوشی آپ کی ہاں میں ہاں ملاتے جائینگے۔ ارے صاحب! اب تو آپ کے اپنے اقتدار کے اڑھائی سال گزر چکے ہیں۔ تبدیلی کے نعروں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ہنی مون پیریڈ کے بعد کا عرصہ تو آزمائش ہی آزمائش ہے۔ آپ عوام کو انکے گوناں گوں مسائل میں ریلیف دینے کے بجائے ان پر آئے روز مہنگائی کے چھانٹے برسا رہے ہیں' ان کا روزگار چھین رہے ہیں' روزگار والوں کی پہلے سے حاصل مراعات محدود کر رہے ہیں اور بے روزگاری کے جھکڑ چلا رہے ہیں تو قعرِ مذلت کی جانب دھکیلے جانیوالے یہ لوگ کیا بس آپ کے سٹائل کی تعریف میں ہی مگن رہیں گے۔ حضور جب پبلک سروس کمیشن کی مشتہر کردہ نوکریاں بھی میرٹ کی پاسداری کی بجائے سرِعام فروخت ہو رہی ہوں اور ہر قسم کے مناصب اقرباء پروری کا شاہکار بنے نظر آ رہے ہوں' عوام کیلئے آسانیوں کی بجائے مشکلات پیدا کی جا رہی ہوں تو ''وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ'' کے مصداق عوام اس حبس کا باعث بننے والے لوازمات سے خلاصی پانے کا ہی چارہ کرینگے۔ کراچی اور پشین (بلوچستان) کی تین صوبائی نشستوں پر ہونیوالے حالیہ ضمنی انتخابات کے نتائج عوام کی جانب سے ''لُو'' کی دعا مانگنے کے ہی عکاس ہیں۔ بھلے یہ نشستیں پیپلز پارٹی اور جے یو آئی (ف) ہی کی تھیں' آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ

نشستیں ہار کر ہمیں کون سا خسارہ ہوا ہے مگر جناب! آپ کے امیدواروں کی ضمانتیں تک ضبط ہو جائیں تو آپ کو ''کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا'' کا ادراک کر لینا چاہیے۔ آج بروز جمعۃ المبارک آپ کا ڈسکہ میں این اے 75 کی خالی نشست کے ضمنی انتخاب میں بھی اپوزیشن کے ساتھ دست پنجہ ہو رہا ہے۔ اسکے نتائج آپ سے اپنے معاملات پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کے متقاضی ہونگے۔ اور آپ کے حلیف چودھری شجاعت حسین کے بیان کا لب لباب بھی یہی ہے کہ ''دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ''۔ اگر اڑھائی سال کے عرصہ میں مہنگائی کا گراف بلند ترین سطح پر پہنچ گیا ہے، ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق کرپشن کا ناگ پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھ پھن پھیلاتا نظر آ رہا ہے، پبلک سروس کمیشن کے اہلکاروں ہی کے ہاتھوں میرٹ کا جنازہ نکل رہا ہے۔ ایک معمولی درجے کی خالی اسامی کیلئے پی ایچ ڈی امیدواروں سمیت عملاً لاکھوں بے روزگاروں کی درخواستیں موصول ہو رہی ہیں جس کا اندازہ پاکستان الیکشن کمیشن کی چند خالی اسامیوں پر موصول ہونیوالی ساڑھے چار لاکھ درخواستوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور پھر بھوک سے عاجز آئے لوگ چور ڈاکو، راہزن بن رہے ہیں یا خودکشی کا راستہ اختیار کر کے خود کو موت کی جانب دھکیل رہے ہیں تو جناب اس اڑھائی سال کے عرصہ میں عوام کی عملاً بس ہو چکی ہے۔ انہیں اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل اسی طرح تاریک ہوتا نظر آئیگا تو شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنے اس شعر کے ذریعے انہیں راستہ دکھایا اور سمجھایا ہوا ہے کہ......

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

آپ اپنے حلیف چودھری شجاعت کی تڑپ کی جانب کان دھریئے اور سلطانیٔ جمہور کو جمہور کے ہاتھوں راندۂ درگاہ ہونے سے بچا لیجئے ورنہ تاریخ بہت بے رحم اور ظالم ہوتی ہے۔ وہ پل پل کا نتارہ کرتی رہتی ہے۔ عوام میں یہ احساس اجاگر نہ ہونے دیجئے کہ......

آپ تے پیویں بُکاں شربت
سانوں گھُٹ گھُٹ زہر پلاویں

یہ احساس اجاگر ہو گیا تو ''کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو'' والا منظر بن جائیگا۔

''الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا''

ملائشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں پاکستان کی بین الاقوامی پرواز کے روکے جانے' ضبط ہونے اور اس پرواز کے مسافروں کے رسوا ہونے سے اس وطن عزیز کو عالمی برادری میں جو ہزیمت اٹھانا پڑی کیا اس پر ہمارے کرتا دھرتاؤں میں سے کسی کی جبینِ نیاز پر خجالت کے پسینے کا کوئی ہلکا سا بھی چھینٹا نمودار ہوا؟ شاید ہم اپنی ادارہ جاتی اور انفرادی روایتی غفلتوں' نااہلیوں اور بدطینتیوں کی انتہاء کو پہنچ چکے ہیں کہ کوئی تہمت' کوئی رسوائی' کوئی ہزیمت ہمارے بے حس ضمیروں کو جھنجوڑ کر جگانے کے اسباب ہی پیدا نہیں کر پا رہی اور ہم آج بھی اپنی ادارہ جاتی غفلتوں پر اٹھائی جانے والی ہر ہزیمت پر یہ سوچ کر اپنے تئیں مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ......

ویسے تو تمہی نے مجھے برباد کیا ہے
الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا

کوالالمپور پر ضبط ہونیوالی ہماری پی آئی اے کی پرواز کے معاملہ پر بھی شرمندہ ہونے کے بجائے ہمارے ہوابازی کے وزیر موصوف غلام سرور خاں نے موجودہ روایتی سیاسی کلچر کے عین مطابق پاکستان کے سر آنیوالی اس ہزیمت و رسوائی کا سارا مدعا بھی سابق حکمران مسلم لیگ (ن) کے سر تھوپ دیا۔ شاید انہیں اس بے رحم سیاست کے ناطے چین کی بنسری بجا کر سکون کی نیند لینے کا موقع مل گیا ہوگا مگر اس وطن عزیز کی ساکھ کو جو بٹہ لگنا تھا وہ تو لگ چکا اور جو ناقابل تلافی نقصان ہونا تھا' وہ تو ہو چکا۔ کیا اس کا حساب اب آنیوالے چکائیں گے۔ پچھلوں نے جو بداعمالیاں' جو غفلت شعاریاں' جو بے ضابطگیاں اور جو بدتماشیاں کیں' آنیوالوں کو کم از کم اس کا اعادہ تو نہیں ہونے دینا چاہیے۔ ہماری ''باوقار سروس' لاجواب پرواز'' کیلئے ویسے تو اس معاملہ میں بھی ''چلّو بھر پانی''

والا محاورہ صادق آتا ہے کہ یہ لیز پر طیارے لے کر اڑا رہی ہے۔ شاید پی آئی اے کا سارا منافع اسے جونکوں کی طرح چمٹے حکام وافسران کے پیٹ بھرنے کیلئے ہی ناکافی ثابت ہو رہا ہے اس لئے ''ڈنگ ٹپاؤ'' پالیسی اختیار کر کے دوسرے ملکوں کی کمپنیوں سے طیارے لیز پر لے کر گزارا کیا جا رہا ہے تا کہ اسکی پروازیں کم از کم فضا میں اڑتی ہوئی تو نظر آئیں۔ مگر روایتی غفلت و بدطینتی تو ہمارے کلچر کے ساتھ نتھی ہو چکی ہے اس لئے کسی عالمی معاہدے میں بھی لیز کی قسطیں بھی بروقت ادا نہ کرنا ہم نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ ہمارے نئے پاکستان کے اڑھائی سال کے عرصہ میں کم از کم یہ کلچر تو بدلا ہوا نظر آنا چاہیے تھا مگر اس تبدیلی میں بھی بس ''کھالے' پی لے' موج اڑا'' والی سوچ ہی غالب نظر آ رہی ہے۔

ایک تو ویتنامی کمپنی سے لیز پر لئے گئے طیارے کی قسطوں کی بروقت ادائیگی میں ڈنڈی ماری گئی اور غیر ادا شدہ قسطوں کی رقم ہضم کرنے کی نیت سے برطانوی عدالت میں مقدمہ دائر کر کے بے نیازی کی چادر اوڑھ لی گئی اور دوسرے اسی متنازعہ طیارے کو بیرون ملک پرواز کیلئے بھیجنا بھی اپنی ہٹ دھرمی کا حصہ بنا لیا گیا۔ اب اس امر کی تحقیقات تو ''سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا'' کے ہی مصداق ہے کہ جب پی آئی اے کے پاس 12 بوئنگ طیارے پرواز پر بھجوانے کیلئے موجود تھے تو پھر اسی طیارے کو بیرونی پرواز پر کیوں بھجوایا گیا جس کا چھ ماہ کا کرایہ واجب الادا تھا۔ اپنے کھاتے میں آنیوالی اس غفلت کا حساب دینے اور اس پر مارے شرمندگی کے مستعفی ہونے کا سوچنے کی بجائے ہوابازی کے وزیر موصوف نے سابق حکومت کے دور میں ہونے والے لیز کے معاہدے کو تنقید کا نشانہ بنانا ضروری سمجھا۔

ایک غیر ملکی ایئرپورٹ پر پی آئی اے کی پرواز ٹیک آف سے پہلے ضبط ہونے پر پاکستان کیلئے جس سبکی کا اہتمام ہوا' اس کا جوابدہ کس کو ہونا ہے اور پھر اس پرواز کے مسافروں کو پاکستان واپس آنے کیلئے جو پریشانیاں اٹھانا پڑیں' اسکی جوابدہی کس کے کھاتے میں آنی ہے' بھائی صاحب! بلیم گیم کی سیاست سے ہٹ کر اس بارے میں تو کچھ سوچ بچار کر لی جائے۔ اگر ماضی والی غفلت شعاری اور ڈنگ ٹپاؤ والی ساری روائتیں ہی برقرار رکھنی ہیں تو آپ کے کس ''طرۂ

امتیاز'' پر ہماری آنیوالی نسلیں فخر کریں گی۔ ادارہ جاتی غفلت شعاری اور دھونس دھاندلی والے جس کلچر نے ملک کی ساکھ وتوقیر کو سابقہ حکمرانوں کے ادوار میں بٹہ لگایا ہے' اسی کا تو آج بھی تسلسل برقرار ہے۔ ماضی میں ہمارے پلّے تو سید جماعت علی شاہ جیسے ایسے بدطینت حکام بھی پڑے رہے جو بھارت کے ساتھ پانی کے تنازعہ پر عالمی بنک کے روبرو ہزیمتوں سے لبریز ایسا بیان بھی قلمبند کرا آئے تھے کہ بھارت کے ساتھ ہمارا پانی کا کوئی تنازعہ ہی نہیں ہے۔ ہم نے ایسے وطن فروشوں کے ہاتھوں ہی بھارت کیخلاف بگلیہار اور کشن گنگا ڈیم سے متعلق اپنے کیس عالمی بنک میں ہارے تھے اور اب تو ماشاءاللہ غیر ملکی عدالتوں میں ہمارے لئے ایسی ہزیمتیں ہاتھ باندھے کھڑی نظر آتی ہیں۔ یہ اسی عہدِ بے مثال کی ''سرخروئی'' ہمارے حصّے میں آئی ہے کہ ریکوڈک کے کیس میں آسٹریلیا کی ٹیتھیان کمپنی نے عالمی بنک کے عدالتی فورم ''آئی سی ایس آئی ڈی'' میں ہم پر ''دھوبی پٹڑا'' مار کر ہمیں چھ ارب ڈالر کے جرمانے کی ادائیگی کا سزاوار ٹھہرا دیا۔ اس کیس کے ہارنے پر پاکستان کیلئے جس ہزیمت کا اہتمام ہوا' کیا اس پر ہمارے کرتا دھرتاؤں میں سے کسی کو ہلکی سی بھی پشیمانی کا احساس ہوا؟

ارے بھائی! اگر احساس ہوا ہوتا تو براڈ شیٹ کے کیس ہی میں اس وطن عزیز کو ہزیمتوں سے بچالیا جاتا۔ مگر......

تھی جو قسمت میں سیاہی' وہ کہاں ٹلتی ہے
کھیر بھی آئی میرے سامنے دلیہ ہوکر

برطانوی عدالت نے براڈ شیٹ کے کیس میں بھی اسکے اٹھائے گئے نقصان کی ساری ذمہ داری ہمارے معتبر احتساب کے ادارے نیب پر ڈال دی اور براڈ شیٹ کے مبینہ نقصان کا ازالہ ہمیں اپنے قومی خزانے سے سات ارب روپے نکال کر کرنا پڑا۔ ایسی ہزیمتوں پر اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنی گورننس کے بارے میں تو فکر کرلی جائے۔ سابقین کی بے تدبیریوں کا ڈھول پیٹ کر اپنی ذہنی تسکین کا تو اہتمام ہوسکتا ہے مگر ملک کی ساکھ کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔

پہلا دن

انسانی زندگیوں پر بھیانک اثرات مرتب کرنے اور ننگ و وحشت، جنگ و جدل اور امراض و حوادث کے ذریعے دنیا کی عملاً تباہی کا اہتمام کرنیوالا سال 2020ء جس کروفر کے ساتھ اپنی وحشت ناکیوں کا سارا بوجھ آج 21ویں صدی کے 21ویں سال پر لاد کر رخصت ہوا ہے اس پر مجھے گورنمنٹ کالج ساہیوال کے اپنے ایک عزیز شاعر دوست ریاض نعمی مرحوم کا ایک شعر بے ساختہ یاد آ گیا ہے۔ ہائے۔ نظام قدرت کے سارے کرب کا تصور کیسے اس شعر میں سمٹ آیا ہے۔

فلک کا رنگ ہے نیلا زمیں کی چوٹوں سے
چھپا کے دونوں کا غم، چاند ہو گیا پیلا

بھئی! یہ دھرتی تو اب انسانی دکھوں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ توسیع پسندانہ عزائم اپنے ذہنی خناس میں پالتے پالتے اور کائنات کی ہر چیز کو مسخر کرنے کی لگن کو بڑھاتے بڑھاتے انسان اپنے ہی ہاتھوں وسعت پذیر کی گئی کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ذریعے محض ایک دائرے، ایک نکتے میں سمٹ آیا ہے۔ چنانچہ اس دھرتی کے کسی بھی نامعلوم مقام پر کوئی سانحہ ہوتا ہے، کوئی افتاد ٹوٹتی ہے اور کرب و بلا کا کوئی منظر بنتا ہے تو دنیا کے ہر کونے پر موجود انسانوں کو اپنے ہونے اور اپنے ساتھ کسی انہونے کا دھڑکا لگ جاتا ہے۔ 2020ء نے تو اس روئے زمین پر یہ دھڑکے ایسے لگائے کہ انسان ابھی تک ہوش و حواس کھوئے بیٹھا ہے۔ شاید مکافاتِ عمل میں اب مراجعت کا سفر شروع ہو چکا ہے اور ہم بے بس انسان آسیب کو اوڑھے اس سفر میں ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں تو انہونے کا خوف ہمیں دو قدم پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ شاید ترقی معکوس کا لفظ ہمارے آج کے چلن کی مناسبت سے ہی

ایجاد ہوا تھا۔ بقول منیر نیازی......

منیر اس شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

خدا کی پناہ! 2020ء میں زور پکڑنے والے کرونا وائرس نے اس انسانی معاشرے کی جو درگت بنائی ہے وہ انسانی سرکشیوں پر خالقِ کائنات خداوندکریم کی پکڑ ہی کی عکاس ہے۔ مگر کیا ہم سرکش انسانوں نے اس سے عبرت حاصل کر لی ہے۔ کیا اس نظام قدرت پر غلبہ حاصل کرنیوالے ہمارے توسیع پسندانہ عزائم و مقاصد کہیں ماند پڑے ہیں۔ کیا جنگ و جدل سے ایک دوسرے کو زیر کرنے والا خناس ہماری سرشت سے نکل گیا ہے۔ کیا طبقاتی فرق کو پاٹ کر ہم آپسی بھائی چارے کے بندھن میں بندھ گئے ہیں۔ کیا ہماری حرص و ہوس میں کوئی کمی آ گئی ہے۔ اور میں اپنی سوچ کا زاویہ صرف اپنی معاشرت پر مرکوز رکھوں تو کیا کرونا وائرس کی آزمائش نے ہمیں ہماری منافقتوں، دوسروں کا حق چھین کر کھانے کی علتوں اور خود کو آقا و عالیجاہ سمجھ کر اپنے سے کمزور انسانوں کی گردنیں ناپنے کی خصلتوں سے خلاصی دلا دی ہے؟ ارے ہم تو انہونی کے خوف میں بھی اپنے کروفر سے باہر نکلنے کو تیار نہیں۔ کسی قومی کاز کی خاطر اپنی جھوٹی اناؤں کی قربانی دینے پر آمادہ نہیں۔ اپنی ذات مجسمۂ عیب ہونے کے باوجود دوسروں کے عیب ڈھونڈ کر نکالنے اور ان کا ڈھنڈورا پیٹنے کے فن میں اتنے یکتا ہو چکے ہیں کہ مکافاتِ عمل کا کوئی ڈراوا بھی ہمارے شعور و لاشعور میں خوف کی کوئی تریڑی پیدا نہیں کرتا۔ اسی لئے ہمیں قدرت کی جانب سے 2021ء کے آغاز ہی میں 2020ء کی غضب ناکیوں سے بھی زیادہ خوفناک آلام و مصائب کی لپیٹ میں آنے کی وارننگ دی جا چکی ہے جو موسمیاتی تغیر و تبدل کی صورت میں اور کرونا وائرس سے بھی زیادہ جان لیوا کسی وائرس کی شکل میں ہم پر نازل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے آج اپنی ساری انائیں، حرص و ہوس، جاہ و حشمت اور خدائی دعوؤں والے کروفر کو تج کر خالق کائنات کے حضور سجدہ ریز ہو جائیے اور راضی برضا ہونے کا چلن اختیار کر لیجئے۔ ہمارے عجز و عاجزی کی قبولیت کی کوئی سعد گھڑی شاید ہمیں مزید بھٹکاوے سے بچا لے۔ وما علینا الا البلاغ۔

سال نو کے حوالے سے میری ایک نظم ''پہلا دن'' کلام سعید میں شامل ہے۔آج وہی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ''شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات''۔

سالِ نو کا پہلا دن ہے اور میں کھویا بیٹھا ہوں
سوچ رہا ہوں، پہلا دن تو پچھلے سال بھی آیا تھا
اس دن سے اس دن تک میری کتنی سوچیں بدلی ہیں
آج بھی دُکھی ہوں اور تب بھی غم کا گیت سنایا تھا

☆......☆......☆

سوچ رہا ہوں پہلا دن بھی کیا کیا تحفے دیتا ہے
اس دن ساری گزری باتیں آنکھوں میں آجاتی ہیں
اس دن پچھلے زخموں سے بھی ٹیس ابھرنے لگتی ہے
اس دن کی کرنیں تو دل میں اور بھی آگ لگاتی ہیں

☆......☆......☆

میں نے دیکھا ہے انسانوں کے آباد گھرانوں میں
اکثر شام ڈھلے سے ہی تاریکی چھائی رہتی ہے
ان کے چولہوں میں نہ کوئی آگ جلائی جاتی ہے
ان کے آنگن میں نہ ہفتوں کوئی صفائی رہتی ہے

☆......☆......☆

بازاروں اور گلیوں میں جب میری نظریں جاتی ہیں
مجھ کو تو ہر کوئی وہاں مایوس دکھائی دیتا ہے
ہر کوئی، ہر لمحے گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہے
ہر در، ہر گھر کے اندر سے شور سنائی دیتا ہے

☆......☆......☆

مانتا ہوں میں یہ سب باتیں مایوسی کی باتیں ہیں
یہ آہوں میں ڈوبی میرے دل کی ہی آواز سہی
اوروں کو احساس نہ ہو تو کیا میں بھی انجان بنوں
پستی کا انجام بھی پستی، یہ اس کا آغاز سہی

☆......☆......☆

بہتر ہے کہ ہم اس دن سے ہی کوئی تدبیر کریں
تا کہ ان تاریک گھرانوں میں بھی کچھ امید بندھے
تا کہ الجھے چہروں پر بھی رونق لوٹ کے آ جائے
تا کہ پھر سے کوئی ظالم اپنی خوشیاں چھین نہ لے

☆......☆......☆

جب تک اپنی قوم کے انساں تن سے ننگے پھرتے ہیں
تب تک اپنی قوم کا ننگا پن بھی چھپ نہ پائے گا
تب تک اپنی قوم تمدن میں نہ آگے جائے گی
جب تک ایک اک فرد ہمارا پیٹ نہ بھر کے کھائے گا

☆......☆......☆

جب ہم اپنے دل میں خوش ہوں تب ماحول بھی اچھا ہے
ورنہ جیسے دن ہیں سارے، ان میں اک یہ دن بھی کیا ہے

لمحۂ خیر کیلئے لمحۂ فکریہ

کہنے کو تو وزیر اعظم عمران خان نے بھی اپنے سیاسی سفر کے دوران اپنے حریف و حلیف سیاست دانوں کے بارے میں کیا کیا توصیفی اور تنقیدی الفاظ استعمال نہیں کئے۔ کسی وقت وہ میاں نواز شریف کو حقیقی محافظِ جمہوریت قرار دیتے رہے۔ اے پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم پر ان کیلئے دادو تحسین کے ڈونگرے برساتے رہے اور اس سے پہلے جب وہ سیاست میں نہیں تھے، شوکت خانم ہسپتال کے سنگ بنیاد کے موقع پر ان کیلئے عملاً ریشہ خطمی ہوتے رہے۔ پھر ایک وقت تھا کہ عمران خان صاحب لندن جا کر ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کو گھسیٹ کر ملک واپس لانے اور ان کیخلاف لندن کی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کا اعلان کرتے رہے۔ پھر ایک وقت تھا کہ عمران خان صاحب، شیخ رشید احمد، فواد چودھری اور غلام سرور خان ٹی وی ٹاک شوز میں ایک دوسرے کو سوکنوں کی طرح طعنے دیتے اور باہم الجھتے پائے جاتے تھے۔ پھر سیاسی منظر نامہ کچھ اور ہوا تو میاں نواز شریف کا نام ہی عمران خان صاحب کیلئے گالی بن گیا اور اب تصورات میں بسا ہوا کوئی گھٹیا ترین انسان انہیں نواز شریف نظر آتا ہے۔ پھر اسی سفاک سیاست نے وہ منظر بھی دیکھا کہ بلوچستان حکومت کو گرانے اور چیئرمین وڈپٹی چیئرمین سینیٹ کو منتخب کرانے کیلئے ایک دوسرے کی گھسیٹا گھسیٹی کا منظر بنانے والے تحریک انصاف، پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے قائدین ایک ہی تسبیح میں پروئے دانے بن گئے۔ شیخ رشید، فواد چودھری اور غلام سرور خان وزیر اعظم عمران خان کی کابینہ کے معتبر ارکان کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

اسی سیاسی منظر نامے کے درمیان ایک وقت ایسا بھی تھا کہ زرداری صاحب نے مسلم لیگ (ق) کو قاتل لیگ کا خطاب دیا اور پھر اقتدار میں آ کر اسی قاتل لیگ کو وفاقی کابینہ کا حصہ بنایا اور چودھری پرویز الٰہی کو نائب وزیر اعظم کے ٹائٹل سے نواز دیا۔ اسی منظر نامے کے دوسرے پارٹ میں عمران خان صاحب نے چودھری برادران کو پنجاب کے سب سے بڑے ڈاکو قرار دیا اور پھر اقتدار میں آنے کیلئے انہیں انہی ڈاکوؤں کی بیساکھیاں استعمال کرنا پڑیں اور چودھری پرویز الٰہی کو

پنجاب کی سپیکر شپ پلیٹ میں رکھ کر دینا پڑی جبکہ اب عمران خان صاحب اپنے کسی انٹرویو میں چودھری برادران کے حوالے سے اپنی ماضی کی سوچ کے بارے میں کوئی تلخ وترشیدہ سوال سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔

اب حکومتی مصاحبین کی جانب سے گڑھی خدا بخش میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی برسی اور اس موقع پر پیپلز پارٹی کے زیراہتمام منعقد ہونیوالے پبلک جلسے میں پی ڈی ایم کے قائدین کی شمولیت پر کیا کیا پھبتیاں نہیں کسی جارہیں اور انہیں انکے ماضی کے حوالے سے کیا کچھ نہیں یاد کرایا جارہا۔ مگر یہی تو ہماری ظالم سیاست کا چال چلن ہے کہ آج کے حریف کل کے حلیف بنے بیٹھے نظر آتے ہیں اور کل کے حریف آج کے حلیف بن کر ایک دوسرے کی بلائیں لیتے' گاڑھی دوستی کا منظرنامہ بناتے ہیں......

اک ہمی ہیں جو بہک جاتے ہیں توبہ کی طرف
ورنہ رندوں میں برا چال چلن کس کا ہے

ارے کوئی کیا جانے کہ آج کے حلیفوں کی کل آپس میں کیا سرپھٹول ہونی ہے۔ اگر ہمارا یہی سیاسی کلچر قائم و برقرار رہنا ہے تو پھر......

ناروا کہیئے' نارسا کہیئے
کہیئے کہیئے' مجھے برا کہیئے

پھر جناب! آپ سیاسی اختلافات کو ذاتی دشمنیوں تک کیوں لے جاتے ہو اور عوام کیلئے کچھ نہ کرنے کے یہ بہانے کیوں بناتے ہو کہ ہمیں تو ہمارے عہدِ اقتدار میں کچھ کرنے ہی نہیں دیا گیا۔ حضور! یہ سلطانی جمہور کو سلطان کی مار دینے کے سب ڈھکوسلے ہیں اس لئے جناب!......

نہ ہم سمجھے' نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیئے اپنی جبیں سے

یہ تو ہم راندۂ درگاہ عوام ہی کا مسئلہ ہے اس لئے......

آجا رَل روئیے سجناں
کلّیاں بہہ کے منہ کیہہ کجناں
کل نوں بُھک نے متھے وجناں
آج تے بہہ کے رَج کے کھا

تو جناب! آج اسی رَلت کی ضرورت ہے، دکھوں کے پہاڑ پاٹنے اور بوجھ بانٹنے کیلئے ایک دوسرے کے سہارے اور باہم تال میل کی ضرورت ہے، قومی اور ذاتی معاملات کے ہر فیلڈ میں معاملہ فہمی، شائستگی، رواداری اور افہام و تفہیم کا دامن تھامنے کی ضرورت ہے۔ آپ ایک دوسرے کو کھوجتے، کریدتے، نوچتے، دھکیلتے رہو گے تو اپنے ہاتھوں راندۂ درگاہ بنائے گئے عوام ہی کے ہاتھ قعرِ مذلت میں جا گرو گے۔

بھئی وقت گزرتے کوئی دیر تو نہیں لگتی۔ ماضی بعید اور قریب کے سارے مناظر آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ہماری سیاست کا یہی چلن برقرار رہا تو حضور! اقتدار کی بوٹی میں بہت کشش ہے جس کیلئے نہ چاہتے ہوئے بھی دل للچا جاتا ہے اور آپ باہمی چھینا جھپٹی میں اگلوں کیلئے ایسے مواقع بھی نکال رہے ہوں تو آپ کے سوال ہی آپ کے جواب بن جائیں گے۔ ابھی 21 ویں صدی کے 21 ویں سال کا پہلا سورج طلوع ہونے میں تین دن کا ہی وقفہ رہ گیا ہے اس لئے موجودہ سال کے آخری لمحات میں یہ عزم باندھ کر قومی سیاست میں باہمی کدورتوں، اپنی پیدا کردہ کثافتوں اور منافرتوں کو کھنگال کر دل سے نکالنے کی کوشش کیجئے کہ......

راستہ نہیں ملتا
منجمد اندھیرا ہے
پھر بھی باوقار انسان
اس یقیں پہ زندہ ہے
برف کے پگھلنے میں
پَو پھٹنے کا وقفہ ہے
اس کے بعد سورج کو
کون روک سکتا ہے

آپ محترمہ بے نظیر بھٹو کی برسی کے موقع پر ہونیوالے اکٹھ میں ماضی کے حریفوں اور آج کے حلیفوں کو ان کا ماضی یاد کرانے کے بجائے اسے مستقبل کی افہام و تفہیم والی شائستگی کی سیاست کی ضمانت بنالیں تو اگلے سال کے سورج کی کرنیں آپ کی سیاست کے گدلے پن کو دھو کر تابناک بنادیں گی۔ اب کوئی لمحۂ موجود لمحۂ خیر بھی بن جانا چاہیے۔

بھٹکاوے کا عنصر اور رائیگانی کا سفر

بے شک نظام قدرت کے آگے ہم حقیر پر تقصیر انسانوں کی کوئی اوقات نہیں۔ کائنات کے سب نشیب و فراز اور انسانوں کے عروج و زوال کے سارے معاملات خالقِ کائنات خداوند کریم کے دستِ قدرت میں ہیں۔ انسانوں کی تقدیریں اور زمانوں کے احوال دست قدرت کے لکھے ہوئے ہیں جنہیں برقرار رکھنے اور تبدیل کرنے کی قدرت بھی ربِ ذوالجلال ہی کو حاصل ہے۔ اسکی منشاء کے بغیر کوئی پتہ بھی اپنی جگہ سے نہیں سرک سکتا۔ ہم نے بہر صورت ہر آئی بھوگنی ہے اور اپنا اپنا نامۂ اعمال ساتھ لے کر جانا ہے۔ پھر بھی دلِ ناآسودہ کو دھڑکے اور وہم سے لگے رہتے ہیں......

کل نوں خورے کیہہ ہووے گا' ڈردا رہناں
پَل نوں خورے کیہہ ہووے گا' ڈردا رہناں

تو بھائی صاحب! اس حیاتِ بے ثبات میں ''پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے''۔ یقیناً یہ ہنگامہ ہماری جستجو کا ہے۔ ہم اپنے اندر انائیں پال کر خدائی کے دعوے دار بن بیٹھے ہیں اور اپنی سرشت میں موجود بھٹکاوے کے عنصر کو پھیلا کر بھٹکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جنگ و جدل' ماردھاڑ' چیر پھاڑ' حرص و ہوس اور شہنشاہِ معظم کیلئے باادب' باملاحظہ' ہوشیار کے مناظر و میدان ہماری جبلت کا حصّہ بنے بھٹکاوے نے ہی سجائے ہیں۔ سو ہماری مجموعی معاشرتی زندگی بھی اسی بھٹکاوے کا پرتو نظر آتی ہے۔

اللہ کی رسی بے شک دراز ہے اور اس میں بھی ربِ کائنات کی کوئی نہ کوئی حکمت کارفرما ہے۔ انسانی سرکشی بڑھتی ہے تو اس کیلئے دراز رسی کے کھینچے جانے میں بھی ربِ کائنات کی ''کن فیکون'' کی قدرت ہی کارفرما ہوتی ہے۔ بے شک انسان نے بہت ترقی کر لی ہے۔ اپنے تجسس کو آگے

بڑھاتے بڑھاتے چانداور مریخ تک کی خبر لینے لگا ہے اور اس ناطے سے اپنے ذہنوں میں یہ خناس سموئے بیٹھا ہے کہ یہ سب سائنس اور سائنسی علوم کا کارنامہ ہے۔ایسے نا ہنجاروں کو خدا کی قدرت کے ساتھ ضد ہے جو یہ بھول بیٹھے ہیں کہ اسکے خاکی وجود کی تخلیق سے اسکے فنا ہونے تک اسکی ہر جسمانی، ذہنی حرکت کا ایک ایک حصّہ اور ایک ایک پل دستِ قدرت میں ہے۔ بھئی! اپنے سائنس کے علم سے خاکی جسم کے ڈھیر ہو جانے کے بعد اس میں دوبارہ زندگی کی روح پھونک کر تو دکھاؤ۔ خالقِ کائنات اگر محض چند لمحات کیلئے اس کائنات کو آکسیجن سے محروم کردے تو اپنی سائنس کے زور پر زندہ رہ کر تو دکھاؤ۔ دستِ قدرت سے جب زلزلے کی صورت میں زمین جھنجوڑی جاتی ہے تو مشیتِ ایزدی کے بغیر اس لمحے خود کو اور کائنات کو اس آزمائش سے بچا کر تو دکھاؤ۔ اگر قدرت کے بے بہا خزانوں میں سے کسی لمحے صرف پانی تک انسان کی رسائی ناممکن ہو جائے تو اپنی سائنس کے زور پر اس نظام کائنات کو رواں دواں رکھ کر تو دکھاؤ۔ ارے......

اپنے پاؤں پہ آتا ہے نہ اپنے پاؤں پہ جاتا ہے
تیری کیا اوقات ہے بندے، جس پہ تو اِتراتا ہے

سائنس نے بے شک بہت ترقی کی ہے۔ نظام کائنات کے رواں دواں رہنے اور نشیب و فراز سے دوچار ہونے کے کچھ معاملات کا کھوج بھی لگا لیا ہے۔ زلزلے، طوفان، بارش اور سردی، گرمی، حبس اور موسم کی خوشگواری کو جانچنے پر کچھ نہ کچھ قدرت بھی حاصل کرلی ہے مگر حضور والا! یہ خدائی اوصاف بھی تو دستِ قدرت نے ہی ناقص انسانی ذہنوں میں ڈالے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ آپ کائنات کے مالک و مختار بن بیٹھیں۔ قدرت نے آپ سے جتنا اور جو کام لینا ہے بس اسی تک آپ کو محدود رہنا ہے۔ آپ اس سے آگے نکلنے کا سوچو گے تو بس اسی لمحے آپ کی دراز کی گئی رسی کھینچ لی جائے گی اور آپ کو آپ کی اوقات دکھا دی جائیگی اس لئے کبھی نظام قدرت کو چیلنج نہ کرو اور مشیتِ ایزدی سے ٹکرانے کا کبھی نہ سوچو۔

اس صدی کا موجودہ سال دکھوں اور آلام کے حوالے سے انسانوں پر کتنا بھاری ثابت ہوا ہے اور آنیوالے سال میں انسانی زندگی کا کیا نقشہ بننا ہے، کیا حشر ہونا ہے یہ سب خالقِ کائنات کی منشاء کے مطابق ہے۔ اس نے انسانی ذہن کو یہ کھوج لگانے کی رسائی ضرور دے دی ہے کہ اس صدی کے ختم ہونیوالے موجودہ سال دسمبر کے جاتے جاتے بھی انسانوں پر آلام کی افتاد ٹوٹنے

والی ہے جو 25 دسمبر سے عملاً قلفی جمانے والے جاڑے اور کئی روز تک جاری رہنے والے طوفانِ بادوباراں کی صورت میں نازل ہوگی اور کرونا وائرس سے بھی انسانی جانوں کیلئے زیادہ سنگین کسی مرض یا آفت کو ساتھ لے کر آئیگی اور اس طرح آنیوالا سال 2021ء بھی لاکھوں بے بس انسانوں کو کرب و آلام سے گزارتا گزارتا انکی فانی زندگی کے خاتمے کی نوبت لے آئیگا تو آپ کو یہ ادراک و آگاہی قدرت کی جانب سے اس وارننگ کی صورت میں دی گئی ہے کہ سنبھل جاؤ' مزید سرکشی اختیار نہ کرو' مظاہر قدرت کو چیلنج نہ کرو اور خدائی رویوں سے رجوع کرلو' کسی کی حق تلفی نہ کرو' شرف انسانیت کو مزید بٹہ نہ لگاؤ' جنگ و جدل کا خناس پال کر اس کائنات میں ہر ذی روح کی ہلاکت اور پورے کرۂ ارض کی تباہی کی نوبت مت لاؤ۔

مگر حضور! آپ کی سرشت میں موجود اور غالب ہوتا ہوا بھٹکاوے کا عنصر آپ کو بھلا کہاں ٹکنے دیگا۔ سو ہماری ان سرکشیوں' ریاکاریوں' بدکاریوں اور خدائی دعوے والی رعونتوں نے ہمارے لئے ربِ کائنات کے غیض و غضب کا اہتمام آنیوالے سال کے دوران بھی کئے رکھنا ہے۔ آپ کرونا کی ویکسین ایجاد ہونے پر فخر و اطمینان کا اظہار کرتے رہیے' دستِ قدرت آپ کو اس سے بھی بڑی نئی آزمائش میں ڈال کر آپ کی خدائی سوچوں کے پرزے اڑا دیگا۔

سو آپ آنیوالے سال کا عاجزی سے استقبال کیجئے' اپنی اب تک کی سرکشیوں سے کنارہ کر کے اور سچے دل سے تائب ہو کر اور نظام قدرت پر قدرت کی کامل عملداری کا یقین و اعتراف کر کے نئے سال میں داخل ہونے کی تیاری باندھیئے۔ موجودہ سال میں بھگتے گئے انسانی آلام آپ کے کروفر کی حقیقت جاننے اور عبرت حاصل کرنے کیلئے کافی ہونے چاہئیں ورنہ آپ کا رائیگانی کا سفر تو جاری ہے......

ڈھگا ڈوڈھ تے ڈِچکراں ہیٹھلے نوں
رہویں وِچ خیالاں دے کیوں بندے
ویلے بجھوں توں جاگ کے وَتّ روسیں
لمّی تان کے گیا ایں سَوں بندے

”یہ روایت میری سرکار نہ ڈالی جائے“

مسلم لیگ (ن) کے سینیٹر پرویز رشید صاحب کو کسی جلسہ کے حدود اربع میں لوگوں کے سمونے اور جلسہ میں موجود اصل تعداد کو جانچنے میں مہارت تامہ حاصل ہے۔ وہ اپنی اس ”فنی“ استعداد کا مظاہرہ عمران خان کے 2011ء سے 2014ء تک کے پبلک جلسوں کی جانچ پڑتال کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ مینار پاکستان لاہور کی وسیع و عریض گراؤنڈ میں عمران خان کا 2011ء کا جلسہ بلاشبہ بہت بڑے پبلک جلسوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس روز وقت ٹی وی کے لائیو ٹاک شو میں پرویز رشید صاحب میرے ہمراہ تھے اور باقاعدہ فیتہ لے کر بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ وہ جلسہ والے مقام کو تصورات میں ناپ کر وہاں موجود کرسیوں اور حاضرین کا تخمینہ لگاتے رہے اور اس جلسہ کو ناکام ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے انہیں دس اپریل 1986ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کے لاہور ایئرپورٹ سے برآمد ہونیوالے جلوس اور وہاں سے مینار پاکستان تک جلسہ گاہ بنی شاہراہ قائداعظم اور لوئر مال روڈ اور پھر سورج ڈوبنے کے بعد مینار پاکستان پر منعقد ہونیوالے اس روز کے جلسہ کی یاد دلائی۔ پرویز رشید صاحب کا اس وقت پیپلز پارٹی کے جیالوں میں ہی شمار ہوتا تھا۔ میں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری کے تحت محترمہ بے نظیر بھٹو کی لاہور آمد پر علی الصبح انکے فقید المثال استقبال سے مینار پاکستان کے شام کے جلسہ تک نوائے وقت کیلئے اس دن کے ہر لمحہ کی کوریج کر رہا تھا۔ چنانچہ میں پورے اعتماد کے ساتھ گواہی دیتا رہتا ہوں کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اس سے بڑا پبلک اجتماع نہ پہلے کبھی ہوا‘ نہ آج کے دن تک ہو پایا ہے۔ علامہ خادم رضوی کا عظیم الشان اور یادگار جنازہ تو قطعی الگ معاملہ ہے اور اس کا کسی سیاسی اجتماع سے موازنہ کرنا بھی نہیں چاہیے کہ یہ کسی قسم کی سیاسی وابستگیوں سے ہٹ کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پایاں محبت وعقیدت کے ناطے مسلمانوں کے ملی جذبات کا اظہار تھا جس کا تقابل کسی سیاسی اجتماع کے ساتھ ممکن ہی نہیں۔ اسکے علاوہ کوئی ریکارڈ ساز سیاسی اجتماع ہوا تو وہ محترمہ بے نظیر بھٹو کا دس اپریل 1986ء والا اجتماع ہی تھا جبکہ بعدازاں خود محترمہ بے نظیر بھٹو بھی اپنا قائم کردہ یہ ریکارڈ نہ توڑ سکیں۔

میں نے پاکستان قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰ سے ایم آر ڈی، پی ڈی اے، پی ڈی ایف، سی او پی، پاکستان عوامی اتحاد، اے آر ڈی اور اے پی ڈی ایم سمیت ہر اپوزیشن اتحاد کے جلسے جلوس دیکھے ہوئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے مولانا عبدالحمید بھاشانی کی کسان تحریک کا بھی نوعمری میں مشاہدہ کرنے کا موقع ملا اور حکومت مخالف ایسے پبلک اجتماعات اور مظاہرون کیخلاف حکومتی جبر اور پابندیوں کو بھی دیکھا اور کبھی کبھار بھگتتا بھی رہا ہوں چنانچہ عمران خان کے 2011ء والے مینار پاکستان کے جلسے پر لائیو ٹاک شو میں تبصرہ کرتے ہوئے بھی میں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کے مینار پاکستان والے اجتماع کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع قرار دیا تھا اور پرویز رشید صاحب نے بھی اس سے اتفاق کیا مگر وہ عمران خان کے پبلک اجتماع کے فلاپ ہونے کی اپنی منطق پر حدود اربع اور کرسیاں لگی جگہ کی پیمائش کر کے بھی مجھے قائل نہ کر سکے۔ آج کل وہ کہیں گم یا گم صم ہیں اس لئے وہ حکومتی اور اپوزیشن اجتماعات کے شرکاء کی تعداد کا کہیں تقابلی جائزہ لیتے نہیں پائے جاتے البتہ حکمران پی ٹی آئی کو اپوزیشن کے جلسوں کی ایسی ہی پیمائش کرنیوالے صوبائی وزیر، مشیر فیاض الحسن چوہان اور ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کی شکل میں اور وفاق کی سطح پر بھی علی زیدی اور شہباز گل کی شکل میں کھوجی اور ''کاہڈے'' دستیاب ہیں جنہوں نے پی ڈی ایم کے گزشتہ روز کے مینار پاکستان والے جلسے کو باقاعدہ ناپ تول کر فلاپ ثابت کر دکھایا اور نئے نئے وفاقی وزیر داخلہ شیخ رشید احمد کو تو اپوزیشن اتحاد کی کشتی بیچ منجدھار میں پھنسی ہوئی نظر آ رہی ہے مگر بھلے لوگو! کبھی یہ بھی سوچ لیا کرو کہ عوامی غم وغصہ کے اظہار والے ایسے پبلک اجتماعات کی نوبت کیوں آتی ہے۔ عمران خان نے اپنے مینار پاکستان والے 2011ء کے پبلک جلسہ کے ذریعہ حکومتی اتھارٹی اور گورننس کو چیلنج کیا اور تبدیلی کا نعرہ لگایا تو اس وقت کی حکومتی پالیسیوں کے باعث گھمبیر ہوتے

روٹی روزگار اور مہنگائی کے مسائل سے راندۂ درگاہ ہوئے عوام کا غم وغصہ ہی انکے تبدیلی کے نعرے کو تقویت پہنچانے کا باعث بنا تھا اور وہ اپنی سیاست کے صفر کے زاویہ سے آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچے تھے۔ انکے مینار پاکستان والے جلسے نے ہی 2013ء کی جمہوریت میں انہیں خیبر پی کے کی صوبائی حکمرانی کا حقدار بنایا اور قومی اسمبلی میں مضبوط اپوزیشن کا مقام دلایا اور پھر روٹی روزگار کے گھمبیر مسائل کیخلاف انکے شامل حال ہوئے عوام کے سیاپے نے ہی انہیں 2018ء کی جمہوریت میں وفاقی اور صوبائی حکمرانی سے ہمکنار کیا ہے اس لئے اب آپ اپنے ہاتھوں بڑھائے اور نئے پیدا کئے گئے عوام کے مسائل کی بنیاد پر عوامی غم وغصے کا جائزہ لے کر اپوزیشن کے پبلک جلسوں کا مشاہدہ اور موازنہ کریں گے تو آپ کو اپنے مصاحبین کی جانب سے فلاپ کا ڈھول پیٹنا دل کو تسکین حاصل ہونے کے باوجود حقائق کی عکاسی کرتا نظر نہیں آئیگا۔ حضور! آپ کسی کا گلا دبا کر اسے یہ تنبیہہ نہیں کر سکتے کہ تم میرے اس عمل کے ردعمل میں آنکھیں کیوں نکالتے ہو۔ یہ تو اس کا فطری ردعمل ہوگا۔ ارے صاحب!

بھکھے کولوں بُرکی کھوہ کے کہندے او کہ بولے نہ
جس دا جھگا بھُجے آخر اوہ تے رولا پاوے گا

اس لئے آپ ''فلاپ'' کے ڈھول پر مسحور ہونے اور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے سکون لینے کے بجائے پبلک جلسوں اور لانگ مارچ کی نوبت تک پہنچنے والی اپوزیشن تحریک کے اصل اسباب ومحرکات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ......

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اور یہ تو بہت کچھ ہے حضور والا! تبدیلی کے خواب دیکھنے والے راندۂ درگاہ عوام آپ کے عوامی اقتدار کے اڑھائی سال کے عرصے کے دوران اصل سکون اور آرام کی خاطر فی الواقع قبرستانوں کی جانب لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔ روزانہ کی بنیاد پر اجتماعی خودکشی کے واقعات شاید آپ کی آنکھوں سے محو ہیں۔ الیکشن افسر کی تین چار اسامیوں کیلئے موصول ہونیوالی ڈیڑھ دو لاکھ

درخواستیں جو الیکشن کمیشن کے آفس میں سمائی نہیں جارہیں' آپ کو موصول ہونیوالی سب اچھا کی رپورٹ میں شاید شامل ہی نہیں کی جاتیں۔ اور آج بڑھتی مہنگائی کا شمار تو کانوں کو ہاتھ لگا کر بھی نہیں ہو پائے گا۔ تو حضور! عوام کا یہی کرب اور دکھ ہے جو انہیں پی ڈی ایم کے احتجاجی پروگراموں کی جانب دھکیل رہا ہے۔ آپ ایسے عوامی غم و غصے کا توڑ فلاپ کے ڈھول بجوا کر سوچیں گے تو ناچتی ہوئی بھوک ساری اقدار ملیامیٹ کر دیگی۔......

بھوک بڑھنا ہی بغاوت کا سبب ہے آسی
یہ روایت میری سرکار نہ ڈالی جائے

اس لئے اب پی ڈی ایم کی جانب سے آپ کو ڈیڑھ ماہ کی مہلت حاصل ہوگئی ہے تو اسے عوام کی فلاح اور انہیں غربت' مہنگائی' بے روزگاری میں حقیقی ریلیف دینے کیلئے بروئے کار لائیے اور کسی طفل تسلی پر نہ جائیے کیونکہ......

اقبال بڑا اپدیشک ہے' من باتوں میں موہ لیتا ہے

''میرا کہا لکھ لو''

پیپلز پارٹی کے یوم تاسیس کے موقع پر اس پارٹی کی قیادت کی جانب سے ملتان میں اپنے مرکزی جلسے کو اپوزیشن اتحاد پی ڈی ایم کے حکومت مخالف جلسے میں تبدیل کرنے کے فیصلہ پر پیپلز پارٹی کے جیالوں کو یقیناً تحفظات ہونگے۔ میرے اپنے بھی اس حوالے سے تحفظات ہیں مگر حکومت نے آمرانہ حکمرانیوں والی جبر کی ایسی فضا بنا دی ہے کہ ایک دوسرے سے نظریاتی اختلاف کو بھی حکومت مخالف سوچ میں نظرانداز کرنا گوارا ہونے لگا ہے۔ ملتان میں اپوزیشن کے اس جلسے کا کیا حشر ہوا یا کیا رونق لگی، اس کا اندازہ تو یہ سطور لکھے جانے کے بعد ہی ہو پائے گا مگر پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم پر پیپلز پارٹی کے یوم تاسیس کو پبلک اجتماع بننے سے روکنے کیلئے حکومتی انتظامی مشینری کی جانب سے ملتان سٹیڈیم کے اندر اور باہر جو حشر اٹھایا گیا اور اپوزیشن لیڈران جس انداز میں ان حکومتی اقدامات کو چیلنج کرتے نظر آئے۔ وہ پی این اے کی تحریک کے دوران میرے لکھے گئے اس شعر کی عکاسی تھی کہ......

قوم پر طاری ہوا ہے چھین لینے کا جنوں
اور پاگل پن میں ہے سرکار، الٰہی خیر ہو

آخر ایسی نوبت کیوں آئی کہ حکومت مخالفین کیلئے حکومت مخالف تحریک کے راستے نکالنا اور ہموار کرنا آسان ہو گیا ہے۔

اگر کسی بھی قسم کے تعصبات کی عینک اتار کر صورت حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ حکومت کی غریب مار پالیسیاں ہی درحقیقت اسکی اپوزیشن کے قالب میں ڈھل گئی ہیں اس لئے حکومت مخالف جماعتوں کو حکومت مخالف تحریک کا راستہ ہموار کرنے اور عام

پبلک کو اس راستے پر ڈالنے کیلئے کوئی زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ پی ڈی ایم کے اب تک کے چار پبلک جلسوں میں عوام کی کرونا کے خوف کے باوجود بڑی تعداد میں شمولیت اور پھر علامہ خادم حسین رضوی کے جنازہ میں لاکھوں افراد کی ہم قدمی بھی حکومتی پالیسیوں کیخلاف عوامی ردعمل ہی کا اظہار تھا۔ بھائی صاحب! اب عوام اپنے ہر مسئلہ اور سسٹم کی ہر خرابی کا ملبہ سابق حکمرانوں پر ڈالنے کی پالیسی قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ اب آپ کے اپنے اقتدار کے بھی اڑھائی سال پورے ہونے کو ہیں۔ اگر ان اڑھائی سالوں میں عوام کیلئے سابق حکمرانوں کے پیدا کردہ غربت، مہنگائی، روٹی روزگار کے مسائل کے حل کی کوئی سبیل نہیں نکل پائی اور یہ مسائل اب مجبور مقہور عوام کو عملاً زندہ درگور کرتے نظر آ رہے ہیں اور موجودہ اقتدار کے اگلے اڑھائی سال کے عرصہ میں بھی ان مسائل کے حل کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی بلکہ حکومتی پالیسیاں عوام بالخصوص ملازم پیشہ طبقات کو قعر مذلت کی جانب دھکیلنے کا عندیہ دے رہی ہیں تو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق عوام کے پاس زہر پھانکنے، اپنے بچوں سمیت کنوؤں میں کودنے یا کھلی ڈکیتی اور رہزنی کے راستے اختیار کرنے اور اسی طرح اپوزیشن کی حکومت مخالف تحریک کا چارہ بننے کے سوا اور کیا چارہ رہ جائیگا۔

اگر حکومت کا منشور عوام کو ایک کروڑ نوکریاں دینے کا ہو جو بقول وزیراعظم عمران خان، انکے اقتدار کے پانچ سال پورے ہونے تک عملی جامہ میں نظر آئیگا اور انکے اقتدار کا آدھا عرصہ گزرنے تک ہزاروں ملازم پیشہ طبقات اپنی ملازمتوں سے فارغ ہو کر بے روزگاری کی شرح میں شتر بے مہار اضافہ اور خطِ غربت کا گراف مزید نیچے کو دھکیلنے کا باعث بن رہے ہوں تو وہ موجودہ اقتدار کے پانچ سال پورے ہونے تک ایک کروڑ نوکریوں کے سراب کے پیچھے کب تک بھاگتے رہیں گے۔ اسکے برعکس روزگار کے حوالے سے حکومتی پالیسیوں کا اظہار وفاقی وزیر فواد چودھری ان سفاکانہ الفاظ کے ذریعے کر رہے ہوں کہ ملازمتیں دینا حکومت کی ذمہ داری نہیں اور وفاقی مشیر خزانہ حفیظ شیخ اپنی اس رائے کے ذریعہ ملازمتوں پر مزید کلہاڑا چلانے کا عندیہ دے رہے ہوں کہ ملازمتوں کا موجودہ سٹرکچر قومی معیشت پر بوجھ بن چکا ہے تو جناب سہانے مستقبل والی ڈیڑھ کروڑ نوکریوں کے خواب دیکھتے عوام کو تو موجودہ نوکریاں بھی چھن جانے کا خوف ادھ موا کر

دیگا۔ حفیظ شیخ صاحب نے جس دن اپنی رائے کا اظہار کیا اس سے اگلے روز سٹیل مل سے ساڑھے چار ہزار ملازم بیک جنبش قلم بیٹھے بٹھائے فارغ کر دیئے گئے اور ایک ملازم یہ جانکاہ خبر سنتے ہی دل ہار کر اپنے خالق حقیقی کو جا پہنچا تو کیا باقی ملازمین کیلئے بھی ایسا ہی ماحول بنایا جا رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ لاہور کی منفعت بخش میٹرو بس کے ملازمین بھی تین تین ماہ تک تنخواہیں نہ ملنے کے باعث بس سروس روک کر ہڑتال پر اتر آئے ہیں اور میڈیا پر جو افتاد ٹوٹی ہے وہ ہم بیان کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں کیونکہ حکومت کو کسی بھی طبقے کا کوئی بھی احتجاج اپوزیشن کی کارستانی ہی نظر آتا ہے چاہے اسکی نوبت حکومت کی اپنی کسی بے تدبیری کے نتیجہ میں ہی کیوں نہ آئی ہو۔ حضور! حقیقت یہی ہے کہ.....

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

آپ کسی کو دباتے، دیوار کے ساتھ لگاتے جائیں اور توقع رکھیں کہ وہ چوں چراں تک نہیں کرے گا اور اپنے لئے ہر ظلم و جبر قبول کرلے گا تو کسی کی ایسی خوش فہمی کو محض اس کا وہم ہی قرار دیا جا سکتا ہے.....

جیہڑا اطعیاں نال کھلاوے، اس دا کہنے کھانا اے
جیہڑا کسے نوں کجھ نہ سمجھے، کون اوہنوں سمجھاوے گا

جناب! اپنی سوچ بدلیں، اپنا چلن درست کرلیں، اپنی پالیسیوں پر نظر آنیوالے ہر عوامی اضطراب کو اپوزیشن کی کارستانی نہ سمجھیں اور عوامی فلاح کو مقدم بنالیں تو کسی حکومت مخالف تحریک کی نوبت آئیگی نہ اسے عوام میں پذیرائی حاصل ہوگی ورنہ ظفر اقبال کی یہ پیشین گوئی ہی صادق آئیگی کہ.....

زمیں زیر و زبر ہونے کو ہے، میرا کہا لکھ لو
کہ میں اس کے فشار زلزلہ پیما میں رہتا ہوں

گلگت بلتستان کے انتخابی نتائج اور ڈراؤنے خواب

گلگت بلتستان کے چوبیس میں سے تیئس حلقوں میں برفباری کے موسم میں ہونیوالے انتخابات درحقیقت وہاں کے عوام کی جانب سے اپنے حقوق سے آگاہی کا اظہار اور اقوام متحدہ کے ودیعت کردہ حق خودارادیت کے حصول کی ریہرسل تھی۔ انتخابی نتیجہ تو نوشتۂ دیوار تھا کہ اب تک وہاں کے ہر انتخاب میں کامیابی وفاق میں برسراقتدار پارٹی کے حصہ میں ہی آتی رہی ہے‘ اور جب وزیراعظم گلگت بلتستان کی انتخابی مہم کے دوران وہاں جا کر ایک پبلک جلسے میں حکومتی وسائل کے زور پر اس علاقے کیلئے ترقیاتی منصوبوں کا اور پھر اسے صوبہ کا درجہ دینے کا اعلان کریں اور اسی طرح وفاقی وزراء پوری انتخابی مہم کے دوران وہاں قطار اندر قطار موجود ہوں اور جتنے ووٹ‘ اس سے سوگنا زیادہ نوٹ کی ترغیبات دے رہے ہوں تو وہاں کے ووٹر بلاول بھٹو زرداری کی اس بات میں تو نہیں آسکتے تھے کہ نوٹ ان سے لیں اور ووٹ ہمیں دیں۔ ہاں اس انتخاب میں اتنا ضرور ہوا ہے کہ بلاول بھٹو زرداری اور مسلم لیگ (ن) کی لیڈر مریم نواز کی قومی انتخابی سیاست کیلئے ریہرسل ہوگئی ہے۔ مجموعی 33 نشستوں کے اس ایوان میں اگلا مرحلہ اسمبلی کے اندر خواتین کی چھ‘ اقلیتوں کی دو اور کسانوں کی ایک مخصوص نشست کے انتخاب کا طے ہونا ہے چنانچہ وفاقی حکمران پی ٹی آئی کی 9 جنرل نشستوں پر کامیابی اگلے انتخابی مرحلے میں اسے آسانی کے ساتھ سنگل مجارٹی پارٹی کی حیثیت دلا دیگی سو وفاق اور دو صوبوں کے بعد گلگت بلتستان میں بھی پی ٹی آئی کی حکمرانی کے ڈنکے بجنا اسکے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ مگر میرا تجسس گلگت بلتستان کی آئینی اور قانونی حیثیت کے حوالے سے مزید بڑھ گیا ہے۔

جب پیپلز پارٹی نے اپنے گزشتہ دور حکومت میں گلگت بلتستان کو انتظامی بنیادوں پر صوبے کا

درجہ دیا تو اس وقت سے اب تک میں اپنی اس عاجزانہ رائے کا ہی اظہار کر رہا ہوں کہ اس علاقے کو جو عملاً ریاست جموں و کشمیر کا حصہ ہے، چاہے انتظامی بنیادوں پر ہی سہی، صوبے کا سٹیٹس دیکر ہم نے کشمیر کیس پر اپنے اصولی دیرینہ موقف کو جھٹکا لگایا ہے۔ بے شک ہماری دانست میں بھی، تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت بھی اور کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق بھی ریاست جموں و کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہونا ہے جس کے بغیر پاکستان کی تکمیل نامکمل ہے اور اس تناظر میں کشمیریوں کی قربانیوں سے لبریز جدوجہد بھی ''کشمیر بنے گا پاکستان'' ہی کا مقصدِ اول رکھتی ہے مگر یہ معاملہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں طے ہونا ہے جن کے تحت کشمیریوں کا حق خودارادیت تسلیم کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی جانب سے بھارت کو کشمیر میں استصواب کے اہتمام کا کہا گیا تھا۔ ہم نے اس وقت سے ہی یہ اصولی موقف اختیار کیا کہ کشمیریوں کو استصواب کا حق دیکر مسئلہ کشمیر مستقل بنیادوں پر حل کیا جائے۔ یہ کشمیریوں پر ہی منحصر ہوگا کہ وہ استصواب میں پاکستان یا بھارت میں سے کس کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بھارت کو چونکہ یقین ہے کہ استصواب کا نتیجہ اس کیخلاف ہی آئیگا اس لئے اس نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کو روندتے ہوئے کشمیر پر اٹوٹ انگ والی ہٹ دھرمی اختیار کر لی اور پھر اپنے آئین میں ترمیم کر کے مقبوضہ کشمیر کو خصوصی آئینی حیثیت کے ساتھ باقاعدہ اپنی ریاست کا درجہ دے دیا۔ اسکے برعکس کشمیریوں نے تو بھارت کے ساتھ اپنا الحاق کبھی قبول ہی نہیں کیا چنانچہ انہوں نے بھارتی فوجوں کے اپنے علاقے میں تسلط کے ساتھ ہی آزادی کی جدوجہد شروع کر دی جو انہوں نے لاکھوں پیاروں کی جانوں کی قربانیاں دیتے اور اپنے مستقبل کو داؤ پر لگاتے ہوئے گزشتہ 72 سال سے اب تک جاری رکھی ہوئی ہے۔ انہیں بھارتی حکمرانوں کی کوئی ترغیب، تحریص اور خوف دام میں نہیں لا سکا اور اس تحریک میں کشمیریوں کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا جذبہ اب انکی تیسری نسل میں منتقل ہو چکا ہے جو اپنے آباء و اقرباء سے بھی زیادہ جوش اور مستعدی کے ساتھ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا کے کونے کونے تک اپنی آواز پہنچانے اور بھارتی توسیع پسندانہ عزائم و مظالم کو اقوام عالم کے سامنے بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ انکی جدوجہد کی کامیابی درحقیقت کشمیر ایشو پر

ہمارے اصولی موقف کے ساتھ ہی منسلک ہے مگر ہم نے گلگت بلتستان کو صوبے کا سٹیٹس دیکر اپنے اصولی موقف پر خود ہی ہتھوڑا چلا دیا ہے اور کشمیر کو اٹوٹ انگ قرار دینے کی بھارتی ہٹ دھرمی کو جواز فراہم کر دیا ہے۔ مودی سرکار نے اسی سے شہ پا کر گزشتہ سال پانچ اگست کو اپنے زیر قبضہ ریاست جموں و کشمیر کا خصوصی آئینی سٹیٹس بھی ختم کر دیا اور اسکے حصے بخرے کر کے بھارتی سٹیٹ یونین کا حصہ بنا دیا۔ اگر اب اس سے عالمی سطح پر کشمیر میں استصواب کیلئے اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کا تقاضا ہوتا ہے تو اسکے پاس اپنی ہٹ دھرمی کا یہ گھڑا گھڑایا جواز موجود ہوتا ہے کہ پاکستان نے بھی تو کشمیر کے علاقے اپنی ریاست کا حصہ بنائے ہیں۔ اسکے توسیع پسندانہ عزائم تو بھارت کے زیر تسلط کشمیر سے نکل کر اب پاکستان سے ملحقہ آزاد جموں و کشمیر اور شمالی علاقہ جات بشمول گلگت بلتستان تک تسلط جمانے کی بدنیتی تک جا پہنچے ہیں جس کی خاطر وہ پاکستان پر جارحیت مسلط کرنے کی بھی منصوبہ بندی کئے بیٹھا ہے اور ہم ہیں کہ گلگت بلتستان کو صوبے کا سٹیٹس دیکر بھارتی ہٹ دھرمی پر ہی مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ وفاقی حکمران اور انکے ہمنوا دانشوروں کے حلقے اس فاش اور سنگین غلطی کو تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں۔

گزشتہ روز واچ ٹی وی چینل کے لائیو ٹاک شو میں میری اس ایشو پر طارق پیرزادہ اور سلمان عابد صاحب کے ساتھ سنجیدہ بحث بھی ہوئی جو ایسی غلطیاں بھی عمران خان کی کامیابیوں کے زمرے میں شامل کرنے کے جذبے سے سرشار ہیں۔ سلمان عابد صاحب بالاصرار اس خلط مبحث میں پڑے رہے کہ ہم نے مودی سرکار کے گزشتہ سال پانچ اگست کے اقدام کو کاؤنٹر بھی تو کرنا تھا چنانچہ گلگت بلتستان کو عبوری صوبہ بنانے کا اعلان کر کے عمران خان نے بھارتی اقدام کا ہی بھرپور جواب دیا ہے۔ ارے بھائی صاحب' کمال کرتے ہیں آپ! بھارت نے یو این قراردادوں کو روند کر مقبوضہ کشمیر کو اپنی ریاست میں ضم کر دیا تو ہم نے اسکے جواب میں کشمیر کے متنازعہ علاقہ گلگت بلتستان کو صوبے کا درجہ دیکر حساب برابر کر دیا؟ جی بھارت یہی تو چاہتا ہے کہ آپ اسکے دام میں آئیں۔ یہ تو سیدھا سیدھا اُدھر کا کشمیر اُدھر اور اِدھر کا کشمیر اِدھر والا فارمولا ہے۔ اس بحث کے دوران طارق پیرزادہ صاحب نے باؤنسر مارنے کی کوشش کی کہ عمران خان

نے تو ابھی گلگت بلتستان کو صوبے کا سٹیٹس دینے کا محض اعلان کیا ہے' ابھی بنایا تو نہیں۔تو بھائی صاحب! گلگت بلتستان آپ کا بنایا گیا صوبہ نہیں ہے تو گزشتہ روز انتخابات کس صوبائی اسمبلی کے ہوئے ہیں۔آپ کان کو گھما کر حقائق تبدیل تو نہیں کر سکتے۔بھلے کشمیر ہمارا ہے اور سارے کا سارا ہمارا ہے۔مگر آپ بھارت ہی کی چال چلیں گے تو آدھا چھوڑ' سارے سے بھی جائینگے۔خدارا! خرد کا دامن تھامیئے اور کشمیریوں کی 72 سالہ جدوجہد کو بٹہ نہ لگایئے۔عصر کے وقت روزہ توڑ کر اپنا ثواب خراب نہ کیجئے۔کشمیری عوام ہم سے بدگمان ہوئے تو ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا سہانا خواب ہمارے لئے ڈراؤنا خواب بن جائیگا۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

امریکی عوام کے شعور کو میرا سلام

امریکی عوام کی اب تک کی سائیکی تو یہی رہی ہے کہ وہ صدارتی انتخاب میں امیدوار کو نہیں، اپنی پسند کی پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں اور اقتدار پر براجمان ہونیوالی جماعت کی دوٹرمیں ضرور پوری کراتے ہیں جس کیلئے امریکی آئین میں ایک ہی صدر کی صرف دوٹرموں کی پابندی عائد کی گئی ہے۔ اگر موجودہ امریکی صدارتی انتخاب میں ری پبلکن ڈونلڈ ٹرمپ کو اپنی دوسری ٹرم کیلئے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے اب تک کے موصولہ نتائج کے مطابق قوی امکانات بھی موجود ہیں اور انکے مدمقابل ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار جو بائیڈن کو نمایاں برتری حاصل ہو رہی ہے تو امریکی انتخاب میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ امریکی عوام ایک پارٹی کی اقتدار کی دوٹرمیں پوری کرانے کیلئے اپنی جاری روایت توڑنے پر مجبور ہوئے ہونگے۔ گزشتہ صدارتی انتخاب میں اگرچہ ڈیموکریٹک پارٹی کی امیدوار ہلیری کلنٹن اپنے مدمقابل ری پبلکن امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ کے مقابلے میں اپنی شہرت اور مقبولیت کی بلندی پر تھیں مگر وہ صدر منتخب ہو جاتیں تو اس انتخاب میں بھی امریکی عوام اپنی سائیکی تبدیل کر کے انہیں منتخب کرتے اور اپنی روایت سے ہٹ کر امریکی انتخاب کی نئی تاریخ مرتب کرتے مگر ہلیری کی مقبولیت کے بام عروج پر پہنچنے اور ٹرمپ کی انتخابی مہم کے دوران ان سے سرزد ہونیوالی حماقتوں اور مسلم کمیونٹی کیخلاف اپنی انتہاء پسندانہ سوچ کے باوجود امریکی عوام نے صدارت کا تاج انکے سر پر ہی رکھا کیونکہ اس انتخاب سے پہلے امریکی ڈیموکریٹک پارٹی اپنے اقتدار کی دوٹرمیں مکمل کر چکی تھی۔

امریکی عوام کو اپنی اس روایت کی بنیاد پر تو ری پبلکن کی دوسری ٹرم کیلئے ٹرمپ کے سر پر ہی صدارت کا تاج رکھنا چاہیے تاہم اب امریکی عوام ایک پارٹی کی دوٹرمیں پوری کرانے کی روایت

سے باغی نظر آئے ہیں اور ری پبلکن امیدوار کی جگہ پھر ڈیموکریٹک پارٹی کو مسند اقتدار پر بٹھانا انہوں نے اپنی مجبوری بنایا ہے تو امریکی عوام کی سوچ کی یہ تبدیلی لازمی طور پر ٹرمپ کی حرکتوں اور بالخصوص مسلمانوں کو کچلنے والی انکی انتہاء پسندانہ سوچ کے ردعمل میں رونما ہوئی ہے۔ امریکی عوام درحقیقت پارٹی کی پالیسیوں کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں اور وہ کسی پارٹی کے امیدوار کو نہیں بلکہ اسکے منشور کو ووٹ دیتے ہیں۔ چونکہ امریکہ میں روایتاً دو جماعتی نظام مستحکم ہو چکا ہے جس میں امریکی عوام کو ری پبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹی میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے اس لئے ہر پارٹی کے دور اقتدار کی پالیسیوں کو سامنے رکھ کر انہیں اپنے اور اپنے ملک کے مستقبل کیلئے بہتر فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے جبکہ ایک پارٹی کی دوٹر میں پوری کرانے کی روایت انہوں نے حکومتی پالیسیوں کا تسلسل برقرار رکھنے کیلئے خود ہی ڈالی ہوئی ہے۔ ہمیں اس تناظر میں کبھی ایسی خوش فہمی نہیں رہی اور نہ ہی ہونی چاہیے کہ فلاں پارٹی اقتدار میں ہوگی تو پاکستان امریکہ تعلقات بہتر ہو جائینگے اور اسکے برعکس دوسری پارٹی اقتدار میں آئیگی تو پاکستان کی مشکلات میں اضافہ ہو جائیگا کیونکہ پاکستان اور دوسری بیرونی دنیا کیلئے امریکی پالیسی برسر اقتدار پارٹی کے منشور کے ہرگز تابع نہیں ہوتی۔ اس میں سراسر امریکی مفادات کو پیش نظر رکھا اور فوقیت دی جاتی ہے۔ سو اقتدار چاہے ری پبلکنز کا ہو یا ڈیموکریٹس کا' پاکستان اور دوسرے ممالک کے ساتھ امریکہ کے تعلقات امریکی مفادات کے تابع رہیں گے۔ اگر کسی وقت امریکہ پاکستان کا دوست نظر آئیگا تو ایسا امریکی مفادات کی بنیاد ہی ہوگا اور اسی طرح جب امریکہ کی جانب سے پاکستان کو گرم ہوا کے جھونکیں آئیں تو یہ امریکی مفادات کا ہی تقاضا ہوتا ہے۔ برسر اقتدار پارٹی نے تو بس امریکی مفادات کے تابع رہ کر بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات کی سمت متعین کرنا ہوتی ہے اور امریکی آئین میں وضع کردہ امریکی پالیسی یہ ہے کہ اپنے مفادات اور سلامتی کے تحفظ کی خاطر امریکہ کو کسی بھی ملک پر حملہ آور ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگر ہم امریکی مفادات کی امریکہ سے بھی آگے بڑھ کر تابعداری اور پاسداری کر رہے ہوں تو امریکی حکومت چاہے ہماری سول یا جرنیلی حکومت کو ناپسند بھی کرتی ہو تو بھی امریکہ ہمارے لئے ریشہ خطمی رہے گا اور جیسے ہی ہم میں خودداری والی سوچ پیدا

ہوگی جس کے شائبہ کی بھی امریکہ کو بھنک پڑ جائیگی تو حکومت ریپبلکنز کی ہو یا ڈیموکریٹس کی، ہمیں رگیدنا اور انتہاء درجے کی دشمنی پر اتر آنا امریکی پالیسیوں کا حصّہ بن جائیگا۔ آپ خود تصور کر لیجئے امریکی نائن الیون کا واقعہ ری پبلکنز حکومت کے دوران صدر بش جونیئر کے دور میں رونما ہوا جس کی بنیاد پر امریکہ نے پاکستان کو افغان جنگ میں فرنٹ لائن اتحادی بنا کر بھی اسے "ڈومور" کے تقاضوں کے تحت رگیدنا اپنی پالیسی کا حصّہ بنایا تو یہ امریکی پالیسی ڈیموکریٹس کے صدر باراک اوبامہ کے دونوں ادوار میں بھی برقرار رہی اور ہماری خودداری اور خودمختاری کو کھلم کھلا چیلنج کرنیوالا ایبٹ آباد اپریشن اور اسی طرح سلالہ چیک پوسٹوں پر امریکی گن شپ ہیلی کاپٹروں کے حملے بھی اوبامہ کے دور میں انکی سرپرستی میں ہوئے۔ پھر ٹرمپ نے آ کر پاکستان کا "سکریو" مزید ٹائٹ کیا اور اسکی سول اور فوجی گرانٹ تک روک کر اسکی سلامتی کو بھارت کی مودی سرکار کے لب و لہجے میں چیلنج کرنا شروع کر دیا تو ایسا انہوں نے پاکستان کے حوالے سے امریکی مفادات پر مبنی پالیسی کے تابع ہی کیا۔ اسی طرح امریکہ کو ٹرمپ کے دور میں افغانستان سے اپنی فوجوں کی محفوظ واپسی کیلئے پاکستان کی معاونت حاصل کرنے کی مجبوری لاحق ہوئی تو یہی ٹرمپ پاکستان کیلئے ریشہ خطمی نظر آیا۔ اگر اس موقع پر ڈیموکریٹ صدر امریکی اقتدار پر براجمان ہوتا تو اسکی بھی ہمارے ساتھ ایسی ہی پالیسی ہوتی۔ چنانچہ 3 نومبر 2020ء کے امریکی صدارتی انتخاب کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں، جو بائیڈن اقتدار میں آتے ہیں یا سال 2000ء کے امریکی انتخاب کی طرح اس بار ری پبلکن ٹرمپ امریکی سپریم کورٹ کا سہارا لے کر پھر اقتدار کی راہداریوں میں بدمستیاں کرتے نظر آتے ہیں تو بھی ہمارے ساتھ امریکہ کا وہی رویہ، وہی پالیسی ہوگی جس کی امریکی مفادات کے تحت واشنگٹن انتظامیہ کو ضرورت ہوگی۔

موجودہ صدارتی انتخاب میں اصل بات تو امریکی عوام کے فیصلہ کی ہے۔ اگر اس فیصلہ کی بنیاد پر ری پبلکن پارٹی کی ایک ہی ٹرم کے بعد دوبارہ ڈیموکریٹک پارٹی اقتدار میں آ رہی ہے تو پھر بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات کے معاملہ میں امریکی مفادات پر مبنی پالیسی کو بھی یقیناً ڈنٹ پڑیگا۔ آخر کچھ تو ایسا ہوا ہے کہ ٹرمپ کی جانب سے اختیار کی گئی پالیسیوں کی بنیاد پر امریکی عوام

ایک پارٹی کی دوٹرموں کیلئے اپنی روایت توڑنے اور متعینہ سوچ تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اگر امریکی عوام کی بدلتی ہوئی اس سوچ کے باعث امریکہ میں خانہ جنگی کی فضا ہموار ہوتی نظر آ رہی ہے جس کی ٹرمپ کے حامیوں کے مظاہروں' انکی پولیس کے ساتھ جھڑپوں اور گرفتاریوں کی صورت میں شروعات بھی ہو چکی ہیں تو یہ دنیا میں امریکہ کا برتری کا زعم ٹوٹنے کی بھی نشاندہی ہے۔ اس کیلئے ٹرمپ نے کلیدی کردار ادا کیا ہے جس کے ردعمل میں انہیں اقتدار کے ایوانوں سے باہر نکلنا پڑ رہا ہے تو ہمارے لئے امریکی معاشرے کو توڑنے والا ٹرمپ کا یہ کردار کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ خلق خدا کے راج میں تاج اچھلتے اور تخت گرتے نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ برتری کے زعم والی اس معاشرت میں انقلاب برپا ہو گیا ہے جو دوسری معاشرتوں میں اپنا ساختہ انقلاب برپا کرنے کی سازشوں میں مگن رہی ہے۔ امریکی عوام کے اس انگڑائی لیتے شعور اور سوچ کو میرا عاجزانہ سلام۔

جمہور کو رگڑے

سلطانی جمہور سے اپنے اچھے مستقبل کی امیدیں وابستہ کرنے اوران امیدوں کے سہارے زندگی کی کٹھنائیاں جیسے تیسے برداشت کرنیوالے راندۂ درگاہ عوام خاطر جمع رکھیں کہ کسی جمہوری انقلاب اور تبدیلی کی کسی سوچ نے ہمارے معاشرے' معاشرت اور بے بس و مجبور خلق خدا کو کیڑے مکوڑے سمجھ کر پاؤں تلے روندنے کے خناسی کلچر کا کچھ بھی تبدیل نہیں کیا اور محض لفظاً نہیں' عملاً وہی اک چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ آپ بخوبی اندازہ لگالیں کہ تبدیلی کی علامت اور نئے پاکستان کے قائد عمران خان نے بھی آج ''سٹیٹس کو'' والے سسٹم کے آگے ہاتھ کھڑے کر دیئے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ روز اسلام آباد میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ''سسٹم'' کے آگے اپنی بے بسی کو محسوس کر کے ہی یہ کہا ہوگا کہ قانون طاقتور کو نہیں پکڑتا' اشرافیہ کے سامنے منی لانڈرنگ سمیت تمام قوانین بے بس ہیں۔ اگر نئے پاکستان کیلئے عزم صمیم کے ساتھ آج عمران خان صاحب نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امیر لوگوں کیلئے بنائی گئی پالیسیوں سے تعلیم اور صحت کا نظام تباہ ہو چکا ہے اور مہنگے بجلی معاہدوں سے عام آدمی اور صنعتی شعبہ متاثر ہوا ہے اور اسی طرح مہنگائی کے سونامی بھی خود ہی اٹھائے جا رہے ہیں تو بھائی صاحب پھر......ع

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

وزیراعظم عمران خان صاحب کے اعتراف حقیقت پر مبنی ان ارشادات پر مجھے 2 ر اگست 2016ء کو نوائے وقت میں شائع ہونیوالا اپنا کالم ''جمہور کو بے بس کرنیوالی سلطانی جمہور'' اس سسٹم کے حوالے سے اپنی حسرت ناکام پر کچوکے لگاتا نظر آیا۔ آج میں اپنے اس کالم پر ہی اکتفا کر رہا ہوں اور اس پر غور و فکر کا معاملہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ سابقہ سلطانی جمہور سے موجودہ سلطانی جمہور تک راندۂ درگاہ عوام کو اسکے معمولی سے ثمرات بھی حاصل ہوئے ہیں یا وہ پہلے سے بھی بدتر

حالات کے رگڑے کھا رہے ہیں۔ آج سلطانی جمہور پر میرا اعتماد ختم نہیں تو متزلزل ضرور ہوا ہے۔ میرا 2 اگست 2016ء والا کالم ملاحظہ فرمائیں۔

''یہ مسلمہ اصول ہے کہ جمہوریت تبھی کامیاب ہوگی جب یہ جمہور کو اپنے ثمرات پہنچا رہی ہو گی۔ یقیناً اسی بنیاد پر جمہور کا جمہوریت کے ساتھ اعتماد کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے مگر ہماری سلطانی جمہور میں تو معاملہ ہی کچھ اور نظر آتا ہے کیونکہ یہاں سلطانی جمہور میں جمہور ہی کی سب سے زیادہ ناقدری ہوتی ہے۔ ہماری جمہوریت میں تو عرف عام والے عوام الناس ہی راندۂ درگاہ ہیں جنہیں جمہوریت میں آسائشات والے لوازمات تو کجا' روٹی روزگار والی بنیادی سہولت بھی میسر نہیں۔ سو ہماری جمہوریت میں جمہور کیلئے درویشی بھی عیاری ہے' سلطانی بھی عیاری۔

کل حکمران مسلم لیگ (ن) سے وابستہ احباب سے گپ شپ ہو رہی تھی۔ بات جمہوریت کے ''ڈیلیور'' کرنے پر آئی تو حکمران پارٹی کے یہ لوگ اپنی ہی حکمرانی کیخلاف پھٹ پڑے۔ ''بھئی اس سسٹم میں تو سلطانی جمہور عوام کے زور پر نہیں' افسران کے زور پر چلائی جا رہی ہے جس میں عام ورکر ہی نہیں' قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان بھی بے بس ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کو سرکاری محکموں میں معمولی روزگار بھی نہیں دلوا سکتے' وہ شکایات کی گٹھڑی اٹھائے اسمبلی کے اجلاس میں جاتے ہیں تو وہاں بھی انکی وزیراعظم اور وزیراعلیٰ تک رسائی نہیں ہو پاتی جبکہ عام دنوں میں تو ان کیلئے وزیراعظم ہاؤس اور وزیراعلیٰ ہاؤس کے دروازے ہی بند ہوتے ہیں۔ اب تو وہ شرمندہ ہوتے اپنے حلقے کا رخ ہی نہیں کرتے کہ وہاں جا کر اپنی بے بسی کا کیسے رونا روئیں اور ان سے اچھے مستقبل کی توقعات وابستہ کئے بیٹھے اپنے ورکروں کو کیسے مطمئن کریں۔ ایک صاحب تو بہت ہی اکتائے ہوئے نظر آئے' مسائل کے تفکرات سے اپنی جبین پر پڑی ہوئی سلوٹوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے ''بھئی ہمارے میاں صاحبان کو اب حکومت چلانے کا ڈھنگ آ گیا ہے'' ''وہ کیسے؟'' ہمارے استفسار پر انکی آنکھوں کی ویرانی اور بھی گہری ہوتی نظر آئی۔ ''ارے انہوں نے بیوروکریسی پر تکیہ کرنے کی عادت اپنا لی ہے۔ وہ بیوروکریسی کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہیں تو بیوروکریسی بھی انہیں اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنے کا فن جان گئی ہے۔ چنانچہ حکمرانی کے درمیان عوام اور انکے نمائندگان کا کوئی وجود نہیں رہا۔ یوں سمجھیں اب ڈائریکٹ ڈائیلنگ اور ڈیلنگ ہے۔ سو اوپر اوپر سب وارے نیارے اور عوام کی سطح پر محرومیاں' ناکامیاں'

نامرادیاں۔

ایک متوالے سے نہ رہا گیا آج کا اخبار سامنے پڑا تھا جس میں پراپرٹی کی خرید وفروخت کے حوالے سے وزیر خزانہ اسحاق ڈار کی اعلان کردہ ایمنسٹی سکیم کی خبر شہہ سرخی کے طور پر موجود تھی۔ میرا ذہن تو اس سکیم کا اچھے پیرائے میں جائزہ لے رہا تھا مگر متوالے نے جو اتفاق سے پراپرٹی کا کاروبار بھی کرتے ہیں اس سکیم کے مضمرات بتانا شروع کئے تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جناب اب دیکھئے آسمان کو پہنچنے والی زمین کی قیمتیں کتنی تیزی سے نیچے کو آتی ہیں۔اب رئیل اسٹیٹ حقیقی بحران سے دوچار ہونیوالی ہے۔''ارے وہ کیسے۔زمین کے نرخ کم ہونے سے تو عام آدمی کو ہی فائدہ ہوگا۔جن کیلئے سونے سے بھی زیادہ مہنگی ہونیوالی زمین پر اپنا گھر بنانے کا تصور ہی بے معنی ہو چکا تھا' وہ زمین کے نرخ سستے ہونے سے کم از کم اپنی چھت کا خواب تو پورا کر سکیں گے۔'' میں نے حکومتی نمائندہ اپنے دوست کو مزید کریدنے کی کوشش کی۔ جناب یہ تو آپ کو مستقبل قریب میں بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ جائیداد کی خرید وفروخت کی نئی سکیم عام عوام کیلئے کتنے بڑے عذاب کا باعث بنتی ہے۔زمین ''ٹکے ٹوکری'' ضرور ہوگی مگر زمین بیچنے والا کوئی نہیں ہوگا اور پھر جن انوسٹرز نے زمین خرید کر بڑے منافع کیلئے محفوظ رکھنی ہوتی ہے' اب ان کا وجود بھی ناپید ہو جائیگا۔ انہوں نے ایف بی آر کو ہتھیار دے دیا ہے اس لئے اب ہوگا یوں کہ جن انوسٹرز نے بڑے منافع کیلئے زمین خرید کر رکھی ہوئی ہے ان پر مختلف نوعیت کے ٹیکس عائد ہونگے تو وہ ان ٹیکسوں سے جان چھڑانے کیلئے اپنی زمینیں اونے پونے داموں بیچنے کی کوشش کرینگے جس سے لامحالہ قیمتیں تیزی کے ساتھ نیچے کو آئیں گی۔ چنانچہ زیادہ تر انوسٹر حضرات ہی سستے داموں یہ زمینیں خریدنے کیلئے میدان میں آجائینگے مگر انہیں اس وقت لینے کے دینے پڑ جائینگے جب وہ چالیس لاکھ سے زیادہ کی اراضی پر کیپٹل گین ٹیکس ادا کرنے کیلئے ایف بی آر کے پاس جائینگے۔وہاں ان سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ اتنی بڑی رقم آپ کے پاس آئی کہاں سے؟ اس کا حساب کتاب شروع ہوگا تو ٹکے ٹوکری ہوئی زمین خریدنے کے خواہشمند سارے انویسٹر بھاگ جائینگے۔چنانچہ مارکیٹ میں زمین بیچنے والا ہوگا نہ خریدنے والا۔اس طرح رئیل اسٹیٹ کا کاروبار ایک دم مندی کا شکار ہو جائیگا اور اس کاروبار سے وابستہ عام عوام کاروبار ٹھپ ہونے سے فاقہ کشی کا شکار ہو جائینگے۔کاروبار چمکے گا تو ایف بی آر والوں کا جو مک مکا کے فن میں یکتا ہیں۔آپ کو اندازہ نہیں کہ اس سکیم کے ذریعہ عام

عوام میں پیدا کی جانے والی یہ بے چینی سلطانی جمہور کا کیسے پھلکا اڑاتی ہے۔ متوالے نے خشمگیں آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے مزید استفسار کا سوچا ہی تھا کہ انکے ساتھ بیٹھے دوسرے متوالے کی زبان کی لگام بھی ڈھیلی ہو گئی جو لیسکو اہلکاروں کی چیرہ دستیوں کے ستائے ہوئے تھے۔ ''ایک تو بجلی ناپید ہے۔ حبس کے اس موسم میں جسم ہر وقت پسینے میں شرابور رہتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ لیسکو نے اپنے لگائے جانے والے سنگل فیز کے میٹر بھی اتنے تیز رکھے ہوئے ہیں کہ انہیں جستیں بھرتا دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو جاتی ہیں۔ میرا نیا میٹر ابھی چالو بھی نہیں ہوا کہ اس نے ایک مہینے کے 42 سو یونٹ میرے کھاتے میں ڈال دیئے۔ اب میٹر درست یا تبدیل کرانے کیلئے لیسکو دفاتر میں چکر لگانے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ جہاں اہلکار بے شرمی کے ساتھ دیدے پھاڑ کر اپنے شکار کے منتظر نظر آتے ہیں' سر عام نذرانہ طلب کرتے ہیں اور انکار کی صورت میں میٹر تبدیل ہوتا ہے نہ بل۔ اس محکمے کو ایسی ہلا شیری اوپر تک کی آشیر باد کے بغیر تو نہیں مل سکتی۔ سو عوام کیلئے لوڈ شیڈنگ بھی اذیت اور معمولی سی بجلی کی فراہمی بھی اذیت۔ جائیں تو جائیں کہاں''۔

تو بھائی صاحب! آپ راندۂ درگاہ بنائے گئے ان عوام سے توقعات وابستہ کریں کہ وہ سلطانی جمہور پر ٹوٹی کسی افتاد کو ٹالنے کیلئے اسکے آگے ڈھال بن جائینگے۔ انہیں روندنے کیلئے آنیوالے ٹینکوں کے آگے بخوشی اپنا سر جھونک دینگے اور ان قربانیوں کے صدقے بچنے والی سلطانی جمہور کو آئندہ کیلئے بھی سر آنکھوں پر بٹھائے رکھیں گے۔ ارے ''یہ کیسی باتیں کرتے ہو' یہ کیسا درد سموتے ہو''۔

مجھے سلطانی جمہور کی اس تصویر میں تو جمہوری سلطانوں کے اپنے اندر سے طوفان اٹھتا اور لاوا اُبلتا نظر آ رہا ہے۔ آپ جمہوریت کو جمہور کی پہنچ سے دور لے جائینگے تو وہ سراب کے پیچھے آخر تک دوڑتے ہلکان ہوتے رہیں گے۔ اسے بچانا اور مضبوط بنانا مقصود ہے تو جمہور کو اسکے ساتھ وابستہ کر لیں۔ جمہوریت اور جمہور میں خلیج بڑھ گئی تو پھر اس خلا میں جن بھوتوں کا ہی بسیرا ہو گا۔''

جمہوریت کو گرانے کے جتن

جب حکومتی اکابرین کی جانب سے خود ان خدشات کا اظہار کیا جانے لگے کہ اپوزیشن کی حکومت مخالف تحریک سے پورا سسٹم جا سکتا ہے تو جناب۔ حالات کے سازگار ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ آج اگر حالات بدقسمتی سے پھر پورے سسٹم کی بساط الٹانے کی طرف جا رہے ہیں تو اس میں اپوزیشن ہی نہیں حکومت خود بھی ''گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو'' والا کردار ادا کرتی نظر آ رہی ہے۔ اپوزیشن جماعتوں کو بھی حکومت نے خود ہی مہنگائی کے سونامی اٹھا کر اور پسے پسماندہ عوام کو مزید راندۂ درگاہ بنا کر، حکومت مخالف تحریک کیلئے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونے کا موقع فراہم کیا۔ جب نیا اپوزیشن اتحاد پی ڈی ایم تشکیل پا گیا اور اس نے جلسے جلوسوں کی شکل میں اپنی مرحلہ وار احتجاجی تحریک کا شیڈول جاری کر دیا تو حکومت اسے غیر مؤثر بنانے کا عوام کو گھمبیر ہوتے غربت، مہنگائی، بے روزگاری کے مسائل میں فوری ریلیف دیکر بندوبست کر سکتی تھی مگر مہنگائی کم کرنے کے اقدامات اٹھانے کے بجائے عوام کو کچلنے والے مہنگائی کے عفریت کو مزید موٹا تازہ کیا جانے لگا اور ٹائیگر فورس کو مہنگائی کنٹرول کرنے کا ٹاسک سونپ کر سیاسی محاذ آرائی بڑھانے کا اہتمام بھی کر لیا گیا۔ پھر اے پی سی اور مسلم لیگ (ن) کے اجلاسوں میں کیا گیا میاں نواز شریف کا ویڈیو لنک خطاب حکومتی اکابرین کے ہتھے چڑھ گیا اور اسے اداروں کے ساتھ جنگ بنا کر انہیں حکومت اور اپوزیشن کے مابین جاری سیاسی محاذ آرائی میں خود ہی فریق بنا لیا گیا۔ اور تو اور۔ رات کے اندھیرے میں اور پلک جھپکتے میں بدر رشید نامی ایک شخص کو پولیس تھانہ شاہدرہ میں نمودار کر کے اسکی مدعیت میں میاں نواز شریف سمیت مسلم لیگ (ن) کے بیالیس قائدین اور عہدیداروں کیخلاف بغاوت کا مقدمہ بھی درج کر لیا گیا جس میں وزیراعظم آزاد کشمیر تک کو ملزم ٹھہرا دیا گیا۔ ضرورت عوام کو اپوزیشن کی تحریک سے ہٹانے کیلئے انہیں ریلیف دینے کی تھی مگر حکومتی اکابرین سیاسی محاذ آرائی کو انتہاء تک پہنچانے پر تل گئے۔

آرمی چیف نے تو اپنے تئیں عساکر پاکستان کا سیاست سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہونے کا

دوٹوک اعلان کر کے سیاست دانوں کو اپنے معاملات متعلقہ فورموں بشمول پارلیمنٹ' نیب اور عدلیہ میں خود طے کرنے کا راستہ دکھایا مگر وزیراعظم عمران خان نے اپنی حکومت کو ریاستی اداروں کی مکمل حمایت حاصل ہونے کا عندیہ دیکر سیاسی مفادات کی جنگ میں اداروں کو دوبارہ گھسیٹ لیا۔ پی ڈی ایم کی تحریک کے پہلے مرحلہ میں اس اپوزیشن اتحاد نے گوجرانوالہ کا انتخاب کیا جہاں 16 اکتوبر کا پبلک جلسہ طے ہوا تو حکومتی اکابرین نے چیلنج دینا شروع کر دیا کہ گوجرانوالہ کا سٹیڈیم عوام سے بھر کر دکھاؤ۔ ماورائے آئین اقدامات کے ڈسے ہوئے میاں نواز شریف بھی طیش میں آ گئے اور انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' براہ راست ادارہ جاتی قیادتوں کا نام لے کر حکومت کے کٹھ پتلی ہونے اور اس کیلئے ووٹ چوری کرنے کا الزام دھر دیا۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر تو اس تقریر کا ایک لفظ بھی نہ آ سکا مگر حکومتی اکابرین نے اس تقریر کے مندرجات ویڈیو کلپس اور اپنے بیانات کے ذریعے اجاگر کر کے پوری قوم کو حفظ کرا دیئے اور پھر رہی سہی کسر خود وزیراعظم عمران خان نے اپنی ٹائیگر فورس کے اجتماع میں اپنی تقریر کے ذریعے نکال دی۔ انہوں نے ایک جانب تو میاں نواز شریف کو واپس لا کر انکے ساتھ جیل میں انتہائی برا سلوک روا رکھنے کا عندیہ دیا اور دوسری جانب خواجہ آصف کے الیکشن ہارنے اور پھر آرمی چیف کو فون کر کے الیکشن جیتنے کی تمسخرانہ لہجے میں کہانی سنا کر اس حوالے سے میاں نواز شریف کے بیانیے کو ہی تقویت پہنچا دی چنانچہ پی ڈی ایم کراچی کے جلسہ میں مولانا فضل الرحمان کو بھی یہ پھبتی کسنے کا موقع مل گیا کہ "ہوئے تم دوست جس کے......"

اور پھر یہ تو جناب غضب ہی ڈھا دیا گیا ہے۔ پیپلز پارٹی کی میزبانی میں ہونیوالے پی ڈی ایم کراچی کے پبلک جلسے میں' جس میں فی الواقع عوام کا جم غفیر تھا' مریم نواز نے بطور خاص بلاول بھٹو زرداری سے مخاطب ہوتے ہوئے ان سے وعدہ لیا کہ ہم آئندہ ایک دوسرے کے سیاسی حریف ہونے کے باوجود ذاتی انتقام والی سیاسی دشمنی پر نہیں اتریں گے۔ اس کیلئے انہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت سے قبل کے انکے ساتھ اپنے والد میاں نواز شریف کے قائم ہونیوالے احترام کے رشتے کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم نے اپنی آئندہ کی سیاست میں بھی یہ رشتے نبھانے ہیں۔

یہ بلاشبہ سیاست میں رواداری اپنانے کا ٹھوس پیغام تھا جس کے ماضی میں عنقا ہونے کے باعث جمہوریتوں پر افتاد ٹوٹتی رہی ہے اس لئے آج جس سیاسی رواداری کی ضرورت ہے' مریم نواز نے پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم پر اور بالخصوص پیپلز پارٹی کی میزبانی میں اسکی فضا ہموار کرنے

کی کوشش کی۔ پھر کیا ایسا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ رات کو جم غفیر کے سامنے بلاول بھٹو زرداری ذاتی انتقام کی سیاست کا ورقہ پھاڑنے کیلئے مریم نواز کے ساتھ عہد و پیا کرتے نظر آئیں اور جلسہ ختم ہونے کے چند ہی گھنٹوں بعد رات کی تاریکی میں دھاوا بول کر اور دروازہ توڑ کر مریم نواز کے خاوند کیپٹن صفدر کو انکی موجودگی میں ہوٹل سے حراست میں لے کر پولیس تھانے پہنچا دیا جائے۔ یہ کارروائی تو یقیناً یہ سوچ کر ڈالی گئی کہ اس گرفتاری کا ملبہ سیدھا پیپلز پارٹی کی سندھ حکومت پر گرے گا اور اس طرح سیاسی رواداری کی فضا بنانے والے قائدین پھر ذاتی انتقامی سیاست پر اتر آئیں گے اور دوسرا فائدہ اپوزیشن اتحاد پی ڈی ایم کو عملاً توڑنے کی صورت میں حاصل ہوگا۔ ارے کیا حکومت مخالف تحریک کی صف بندی کرنیوالے سیاست دان اتنے احمق ہیں کہ بلا سوچے سمجھے اس ٹریپ میں آ جاتے۔ چنانچہ سندھ حکومت کی جانب سے فوری طور پر کیپٹن صفدر کی گرفتاری کے اس واقعہ سے لاتعلقی کا اعلان سامنے آ گیا۔

جس انداز میں یہ گرفتاری عمل میں آئی اور اس گرفتاری کے پس منظر میں جو کہانی چل رہی ہے وہ جمہوریت کی عملداری کیلئے سازگار حالات کی ہرگز عکاسی نہیں کر رہی۔ اگر اس کہانی کا پلاٹ حکومتی سرکل کی جانب سے کراچی میں بھی بدر رشید جیسا ایک مدعی وقاص احمد خان کی شکل میں ڈھونڈ کر اسکی مدعیت میں پولیس تھانہ بریگیڈ کراچی میں توہین قائد کے سنگین جرم پر مبنی دفعات کے تحت جھٹ پٹ ایف آئی آر کٹوانے اور اسکی بنیاد پر کیپٹن صفدر کو بہیمانہ انداز میں گرفتار کرنے کی صورت میں تیار کیا گیا ہے تو یہ بلاشبہ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مارنے والی بات ہے۔ مزار قائد پر ماضی قریب میں ہونیوالے سیاسی پبلک جلسوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا رہا۔ اسکے گواہ ڈھونڈ لانا بھی چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ مجھے تو اس کھیل میں بہر حال جمہوریت کا چمن اجڑتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس کیلئے اودھم مچانے والے حکومتی سیانے تو ''جو بولے سو نہال'' کے مصداق فیض پانے والوں کی قطار میں شامل رہیں گے یا بیرون ملک اپنے ٹھکانوں میں جا بسیں گے۔ جناب وزیر اعظم داؤ پر تو آپ کا سب کچھ لگا ہوا ہے اور جمہوریت کو بچا کر رکھنے میں ہی آپ کی بچت ہے۔ اگر سیاسی انتقام کی بھڑکائی گئی آگ شعلۂ جوالہ بن گئی تو اپنے سٹیک ہولڈرز سمیت اس میں جھلستی جمہوریت کراہتی، سسکیاں بھرتی ہاتھ سے نکل جائیگی اس لئے اب سیاسی رواداری کو پھیلا کر ہی قائد کے پاکستان کی سیاست اور جمہوریت کو بچایا جا سکتا ہے۔ آپ ڈھول اڑاتے رہیں گے تو پھر جمہوریت پر ماضی جیسی شب خونی کوئی دور کا معاملہ نہیں رہے گا۔

مہنگائی کے توڑ کا مجرب نسخہ

ویسے تو خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے مگر ڈھلتی عمر میں خود کو ادویات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا سو میرا اور اہلیہ کا ان دنوں ادویات پر ہی گزارا چل رہا ہے۔ اور اب کیفیت ایسی بنی ہوئی ہے کہ......؎

قلب و جگر سے ہو کے نظر تک بھی آئے ہیں
پہلو سے اٹھتے اٹھتے حشر تک بھی آئے ہیں

ایک مرض کے علاج کی تجویز کردہ ادویات زیرِ استعمال آتی ہیں تو ساتھ ہی کسی دوسرے مرض کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ......؎

روز تھکتا ہوں میں کر کر کے مرمت اپنی
روز اک نقص نیا مجھ میں نکل آتا ہے

سو ادویات سے بھی آشنائی ہے اور پھر انکے ناپید ہوتے اور بڑھتے نرخوں سے پنجہ آزمائی ہوتی رہتی ہے۔ ان دنوں شوگر، بلند اور کم فشارِ خون، لوز موشنز، سکن الرجی جیسے امراض تو انسانی صحت کا لازمی حصہ بن چکے ہیں اور روزمرہ کی ٹینشن انکے بنیادی اسباب ہیں۔ ڈھلتی عمر بذات خود ایک مرض بن جاتی ہے۔ جس کیلئے مرحوم پرویز حمید میاں محمد سے منسوب کر کے اکثر یہ شعر سنایا کرتے تھے کہ......؎

کوئی کہندا اے پیڑ لکے دی، کوئی کہندا اے چُک
سچّی گل اے محمد بخشا، اندروں گئی اے مُک

ہمارے شاعر حضرات بھی زندگی کے سفر میں یاس و امید کے مراحل سے گزرتے ہیں تو حسبِ حال شاعری کے ذریعے اسکی منظر کشی کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے امید و یاس کی منظر کشی

اپنے اس شعر کے ذریعے کی کہ......

گزر رہا ہے عجب کش مکش میں دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے، زندگی کی آس نہیں

میر یہ سوچ کر کشمکش دیدہ و دل کی عکاسی کرتے ہیں کہ......

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اور غالب یہ محسوس کر کے طمانیت کا اظہار کرتے ہیں کہ......

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

مگر شاعر کی یہ کیفیت تو مایوسی کی انتہاء کو جا پہنچی ہے کہ......

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہاں تو جناب!

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

اپنے ''یار زندہ صحبت باقی'' والے یار باش ریاض شاکر کی جواں مرگی نے تو دل کو لرزا کر رکھ دیا ہے۔ بے ثبات زندگی کی سفا کیوں کو اور بھی اجاگر کر دیا ہے اس لئے اب تو ''بونس لائف'' کو ادویات کے سہارے گھسیٹ کر ہی گزارا جا سکتا ہے اور ادویات کے ''نرخِ بالا کن'' نے تو زندگی کی گھسیٹا گھسیٹی بھی مشکل بنا دی ہے۔ ایسے ماحول میں زندگی سے گزر جانے والا غالب کا یہی نسخہ مجرب سمجھ کر استعمال کیا جائے تو زندگی کی کٹھنائیوں سے جلد جان چھوٹ سکتی ہے کہ......

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

اس کیلئے سوشل میڈیا پر چلنے والا یہ ''اشتہار'' بھی زادِراہ بنالیا جائے تو زندگی کے جھنجٹوں سے چھٹکارے میں مزید آسانی ہو جائیگی۔ اس ''اشتہار'' میں ہم راندۂ درگاہ طبقات کو ہی یہ صائب مشورہ دیا گیا ہے کہ ''تمام دوائیں غریبوں کی پہنچ سے دور رکھیں، طبیعت زیادہ خراب ہو تو یاد رکھیں کہ سکون صرف قبر میں ہے۔''

اور جناب! ''نرخِ بالا کن'' کے جواز نے تو دل باغ باغ کر دیا ہے۔ وزیراعظم کے معاون خصوصی برائے صحت غالباً ڈاکٹر فیصل سلطان میڈیا کے روبرو آ کر کتنے اعتماد کے ساتھ فرما رہے تھے کہ ادویات کے غیر معیاری ہونے اور مارکیٹ میں ناپید ہونے کا توڑ ادویات کے نرخ بڑھا کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ بھئی یہ تو بہت مجرب نسخہ ہے جو گزشتہ دو سال میں اب تک پانچ بار آزمایا جاچکا ہے۔ سوشوگر کی جس دوائی کا پیکٹ دو سال قبل 75 روپے میں دستیاب تھا، وہ اب تین سو روپے تک جا پہنچا ہے اور اس دوائی کے معیاری ہونے کی چھان پھٹک مریض کی صحت کا اندازہ لگا کر بخوبی کی جاسکتی ہے۔ ارے یہ تو ''مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک، بے اثر'' والا معاملہ ہے۔ اور پھر تاثیر گورننس یہی ہے کہ مارکیٹ میں جو چیز نایاب ہو جائے اسکے نرخ بڑھا کر عوام کیخلاف ایسی سازشیں کرنیوالے بدطینتوں کا منہ توڑ دیا جائے۔

خدا لگتی کہیئے، اس گورننس کی تاثیر اس عہدِ خوش خصال میں بڑھتی نہیں جا رہی؟ فلور ملز والوں نے پہلے آٹے کا معیار گرایا اور پھر انسانی صحت کو رگڑے دینے والا یہ آٹا بھی مارکیٹ سے غائب کر دیا۔ عوام آٹے کی اس کمیابی پر مضطرب ہوئے تو اسکے نرخ بڑھا کر یہ غیر معیاری اور مہنگا آٹا خریدنے پر عوام کو مجبور کر دیا۔ گندم کی بمپر فصل ہوئی تو تاجر طبقہ کو سستی گندم خرید کر مہنگے داموں بیرون ملک برآمد کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس طرح گندم کی ملک میں قلت پیدا ہو گئی تو اسے سستے داموں مارکیٹ میں لانے کا جواز ہی ختم ہو گیا۔ سو عوام بھی مہنگے داموں گندم خریدنے پر آمادہ ہو گئے مگر ''ہم خرما، ہم ثواب'' والوں کے اس منافع خوری پر بھی جی نہ بھرے تو انہیں اپنی ہی بھجوائی گئی گندم درآمد کرنے کی اجازت دیکر انہیں مزید منافع کی سہولت فراہم کر دی گئی۔ لگے ہاتھوں شوگر ملز مالکان نے بھی اس بہتی گنگا میں اشنان کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چینی مارکیٹ

میں ناپید کی اور پھر ''نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز'' کا تصور باندھ کر چینی کے نرخوں کے جستیں بھرنے کا اہتمام کر کے عوام کیلئے چینی کی قلت کا عذاب ختم کر دیا۔ حکومت کو عالمی مارکیٹ کے حساب سے پٹرولیم نرخوں میں کمی کا کریڈٹ لینے کا شوق چرایا تو پٹرولیم مافیا نے پٹرول کی رسد روک کر حساب برابر کر دیا چنانچہ حکومتی گورننس کا یہی تقاضا تھا کہ پٹرول کے کم کئے گئے نرخ واپس لے کر مافیا کا گٹھ جوڑ توڑا جائے۔ سو حکومت اس میں بھی ''سرخرو'' ہوگئی اور جناب! میڈیسن والا مافیا تو حکومت کو بار بار اپنی گورننس کا یہی طریق کار اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے اور حکومت بھی پر عزم ہے کہ وہ اپنی گورننس کے اس طریق کار پر کوئی حرف نہیں آنے دیگی۔ ایسے حالات سے گھبرائے عوام کو نوید ہو کہ حکومت انہیں زہر کھا کر مرنے نہیں دیگی کیونکہ اب زہر بھی مارکیٹ میں ناپید ہو کر اتنا مہنگا ہو جائیگا کہ اسے خریدتے وقت عوام کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائینگے' تو جناب! اس گورننس میں راندۂ درگاہ عوام کی حالت دیکھنی ہو تو اس شعر کا ورد کر لیجئے کہ......

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

آپ یہ نسخہ آزمائیں اور اس گورننس میں آسودگی پائیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

اندھا قانون اور اُجلا انصاف

انصاف کی عملداری کا ایک اجلا چہرہ تو برطانوی وزیراعظم چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ضرب المثل بنے اپنے اس فقرے کے ذریعے دکھایا تھا کہ اگر ہماری عدالتیں انصاف دے رہی ہیں تو پھر ہمیں کسی سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اور محسنِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول تو عدل گستری کیلئے روشن مثال بن چکا ہے کہ کفر کا نظام تو چل سکتا ہے مگر ظلم کا نظام نہیں رہ سکتا۔ انصاف کی عملداری کی ایک اور مثال بھی ضرب المثل ہے کہ انصاف ہونا ہی نہیں چاہیے' ہوتا ہوا نظر بھی آنا چاہیے۔ ہماری عدلیہ کے فیصلوں میں بے شمار ایسی مثالوں کے حوالے موجود ہیں اور انصاف کی عملداری پر زور دینے والے ہمارے فاضل منصف حضرات' آئینی اور قانونی ماہرین' دانشور اور سیاست دان بھی اس ضرب المثل فقرے کا ضرور سہارا لیتے ہیں کہ انصاف میں تاخیر انصاف کے قتل کے مترادف ہے۔

ہماری عدل گستری میں انصاف کی جو عملی تصویر اپنے نین نقوش کے ساتھ پختہ ہو چکی ہے وہ جنگل کے بادشاہ کی اس کہانی پر مبنی ہے کہ اس نے اپنے کئے ہوئے شکار کے تین حصے بنائے اور پھر جنگل کی ساری مخلوق (چرند پرند) کو اکٹھا کر کے ان حصوں کی تقسیم کیلئے عدالت لگائی۔ خود ہی کیس پیش کیا اور خود ہی فیصلہ صادر کیا کہ ان میں ایک حصہ تو میرا اس لئے ہے کہ یہ شکار میں نے کیا ہے' دوسرا حصہ میرا اس لئے ہے کہ میں جنگل کا بادشاہ ہوں اور تیسرا حصہ آپ کے سامنے پڑا ہے' کسی میں ہمت ہے تو اٹھا لے۔

اس تیسرے حصے پر بھی جنگل کے بادشاہ کی ملکیت اس کہانی کے ذریعے ثابت ہوتی ہے جس میں کسی نے ایک آدمی سے پوچھا کہ اگر اچانک آپ کے سامنے شیر نمودار ہو جائے تو آپ کیا کرینگے۔ اس آدمی نے مرجھائے ہوئے لہجے میں اور شیر کی موجودگی کا تصور باندھ کر کپکپاتی زبان کے ساتھ جواب دیا کہ حضور میں نے کیا کرنا ہے' جو کرنا ہے شیر نے کرنا ہے۔ تو حضور! ہم عدل گستری کے ایسے ہی ماحول میں انصاف کی عملداری کے گن گاتے یا متقاضی ہوتے ہیں۔

پاکستان کے ہر منصف اعلیٰ کا تو یہی تردد، تجسس اور عزم رہا ہے کہ انصاف کی مثالی عملداری قائم کی جائے۔ اس کیلئے کئی عملی اقدامات کا تقاضا بھی کیا جاتا ہے اور کئی عملی اقدامات اٹھائے بھی جاتے ہیں جن کا ایک عدالتی رپورٹر کی حیثیت سے میں عینی شاہد بھی ہوں۔

انصاف کی عملداری کی گھن گرج تو بہت سنائی دیتی رہی ہے مگر ''جنگل کے بادشاہ'' کی ایک دھاڑ سب کا پتہ پانی کر دیتی ہے۔ عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ میں جسٹس مولوی مشتاق سے جسٹس افضل ظلہ، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال سے جسٹس سجاد علی شاہ، جسٹس ارشاد حسن خان سے جسٹس افتخار محمد چودھری تک کی عدلیہ کی تاریخ تو میری آنکھوں کے سامنے مرتب ہوئی ہے اور انصاف کی عملداری کے بہت سارے معاملات سود و زیاں کو رپورٹ کرتے ہوئے عدالتی تاریخ کے رقم ہوتے ابواب میں میں نے اپنا حصہ بھی ڈالا ہوا ہے اور پھر جسٹس میاں ثاقب نثار سے جسٹس آصف سعید کھوسہ تک کے جوڈیشل ایکٹوازم (عدالتی فعالیت) کے عرصہ سے اب جسٹس گلزار احمد کے عہدِ انصاف تک سربراہان عدل گستری کی جانب سے انصاف کی عملداری کے عزم کی کئی زندہ مثالیں بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مگر پتہ نہیں جنگل کے بادشاہ والے انصاف کی عملداری کے تصور پر حضرت علیؓ اور چرچل کے انصاف کی عملداری کا تصور کب غالب آئیگا۔ کب ہم اس خواب کو حقیقت کے روپ میں ڈھلتا دیکھیں گے کہ.....

رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا
کس کے روکے رکا ہے سویرا

ہم تو بھائی صاحب اندھے قانون کی حکمرانی میں انصاف کی عملداری کا اجلا چہرہ دیکھنے کی لگن اور تڑپ میں یہی تصور باندھے بیٹھے ہیں کہ ''لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے'' مگر اس ''شام'' کی گہری ہوتی سیاہی تو چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اسکے باوجود میری رجائیت پسندی مجھے یہی کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ.....

ویسے تو دکھ ہیں کہ بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
پھر بھی یہ عدل کی زنجیر ہلائی جائے

عدل زنجیر ہلانے کا ایک تازہ منظر بلوچستان کے اچکزئی سیاسی خانوادے کے ایک ''سپوت''، مجید خان اچکزئی کیلئے انصاف کی عملداری کی صورت میں سامنے آیا ہے تو میری ساری رجائیت پسندی دھڑام سے نیچے آگری ہے۔ محمود خان اچکزئی کے اس برادر خورد اور رکن

بلوچستان اسمبلی نے تین سال قبل جون 2017ء میں کوئٹہ کے ایک بھرے بازار کے چوک میں ڈیوٹی پر مامور ایک ٹریفک سارجنٹ کو ادائے بے نیازی کے ساتھ اپنی تیز رفتار گاڑی کی ٹکر مار کر کچل دیا۔ یہ سارا منظر سی ٹی وی کے کیمرہ میں محفوظ ہو کر سوشل میڈیا کی زینت بن گیا اور پھر اُچکزئی خاندان کی چیدہ چیدہ شخصیات نے مقتول ٹریفک سارجنٹ کے گھر جا کر اسکے لواحقین سے معافی مانگنے کی صورت میں مجید خان اچکزئی کے سرزد ہونیوالے جرم کا اقرار بھی کر لیا مگر کوئٹہ کی ماڈل عدالت نے اس کیس کی تین سال تک سماعت کر کے یہ قرار دیکر ''جنگل کے بادشاہ'' کو باعزت بری کر دیا کہ اسکے جرم کے ثبوت ناکافی ہیں۔ مجھے اس پر منو بھائی کی ایک نظم ''احتساب دے چیف کمشنر صاحب بہادر'' بے ساختہ یاد آئی اور سوشل میڈیا پر وائرل ہونیوالی اس ایک پیرے کی کہانی نے تو میرے چودہ طبق روشن کر دیئے کہ ''پاکستان میں گھر بیٹھے ہی چالان کی سہولت سے مستفید ہونے کیلئے کیمرے کی آنکھ کافی ثبوت ہے مگر پورا بندہ کچل دیا جائے تو کیمرے کی آنکھ اسکے ساتھ انصاف کیلئے ناکافی ثبوت ہے۔ ارے بھائی صاحب! آپ خلقت کی جیتی جاگتی آنکھوں اور پھر اسے مشینی سی سی ٹی وی کیمرے کی شاطر آنکھ کے سامنے سرزد ہوتے ننگے جرم کے اور کہاں سے ثبوت ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کیمرے کی شاطر آنکھ نے تو سانحہ ساہیوال میں ایک مخصوص فورس کی گولیوں سے ایک خاندان کے بھونے جانے والے منظر کو بھی محفوظ کر کے بطور ثبوت پیش کر دیا تھا مگر جنگل کے بادشاہ کے سامنے سے اسکے شکار کا تیسرا حصّہ کوئی اٹھا کر تو دکھائے۔ ایک معروف ٹی وی آرٹسٹ خوش شکل و خوش الحان خاتون نے لاہور ایئرپورٹ پر اپنے قبضے سے شراب کی دو بوتلوں کی برآمدگی کا کیس ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک بھگتا اور باعزت بری ہو کر ''سپیڈی جسٹس'' کے ڈنکے بجائے۔ حضور! جنگل کے بادشاہ کے انصاف میں شراب کی بوتل شہد کی بوتل بن جائے تو بھلا کسی کی مجال ہے کہ وہ دن کی سفیدی کو تاریک رات ظاہر کرنیوالی کہانی کو جھٹلائے۔ ہم اندھے قانون میں اجلے انصاف کے متمنی ہیں۔ چیف جسٹس پاکستان جسٹس گلزار احمد نے مجید خان اچکزئی کی بریت کے معاملہ کا اپنے ازخود اختیارات کے تحت نوٹس لے لیا ہے تو میری رجائیت پسندی مجھے اجلے انصاف کے تصور میں بھی سرخرو دکھا رہی ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے ساغر صدیقی کا یہ شعر کچو کے پر کچوکے لگائے جا رہا ہے کہ......

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

سیاسی مخالفین کو بزور دبانے کا شاہکار کلچر

یہ تو اٹل حقیقت ہے کہ کوئی بھی حکومت چاہے وہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئی ہو یا کسی ماورائے آئین اقدام کے تحت اقتدار پر براجمان ہوئی ہو اپنے خلاف کسی تحریک یا احتجاج کو برداشت نہیں کر سکتی چنانچہ حکومت مخالف کسی تحریک کو ریاستی اتھارٹی اور حکومتی انتظامی مشینری کے زور پر دبانا ہماری حکومتوں کا خاصہ رہا ہے۔ دانشمندی کا تقاضا تو یہی ہوتا ہے کہ اول تو بہتر گورننس کی بنیاد پر کسی حکومت مخالف تحریک کی نوبت ہی نہ آنے دی جائے اور اگر سوسائٹی کا کوئی طبقہ بشمول اپوزیشن کسی ایشو کو بنیاد بنا کر حکومت کیخلاف احتجاج کیلئے سڑکوں پر آتا ہے تو اسکے ساتھ ڈائیلاگ کا راستہ کھول کر مطالبات جائز ہوں تو منظور کر کے اور عملی اقدامات اٹھا کر احتجاجی طبقے یا طبقات کو مطمئن کر دیا جائے تاہم اس کیلئے معاملہ فہمی، تحمل، برداشت اور عقل و خرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے سیاسی کلچر میں آج تک حکومتی اور اپوزیشن دونوں سطحوں پر معاملہ فہمی اور برداشت کا فقدان ہی رہا ہے اور بالخصوص حکمران طبقات کی تو ریاستی طاقت کی تقویت حاصل ہونے پر معاملہ فہمی والی آنکھیں بند ہی ہو جاتی ہیں اس لئے ہمارے سیاسی کلچر میں جمہوری اقدار کبھی مستحکم نہیں ہو پائیں۔

اپنے مخالفین کو دبا کر رکھنا مطلق العنان حکمرانوں کی تو مجبوری ہوتی ہے کہ انکی جڑیں عوام میں موجود نہیں ہوتیں مگر کسی منتخب سول حکمرانی میں بھی مخالفین کو دبانے کیلئے مطلق العنان حکمرانوں والی پالیسیاں اختیار کی جائیں اور سلطانی جمہور کے ثمرات سے عوام کو محروم بھی رکھا جائے تو اسے بالآخر حکومت مخالف عوامی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو کسی مرحلے پر تشدد کا راستہ بھی اختیار کر سکتی ہیں۔ میں نے بطور پولیٹیکل اور کورٹ رپورٹر اپنے صحافتی فرائض کی انجام دہی کے دوران

سول اور جرنیلی آمروں کیخلاف اٹھنے والی متعدد عوامی تحریکوں کا مشاہدہ بھی کیا ہوا ہے' ان تحریکوں کے پس منظر سے آگاہی کیلئے بھی سر پھٹول کرتا رہا ہوں اور ان تحریکوں کے انجام کی بھی تھوڑی بہت خبر رکھتا ہوں۔ کچھ تحریکیں تو جسمانی تشدد اور قید و بند کی صورت میں میں نے بھگتی بھی ہوئی ہیں اور کچھ تحریکوں میں موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتا ہوا بھی دیکھا ہے۔ بھٹو مرحوم کی سول آمریت کا میں نے نوعمری میں مشاہدہ کیا جس کیخلاف بالآخر قومی اتحاد کی 9 ستاروں والی تحریک ابھری جس نے بھٹو حکومت کی پرتشدد پالیسیوں کے باعث تشدد کا راستہ اختیار کیا چنانچہ بھٹو مرحوم کو انتخابات کے انعقاد کا مرحلہ طے کرنے کے باوجود ضیاء الحق کے مارشل لاء کے ذریعے گھر اور پھر عالم بالا میں جانا پڑا۔ اس تحریک کو دبانے کیلئے ریاستی' انتظامی مشینری کا بے مہابا استعمال کیا گیا۔ حکومتی ذاتی فورس ایف ایس ایف کو بھی بروئے کار لایا گیا اور احتجاجی خواتین کو دبانے کیلئے ''نتھ فورس'' کے جلوے بھی دکھا دیئے گئے۔

اس تحریک کے دوران میں 23 مارچ 1977ء کو مشتعل پولیس کے ہتھے چڑھا جو چوک لاہور ہائیکورٹ سے ائرمارشل اصغر خان کی زیر قیادت برآمد ہونیوالے پی این اے کے جلوس کو عملاً کچلنے کیلئے ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھی۔ میں اس وقت روزنامہ وفاق کیلئے فرائض سرانجام دے رہا تھا کہ پولیس کے ایک مشتعل دستے نے میرے سر پر بندوقوں کی سنگینیں تان کر مجھے حراست میں لیا اور پھر جسمانی تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے مجھے پولیس وین میں دھکیل دیا جس میں اے این پی کے لیڈر راؤ مہروز اختر کے صاحبزادے مسعود اختر پہلے ہی خون میں لت پت پڑے تھے' اسی طرح پی این اے کے تشدد زدہ متعدد دوسرے کارکن بھی پولیس وین میں بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ہمیں راستے بھر مزید تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے پولیس تھانہ سول لائنز لے جایا گیا جہاں حوالات میں ڈال کر رات بھر کھڑا کر کے جگائے رکھا گیا اور اگلے روز ہمیں کیمپ جیل منتقل کر دیا گیا۔ اس ریاستی دہشت گردی میں میرا صحافی ہونا بھی میرے کسی کام نہ آیا اور مجھے گھیراؤ' جلاؤ' بلوے' قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے سنگین جرائم والے اٹھارہ مقدمات میں ملزم نامزد کر دیا گیا۔ جیل کے اندر سیاسی کارکنوں اور قائدین کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا وہ ایک الگ داستان ہے۔ تقریباً

ایک ماہ جیل میں گلنے سڑنے کے بعد مجھے پی این اے کی لیگل ٹیم کے ذریعے ضمانت پر رہائی نصیب ہوئی۔ اس واقعہ کے 44 سال گزرنے کے بعد بھی مجھے اپنے خلاف درج مقدمات کے بارے میں علم نہیں ہو سکا کہ وہ ابھی تک فائلوں میں موجود ہیں یا داخل دفتر ہو چکے ہیں۔ میں جمہوریت کی عملداری اور آئین و قانون کی حکمرانی کیلئے ہمیشہ فکرمند رہتا ہوں مگر جب بھی اپنی گرفتاری اور پولیس تشدد کا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے تو میرا دماغ گڑبڑانے لگتا ہے۔

پھر ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران مسلسل سات سال تک میں نے سیاسی کارکنوں کو ریاستی طاقت کے زور پر دبانے کے واقعات کا عملی مشاہدہ کیا ہے کیونکہ ایم آر ڈی کی تحریک کی کوریج میری صحافتی ذمہ داریوں کا حصّہ تھی۔ اس تحریک کے دوران بھی میں کئی بار خود ریاستی تشدد اور پولیس لاٹھی چارج کی زد میں آیا۔ ایک بار تو دیال سنگھ مینشن کے پاس حکومتی حاشیہ برداروں نے ایم آر ڈی کے جلوس پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ چنانچہ ایم آر ڈی کے قائدین، کارکن اور صحافی پناہ لینے کیلئے دیال سنگھ مینشن کی بالائی منزل پر گئے تو حملہ آوروں نے لکڑیوں کو آگ لگا کر ہماری جانب پھینکنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ پتھراؤ بھی کرتے رہے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اور پھر بیرون لوہاری گیٹ کا وہ منظر تو آج بھی تصور میں آ کر میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے جب پولیس نے ایم آر ڈی کے کارکنوں پر سیدھے فائر کئے جس کے نتیجہ میں ایم آر ڈی کے 20 کارکن موقع پر ہی شہید ہوئے۔ ایک گولی میرے سر کے عین اوپر سے گزری مگر خدا نے محفوظ رکھا۔

بدقسمتی سے برسر اقتدار طبقات کی اپنے مخالفین کو ریاستی اختیارات و وسائل کے ذریعے دبانے کی سوچ آج بھی غالب نظر آتی ہے اور جب یہ سوچ کسی منتخب سول جمہوری حکمران کی جانب سے بروئے کار لائی جاتی ہے تو میرے مشاہدے کے مطابق اس سے جمہوریت پر ہی زد پڑتی ہے اور پھر جمہوریت کے ساتھ یہ نوبت لانے والے ہمارے سیاسی قائدین بحالیٔ جمہوریت کے نعرے لگاتے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس ناطے سے مجھے کراچی میں گزشتہ

پانچ روز سے رونما ہونیوالے سانحات درسانحات پر سخت تشویش ہے کیونکہ ایک منتخب سول حکومت کے دور میں ریاستی طاقت کے استعمال کے بارے میں ماضی سے بھی بڑھ کر کچھ انہونیاں ہو رہی ہیں۔ایک انہونی آئی جی پولیس سندھ کو انکے گھر سے باقاعدہ اغواء کر کے ان سے اپنی مرضی کے مقاصد پورے کرنیوالی ہوئی۔دوسری انہونی کراچی کے کے ایک ہوٹل میں گھس کر اور ہوٹل کے کمرے کا دروازہ توڑ کر مریم نواز کی موجودگی میں انکے شوہر کیپٹن (ر) صفدر کی گرفتاری کی صورت میں دکھائی گئی اور تیسری انہونی سیاست میں اسٹیبلشمنٹ کے عمل دخل کے مخالف پیپلز پارٹی کے قائد بلاول بھٹو زرداری کی جانب سے آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ سے متذکرہ دونوں واقعات کے معاملہ میں انکوائری کی باقاعدہ درخواست کر کے سامنے لائی گئی۔اب آرمی چیف نے انکی درخواست پر کور کمانڈر کراچی کے ذریعے انکوائری کا حکم دیا ہے تو سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکمرانی میں جمہوریت کا مردہ خراب کرنے کا آغاز خود جمہوریت کے ان نام لیواؤں نے ہی کیا ہے۔ انکوائری کیا نتیجہ لاتی اور کیا اثر دکھاتی ہے یقیناً اس کا بھی مشاہدہ ہو جائیگا۔مگر منہ پر ہاتھ پھیر کر اپوزیشن کو چیلنج کرنے اور اپوزیشن لیڈروں سے براسلوک روا رکھنے کے داعی وزیراعظم عمران خان اور انہیں اس دعوے کا ''مسکت'' جواب دینے کیلئے آرمی چیف سے رجوع کرنیوالے جمہوریت کے چیمپئن بلاول بھٹو زرداری جمہوریت پر کوئی افتاد ٹوٹنے کی ذمہ داری سے خود کو کیسے بچائیں گے؟

ہائے ری ہماری توقعات

امریکہ کے چھیالیسویں صدر کو انتقال اقتدار کا مرحلہ طے ہوتے ہوتے ابھی سود و زیاں کے بہت سے مراحل آنے ہیں کیونکہ ٹرمپئی ذہنیت نے بالکل ہمارے ہی انتخابی کلچر کی طرح انتخابی نتائج کی صورت میں سامنے آنیوالی اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ ٹرمپ یہ نتائج قبول کرنے سے انکاری ہیں اور ری پبلکنز کی شمار ہوتی امریکی ریاستوں میں اپنی شکست انہیں بالکل ہضم نہیں ہو رہی۔ وہ ان ریاستوں کی عدالتوں سے لے کر امریکی سپریم کورٹ تک طوفان اٹھانے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں۔ امریکی سینٹ میں ری پبلکنز ہی کو اکثریت حاصل ہوئی ہے جہاں ڈیموکریٹک 48 کے مقابلے میں ری پبلکن پارٹی کے پاس 50 ارکان ہیں اور سینٹ کے سربراہ کے منصب پر بھی ری پبلکن براجمان ہے جس نے ڈیموکریٹ جو بائیڈن کو بطور امریکی صدر قبول کرنے سے پہلے ہی انکار کیا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ امریکی عدالتوں میں انصاف کا بول بالا ہوتا ہے مگر یہ کیا ہے کہ ہمارے ہی کلچر جیسا معاملہ امریکی عدالتوں کے حوالے سے بھی بنا ہوا دکھایا جا رہا ہے اور اسی زعم میں ری پبلکنز داعی نظر آتے ہیں کہ ریاستی عدالتوں سے سپریم کورٹ تک ٹرمپ کے نامزد جج بائیڈن کی جیت انکے منہ پر دے ماریں گے۔ ارے بھائی! اگر امریکہ میں بھی انصاف کا ایسا ہی معاملہ ہے تو ہم امریکی معاشرت میں در آنیوالے شر سے خیر کشید کرنے کا کارنامہ کیسے سرانجام دے پائیں گے۔ ہم تو ایسے سادہ ہیں کہ بلا تحقیق اور بغیر سوچے سمجھے ہر امریکی حکومت سے بے جا توقعات باندھ لیتے ہیں اور جب اچانک ان کا اوچھا وار ہماری جانب جھپٹا مارتا ہے تو ہم سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ہمارے ساتھ ہو کیا گیا ہے۔

ہمیں بالعموم ری پبلکنز پاکستان کے ساتھ پالیسی معاملات میں سخت گیر اور ڈیموکریٹس دلگیر

نظر آتے رہے ہیں مگر وہ امریکی پہلے اور ری پبلکنز یا ڈیموکریٹس بعد میں ہوتے ہیں۔ کوئی ڈیموکریٹ حکمران چاہے ذاتی طور پر ہمارے پلڑے میں اپنا وزن ڈالنے کا خواہش مند بھی ہو مگر وہ امریکی ریاستی مفادات کے آگے پر بھی نہیں مار سکتا۔ گزشتہ 40, 45 سال سے ہم امریکہ کی جانب سے یہی کھیل دیکھ اور بھگت رہے ہیں۔ اگر امریکی ریاستی مفادات ہمارے ساتھ اچھے مراسم استوار کرنے کے متقاضی ہونگے تو ری پبلکن ریگن بھی ہمارے لئے ریشہ خطمی ہوگا اور افغان مجاہدین کو پروٹوکول کے ساتھ وائٹ ہاؤس مدعو کرکے سوویت یونین کیخلاف سرد جنگ میں ہماری معاونت حاصل کرنے کا متمنی رہے گا اور مطلب نکل جانے کے بعد ہمیں بھی لات مار کر باہر نکال پھینکے گا۔ پھر ڈیموکریٹ کلنٹن ہمیں امریکی پالیسیوں میں واپس لانے کا تردد تو نہیں کرتا کہ اسکی حکومت نے بھی امریکی ریاستی مفادات کی ہی پاسداری کرنا ہوتی تھی۔ پھر ری پبلکنز بش نے تو افغان جنگ کے نام پر مسلم دنیا اور عملاً ہمارے ساتھ اعلانیہ کروسیڈ کا آغاز کیا تھا۔ انکے دور کی منافقت ایسی تھی کہ افغان جنگ میں ہمیں فرنٹ لائن اتحادی بنا کر بھی ہمیں گھورتا' ڈانٹتا' ڈراتا رہا اور دہشت گردی کی آگ میں دھکیل کر افغانستان کی طرح ہمارا بھی ''تورابورا'' بنادیا۔

پھر ڈیموکریٹ باراک اوبامہ تو باقاعدہ تبدیلی کا نعرہ لگا کر انتخابی میدان میں اترے۔ ہم نے اس کا مسلمان ہونے کا خاندانی پس منظر بھی ڈھونڈ نکالا اور اسکی جوانی کا کچھ عرصہ گوجرانوالہ اور کراچی میں بسر ہونے اور اس عرصے کے دوران اسکے دوست بننے والے پاکستانی باشندوں کا بھی کھوج لگالیا۔ ہم نے بہت توقع باندھی کہ یہ تو باراک حسین اوبامہ ہے اس لئے ری پبلکنز کی وضع کی گئی ہمارے ساتھ دشمنی کی پالیسی الٹ دیگا تو حضور! کیا ہماری یہ توقعات پوری ہوئیں؟ ہمارے ہمدرد اسی اوبامہ نے ایبٹ آباد اپریشن اور سلالہ چیک پوسٹوں پر امریکی حملوں کے ذریعے ہماری ریاستی خودمختاری کو بٹہ لگایا۔ کلنٹن کی اہلیہ ہلیری انکی کابینہ میں سیکرٹری آف سٹیٹ تھیں جو رعونت کے ساتھ پاکستان کا ہاتھ جھٹک کر بھارت اور افغانستان اڑان بھرتی اور ہمیں افغان ٹرانزٹ ٹریڈ معاہدے میں پھنساتی رہیں۔ پھر امریکی روایت کے مطابق ڈیموکریٹس کی دو ٹرموں کے بعد ری پبلکنز کی باری آئی اور اپنی انتخابی مہم کے دوران بھی مسلم دنیا کا تمسخر اڑانے والے ٹرمپ صدر منتخب ہوئے تو ہماری مزید کمبختی تو آنی ہی آنی تھی' پوری مسلم دنیا بھی ٹرمپئی رعونتوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ ہماری تو فرنٹ لائن اتحادی ہونے کے ناطے دی جانیوالی سول اور فوجی گرانٹ بھی رک گئی اور

بھارت نے فطری امریکی اتحادی کا درجہ پالیا کہ مسلم دنیا اور پاکستان کیخلاف ٹرمپ' مودی ذہنیت کا باہم ملاپ ہو گیا تھا۔

اسی ٹرمپئی دور میں اسرائیل کو ہلہ شیری ملی اور ٹرمپ نے مقبوضہ بیت المقدس کو اعلانیہ اسرائیل کا دارالحکومت بنا کر وہاں امریکی سفارتخانہ منتقل کر دیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھاری اکثریت کے ساتھ ٹرمپ حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی اور فلسطین کا سٹیٹس سلامتی کونسل کی قرارداد کے مطابق بحال کرنے کا تقاضا کیا مگر ٹرمپ نے تن تنہا پوری اقوام متحدہ کو لات ماردی جبکہ کشمیریوں پر جاری مودی سرکار کے مظالم کی بھی بھارت کے ساتھ جنگی دفاعی تعاون کے معاہدے کر کے تائید کی جاتی رہی۔ اسی طرح مسلم دنیا میں پھوٹ بھی ٹرمپئی چالبازی کے ذریعے ہی ڈالی گئی اور پہلی بار اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح استعمال کر کے پوری مسلم دنیا پر دہشت گردوں کا سرپرست ہونے کا لیبل لگا دیا گیا۔ ایک امریکی جریدے نے ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ بھارت کو عالمی نمبرون دہشت گرد قرار دیا مگر ٹرمپ نے جھوٹے منہ کے ساتھ بھی اپنے ملکی جریدے کی اس رپورٹ کی تائید نہ کی۔ اب آئندہ سال جنوری میں ڈیموکریٹ جو بائیڈن کو اقتدار کی منتقلی کی صورت میں انکے اور امریکی منتخب نائب صدر کملا ہیرس کے بالخصوص کشمیر کے حوالے سے سابقہ بیانات کی بنیاد پر امریکہ کی جانب سے پاکستان کیلئے خیر کی توقعات باندھی جارہی ہیں اور ہمیں یاد آ گیا ہے کہ جو بائیڈن کو تو ہم نے انکی نائب صدارت کے دور میں ہلال پاکستان کا امتیازی ایوارڈ بھی دیا ہوا ہے۔ وہ کم از کم اس ایوارڈ کی ہی پاسداری کریگا۔ ارے صاحب! یہ سب سراب ہے۔ ہمارے ساتھ امریکہ نے وہی برتاؤ کرنا ہے جو اسکے مفاد میں ہوگا۔ ابھی سوشل میڈیا پر میں کملا ہیرس کی زیرگردش دو روز قبل کی جوشیلی تقریر کی ویڈیو دیکھ رہا تھا جس میں فلسطین' شام' ایران کے ساتھ امریکی معاملات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنے اس عزم کی گردان کئے جارہی تھیں کہ ہمیں اسرائیل کے ساتھ کھڑا ہونا ہے۔ آپ کشمیر کی حمایت میں اسکے سابقہ بیانات نکالتے کھنگالتے رہیے' وہ اور اسکے ڈیموکریٹ صدر امریکی ریاستی پالیسی کے ساتھ ہی کھڑے ہونگے۔ ہم اس سے کم از کم یہی سبق حاصل کر لیں کہ ہم بھی اپنی ریاستی پالیسی کو عزیز اور مقدم رکھیں۔ پھر کوئی ڈیموکریٹ ہو یا ری پبلکن' ہمارے ساتھ ساجھے داری تو کریگا' بگاڑ ہرگز پیدا نہیں کر سکے گا۔

”پر اجے قیامت نہیں آئی“

کل ایک معروف ٹی وی ٹاک شو میں ایک ماہر فلکیات وارضیات اور ستارہ شناس اپنے حساب کتاب کے ساتھ آئندہ اپریل مئی تک پاکستان میں سیاسی انتشار اور خلفشار کی اندوہناک نقشہ کشی کر رہے تھے۔ ٹاک شو کے میزبان انہیں گھیر گھار کر وزیراعظم عمران خاں کے حال اور مستقبل کا کھوج لگانے کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے مگر ان صاحب کی ستارہ شناسی میں مجموعی افراتفری کے سوا کسی رجائیت پسندی کی جھلک دکھائی نہ دیتی۔ اس ستارہ شناسی میں عمران خاں کا اقتدار تو انہوں نے آئندہ ماہ سے اپریل تک تاریک راہوں میں اُلجھتا، ٹامک ٹوئیاں مارتا دکھا دیا اور پھر اپریل مئی میں نئے انتخابات کا امکان بھی ظاہر کر دیا مگر آگے ملک اور عوام کا مقدر کس کے دستِ قدرت میں آنا ہے۔ اس کی کوئی واضح تصویر دکھانے سے غالباً وہ دانستہ طور پر گریز کرتے رہے۔ بلاول بھٹو زرداری کے بارے میں تو انہوں نے فتویٰ جاری کر دیا کہ ان کی پیدائش جس تاریخ کے جس لمحے میں ہوئی ہے وہ ان کے اقتدار والا لمحہ تھا ہی نہیں بلکہ ان کے لئے مشکلات والا لمحہ تھا اس لئے بالفرضِ محال انہیں اقتدار نصیب ہو بھی گیا تو وہ ان کے برے انجام کا باعث بنے گا۔ میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کے مستقبل کے حوالے سے ان کی ستارہ شناسی شائد خود ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی اس لئے انہوں نے شریف برادران کے حوالے سے خاموشی اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا، شائد اس ٹاک شو کے میزبان کی اپنی بھی یہی حکمت عملی ہوگی اس لئے انہوں نے پورے ٹاک شو میں بس عمران خاں اور بلاول بھٹو کو ہی فوکس کئے رکھا جبکہ مستقبل کے قیافے لگانے والے ستارہ شناس نے قوم میں مایوسی اور نا اُمیدی پھیلانے کے سوا اپنے علم الاعداد کا کوئی مثبت پہلو اجاگر نہ کیا۔

یہ تو معاملہ ہوا محض ٹامک ٹوئیاں مارنے اور ستارہ شناسی کے بل بوتے پر ''ٹیوے'' لگانے کا مگر صاحبو، ذرا زمینی حقائق پر بھی تو نظر ڈالئے۔ اگست 2018ء سے وسط جنوری 2020ء تک عوام پر جو بیت گئی ہے اور انہوں نے جو کچھ بھگت لیا ہے، کیا وہ کسی ستارہ شناس کے علم الاعداد میں ظاہر ہونے والی افراتفری، اضطراب اور انتہاء درجے کی مایوسی سے کچھ کم ہے یا معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ اگر اس عرصے کے دوران ملک میں اجتماعی مایوسی اور کسی دانشور کے بقول آسیب کے سائے حاوی ہوتے نظر آئے ہیں تو یہ اصحابِ اقتدار کے لئے ہی لمحۂ فکریہ ہونا چاہئے۔ ساغر صدیقی کی درویشی نے تو ایسے حالات کا یہ نتیجہ نکال کر اپنے شعر میں سمو دیا تھا کہ۔۔۔۔

جس شہر میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس شہر کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

حضور یہاں تو سہانے مستقبل کے دام فریب کی اسیر ہونے والی رعایا کے اسباب لٹنے کی اخیر ہوگئی ہے۔ ''پر اجے قیامت نہیں آئی''۔ ارے نئے پاکستان کا تو آغاز ہی ضمنی میزانیہ لا کر اور ڈالر کو بلند پروازی کے لئے ''ڈچکر'' مار کر کیا گیا۔ ضمنی میزانیئے میں بڑھائے گئے ٹیکسوں اور روشناس کرائے گئے نئے ٹیکسوں نے خوش فہموں کے رومانٹسزم کو جھنجوڑا اور پھر ڈالر نے جستیں بھرتے ہوئے مہنگائی کے بوتل میں بند جن کو چھلانگ مار کر عوام کے سامنے دیدہ دلیری کے ساتھ پھنکارے مار کر کھڑا ہونے کی ہلہ شیری دے دی سو مہنگائی نے عام عوام کی عملاً مت مار دی ''پر اجے قیامت نہیں آئی''۔ اور پھر قیامت آنے کے آثار تب بھی نظر نہ آئے جب بجلی، گیس، پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں ہر پندھرواڑے اور ماہانہ اضافہ کی سابقین کی روایت کو ثابت قدمی کے ساتھ تھام لیا گیا اور کراہتے، دھاڑیں مارتے عوام کو یہ کچوکے لگانا بھی شعار بنا لیا گیا کہ مہنگائی آگے چل کر مزید بڑھے گی۔ آپ نے گھبرانا نہیں۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق عوام نے صبر کا دامن تھام کر اپنے اچھے مستقبل کی امیدیں ٹوٹنے نہ دیں مگر آئی ایم ایف کے قرضوں اور اس کی تمام شرائط کو سرِ تسلیم خم کر کے قبول کرنے کے چلن نے مہنگائی کو مہمیز لگائی تو عوام کی زندہ درگوری میں کوئی کسر ہی باقی نہ رہی۔ مگر قیامت تو پھر بھی نہ آئی

کہ کرپشن میں لتھڑے سابقین پر قیامت ڈھائی جارہی تھی جن کی نکلتی چیخوں سے عوام کو مسرور و مسحور کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ جب عوام کی حالت اس معاشرے والی بن گئی جہاں رش سے بچنے کے لیے درے مارنے والوں کی تعداد میں اضافہ کی عاجزانہ درخواست کی جاتی ہے تو نئے پاکستان میں چھوٹے موٹے روزگار والوں کو روزگار سے محروم کرنے اور نئے روزگار کے تمام راستے مسدود کرنے کی پالیسی طے ہوگئی۔ ناروا ٹیکسوں نے تاجروں اور کاروباری طبقات کو خوف میں مبتلا کیا تو انہوں نے کاروبار سے ہاتھ کھینچ کر بے روزگاری مزید پھیلا دی۔ بے بس لوگ خودکشیوں اور لوٹ مار کے راستوں پر نکل آئے۔ امن وامان کی فضا پر بھی جن پھر گیا، ''پر اجے قیامت نہیں آئی۔''

اس شاہانہ فضا نے عوام ہی نہیں، حکومتی مخالفین کو بھی محض کیڑے مکوڑوں کا درجہ دے دیا جنہیں کچلنا، مسلنا عالم پناہوں کا دل پشوری مشغلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مہنگائی کے عفریت کے ساتھ ساتھ سرد آہیں بھرنے والے عوام اس شاہانہ مشغلے کی زد میں بھی آتے رہے۔ مگر قیامت تو پھر بھی نہیں آئی۔ حتیٰ کہ ریاستی اداروں کے ساتھ متھا لگانے کا شوق پورا کرتے ہوئے بھی قیامت کو سرعام دعوت دی جانے لگی مگر قیامت گریز پا ہی رہی۔ اب حالت یہ ہے کہ اب نئے نئے بحرانوں کو سیٹیاں اور ششکارے مار کر دعوت دی جارہی ہے اور پورے فہم وادراک کے ساتھ ہر بحران کا سابقین ہی کو ذمہ دار گردانا جارہا ہے۔ ایسی دیدہ دلیریوں سے مجبور و مقہور عوام ہی زچ نہیں ہوئے ،حکومت کی اپنی صفوں میں بھی ''شور محشر'' بپا نظر آرہا ہے۔ حکومتی پارٹی کے ایم این اے سرکاری ملازمتیں سرعام فروخت ہونے کی رہائی دے رہے ہیں اور حکومتی اتحادی وزیراعظم کے نام پر کرپشن کا کاروبار پھیلائے جانے کی نشاندہی کررہے ہیں۔ مگر جناب قیامت تو پھر بھی نہیں آئی۔

اب اقتداری خوداعتمادی میں آٹے کا سنگین بحران در آیا ہے۔ 45 روپے کلو والا آٹا 70 روپے کلو تک جا پہنچا ہے۔ لوگ سیر، پاؤ آٹے کے حصول کی خاطر لمبی قطاریں بنائے کھڑے ہیں۔ سیاپا کررہے ہیں۔ کوس رہے ہیں کہ 29 روپے کلو کے بھاؤ لاکھوں ٹن گندم برآمد کرکے اب وہی گندم سابقین والی پالیسی ہی کی طرح 80,70 روپے کلو کے حساب سے درآمد ہوگی تو کیا پھر

بھی قیامت نہیں آئے گی۔ بابا فرید گنج شکر نے تو روٹی کو دین کا پانچواں رکن قرار دیا ہوا ہے۔

فریدا روٹی میری کاٹھ دی تے لاہون میری بھکھ
جہناں کھاہدیاں چوپڑیاں، گھنے سہن گے دکھ

اور اسی طرح ساحر لدھیانوی نے بھی کوک ماری تھی کہ.....

مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک اطوار کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی

تو بھائی صاحب، کچھ کرلو۔ زمینی حقائق تیور بدل رہے ہیں، تیوڑیاں ڈال رہے ہیں۔ آخر قیامت کب تک ٹالی جائے گی، ستارہ شناسوں کے قیافوں اور ان کی ٹامک ٹوئیوں پر نہ جائیں، یہ جان رکھیں کہ بھوک ساری قدریں ملیامیٹ کر دیا کرتی ہے۔ جب بھوک کا راج ہوگا تو قیامت کیوں نہیں آئے گی۔.....

بھوک بڑھنا ہی بغاوت کا سبب ہے آسی
یہ روائت میری سرکار نہ ڈالی جائے

''افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر''

ماشاءاللہ ہمارے وزیراعظم اتنے معروف ومقبول ہیں کہ سپر پاور کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ بھی انہیں عزیز رکھتے ہیں اور انکی دوستی پر اعلانیہ فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت ڈیووس میں عالمی اقتصادی فورم کے سالانہ عالمی اجتماع کے موقع پر وزیراعظم عمران خاں اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ دوران ملاقات خوشگوار لہجے میں خندہ پیشانی، ناچتی آنکھوں اور دمکتے گالوں کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کرتے ہوئے یوں باہم شیر وشکر نظر آئے جیسے وہ ہمجولی رہے ہوں اور ملاقات کے اس موقع سے باہمی اظہار یکجہتی کیلئے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ ہمجولی باہم ملتے ہیں تو یارانِ طرح دار کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹھٹھہ مذاق کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں کی یادیں بھی تازہ کرتے ہیں۔ مجھے عمران خاں اور ڈونلڈ ٹرمپ کے مابین اقتدار سے پہلے کے بے تکلفانہ تعلقات کے بارے میں تو کوئی علم نہیں ہے البتہ ان کی ڈیووس والی ملاقات انکی دیرینہ بے تکلفانہ دوستی کی ہی عکاسی کررہی تھی۔ مگر اس سے بھی کہیں زیادہ بے تکلفانہ دوستی ٹرمپ کی ہمارے موذی دشمن مودی کے ساتھ ہے تو پھر جناب ''یہ تکلف، یہ تکلّم تیری عادت ہی نہ ہو۔''

ٹرمپ، عمران ملاقات میں یہ تکلف اور تکلّم دوآتشہ اس لئے نظر آیا کہ دوطرفہ تھا اور دونوں کو لاحق اپنے اپنے خطرات کا غم غلط کرنے کیلئے اختیار کیا گیا نظر آتا تھا۔ یقیناً ٹرمپ پر ایسا جملہ بے تکلفی میں ہی کسا جاسکتا ہے کہ اب ہم آپ کی جنگ کبھی نہیں لڑیں گے۔ وزیراعظم عمران خاں کا یہ فقرہ ممکنہ امریکہ ایران جنگ کے حوالے سے تھا، مگر اس فقرے میں انہیں افغان جنگ میں پاکستان کی امریکی فرنٹ لائن اتحادی بننے والی غلطی بھی یاد دلا دی گئی اور ٹرمپ بس کشمیر ایشو پر پاکستان اور بھارت کے مابین ثالث بننے کی پیشکش کا ہی اعادہ کرتے رہ گئے۔ ان کا صرف ایک

ذو معنی فقرہ ان کے ساتھ وزیراعظم عمران کی بے تکلفی پر حاوی ہوسکتا ہے کہ ہم کچھ سرحدوں پر بھی مل کر کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ سرحدیں پاکستان کے ساتھ منسلک ہیں تو ان میں افغانستان اور بھارت کے علاوہ ایران کی سرحدیں بھی شامل ہیں اور سردست امریکہ کا ان سرحدوں کے ساتھ ہی معاملہ ہے۔ اس لئے کھوج لگانے والے جانیں کہ ٹرمپ کے اس فقرے کا کیا مفہوم اور کیا پس منظر ہوسکتا ہے۔ ہمارے وزیراعظم نے تو انہیں دوٹوک باور کرادیا ہے کہ اب ہم کسی کی جنگ نہیں لڑیں گے۔ جب ''کھوجی'' اس فقرے کی تہہ تک پہنچ جائیں گے تو پھر ہمیں بھی اپنے وزیراعظم کے دوٹوک اعلان کے حوالے سے کچھ قیافے لگانے کی سہولت مل جائیگی۔ سردست تو اس بے تکلفانہ ملاقات میں ایک دوسرے کو درون خانہ لاحق جن ممکنہ خطرات اور دکھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کیا گیا ہوگا وہ اتھل پتھل والے خطرات اور ایک جیسی آنچ دینے والے دکھ ہی ہوسکتے ہیں۔ ٹرمپ کو آج امریکی ایوان نمائندگان میں مواخذے کی تحریک کا سامنا ہے جس کیلئے جیوری کے ارکان نے مواخذے کی کارروائی میں مکمل غیر جانبدار رہنے کا حلف اٹھا کر اس کارروائی کا آغاز کیا ہے۔ یہ تحریک عین اس وقت شروع ہوئی ہے جب ٹرمپ کی جانب سے آئندہ نومبر میں ہونیوالے امریکی صدارتی انتخاب میں دوبارہ امیدوار بننے کا عندیہ دیا جاچکا تھا۔ یہ تحریک کب تک چلتی ہے اور اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے' یہ تو بعد کی بات ہے مگر ٹرمپ کے سر پر سنگین خطرات کی تلوار تو ابھی سے لٹک گئی ہے، بے شک ٹرمپ مواخذے کی اس تحریک کو امریکی جمہوریت کے ساتھ بھونڈے مذاق سے تعبیر کر رہے ہیں اور اسے ری پبلکن مخالف ڈیموکریٹس کی سپیکر نینسی پلوسی کی کسی سازش سے تعبیر کر رہے ہیں مگر وہ اس تحریک پر کارروائی روکنے کے تو ہرگز مجاز نہیں۔ اس لئے انہیں اس تحریک کا سامنا بھی کرنا ہوگا اور اس کے نتائج کو قبول بھی کرنا ہوگا۔ ری پبلکن پارٹی کی جانب سے انہیں دوبارہ صدارتی امیدوار بنانے کے فیصلہ کا بھی اس تحریک کے فیصلہ پر ہی انحصار ہے۔ اس لئے ''ہمجولیوں'' کی ملاقات میں ایسے معاملات سود وزیاں پر کوئی بات نہ ہونا ہمجولی ہونے پر شکوک وشبہات لاسکتا ہے۔

ہمارے وزیراعظم کو تو درون خانہ ایسے بے شمار خطرات اور غم لاحق ہیں۔ انکے تمام کے تمام اتحادی اچھل کود کر رہے ہیں۔ ایک اتحادی وفاقی کابینہ سے نکل چکے ہیں اور روٹھے سیاں کو منانے کی تمام کوششیں بھی اکارت جاچکی ہیں۔ بلوچستان والے اتحادی اتنے بدکے ہیں کہ وفاق کو

جھنجوڑتے جھنجوڑتے اب بلوچستان کی مخلوط حکومت کو بھنبھوڑتے نظر آرہے ہیں۔ گزشتہ روز ندیم ملک کے ٹی وی ٹاک شو میں وزیراعلیٰ بلوچستان اور سپیکر بلوچستان اسمبلی باہمی اختلافات کے قصے چھیڑ کر بلوچستان حکومت کیلئے صبح گیا یا شام گیا والی منظر کشی تک جا پہنچے تھے۔ ماضی بعید و قریب کے تجربات تو اس حقیقت کی ہی گواہی دیتے ہیں کہ وفاق کو ہلانے کے لئے پہلے بلوچستان میں اتھل پتھل کیا جاتا ہے۔ تو کیا اب کی بار بھی آغاز بلوچستان سے کیا جا رہا ہے کیونکہ سپیکر بلوچستان کے بقول تو اب وزیراعلیٰ بلوچستان کے خلاف تحریک عدم اعتماد میں سرخروئی ایک دو دن کا معاملہ ہی رہ گیا ہے۔ اور جناب یہ خیبر پی کے والی خالصتاً اپنی حکومت کی جوتیوں میں یکا یک کیوں دال بٹتی نظر آنے لگی ہے۔ اس معاملہ میں میڈیا پر آنے والی تازہ ترین اطلاعات کے مطابق وزیراعلیٰ خیبر پی کے کیخلاف پانچ وزراء اور 20 ارکان اسمبلی نے اپنا گروپ بنالیا ہے اور ان پانچوں وزرا نے وزیراعلیٰ پر کرپشن کے سنگین الزامات عائد کرتے ہوئے وزارت سے مستعفی ہونے کی دھمکی بھی دے دی ہے۔

اور حضور والا! ایسی ہی اتھل پتھل پنجاب میں بھی شروع ہوئی نظر آ رہی ہے۔ کہیں وزیراعلیٰ کے خلاف 20 ارکان کے باغی گروپ کے تذکرے ہو رہے ہیں، کہیں گورنر پنجاب کے ساتھ پندرہ ارکان کے کھڑے ہونے کی باتیں چل رہی ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر حکومتی اتحادی مسلم لیگ (ق) جھٹکے لگا رہی ہے۔ مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین نے تو گزشتہ روز یہ تک باور کرا دیا کہ ان کی پارٹی کا حکومتی پارٹی کے ساتھ نہیں، حکومت کے ساتھ اتحاد ہے اس لئے ہمیں محض اتحادی کی کیٹگری میں شامل نہ کیا جائے۔ اس سے پہلے چودھری مونس الٰہی اور کامل علی آغا کی جانب سے جن تحفظات کا اظہار کیا گیا وہ ''گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو'' کے مصداق ہی نظر آتے تھے۔ اس ماحول میں جب ایک وفاقی وزیر چودھری فواد حسین ''ایک دھکا اور دو'' کے الاپے جانے والے راگ میں اپنی شیریں بیانی بھی شامل کر رہے ہوں تو کھوجیوں کیلئے معاملہ کی اصل تہہ تک پہنچنا کوئی مشکل تو نہیں رہتا۔ تو جناب! وفاق اور تین صوبوں میں پکنے والی اس کھچڑی کے کچھ تو اسباب ہیں۔ اگر ہمارے وزیراعظم کو اپنے ''ہمجولی'' ٹرمپ کے ساتھ بے تکلفی والے ماحول میں اپنے اردگرد منڈلاتے ان خطرات کے تذکرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہوگی تو یہ انکے اعصاب کی مضبوطی کی ہی دلیل ہے۔ مگر زا یئے تو سارے باد مخالف کے موثر

ہونے کی ہی عکاسی کر رہے ہیں۔ گزشتہ کالم میں میں نے ایک ماہر علم الاعداد کی ایک ٹی وی ٹاک شو میں ہونے والی گفتگو کا تذکرہ کیا تھا جو وزیر اعظم کیلئے اپریل مئی تک کی سختیوں کا حساب کتاب لگا رہے تھے۔ آج کے زمینی حقائق تو بہت جلدی وہی نتیجہ نکالتے نظر آ رہے ہیں کہ آج خلق خدا اپنے روٹی روزگار کے گھمبیر مسائل کے آگے مکمل بے بس ہو چکی اور عاجز آئی نظر آتی ہے۔ اگر خلق خدا کی بے بسی آپکی پالیسیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے تو ''افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر''۔ حضور خلق خدا کیلئے کچھ کر لیجئے تو بچت ہے ورنہ کسی کی مقبولیت کا بھرم ٹوٹتے کوئی دیر تو نہیں لگتی۔

''اتنے نہ در بناؤ کہ دیوار گر پڑے''

سوشل میڈیا نے جہاں بہت سی سماجی اور اخلاقی برائیوں کو جنم دیا ہے وہیں سوشل میڈیا عالمی برادری کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے اور ایک دوسرے کے سنجیدہ مسائل سے آگاہی کا ذریعہ بھی بنا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے کی پل پل کی خبر انٹرنیٹ کے ذریعے ہم تک پہنچ جاتی ہے۔ جس سے اپنے معاملات کا موازنہ کرنا اور کتھارسس کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ ان دنوں بھارت کی دہلی سٹیٹ کے انتخابات کی مہم جاری ہے۔ غالباً کل 8- فروری کو پولنگ ہے۔ اس مہم میں دہلی کی حکمران عام آدمی پارٹی تو عوامی ایشوز کو اجاگر کرنے کے معاملہ میں خاصی ''ماٹھی'' نظر آتی ہے اور وزیر اعلیٰ کجریوال خود بہت کم ہی اپنے امیدواروں کے انتخابی جلسوں میں آئے ہیں مگر سابق حکمران کانگرس آئی کی نوجوان قیادت پریانکا اور راہول گاندھی نے انتخابی میدان جمایا ہوا ہے جنہوں نے اپنی توپوں کے دہانے دہلی کی کجریوال سرکار ہی نہیں، بھارت کی مودی سرکار کی جانب بھی پورے زور شور کے ساتھ کھول رکھے ہیں۔

گزشتہ روز سوشل میڈیا پر مجھے دہلی کے ایک انتخابی جلسے کی ویڈیو دیکھنے کا موقع ملا جو میں نے بھارتی کانگرس کی نوجوان قیادت کے اپنی سیاسی قیادتوں کے ساتھ موازنے کیلئے راہول اور پریانکا کی تقاریر سمیت پوری کی پوری دیکھی اور مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ نہرو خاندان کے یہ دونوں نوجوان پارٹی قائدین اپنے ملک اور عوام کے متعلقہ ایشوز کا نہ صرف مکمل ادراک رکھتے ہیں بلکہ ان کا اظہار کیلئے زبان و بیان کا ڈھنگ بھی جانتے ہیں۔ پھکڑ پن سے کام نہیں لیتے۔ عامیانہ زبان استعمال نہیں کرتے۔ اپنی مخالف حکومتوں پر تنقید کے نشتر چلاتے ہیں تو منطق اور دلیل کے ساتھ جبکہ سنجیدگی اور متانت انکے چہروں سے ٹپکتی نظر آتی ہے۔ اس جلسے میں ان دونوں نے ٹھوس اعداد و شمار کے ساتھ نریندر مودی اور کجریوال کے عوام سے کئے گئے وعدوں اور حکومت میں آنے

کے بعدان پر عملدرآمد کا کچا چٹھہ کھولا اور پھر کانگرس آئی کے دور کا انکے ساتھ موازنہ کیا۔
انکی تقاریر سے ہی مجھے بھی یہ مکمل آگاہی ہوئی کہ بھارتی جنتا بھی مودی سرکار کی پیدا کردہ بے روزگاری اور مہنگائی سے عاجز آئی ہوئی ہے جس کی ترجمانی کرتے ہوئے پریانکا اور راہول نے نریندر مودی اور کجریوال کی حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے مہذب لہجے میں خوب درگت بنائی۔ انکے بقول مودی نے اپنے پہلے انتخابات کی مہم کے دوران جنتا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر سال دو کروڑ نوکریاں دینگے مگر آج انکے اقتدار کا چھٹا سال شروع ہو چکا ہے، جنتا کو نوکریاں تو کیا ملتیں، ان کے پہلے موجود روزگار بھی ختم ہو گئے ہیں اور اب یہی مودی انہیں کہہ رہے ہیں کہ انکے پاس کوئی نوکریاں نہیں ہیں، جنتا بھوکی مر رہی ہے، خودکشیوں پر اتر آئی ہے مگر مودی جی انکے اصل ''مدعا'' پر آنے کے بجائے جنتا میں مذہبی بنیادوں پر پھوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ سیکولر بھارت میں ہندو مسلم سکھ عیسائی کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں اور منافرت کی آگ بھڑکا رہے ہیں۔ اقلیتوں کو ہندوستان سے دھکیل رہے ہیں اور پاکستان کیخلاف محاذ گرما رہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اقتصادی مسائل پر مضطرب جنتا کو جنگ و جدل کے راستے دکھا کر اپنے لئے عوامی ہمدردیاں حاصل کرنے کی مفاد پرستانہ سیاست کر رہے ہیں جنہیں ملک اور عوام کے مفادات سے کوئی سروکار نظر نہیں آتا۔

یقیناً آبادی کے تناسب سے انکے انتخابی جلسوں میں بھی ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہیں جو اپنی اپنی پارٹی قیادتوں کا دم بھرتے ہیں اور انکی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں مگر کانگرس آئی کی نوجوان قیادت اپنے ووٹروں کو مخالفین کیخلاف مشتعل کرنے والی تقاریر کے بجائے انکے اصل ''مدعا'' کو فوکس کرتی ہے اور پھر موازنے کیلئے میدان کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ مجھے بھی کانگرس آئی کے اس انتخابی جلسے کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کرنے کا موقع ملا کہ پاکستان اور بھارت کے عوام کے مسائل تو ایک جیسے ہی ہیں اور دونوں ممالک کے حکمرانوں کے لچھن بھی یکساں ہیں۔ آج پاکستان کے عوام غربت، مہنگائی، بے روزگاری کے جس دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں وہ نئے پاکستان والے حکمرانوں کی اقتصادی اور مالی پالیسیوں کا ہی پیدا کردہ ہے جنہوں نے کرپشن، مہنگائی، بے روزگاری سمیت ہر برائی کا ملبہ سابق حکمرانوں پر ڈال کر عوام کو اس دلدل سے نکالنے کے بلند بانگ دعوے کئے۔ عوام کو لاانتہاء ٹیکسوں اور آئی ایم ایف کے شکنجے سے بچانے کی نوید سنائی اور

دشنام طرازی کے کلچر کو فروغ دے کر انتخابی سیاست کا نقشہ ہی بدل ڈالا مگر اقتدار میں آتے ہی عوام کو ریلیف دینے کے معاملہ میں انکے رویے اور لہجے میں بے اعتنائی والی تبدیلی در آئی چنانچہ مودی کی طرح آج ہمارے حکمران بھی عوام کو یہی باور کرا رہے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی نوکریاں موجود نہیں اور نوکریاں دینا تو حکومت کا کام ہی نہیں ہے۔ آج وہی آئی ایم ایف ہے جس کی شرائط کے تابع ہماری معیشت ڈوب رہی ہے اور عوام کے پاؤں میں زنجیر باندھ کر انہیں غربت، مہنگائی، بیروزگاری کے عفریت کے آگے پھینکا جا رہا ہے اور ان کے دماغوں سے خودداری کے کیڑے چن چن کر نکالے جا رہے ہیں۔ یہ تو مودی سرکار اور ہماری تبدیلی سرکار کا کمال کا یکساں ایجنڈا ہے۔ مودی نے اپنے خلاف عوامی اضطراب کا علاج سیکولر بھارت کو جنونی ہندو ریاست میں تبدیل کر کے اور پاکستان کے ساتھ جنگ کا محاذ گرم کر کے نکالا ہے جبکہ ہمارے دبنگ قائد عمران خان نے عوام کی توجہ انکے گوناگوں مسائل سے ہٹانے کیلئے اپوزیشن اور دوسرے تمام حکومتی مخالفین کو ''دھر رگڑا'' کی پالیسی اختیار کی ہے۔ اس پالیسی کے تحت اتنی منافرت پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ حکومت اور اپوزیشن کے لوگ ایک دوسرے کیساتھ ہاتھ ملانے کے بھی روادار نہ ہوں۔

اگر تو اس پالیسی کا نتیجہ سوسائٹی کے سدھار کی صورت میں نکلا ہوتا، فی الواقع کرپشن فری سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا چکی ہوتی اور ریاست مدینہ کے تصور والی فلاحی ریاست کے ثمرات عوام تک انکے گوناگوں مسائل میں ریلیف کی صورت میں پہنچ رہے ہوتے تو لوگ پرانے پاکستان کو بھول کر نئے پاکستان کے ڈنکے بجا رہے ہوتے مگر ریاستی مملکتی معاملات تو سارے سابقین والے ہی چل رہے ہیں اور گورننس کے معاملات میں بھی وہی اک چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے تو جناب پھر کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد۔ آج راہول اور پریانکا بھی مودی سے پرانا بھارت واپس لوٹانے کا تقاضا کر رہے ہیں اور نئے پاکستان نے ہم عوام کو بھی راندہ درگاہ بنا کر پرانے پاکستان کے تقاضے پر مجبور کر دیا ہے۔

اور پھر عوام کو بخوبی یاد تو ہوگا کہ ہمارے قائد عمران خان نے مودی کی دوسری ٹرم کیلئے بھارتی لوک سبھا کے انتخابات میں کامیابی کی بھی اس لئے تمنا کی تھی کہ وہ دوبارہ اقتدار میں آ گئے تو اس سے مسئلہ کشمیر کا حل آسان ہو جائیگا۔ مودی نے دوسری ٹرم کے اقتدار پر آتے ہی مقبوضہ وادی کو

بھارت میں ضم کر کے اور کشمیریوں کو جان لیوا کرفیو کے ذریعے انکے گھروں میں محصور کر کے اور پھر پاکستان کے خلاف سرحدی محاذ گرما کر مسئلہ کشمیر کا جو حل نکالا ہے، کیا ہماری قیادت کو یہی حل مقصود تھا۔ آج پوری دنیا مودی سرکار پر تھوتھو کر رہی ہے اور اس فضا میں ہم بطور قوم یکجہت ہو کر جنونی ہندو کی اس گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور لگا کر اس میں سے کشمیریوں کی آزادی کا راستہ نکال سکتے ہیں مگر ہمیں تو آج بھی بس اپنے مخالفین کو دیوار سے لگانے سے غرض ہے۔ حضور کچھ ملک کی فلاح و بقاء کا سوچ لیجئے۔ عوامی اضطراب کا مداوا انکے روٹی روزگار کے مسائل عملی اقدامات کے ذریعے ختم کر کے کیجئے اور خود کو مودی کی ڈگر پر مت چلائیے۔ عملیت پسندی کی طرف آیئے اور تازہ ہوا کے شوق میں اتنے نہ در بنایئے کہ دیوار گر پڑے۔

آگے آپ کی مرضی ہے

یہ الگ بحث ہے کہ ہمارے ملک میں اغواء برائے قتل اور معصوم بچیوں کے ساتھ ریپ جیسے گھناؤنے جرائم کیوں بڑھ رہے مگر ان جرائم کے سدباب کیلئے کسی ایک مجرم کو بھی سرعام پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر اسے عبرت کی مثال بنا دیا جائے تو ایسی ذہنیت والے دیگر ملزمان کے دلوں میں ضرور خوف کی تریڑیاں پیدا ہوں گی۔ اگر خالق کائنات نے اپنے پیارے نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کئے گئے صحیفۂ آسمانی قرآن مجید میں سراحت کے ساتھ زنا بالجبر کے جرم کو حدود اللہ میں شمار کرتے ہوئے اسکی سزا سنگساری متعین فرمائی تو بلاشبہ اس عبرتناک سزا کا مقصد انسانی اسلامی معاشرے کو ایسے گھناؤنے جرائم سے پاک کرنا تھا مگر ہمیں تو بس سیاست سے سروکار ہے۔ وزیراعظم عمران خاں اپنے اقتدار کے آغاز سے اب تک اس مملکت کو ریاست مدینہ کے قالب میں ڈھالنے کا عزم باندھتے آ رہے ہیں مگر انکی اپنی مالی، اقتصادی، قانونی معاملات کی ٹیمیں ایسے مشورے دیتی اور ایسے اقدامات اٹھاتی نظر آتی ہیں کہ ریاست مدینہ کا تصور اپنے معنی ہی کھو دیتا ہے۔

بے شک ریاست مدینہ کی بنیاد سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی فلاحی معاشرہ کی تشکیل اور احکام خداوندی کی تعمیل کیلئے کتابِ ہدایت قرآن مجید میں وضع کئے گئے قوانین ربانی کی روشنی میں رکھی تھی جبکہ دین اسلام ماضی کی تمام خرافات، سماجی برائیوں اور اخلاق باختگیوں کو ملیامیٹ کر کے غالب ہوا تھا۔ اگر آج عمران خاں ریاست مدینہ کے اسی تصور کی بنیاد پر مملکت خداداد کو خالصتاً اسلامی فلاحی ریاست کے قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس کا آغاز سماجی، معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کے تدارک کیلئے احکام خداوندی کی روشنی میں سخت اقدامات اٹھا کر کرنا ہوگا۔ مگر بدقسمتی سے حکومتی ٹیم اس معاشرے کو اسلامی فلاحی ریاست کے قالب میں ڈھالنے کے تصور سے ہی بدلتی ہے اور اصلاح احوال کی کسی مثبت سوچ پر مروجہ قوانین، عدالتی

فیصلوں اور مغربی کلچر کے حوالے دے کر وہ طوفان اٹھایا جاتا ہے کہ ریاست مدینہ کا تصور کسی کونے کھدرے میں دبکا بیٹھا بھی شرمندہ نظر آتا ہے۔

معصوم بچیوں سے زیادتی اور قتل کے مجرمان کو سرعام پھانسی دینے کی بحث قصور کی زینب کے قتل کیس سے شروع ہوئی تھی اور اس وقت موم بتیوں والی روشن خیال این جی اوز کی خواتین بھی ایسے مجرمان کو سرعام پھانسی کی وکالت کرتی رہیں جبکہ جنرل ضیاء الحق کے کٹر مخالفین بھی اس معاملہ میں ضیاء الحق کی فوجی حکومت میں پپو کے قاتل کو کیمپ جیل کے باہر سرعام پھانسی پر لٹکانے والی عبرت ناک سزا کا حوالہ دے کر زینب اور دوسری بچیوں کے قاتل کیلئے اسی سزا کا تقاضہ کرتے رہے۔ مگر آج ایک حکومتی وزیر مملکت علی محمد کی جانب سے ایسے گھناؤنے جرائم کے مجرمان کو سرعام پھانسی دینے کی قرارداد قومی اسمبلی میں پیش کی گئی جو اکثریت رائے سے منظور بھی ہوگئی تو کئی ''روشن خیال'' حکومتی وزیر مشیر بھی خم ٹھونک کر اس سزا کی مخالفت پر اتر آئے۔ کیا فواد چودھری اور کیا فروغ نسیم، سب اس فکر میں غلطاں نظر آئے کہ سزا کا یہ تصور تو غیر انسانی سزا والا ہے۔ ایک صاحب سپریم کورٹ کا ایک دیرینہ فیصلہ بھی ڈھونڈ لائے جس میں سرعام پھانسی کی سزا کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔ بعض محبان کو ہیگ کنونشن بھی یاد آ گیا جس پر پاکستان نے دستخط کر رکھے ہیں اور اس کی بنیاد پر سرعام پھانسی تو کجا، سزائے موت کی بھی گنجائش نہیں رکھی گئی، تو بھائی صاحب، ہم نے انسانی آزادیوں کے نام پر فروغ پانے والے مغربی کلچر کو اس کی تمام خرافات سمیت ہی اپنانا ہے اور گھناؤنے جرائم کی متعینہ انہی کی سزاؤں کی وکالت کرنی ہے تو وزیراعظم کے ساتھ ایک فکری نشست کر کے انہیں قائل کرلیں کہ وہ ریاست مدینہ کی بات نہ کیا کریں۔ اگر کئی قباحتوں والے مروجہ قوانین کا دامن ہی تھامے رکھنا ہے تو پھر اصلاح احوال کے تصور کو بھی انگڑائی نہیں لینے دینی چاہیئے۔ مروجہ قوانین میں تو یقیناً کسی مجرم کو سرعام پھانسی دینے کی گنجائش نہیں ہے اور سپریم کورٹ نے مروجہ متعلقہ قانون کی بنیاد پر ہی سرعام پھانسی غیر قانونی قرار دی مگر حضور والا! مروجہ قوانین میں تبدیلی کے بغیر آپ اصلاح احوال کی جانب کیسے قدم اٹھا سکتے ہیں اور قانون پارلیمنٹ کے منتخب ایوانوں نے ہی تبدیل یا ختم کرنا ہوتا ہے اور اسکی جگہ نیا قانون وضع کرنا بھی پارلیمان کے دست قدرت میں ہے اس لئے آپ کو تو قومی اسمبلی میں منظور ہونیوالی وزیر مملکت کی قرارداد پر باضابطہ قانون سازی کر کے اس کا کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈالنا چاہیئے چہ جائیکہ آپ اس معاملہ میں پیپلز پارٹی اور دوسری جماعتوں کے اپنے تئیں روشن خیال لیڈران اور ارکان پارلیمنٹ کے

ساتھ کھڑے نظر آئیں، اس حوالے سے تو پیپلز پارٹی کی سینیٹر شیری رحمان اور حکومتی رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر شیریں مزاری ایک ہی صف میں کھڑی نظر آتی ہیں جو معصوم بچیوں سے زیادتی اور ان کے قتل میں ملوث مجرمان کے لئے سرعام پھانسی کی تجویز کردہ سزا کو غیر انسانی سزا ٹھہرا رہی ہیں جبکہ یہ گھناؤنا جرم بذاتِ خود غیر انسانی ہے۔ اور پھر حدود اللہ کے زمرے میں آنے والے جرائم کی کتاب ہدایت میں متعینہ سزاؤں کو غیر انسانی قرار دے کر ہم بھلا کیونکر ریاست مدینہ کے تصور کی وکالت کرسکتے ہیں۔ اگر ان سزاؤں کی منشا معاشرے میں سماجی اور اخلاقی برائیوں کا تدارک ہے تو انکی مخالفت کرنا مشیت ایزدی کی منشاء کی مخالفت کرنا ہے جبکہ مسلمہ حقیقت یہی ہے کہ سخت سزاؤں کے ذریعے مجرمانہ ذہنیت والے لوگوں میں خوف کی فضا پیدا کر کے اور کسی مجرم کو عبرت کا نشان بنا کر ہی معاشرے کو قبیح جرائم سے پاک کیا جاسکتا ہے۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں حدود اللہ کے زمرے میں آنے والے جرائم کی وہی سزا دی جاتی ہے جو حدود اللہ میں متعین ہے۔ چنانچہ وہاں مجرمان کے جرم کی مناسبت سے سر قلم ہوتے ہیں اور قطع یدین ہوتی ہے تو اس سے طاری ہونے والا خوف ایسی ذہنیت والے دوسرے افراد کو ایسے جرائم کی جانب قدم اٹھانے سے یقیناً باز رکھتا ہے۔

ابھی گزشتہ برس ہی ایران میں ایک خاتون سے زیادتی اور اسکے قتل میں ملوث پانچ ملزمان کو چوک میں لا کر سرعام پھانسی پر لٹکایا گیا جو یقیناً اس ذہنیت والے دیگر افراد کیلئے عبرت کا باعث بنا۔ اس کی ویڈیو آج بھی سوشل میڈیا پر زیر گردش ہے اور اسکی مثال دیکر سرعام پھانسی کی سزا معاشرے کو اخلاقی برائیوں اور گھناؤنے جرائم سے پاک کرنے کیلئے وہ حلقے بھی ضروری گردان رہے ہیں جنہیں حدود اللہ کے زمرے میں آنے والے جرائم کی سزائے موت بھی غیر انسانی سزا نظر آتی ہے۔ تو جناب ہم نے فی الواقع اصلاح احوال کرنی ہے اور ریاست مدینہ کے تصور کو عملی قالب میں ڈھالنا ہے تو پھر ہمیں دو عملی سے باہر نکلنا ہوگا۔ جب باضابطہ قانون سازی کر کے معصوم بچوں کے ساتھ زیادتی اور انکے قتل کی سزا سرعام پھانسی کی متعین کر دی جائے گی تو عدالتوں کے فیصلے بھی اس قانون کی روشنی میں ہی آئیں گے۔ آپ دل بڑا کریں اور حدود اللہ کی سزاؤں کے متقاضی جرائم سے معاشرے کو پاک کرنے کیلئے وہی سزائیں قانوناً متعین کر دیں جو خالق کائنات خداوند کریم کی منشاء ہے۔ کفر اور اسلام میں یہی تو ایک امتیاز ہے جو ہر صورت آپ کے کریڈٹ میں آنا چاہئے، آگے آپ کی مرضی۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

بس آگاہ رہیے جناب!

قومی معیشت کے سدھار کے لئے حکومت کی کوششوں اور خود وزیراعظم عمران خاں کی نیک نیتی پر تو مجھے کوئی شک وشبہ نہیں۔ اگر عمران خاں نے 23 سال قبل ''سٹیٹس کو'' توڑنے اور پدرم سلطان بود کی شاہکار موروثی اقتداری سیاست سے ملک اور عوام کو خلاصی دلانے کے لئے سیاست کی خارزار وادی میں قدم رکھا تھا تو یقیناً ان کے پیش نظر ایک واضح نصب العین تھا اور وہ تھا قائد کے پاکستان سے قوم کو سرفراز کرنا جو قائد کی وفات کے بعد ہندو اور انگریز کے ٹوڈی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور مفاد پرست سیاستدانوں نے چھین لیا تھا اور ملک پر وہی استحصالی، طبقاتی نظام مسلط کر دیا تھا جس سے خلاصی کے لئے برصغیر کے مسلمانوں کو قائداعظم کی قیادت میں پرعزم تحریک چلانا پڑی اور بھاری جانی اور مالی قربانیاں دے کر ملک خداداد پاکستان کی شکل میں اپنے لئے ایک الگ خطۂ ارضی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

قائد کے ذہن میں تو یقیناً تعمیر واستحکام پاکستان کا ایک واضح نقشہ موجود تھا جو بلاشبہ ریاست مدینہ جیسی جمہوری، اسلامی، فلاحی ریاست سے مطابقت رکھتا تھا اور اس ریاست کے دستور کی بھی انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہہ کر واضح جھلک دکھا دی تھی کہ ہمارا دستور وہی ہے جو ذات باری تعالیٰ نے کتابِ ہدایت قرآن مجید کی شکل میں پہلے ہی ہمارے لئے گائیڈ لائین کے طور پر نازل فرما دیا ہوا ہے۔ بے شک اسلامی جمہوری فلاحی پاکستان کا مقصد متعصب اور جنونی ہندو سے مذہبی آزادی کا حصول ہی نہیں تھا بلکہ ہندو ساہوکار کے استحصالی اقتصادی نظام سے خلاصی پانا بھی مقصود تھا تاکہ مملکت خداداد کے باسی ہر قسم کے اقتصادی اور معاشی تفکرات سے بے نیاز ہو کر آبرومندی کے ساتھ کاروبار کر سکیں، روزگار اپنا سکیں اور پراعتماد وخوشحال زندگی بسر کر سکیں۔ اگر قائد نے ہندو اور انگریز کی ملی بھگت سے معیشت کو انتہائی کمزور کر کے اور کاٹ پیٹ کر دیئے گئے پاکستان کو دس گیارہ ماہ کے مختصر عرصہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے دکھایا اور جنونی ہندو لیڈرشپ

کے چند ماہ میں ہی پاکستان کے نہ سنبھالے جانے کے باعث واپس ان کی جھولی میں آ گرنے کے خواب چکنا چور کر دیئے تھے تو بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ قیام پاکستان کے بعد مزید کچھ عرصہ حیات رہتے تو اقوام عالم میں ایک آزاد، خود مختار اور خوشحال ملک کی حیثیت سے پاکستان کس بلند مقام تک جا پہنچتا۔

قائد کے بعد تو ہماری تاریخ میں ہزیمتیں ہی ہزیمتیں ہیں۔ اقبال کے خواب والی سلطانی جمہور کو پنپنے نہ دینے کی ہزیمتیں، ماورائے آئین اقدام والوں کی ننگی آمریتوں کی شکل میں مسلط کی گئی ہزیمتیں، اپنوں ہی کی سازشوں سے ملک کے دولخت ہونے کی ہزیمتیں اور پھر ملک کی معیشت کو آئی ایم ایف کے شکنجے میں جکڑوانے کی ہزیمتیں۔ ہماری آزادی، خود مختاری اور آبرومندی کو تو پل پل جھٹکے لگتے رہے ہیں۔ قومی خودداری تو لحہ لحہ رگڑے کھاتی رہی ہے اور اسی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے ہم 70 دہائیوں کا سفر طے کر گئے۔ اسکے دوران عالم پناہ مزید قہر آلود ہوتے رہے۔ عالیجاہ رعایا کو نابود کرنے کے مزید عزم باندھتے رہے اور پھر سلطانی جمہور میں بھی جمہور ہی راندۂ درگاہ بنتے رہے۔ حبیب جالب بے چارہ پکارتا ہی رہ گیا کہ......

کہاں بدلے ہیں دن فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

ملک کے مجبور و مقہور عوام کو تو یقیناً ایسی قیادت کی ضرورت تھی جو ظلم و جبر اور اقتصادی ناہمواریوں والے استحصالی نظام سے انہیں خلاصی دلا کر انہیں قائد کا پاکستان واپس لوٹانے کا چارہ کر سکے۔

آپ اس ساری صورتحال کا جائزہ لیں تو عمران خاں اس حوالے سے خوش قسمت نظر آئیں گے کہ انہوں نے ایک ایسے وقت میں تبدیلی کا بگل بجایا جب استحصالی سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام اور موروثی سیاسی قیادتوں سے نکونک آئے عوام اس سے خلاصی پانے کے راستے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے کرپشن فری سوسائٹی اور نئے پاکستان کا نعرہ لگایا اور اس کیلئے پہلے سے آمادہ عوام نے انہیں لبیک کہتے ہوئے اپنے سہانے سپنوں کی تعبیر بنالیا۔ بے شک عمران خاں نے ریاست

مدینہ والے جمہوری اسلامی فلاحی ریاست کے تصور کو ہی اپنے اقتدار کی بنیاد بنایا اور ''سٹیٹس کو'' والوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے جس میں انہیں دوسرے ریاستی اداروں کو بھی مکمل تائید وحمایت حاصل رہی مگر شائد کہیں پر کوئی ''مینوفیکچرنگ فالٹ'' رہ گیا تھا کہ ریاست مدینہ والے سارے دعوے بس ہوا میں ہی تحلیل ہوتے رہے اور فلاحی ریاست کے تصور میں بندگان خدا عام عوام اقتصادی پسماندگی کی آخری حدوں کو چھوتے خط غربت سے تیزی سے نیچے گرتے رہے۔ عوام پر ٹوٹنے والے اس قہر مزّلت کا پس منظر روٹی، روزگار، غربت مہنگائی کے گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے وہی مسائل ہیں جن سے خلاصی دلانے کا ماٹو لے کر عمران خاں ان کے پاس گئے اور پھر ان کا مینڈیٹ حاصل کر کے اقتدار میں آئے۔ اور جناب! ان سارے مسائل کے گھمبیر ہونے کا پس منظر ہمیں اقتصادی غلامی کے شکنجے میں جکڑنے والی عالمی مالیاتی ادارے (آئی ایم ایف) کی ناروا شرائط ہیں جو آج پہلے سے بھی زیادہ فرمانبرداری کے ساتھ سر تسلیم خم کئے من وعن قبول کی جا رہی ہیں۔

یہ محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ مسلمہ عالمی اور قومی اداروں کی ٹھوس اعداد و شمار کے ساتھ تیار کی جانے والی رپورٹیں کہہ رہی ہیں کہ موجودہ دور کے ایک سال میں مہنگائی نے ساری حدیں عبور کر لی ہیں اور آئندہ سال دو سال میں بھی مہنگائی میں کمی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ اسکے برعکس آئی ایم ایف کی ہر قسط کے عوض نئی شرائط آئیں گی تو ان کی بنیاد پر لگنے والے نئے ٹیکس اور بڑھائی جانیوالی بجلی، گیس، پٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں راندۂ درگاہ عوام کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور کند چھری کے ساتھ ذبح کر کے ان سے وصول کی جائیں گی۔

تو جناب۔ مہنگائی میں کمی لانے کے وزیراعظم عمران خاں کے تفکر و تجسس اور انکے اعلان کردہ اقدامات سے تو زخموں پر پھاہے رکھے جاتے نظر نہیں آ رہے اور گھن چکر ایسا ہے کہ کہیں اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ریلیف دیا جاتا ہے تو اس فارمولے کے لاگو ہونے سے پہلے ہی اس کے ممکنہ ثمرات متعلقہ اشیاء کے نرخوں میں اضافہ کر کے منہا کر لئے جاتے ہیں۔ پھر آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ ریاست مدینہ کے تصور والی فلاحی ریاست پر بھی راندۂ درگاہ عوام کا مان ٹوٹ گیا تو یہ کس انقلاب کی نوید بنے گا اور عالیجاؤں، عالم پناہوں، ناخداؤں اور عیش وطرب میں ڈوبے سارے ''تجمل حسین خانوں'' پر کیا حشر ڈھائے گا، بس آگاہ رہیئے اور بچاؤ کی سبیل کر لیجئے اس وقت سے جب راج کریگی خلق خدا، جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو۔

”مگراس میں لگتی ہے محنت زیادہ“

یہ 26- نومبر 2012ء کا دن تھا جب بھارت کے ایک سابق بیوروکریٹ اروند کجریوال نے اپنے چار ساتھیوں یوگندرایادیو، پرشانت بھوشن، شازیہ علمی اور آنند کمار کے ہمراہ ایک طویل پریس کانفرنس سے خطاب کر کے بھارت کے اصل مسئلہ کرپشن کو اجاگر کیا' اس وقت کی حکمران کانگرس اور کرپشن کی لت میں مبتلا دوسرے حکمران طبقات اور بیوروکریٹس کے لتے لئے اور پھر اس ناسور سے بھارت دیش کو نجات دلانے کے لئے ”عام آدمی پارٹی“ کی تشکیل کا اعلان کیا، ان کی یہ پریس کانفرنس پاکستانی ٹی وی چینلز نے بھی کور کی اور اتفاق سے اس روز کجریوال کی یہ ساری پریس کانفرنس میں نے خود ملاحظہ کی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شخصیت اور باڈی لینگوئج کا بھی مشاہدہ کرتا رہا۔ چونکہ عمران خاں بھی کرپشن فری سوسائٹی کا نعرہ لگا کر پاکستان کے سیاسی میدان کارزار میں داخل ہوئے تھے اور 2012ء میں ان کی سیاست و مقبولیت مقام عروج پر پہنچ چکی تھی اس لئے مجھے کجریوال میں بھی عمران خاں کی جھلک نظر آئی اور یہ احساس بھی شدت سے اجاگر ہوا کہ ایک دوسرے کے دیرینہ دشمن پاکستان اور بھارت کے حکمران طبقات اور بیوروکریٹس نے ایک جیسے ہی انداز حکمرانی کے تحت کرپشن کلچر کو فروغ دیا اور اس مقصد کے لئے اپنے ریاستی اور ادارہ جاتی اختیارات کو استعمال کیا ہے جنہیں اپنے اپنے عوام کو ہر انتخاب کے موقع پر مستقبل کے سہانے سپنے دکھا کر بس بے وقوف بنانا ہی آتا ہے۔ کجریوال نے اپنی پریس کانفرنس میں جس طرح اپنے ملک کے حکمران طبقات کا کچا چٹھہ کھولا، مجھے اس وقت یقین ہو گیا کہ بھارتی عوام موروثی سیاست سے چھٹکارا پانے کے لئے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے 26- نومبر 2012ء کو اپنی پارٹی تشکیل دی اور دسمبر 2013ء کے ریاستی انتخاب میں دہلی کی 70 میں سے 28 نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی۔ یہ ان کے لئے یقیناً خوشبو کی طرح پذیرائی والی

بات تھی کہ اپنی پارٹی کے قیام کے ایک سال کے عرصہ میں وہ دہلی میں حکومت سازی کی پوزیشن پر آ گئے ،حکومت تشکیل دینے کے لئے انہیں 36 نشستوں کی سادہ اکثریت کی ضرورت تھی جس کے لئے انہیں کانگرس آئی کے ساتھ اتحاد کرنا پڑا اور پھر حکومت تشکیل دیتے ہی وہ کرپشن کے تدارک کے لئے اپنا وضع کیا گیا ''لوک پال بل'' منظور کرانے کے لئے دہلی اسمبلی میں سرگرم ہو گئے مگر ان کی اتحادی کانگرس آئی ہی اس بل کے آڑے آئی اور کجریوال کو متذکرہ بل کے ذریعے کرپشن فری سوسائٹی کی تشکیل میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ انہوں نے 28- دسمبر 2013ء کو دہلی کے وزیر اعلیٰ کا حلف لیا تھا اور بل منظور نہ کرا پانے کے باعث اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے وہ 14- فروری 2014ء کو اپنے اقتدار کے صرف 49 روز بعد وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو گئے اور اقتدار چھوڑ کر عوام کے پاس واپس آ گئے۔

کجریوال کی دھان پان سی شخصیت کا جائزہ لیں تو وہ چہرے مہرے اور لب و لہجے سے کسی صورت کروفر والے سیاستدان نظر نہیں آتے۔ انہوں نے عام آدمی پارٹی کی بنیاد رکھتے ہوئے اپنی رونمائی بھی ایک عام انسان کی طرح کرائی۔ سادہ لباس، پاؤں میں قینچی چپل اور عام فہم زبان کا استعمال۔ انہوں نے اپنے اقتدار کے دوران بھی اپنی وضع قطع تبدیل نہیں کی۔ انہیں کبھی کلف لگے کپڑے، اجلے لباس، ڈیزائن دار واسکٹ اور چمکیلے جوتوں کے ساتھ نہیں دیکھا گیا، بالکل عام طبقات کے انسانوں جیسے انسان، کسی رکھ رکھاؤ اور پروٹوکول کی عادت بھی نہیں اپنائی۔ میں نے اپنے تجسس کی بنیاد پر ان کی شخصیت کو گوگل پر کھنگالا تو اکیاون سالہ کجریوال کی شخصیت کی کھلتی ہوئی پرتوں سے میرے لئے اپنے ملک کے روائتی سیاستدانوں کے ساتھ ان کا موازنہ بھی مشکل ہو گیا۔ انہوں نے انڈین ریونیو سروس میں بھی ایک دیانتدار افسر کی شہرت پائی اور اپنے محکمے میں ہی کرپشن کے تدارک کی مہم کا آغاز کیا چنانچہ ان کے بے لوث کام پر 2006ء میں انہیں کیش ایوارڈ رامون سے نوازا گیا۔ انہوں نے اپنے ایوارڈ کی ساری رقم کرپشن فری سوسائٹی کے لئے آگاہی کی مہم چلانے والی این جی او پبلک کاز ریسرچ فاؤنڈیشن کو عطیہ کر دی اور پھر جوائنٹ کمشنر انکم ٹیکس کے منصب سے استعفیٰ دے کر اسی این جی او کے ساتھ کرپشن کے تدارک کی مہم کا ایک کارکن کی حیثیت سے باقاعدہ آغاز کر دیا جو بالآخر 26- نومبر 2012ء کو ''عام آدمی پارٹی'' کی تشکیل پر منتج ہوئی۔

کجریوال نے آٹھ سال کے مختصر عرصہ میں ریاستی انتخابی سیاست میں جو کامیابیاں سمیٹی ہیں اس کا تقابل بھارتی روائتی سیاستدانوں ہی نہیں، دنیا کے کسی بھی دوسرے سیاستدان کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ کرپشن فری سوسائٹی کے اپنے مشن میں ان کا عزم اتنا راسخ اور عوام پر اعتماد اتنا مضبوط ہے کہ انہوں نے اپنی حکومت میں ''لوک پال بل'' منظور نہ ہونے پر اقتدار سے باہر آنے میں ایک لحہ کو بھی توقف نہ کیا اور پھر فروری 2015ء کے ریاستی انتخاب میں تین کروڑ آبادی والے بھارتی وفاقی دارالحکومت دہلی کے عوام نے دہلی اسمبلی کی 70 میں سے 67 نشستوں پر انہیں سرفراز کر دیا چنانچہ 14- فروری 2015ء کو وہ دوبارہ وزیر اعلیٰ منتخب ہو گئے اور انہیں اپنی منشاء کی قانون سازی کے مکمل اختیارات بھی مل گئے۔ یہ اختیارات انہوں نے اپنے مخالفین کو دبانے کے لئے ہرگز استعمال نہیں کئے اور صرف عوام کی فلاح و بہبود کے لئے قانون سازی ان کا مطمعٔ نظر رہا چنانچہ انہوں نے دہلی کے پسماندہ عوام کو اوپر لانے کے لئے مثالی قوانین لاگو کئے۔

یقیناً یہ فلاحی ریاست کا عملی نمونہ ہے کہ دہلی کی ریاست کے عوام کو ماہانہ دوسو یونٹ بجلی، 20 ہزار لٹر پانی، خواتین کے لئے میٹرو بس، سرکاری سکولوں میں بچوں کی تعلیم اور سرکاری ہسپتالوں میں صرف ایمرجنسی نہیں، مکمل طور پر علاج معالجہ کی مفت سہولتیں میسر آئیں۔ یقیناً اس ریاست کے عوام بھی ناشکرے نہیں چنانچہ انہوں نے کجریوال کو سر آنکھوں پر ہی بٹھائے رکھا اور 8- فروری 2020ء کے ریاستی انتخاب میں حکمران بی جے پی اور سابق حکمران کانگرس آئی کے مقابل 70 میں سے عام آدمی پارٹی کو پھر 63 نشستوں پر سرفراز کر دیا۔ چنانچہ آج کجریوال دہلی کی وزارت اعلیٰ کا تیسری بار حلف اٹھا چکے ہیں۔ بے شک وہ ایک بھارتی ریاست کے وزیر اعلیٰ ہیں مگر وہ ریاست بھارت کا وفاقی دارالحکومت ہے جہاں انہی کا سکہ چل رہا ہے تو جناب! یہ ہے فلاحی ریاست تشکیل دینے کا حقیقی جذبہ۔ ہم ان کا کس برتے پر اپنی قیادتوں کے ساتھ موازنہ کریں۔ عمران خاں نے بے شک کرپشن فری سوسائٹی کا نعرہ لگایا اور اس نعرے کی بنیاد پر عوام میں پذیرائی بھی حاصل کر لی۔ انتخابی مہم کے دوران وہ یہ اعلانات بھی کرتے رہے کہ انہیں سہاروں والے اقتدار کی ہرگز ضرورت نہیں۔ انہیں انتخابات میں سنگل میجارٹی حاصل نہ ہوئی تو وہ اپوزیشن میں بیٹھنا قبول کر لیں گے مگر اقتدار کے لئے کسی کا سہارا نہیں لیں گے مگر انتخابات کے بعد انہوں نے محض اقتدار کی خاطر کتنے سہارے لئے؟ جبکہ آج وہی پتے انہیں ہوا دیتے بھی نظر آتے ہیں اور وہ

اقتدار ختم ہونے کے دھڑکے سے ان کا دامن تھامے رکھنا ہی اپنی مجبوری بنائے ہوئے ہیں۔اور پھر فلاحی ریاست والے معاملات کا کیا کہیئے۔عوام پر مہنگائی کے عفریت چھوڑنے میں کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی گئی۔نت نئے ٹیکسوں سے ان کا کچومر نکال دیا گیا ہے اور لاکھوں نئے روزگار نکالنے کے وعدے کرتے کرتے لاکھوں روزگار والوں کو بے روزگار کر دیا گیا ہے۔اس فلاحی مملکت کے وزراء عوام کو باور کراتے ہیں کہ روزگار دینا حکومت کا کام نہیں اور وزیراعظم خود یہ کہہ کر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کرنے کا عندیہ دیتے ہیں کہ سرکاری ملازمت تو آدمی کو سہل پسند اور نکما بنا دیتی ہے۔آج کئی ملیں، فیکٹریاں، کارخانے اور دوسرے کاروباری ادارے حکومتی پالیسیوں کے نتیجہ میں بند ہو کر بے روزگاری کے سونامی لا چکے ہیں اور جو ملازمتیں موجود ہیں وہ بھی قطعی عدم تحفظ کا شکار ہیں۔اسی طرح سرکاری سطح پر تعلیم اور علاج کے معاملات بھی اتنے دگرگوں ہو چکے ہیں کہ اب فلاحی ریاست کا تصور ہی شرمانے لگا ہے۔جناب! کرپشن فری سوسائٹی تشکیل دینی ہے اور ریاست مدینہ والی فلاحی ریاست عملی طور پر بنانی ہے تو آپ کو خود کو کجریوال کے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔آپ اپنے اردگرد کا جائزہ لیں اور پھر کجریوال کے اقتدار کے ساتھ اپنا موازنہ کریں۔سوائے زبانی جمع خرچ کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔آپ کجریوال کے طرز حکمرانی کی عملی مثال بن جائیں، عوام آپ کو بھی قطعی اور اٹل اکثریت سے سرفراز کر دیں گے مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ۔

ٹرمپ، مودی گٹھ جوڑ اور ہماری خوشیاں

نریندر مودی کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام سے شہرت پانے والی بھارتی ریاست گجرات کے سب سے بڑے شہر احمد آباد میں مودی سرکار کی جانب سے ''نمستے ٹرمپ'' کا اہتمام کرنا کوئی معمول کا اور امریکی صدر ٹرمپ کی محض پذیرائی کا اہتمام کرنے کا معاملہ نہیں تھا۔ مودی اس ریاست گجرات کے وزیر اعلیٰ رہے اور مسلمانوں کے خلاف اپنے تعصب کی انتہا کر دی۔ انتہا پسند ہندو تنظیموں راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) اور شیو سینا کے غنڈوں نے مودی کی سرپرستی میں ہی گجرات میں مسلم کش فسادات کا آغاز کیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس ریاست میں گاجر مولی کی طرح کاٹنا ریاستی مودی راج کیلئے فخر کی علامت بن گیا۔ امریکہ نے محض انسانی حقوق کے حوالے سے ان مسلم کش فسادات کا نوٹس لیا اور مودی کے امریکہ میں داخل ہونے پر باضابطہ پابندی لگا دی۔ اب امریکی صدر ٹرمپ کی اسی بھارتی ریاست میں پذیرائی کرا کے درحقیقت دنیا کو یہ پیغام دیا گیا کہ ہمارا تو مسلم دشمنی کا ایجنڈا ہی مشترکہ ہے۔ یقیناً اس پیغام کو ہی مؤثر اور ٹھوس بنانے کیلئے ٹرمپ نے احمد آباد کی جلسہ گاہ میں تقریر کرتے ہوئے بطور خاص ''اسلامی دہشت گردی'' کی اصطلاح استعمال کی جو انہی کی ایجاد کردہ ہے اور امریکی صدر کا منصب سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنے پہلے سٹیٹ آف دی یونین خطاب میں مسلم دنیا پر دہشت گردی کا ملبہ ڈالتے ہوئے ''اسلامی دہشت گردی'' کی اصطلاح ہی استعمال کی تھی اور اس کے تدارک کیلئے مسلم ممالک پر چڑھائی تک کرنے کا بھی عندیہ دے دیا تھا۔ وہ اپنے اس ایجنڈے پر اپنی صدر کی موجودہ ٹرم ختم ہونے تک کاربند ہیں اور امریکی صدر کا اگلا انتخاب بھی اسی ایجنڈے کے تحت لڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ چنانچہ احمد آباد کی جلسہ گاہ کو بھی انہوں نے اپنے مسلم کش ایجنڈے کو پھیلانے کیلئے بطور پلیٹ فارم استعمال کیا اور مبینہ ''اسلامی دہشت گردی'' کو

امریکہ اور بھارت کیلئے سب سے بڑا چیلنج قرار دیکر اسکے تدارک کیلئے اپنی اور مودی کی سوچ اور منصوبہ بندی پر ہم آہنگی کا بھی کھلم کھلا اعلان کر دیا۔

اسی کے تسلسل میں ٹرمپ نے ''اسلامی دہشت گردی'' کے سدباب کیلئے طے کی گئی اپنی حکمت عملی پر عملدرآمد کے حوالے سے پاکستان اور وزیراعظم پاکستان کی بھی تعریف کی اور اپنی آنکھیں نچاتے ہوئے بھارتی وزیراعظم مودی اور جلسہ گاہ میں موجود ہندو کمیونٹی کو باور کرایا کہ پاکستان نے دہشت گردی کے سدباب کیلئے بہت کچھ کیا ہے اور اس بنیاد پر ہماری پاکستان کے ساتھ آئندہ کیلئے بھی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔اسی حوالے سے پاکستان کے ساتھ ہماری دوستی ہے اور وزیراعظم عمران خان بھی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ٹرمپ کے ان الفاظ پر ہمارے بعض حلقوں کی جانب سے خوشی سے جھوم اُٹھنے کا اہتمام کیا گیا اور مودی سرکار پر اس حوالے سے پوائنٹ سکورنگ کی گئی کہ ٹرمپ نے مودی کی موجودگی میں پاکستان اور وزیراعظم پاکستان کی تعریف کی جو ہماری بہت بڑی سفارتی کامیابی ہے جبکہ ٹرمپ کے ان الفاظ پر مودی اور پنڈال میں موجود پاکستان مخالف ہندوؤں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

ارے بھلے لوگو! آپ کو اس ساری ساختہ کہانی پر ٹرمپ، مودی گٹھ جوڑ کی جھلک کیوں نظر نہیں آئی۔آپ ٹرمپ کے اقتدار سنبھالنے سے اب تک کے امریکہ پاکستان تعلقات کے حوالے سے معاملات کا جائزہ لیں۔اسی ٹرمپ نے اپنے اقتدار کے آغاز میں ہی پاکستان کو دہشت گردی کے خاتمہ کے نام پر افغانستان میں شروع کی گئی اپنے مفادات کی جنگ میں ''خلوص دل'' کے ساتھ امریکی اتحادی کا کردار ادا نہ کرنے پر مطعون کیا اور خبردار کرتے ہوئے اس نے ''ڈومور'' کا تقاضا کیا پھر اسی ٹرمپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاکستان کی سول اور فوجی گرانٹ روک لی اور اس پر اقتصادی پابندیاں عائد کرانے کی بھی دھمکی دے ڈالی۔ چنانچہ اس وقت کی حکومت پاکستان ٹرمپ انتظامیہ کے ''ڈومور'' کے تقاضے پر ''نومور'' کا جواب دینے پر مجبور ہوئی اور چین کے ساتھ دفاعی بندھنوں میں بندھنے کا بھی عندیہ دے دیا۔ٹرمپ نے اس کے جواب الجواب میں بھارت کو تھپکی دے کر اسے علاقے کا تھانیدار بنانے کا گرین سگنل دے دیا۔ہمارے مہربانوں کو یقیناً یاد ہوگا کہ بھارت نے اس دور میں پہلی بار پاکستان پر سرجیکل سٹرائیک کی بڑ ماری اور پھر جاسوسی کیلئے اپنا ڈرون بھی ہماری فضائی حدود میں داخل کر دیا جسے پاک فضائیہ نے مار گرایا۔

پھر جناب! پاکستان امریکہ تعلقات میں آنے والی سرد مہری میں برف کیسے پگھلی۔ یہ معاملہ یقیناً عمران خان کے اقتدار میں آنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ جب طالبان کے زیرحراست ایک امریکی خاتون اوراس کے اطالوی شوہر کو بچوں سمیت بازیاب کرا کے امریکہ کے حوالے کیا گیا۔ یہ برف پگھلتے پگھلتے امریکہ کی جانب سے ہمارے لئے ریشہ خطمی تک آ گئی کیونکہ ہم طالبان کے ساتھ امن مذاکرات کے ذریعے امریکہ کو افغان جنگ سے خلاصی دلانے کیلئے یکا یک کارآمد ہو گئے۔ اسی بنیاد پر وزیراعظم عمران خان کو خصوصی پروٹوکول کے ساتھ وائٹ ہاؤس مدعو کیا گیا اور ٹرمپ کی ''ٹرمپی چال'' ان کی وزیراعظم عمران خان کے ساتھ دوستی کے ڈنکے بجانے لگی۔

اب ذرا اس سارے پس منظر کو پیش نظر رکھ کر احمد آباد کے جلسہ میں ٹرمپ کی جانب سے پاکستان اور وزیراعظم پاکستان کیلئے ادا کئے گئے تعریفی توصیفی کلمات کا جائزہ لیں اور اس پر خوشی سے جھومنے والے ہمارے حلقوں سے پوچھیں کہ ٹرمپ نے یہ تعریف کس تناظر میں کی ہے۔

حضور والا! انہوں نے ''اسلامی دہشت گردی'' کے تدارک کیلئے اپنی اور مودی کی ہم آہنگی کا حوالہ دے کر پاکستان کی تعریف کی کہ اس معاملے میں وہ ہمارے ساتھ پہلے ہی بہت تعاون کر رہا ہے۔ سو یہ تعریف تو مبینہ ''اسلامی دہشت گردی'' کے خلاف ٹرمپ، مودی گٹھ جوڑ کے مطابق دہشت گردی کے سدباب کیلئے پاکستان کی جانب سے بہترین کردار ادا کرنے پر کی گئی ہے۔ اس پر بھلا مودی کو اور پاکستان و مسلم دشمن ہندوؤں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ انہوں نے تو ٹرمپ کے ان الفاظ کو اپنے لئے ''آشیرباد'' گردانا اور ان کی تقریر ختم ہوتے ہی دہلی اور دوسرے بھارتی شہروں میں مسلمانوں پر عذاب توڑنے کیلئے کمر کس لی۔

تو بھائی صاحب! دہلی اور دوسرے بھارتی شہروں میں گزشتہ چار روز سے جاری مسلم کش فسادات ٹرمپ کی اس تقریر ہی کا شاخسانہ ہے جس پر اب تک تین درجن کے قریب بھارتی مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹے جا چکے ہیں اور موٹر وہیکلز سمیت ان کی قیمتی جائیدادیں نذرآتش اور تباہ کی جا چکی ہیں۔ حتیٰ کہ مساجد پر چڑھائی بھی اس ہندو جنونیت کیلئے فخر کی علامت بنا دیا گیا ہے اور ہم ہیں کہ بھارتی مسلمانوں پر عذاب مسلط کرنے کا راستہ صاف کرنے والی ٹرمپ کی اس تقریر پر خوشی سے جھومے جا رہے ہیں۔ مودی کو تو ٹرمپ کی اس تقریر سے دہرا فائدہ

حاصل ہوا ہے۔ وہ بھارتی ہندوؤں ہی نہیں امریکیوں کے بھی ہیرو بن گئے ہیں کہ اسلامی دہشت گردی کے تدارک کے ایجنڈا میں ٹرمپ نے مودی کو بھی امریکہ کا حصہ دار بنا دیا ہے۔ پھر ذرا سوچئے، ٹرمپ کی تقریر پر خوشی سے جھومنے والے ہمارے حلقے بھی کیا ٹرمپ کے اس ایجنڈے کے ساتھ ہی کھڑے ہیں؟ مجھے اس معاملے میں اور کوئی سوال نہیں اُٹھانا۔ ہم ٹرمپ کی تقریر پر اپنی سرخوشی پر اپنے دل کو ہی مطمئن کر لیں تو میرے سارے استفسارات کا جواب مل جائے گا۔ ارے صاحب! مودی کی ہندوگردی پر تو خود بھارتی لیڈروں اور عوام کو قائداعظم کا بیان کردہ دوقومی نظریہ پھر سے اُجاگر ہوتا نظر آ رہا ہے مگر ہمیں ٹرمپ، مودی گٹھ جوڑ سے اپنے لئے خوشیوں کا اہتمام کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ کیوں حضور والا کیوں؟

JALALI BOOKS

دوسروں کیلئے بوئے کانٹوں سے اپنی آزمائش

جناب یہ تو ہونا ہی تھا۔ بھاؤ تاؤ کی سیاست ہوگی تو اس میں سود و زیاں پر واویلا کیا معنی رکھتا ہے۔ آپ انہیں ''ان ہاؤس تبدیلی'' کے ڈراوے دے رہے تھے تو آپ کے پارٹی ڈسپلن کو آزمائش میں ڈالنے اور نقب لگانے کا انہیں بھی حق حاصل ہے۔ سو آپ کے آٹھ ارکان پنجاب اسمبلی وزیراعلیٰ پنجاب سے ملاقات کر کے ان کا دم بھرنے لگے۔ آپ اسے سیاسی وفاداریاں خریدنے سے تعبیر کر رہے ہیں اور وہ اسے ایسے کو تیسا گردان رہے ہیں۔ فیاض الحسن چوہان تو اب اس سے بھی آگے کی بڑھک لگا رہے ہیں۔ بھئی راستہ کھل گیا ہے تو آگے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارا سیاسی کلچر تو ایسی بے وفائیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں چھلانگیں لگانے میں بھلا کسی نے کسر چھوڑی بھی ہے۔ ہماری سیاسی تاریخ میں 80ء اور 90ء کی دہائی تو فلور کراسنگ کا شاہکار بنی رہی ہے۔ 1988ء کی اسمبلی کا وہ منظر آج بھی میری نگاہوں کے آگے گھوم رہا ہے جب اس اسمبلی کے انتخابات میں وفاق میں پیپلز پارٹی کے اقتدار کی راہ ہموار ہوگئی اور پنجاب اسمبلی میں بھی دیگر جماعتوں کے مقابلہ میں پیپلز پارٹی اپنے زیادہ ارکان کی بدولت حکومت تشکیل دینے کی پوزیشن میں تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم منتخب ہو چکی تھیں اور پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے لئے انہوں نے سردار فاروق لغاری کو امیدوار نامزد کر دیا تھا۔ انہیں حکومت تشکیل دینے کے لئے اپنی پارٹی کے ارکان کے علاوہ مزید 20 کے قریب ارکان کی ضرورت تھی اور یہ تعداد وہ آزاد ارکان کو ساتھ ملا کر پوری کر سکتے تھے مگر وہ پیپلز پارٹی کی اصولوں کی سیاست کا دامن تھام کر ایف سی سی گلبرگ لاہور والے اپنے گھر کے وسیع و عریض لان میں بس ٹہلتے ہی رہے اور یہ تصور کئے بیٹھے رہے کہ ہم حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہیں تو آزاد ارکان خود ہی پکے ہوئے بیر کی طرح ان کی گود میں آ گریں گے مگر ان کے مدمقابل مسلم لیگ (جونیجو) کے امیدوار میاں نواز شریف اپنی پہلی وزارت

اعلیٰ میں اچھے خاصے سیاسی داؤ پیچ سیکھ چکے تھے۔ انہوں نے چھانگا مانگا میں ہارس ٹریڈنگ کے لئے اصطبل بنا دیا چنانچہ پنجاب اسمبلی میں منتخب ہونے والے سارے آزاد ارکان اس اصطبل میں آ کر جگالی کرنے لگے۔ صرف یہی نہیں، پیپلز پارٹی کے کچھ ارکان بھی اسی اصطبل میں جگالی کرتے نظر آئے اور اس طرح فاروق لغاری کی بنی بنائی پنجاب حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور انہیں اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنا پڑا مگر وہ تو اقتدار کے مزے لوٹنا چاہتے تھے چنانچہ چند ہی ماہ بعد انہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو قائل کر کے پنجاب اسمبلی کی رُکنیت سے استعفیٰ دیا۔ دوبارہ قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور منتخب ہونے کے بعد وفاقی حکومت میں واپڈا کی وزارت کا قلمدان سنبھال لیا۔

جب 88ء کی قومی اسمبلی میں کمبائنڈ اپوزیشن (سی او پی) کی جانب سے محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لائی گئی تو اس وقت پیپلز پارٹی بھی ہارس ٹریڈنگ والے میاں نواز شریف کے داؤ پیچ سیکھ چکی تھی چنانچہ اس پارٹی نے سیاسی اصطبل لگانے کے لئے بھوربن کا انتخاب کیا اور اس طرح محترمہ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک ناکام بنا دی۔ ہارس ٹریڈنگ کی مستحکم ہونے والی اسی روائت کے باعث میاں نواز شریف مسلم لیگ (جونیجو) کو ہائی جیک کرنے میں کامیاب ہوئے اور اس کے غالب ارکان کو اپنی جانب کھینچ کر مسلم لیگ (ن) کی بنیاد رکھ دی۔ پھر 90ء کی اسمبلی میں اس وقت ہارس ٹریڈنگ کا عروج نظر آیا جب صدر غلام اسحاق نے 1993ء میں یہ اسمبلی تحلیل کی اور میاں نواز شریف کو وزارت عظمیٰ سے فارغ کر دیا تاہم پنجاب اسمبلی برقرار رکھی۔ جہاں مسلم لیگ (ن) کے دو تہائی اکثریت والے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کے مقابل اس اسمبلی کے سپیکر میاں منظور وٹو میدان میں آ گئے اور ایسا چھو منتر لگایا کہ سرکاری بنچوں پر بیٹھے ارکان کی غالب اکثریت چھلانگیں مار کر میاں منظور وٹو کے آنگن میں چوکڑیاں بھرنے لگی۔ غلام حیدر وائیں کا تحریک عدم اعتماد میں پٹڑا ہو گیا اور منظور وٹو اسی اسمبلی میں نئے قائد ایوان منتخب ہو گئے۔ بے شک وائیں مرحوم کے ساتھ ڈٹے رہنے والے مسلم لیگ (ن) کے 45,40 ارکان نے ہاؤس میں خوب اودھم مچایا اور سپیکر سعید احمد منہیس کی ڈائس کی جانب کرسیاں تک دے ماریں مگر ہارس ٹریڈنگ نے اپنا رنگ جما کر دکھایا۔

ہارس ٹریڈنگ کے یہ جلوے 96ء کی اسمبلی تک اپنی آب و تاب دکھاتے رہے اور پھر

مشرف آمریت نے مسلم لیگ (ن) کے پتے ہوا میں بکھیر دیئے۔ چنانچہ اس کے کھونٹے پر بیٹھے پکھیرو اُڑ کر مشرف کے سجے سجائے کھونٹے پر آ بیٹھے۔ مشرف نے 2002ء کے انتخابات کے لئے مسلم لیگ (ق) کی تشکیل کے لئے ہلہ شیری دی تو مسلم لیگ (ن) کے سارے نامی گرامی اس کا دامن تھامے نظر آئے۔ یقیناً پیپلز پارٹی کو بھی مارشل لاء ادوار میں اپنی پارٹی کے اندر ایسی ''جلوہ نمائیاں'' بھگتنا پڑی ہیں۔ کبھی پیپلز پارٹی شہید بھٹو کی شکل میں، کبھی پیپلز پارٹی زیڈ اے بی کی شکل میں اور کبھی پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کی شکل میں۔ مگر یہ تمام گروپ پیپلز پارٹی میں کوئی موثر دراڑ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ صرف پیٹریاٹ کو مشرف اقتدار میں شیرینی ملی۔ جب پیپلز پارٹی 2008ء میں دوبارہ اقتدار میں آئی تو اس کے قائد آصف علی زرداری نے آئینی اصلاحات کا بیڑہ اُٹھایا اور 18 ویں آئینی ترمیم کے لئے مسلم لیگ (ن) اے این پی اور دوسری اپوزیشن جماعتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس 18 ویں ترمیم کے مسودے میں آئین کی دفعہ 63 میں بھی شق اے شامل کر کے ہارس ٹریڈنگ کا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی اور اس کے تحت پارٹی ہیڈ کو اختیار دے دیا گیا کہ ان کی پارٹی کا کوئی رکن اپنے پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کرے اور کسی دوسری پارلیمانی پارٹی میں شامل ہو جائے یا اپنی پارٹی کے فیصلوں کے برعکس ہاؤس میں ووٹ دے تو پارٹی ہیڈ اس کے خلاف سپیکر کو درخواست دے کر اس کی اسمبلی کی رکنیت ختم کرا سکتے ہیں۔ مگر ہارس ٹریڈنگ کی چمک نے آگے چل کر اس آئینی شق کو بھی عملاً غیر موثر بنا دیا اور حد تو یہ ہے کہ اصولی سیاست کی بنیاد پر ایک دوسرے کے کٹر مخالف بھی اپنے سیاسی فائدے کے لئے باہم شیر وشکر ہو گئے۔ میاں نواز شریف کے دور کے آخری مراحل میں انہیں جھٹکا لگانا مقصود تھا جو بلوچستان اسمبلی کے ذریعے لگایا گیا اور وزیر اعلیٰ کا پتڑہ کر کے نواز شریف کو ان کی ہارس ٹریڈنگ والی مہارت کا آئینہ دکھا دیا گیا۔ پھر سینیٹ کی 20 خالی نشستوں کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو مسلم لیگ (ن) میں پھر نقب لگ گئی اور ایک دوسرے کی مخالف پیپلز پارٹی اور پی ٹی آئی بلوچستان اسمبلی میں کئے گئے اپنے مشترکہ تجربے کی بنیاد پر سینیٹ میں اپنا چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین لانے میں بھی کامیاب ہو گئی۔

جب اصولوں کی سیاست پر مفاہمت ہوئی تو 2018ء کے انتخابات کے بعد پی ٹی آئی بھی حصول اقتدار کے لئے ہارس ٹریڈنگ والے داؤ پیچ لگانے میں کامیاب ہوئی اور گزشتہ سال

اپوزیشن بشمول مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی نے پی ٹی آئی کو محض نیچا دکھانے کے لئے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین سینیٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تو حیران کن طریقے سے پی ٹی آئی ہاؤس میں واضح طور پر عددی اقلیت میں ہونے کے باوجود یہ تحریک ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ ہارس ٹریڈنگ کی اچھوتی مثال تھی کہ ہاؤس کے اندر مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کے مجموعی 65 سینیٹروں نے ہاتھ اٹھا کر تحریک عدم اعتماد کے حق میں فیصلہ دیا مگر جب خفیہ رائے شماری کے ذریعے ووٹنگ کی نوبت آئی تو چیئرمین سینیٹ صادق سنجرانی کے خلاف پیش ہوئی تحریک عدم اعتماد کے حق میں صرف 47 ووٹ برآمد ہوئے۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کیلئے یہ سیاسی شکست ہی نہیں، خفت کا بھی مقام تھا۔ چنانچہ ان کی پارٹی قیادتوں نے چیئرمین سینٹ کے حق میں ڈیفیکشن کی رونق لگانے والے اپنے ارکان کے خلاف کارروائی کا اعلان کیا۔ ان ارکان کی نشاندہی بھی ہوگئی مگر آج تک ان کے خلاف کارروائی کی نوبت نہیں آسکی۔ تو بھائی صاحب! اگر آپ اس وقت ہی کارروائی کی نوبت لے آتے تو آج آپ کو وزیراعلیٰ پنجاب کے حق میں ڈیفیکٹ کرنے والے اپنے ارکان کی جانب سے ڈیفیکشن کا کوئی خطرہ ہی لاحق نہ ہوتا۔ اب آپ ان کے خلاف کارروائی کا عندیہ دے رہے ہیں تو ذرا سوچ رکھئے کہ آپ کی کارروائی کے نتیجہ میں ان ارکان کی خالی ہونے والی نشستوں پر آپ اپنے بندے منتخب کروانے میں کامیاب بھی ہو پائیں گے یا مزید سبکی آپ کے حصے میں آئے گی۔

پی ٹی آئی اس وقت اپنے اقتدار کے جوبن پر ہے۔ وہ چیئرمین سینیٹ کے خلاف تحریک عدم اعتماد میں آپ کے بندے توڑ سکتی ہے تو ضمنی انتخابات میں بھی یہ کرشمہ دکھا سکتی ہے۔ پھر آپکے پلے کیا رہ جائے گا۔ تو جناب پہلے اپنا کتھارسس کیجئے۔ ملک میں بیٹھ کر سیاست کیجئے۔ اپنے کارکنوں اور عوام کو مطمئن کیجئے اور پھر ڈیفکیشن والوں کو مات دینے کا عزم باندھئے۔ یہ درحقیقت وہی کانٹے ہیں جو آپ دوسروں کیلئے بوتے رہے۔ اب یہ آپکے پاؤں چھیدنے کا باعث بن رہے ہیں۔ اس ظالم، خودغرضانہ سیاست میں اصولوں کی سیاست بھلا کہاں پھلے پھولے گی کہ ہماری سیاست میں اصول نام کی کوئی چیز پنپ ہی نہیں پائی۔

فاضل عدلیہ کا گھر کا معاملہ

ہماری محترم عدلیہ میں جسٹس اقبال حمید الرحمان مجھے آج بھی آئیڈیل جج نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی چیف جسٹس اسلام آباد ہائیکورٹ کے منصب سے استعفیٰ دیا اور خاموشی کے ساتھ گھر روانہ ہو گئے۔ان پر محض یہ الزام تھا کہ انہوں نے بطور چیف جسٹس اسلام آباد ہائیکورٹ اپنے انتظامی اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے اسلام آباد ہائیکورٹ میں قواعد وضوابط کے برعکس تقرریاں کیں۔اگر وہ سپریم جوڈیشل کونسل میں خود پر عائد ہونیوالے الزامات کا دفاع کرتے تو میں یقین کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس میں سرخرو ہوتے کیونکہ وہ اسلام آباد ہائیکورٹ کی تشکیل کے بعد اسکے پہلے چیف جسٹس مقرر ہوئے تھے اور انہوں نے ضرورت کے مطابق عدالت عالیہ کے انتظامی عہدوں پر تقرریاں کی تھیں' اسکے باوجود انہوں نے اپنے دامن پر کوئی ہلکا سا بھی چھینٹا نہ پڑنے دینے کی خاطر اپنے منصب سے سبکدوش ہونا ہی مناسب سمجھا۔

سپریم جوڈیشل کونسل بھی درحقیقت عدلیہ ہی کا حصہ ہے جس کی تشکیل بطور خاص ہائیکورٹس اور سپریم کورٹ کے ججوں کے احتساب اور مواخذہ کیلئے آئین کی دفعہ 209 کے تحت عمل میں لائی گئی ہے اور اسکی شق سات کے تحت واضح کر دیا گیا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کے کسی جج کو سپریم جوڈیشل کونسل کے سوا فارغ کرنے کی کوئی دوسری مجاز اتھارٹی نہیں۔آئین کی دفعہ 209 کی شق آٹھ کے تحت ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے فاضل ججوں کیلئے کوڈ آف کنڈکٹ بھی سپریم جوڈیشل کونسل ہی جاری کرتی ہے۔فاضل ججوں کے احتساب کا یہ ادارہ اس لئے بھی معتبر ہے کہ یہ سپریم کورٹ کے سٹنگ چیف جسٹس کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے دو سینئر ترین فاضل ججوں اور ہائیکورٹوں کے دو سینئر ترین چیف جسٹس صاحبان پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے برادر ججوں کو اپنے احتساب کے اس ادارے پر تو بہرصورت اعتماد ہونا چاہیے جبکہ آئین کی دفعہ 211 کے تحت یہ امر

بھی واضح طور پر متعین کیا جا چکا ہے کہ کسی جج کیخلاف سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی' اسکی رپورٹ اوراس رپورٹ کی بنیاد پر صدر مملکت کی متعلقہ جج کو برطرف یا سرخرو کرنے کی کارروائی کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کی جا سکے گی۔ مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری نے بطور چیف جسٹس سپریم کورٹ عدلیہ کے احتساب کے اس ادارے کو مزید مؤثر اور معتبر بنانے کیلئے کچھ اضافی قواعد و ضوابط بھی مرتب کرا دیئے تھے جن کے تحت کسی عام شہری کے بھی سپریم کورٹ یا ہائیکورٹ کے کسی جج کیخلاف سپریم جوڈیشل کونسل سے رجوع کرنے کا راستہ نکالا گیا۔ آئین کی دفعہ 210 کے تحت سپریم جوڈیشل کونسل کو دفعہ 204 والی توہین عدالت کی کارروائی سمیت سپریم کورٹ کے تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں جبکہ سپریم جوڈیشل کونسل کو کسی جج کو برطرف کرنے کا اختیار صرف دو وجوہ پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ متعلقہ فاضل جج ذہنی یا جسمانی طور پر معذور ہو جائے اور عدالتی فرائض سرانجام دینے کے اہل نہ رہے۔ دوسرا یہ کہ متعلقہ فاضل جج کیخلاف ''مس کنڈکٹ'' کا الزام ثابت ہو جائے۔ یہ الزام ریفرنس کے ذریعے صدر مملکت یا سپریم جوڈیشل کونسل خود بھی اپنے صوابدیدی اختیار کے تحت اعلیٰ عدلیہ کے کسی جج پر عائد کرسکتی ہے۔ میری ناقص رائے میں اعلیٰ عدلیہ کے کسی فاضل جج پر ''مس کنڈکٹ'' کا الزام سپریم جوڈیشل کونسل کے وضع کردہ کوڈ آف کنڈکیٹ کی خلاف ورزی سے متعلّق ہوتا ہے چنانچہ اس کا فیصلہ کرنے کی سپریم جوڈیشل کونسل ہی مجاز اتھارٹی ہے۔

بدقسمتی سے سپریم جوڈیشل کونسل کو بائی پاس کرنے کی روایت بھی انہی جسٹس افتخار محمد چودھری نے ڈالی جنہوں نے اعلیٰ عدلیہ کے کسی جج کو سپریم جوڈیشل کونسل کے کٹہرے میں لانے کا عام شہری کو بھی اختیار دے دیا تھا۔ جب اس وقت کے جرنیلی آمر مشرف نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سے استعفیٰ لینے میں ناکامی کے بعد ان کیخلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس بھجوایا تو وہ کوئی عذر تلاش کرنے کے بجائے اپنے دفاع کیلئے سپریم جوڈیشل کونسل میں پیش ہو گئے تھے مگر انکے وکیل بیرسٹر اعتزاز احسن نے انہیں اس خدشے پر سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کا راستہ دکھایا کہ سپریم جوڈیشل کونسل کے بعض ارکان نے ان کیخلاف فیصلہ دینے کا پہلے ہی ذہن بنا رکھا ہے جو بقول انکے' انکے دلائل کے نوٹس تک نہیں لے رہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرنا یقیناً ماورائے آئین اقدام تھا مگر اس

وقت وکلاء کی عدلیہ بحالی تحریک زوروں پر تھی جس کے سرخیل خود چودھری اعتزاز احسن تھے اس لئے سپریم جوڈیشل کونسل کیخلاف جسٹس افتخار محمد چودھری کی درخواست پر جسٹس خلیل رمدے کی سربراہی میں عدالت عظمیٰ کی فل کورٹ بھی تشکیل دے دی گئی جس نے نہ صرف تکنیکی بنیادوں پر جسٹس افتخار چودھری کیخلاف دائر ریفرنس خارج کر دیا بلکہ عدلیہ کو زیر بار رکھنے والا نظریہ ضرورت بھی سپریم کورٹ کے احاطہ میں دفن کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ عدلیہ میں ایک طرح کا انقلاب تھا جس کی رو میں آئین کی پاسداری کو بھی بہا دیا گیا۔

اب آئین کی دفعہ 211 تو اپنی جگہ موجود ہے جس کے تحت سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کی جا سکتی مگر اس معاملہ میں سپریم کورٹ کی فل کورٹ کا 2007ء والا فیصلہ حاوی ہو گیا ہے اور اسی کا سہارا لے کر اب سپریم کورٹ کے دس رکنی بنچ نے اپنے برادر جج مسٹر جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کیخلاف صدارتی ریفرنس اور اس میں سپریم جوڈیشل کونسل کی جانب سے جاری کیا گیا اظہار وجوہ کا نوٹس کالعدم قرار دیا ہے۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے کہ: WHO WILL JUDGE THE JUDGES۔ تو جناب اب اس عدالتی انقلاب کے آگے بھلا کون پر مار سکتا ہے۔ آئین کی تشریح کی مجاز اتھارٹی بھی سپریم کورٹ ہی ہے۔ ہم ایسوں ویسوں کو اسکی تشریح سے اختلاف یا انکار کی مجال کہاں۔ ہماری اس ''مجال'' کی ٹی تو جسٹس فائز عیسیٰ کیخلاف ریفرنس میں انکی اور وکلاء تنظیموں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن اور پاکستان بار کونسل کی دائر کردہ درخواستوں پر عدالت عظمیٰ کے دس رکنی بنچ کے متفقہ فیصلہ اور اسی بنچ کے سات فاضل ارکان کے اکثریت رائے والے فیصلہ کے مبہم ہونے کا سوال اٹھاتے ہوئے ہی گم ہو جاتی ہے۔ جسٹس فائز عیسیٰ اور انکے اہل خانہ کو عدالت عظمیٰ کے اس متفقہ اور اکثریت رائے والے فیصلہ کی بنیاد پر سود و زیاں کے کن مراحل سے گزرنا پڑیگا' یہ فاضل عدلیہ کا اپنا گھر کا معاملہ ہے۔ ہم اس میں دخل در معقولات یا نا معقولات کرنیوالے بھلا کون ہوتے ہیں۔ بس اپنی ناقص رائے کا اتنا سا اظہار ضرور کروں گا کہ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ اگر اپنے خلاف ریفرنس کا سپریم جوڈیشل کونسل میں ہی دفاع کرتے تو انکے حق میں زیادہ بہتر ہوتا۔ شاید وہ آج مکمل سرخرو ہو کر اپنے لئے 2023ء کا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا منصب محفوظ بھی کر چکے ہوتے۔ اب تو انہیں پنجابی زبان کے اس محاورے کے مثل حالات کا سامنا اور مقابلہ کرنا پڑیگا کہ:

''بھجدیاں نُوں ہلوان اِکو جیہا''

’’بھول کس سے ہوئی ہے‘‘

عوام پر گرایا جانیوالا پٹرول بم اتنا ناروا ہے کہ خود حکومتی ذمہ داران کیلئے اس فیصلے کا دفاع کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وزیراعظم عمران خان کو پٹرول کے نرخوں میں 25 روپے فی لٹر اضافہ کا مشورہ دینے اور انہیں اس پر قائل کرنیوالے مالیاتی ایڈوائزر ندیم بابر بھی اب یہ کہہ کر تپلی گلی سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میرا کام تو حکومت کو محض مشورہ دینا ہے‘ یہ حکومت کا اختیار ہے کہ وہ اس مشورے پر عمل کرے یا نہ کرے۔ جب وہ یہ بات وفاقی وزیر عمر ایوب کے ساتھ بیٹھ کر پریس کانفرنس میں کر رہے تھے تو مجھے وزیراعظم کے حسن انتخاب پر افسوس ہو رہا تھا کیونکہ ندیم بابر تو اپنے پاؤں پر کھڑے نظر ہی نہیں آ رہے تھے حالانکہ ’’اندر‘‘ کی کہانیوں کے مطابق ان صاحب نے یہ کہہ کر وزیراعظم کو پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں فوری طور پر 25 روپے تک فی لٹر اضافہ کرنے پر قائل کیا تھا کہ اگر قیمتیں بڑھانے کا فیصلہ یکم جولائی کو کیا گیا تو پھر یہ نرخ 32 روپے فی لٹر تک بڑھانا پڑینگے۔ وزیراعظم کی ٹیم اسی بنیاد پر پٹرولیم نرخوں میں اضافے کے فیصلہ کا جیسے تیسے دفاع کرتی رہی مگر جب اس اضافہ کی ذمہ داری قبول کرنے کا مرحلہ آیا تو وزیراعظم کے مالیاتی ایڈوائزر اپنی بچھائی گئی بساط سے خود ہی دبے پاؤں باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈتے نظر آئے۔ ایسے میں اپوزیشن کی تنقید پر اسے وفاقی وزیر فواد چودھری کا یہی جواب دینا بنتا تھا کہ ہم سے تو 25 روپے اضافہ کا دفاع نہیں ہو رہا‘ آپ اپنے قائدین کی اربوں کی کرپشن کا نہ جانے کیسے دفاع کر لیتے ہیں۔

آج حکومتی ٹیم کو مافیاز کو سہولت اور ایک چٹکی میں اربوں کا فائدہ پہنچانے کا باعث بننے والے حکومتی فیصلوں کے دفاع کیلئے اپنے ضمیر کو تھپکی دیکر سلانے اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کیلئے

اس عمل میں مکمل مشاق ہونے کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں حکومتی اتحادیوں کا بدکنا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں مگر حکومتی صفوں کے اندر بھی خاصی کھلبلی پیدا ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ قومی اسمبلی میں بجٹ کی منظوری کی سرخروئی حاصل کرنے کیلئے حکومت بالخصوص وزیراعظم عمران خان کو خاصی مشقت کرنا پڑی ہے مگر اعداد وشمار کا حساب کتاب رکھنے والے خواتین وحضرات کی باچھیں کھلی نظر آ رہی ہیں تو بھائی صاحب! معاملات سود و زیاں میں کچھ تو گڑبڑ چل رہی ہے۔ ایسی قیاس کی فضا میں بھی اگر پیپلز پارٹی کے سابق جیالے اور حکمران پی ٹی آئی کے حالیہ ترجمان شوکت بسرا پورے اعتماد کے ساتھ پاؤں باندھ کر پٹرولیم نرخوں میں اضافے کے فیصلہ کا دفاع کر رہے ہیں تو کم از کم انکی اس ادائے بے نیازی پر تو انہیں داد دینا بنتی ہے۔ وہ ایک ٹی وی ٹاک شو میں حکومت کے دفاع کا حق ادا کر رہے تھے تو مجھے اس شعر کی عملی تصویر بنے نظر آ رہے تھے کہ......

جھوٹ کو کیوں جھوٹ جانیں، سچ سمجھ کر بولئے
جھوٹ سے گر کام چلتا ہو تو اکثر بولئے

انہوں نے اسی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے یہ ''دلیل'' دیکر پروگرام کے اینکر اور انکے مہمان مسلم لیگ (ن) کے رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر نثار چیمہ کو بھی حیران و پریشان کر دیا کہ ہم نے تو اس ماہ پٹرول کے نرخ صرف 25 روپے فی لٹر بڑھائے ہیں جبکہ مسلم لیگ (ن) اپنے گزشتہ دور حکومت میں ایک دن میں پٹرول کی قیمت 33 روپے فی لٹر بڑھا چکی ہے۔ چیمہ صاحب نے ان سے اس ''خوش قسمت'' دن کی بابت استفسار کیا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود ایک کاغذ لہراتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ یہ تاریخی دن 31 جولائی 2014ء کا تھا جب حکومت نے پٹرول کی قیمت 75 روپے فی لٹر سے بڑھا کر 108 روپے فی لٹر کر دی تھی۔ بسرا صاحب نے جس اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا اس پر ٹاک شو کے تمام شرکاء شش و پنج میں پڑ گئے۔ اگرچہ ڈاکٹر نثار چیمہ صاحب نے انہیں چیلنج کیا کہ ان کا یہ دعویٰ سچ ثابت ہوا تو وہ سیاست چھوڑ دیں گے تاہم وہ یہ چیلنج دیتے ہوئے بھی غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا نظر آئے۔ ہم تو پٹرولیم نرخوں میں یکدم 25 روپے فی لٹر اضافے کو ہی ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا اضافہ گردان رہے تھے مگر

شوکت بسرا صاحب نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ میں خود انکے اس دعوے پر خاصی دیر تک شش و پنج میں پڑا رہا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ انٹرنیٹ کے ذریعے اسکی تصدیق کر لی جائے چنانچہ میں نے نوائے وقت کی ویب سائٹ پر 2014ء کے ہر پہلی تاریخ کے اخبار کھنگالنا شروع کر دیئے۔ یہ وہ سال ہے جب عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری کی حکومت مخالف دھرنا تحریک عروج پر تھی اور جمہوریت کو ممکنہ ''شب خونی'' سے بچانے کی خاطر حکومت اور اسکے اتحادیوں نے مشترکہ پارلیمنٹ کا اجلاس بلا کر اسے طویل دے رکھا تھا اور پیپلز پارٹی سمیت اپوزیشن جماعتیں بھی اس وقت کی حکمران مسلم لیگ (ن) کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑی تھیں۔ میری حیرت اس بنیاد پر بھی تھی کہ آیا حکومت نے ایسی کٹھن آزمائش کے مراحل میں بھی پٹرولیم نرخوں میں اتنے زیادہ اضافے والا عوام دشمن فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے نیٹ پر یکم اگست 2014ء کا اخبار دیکھا' اس میں پٹرولیم نرخوں میں ردوبدل کے حوالے سے سرے سے کوئی خبر موجود ہی نہیں تھی اور گزشتہ نرخ ہی برقرار رکھے جانے کی چھوٹی سی خبر موجود تھی۔ پھر میں نے یکم جنوری 2014ء سے یکم جنوری 2015ء تک کے نوائے وقت کے تمام شماروں کی نیٹ پر ورق گردانی کی تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ اس پورے سال کے دوران صرف ایک ماہ پٹرول کے نرخوں میں اضافہ ہوا جو محض چند پیسوں کا اضافہ تھا جبکہ زیادہ تر مہینوں میں پٹرولیم مصنوعات کے سابقہ نرخ ہی برقرار رکھے گئے اور دو مہینوں کے دوران نرخ خاطر خواہ کم کیے گئے۔

شوکت بسرا صاحب نے تو بہر حال ٹاک شو میں حکومت کے نامعقول فیصلے کا بھی دفاع کرنے کا حق ادا کر دیا چاہے بعد میں ان کا دعویٰ جھوٹا ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے' جبکہ پٹرولیم نرخوں میں اضافے کا ایسا ہی دفاع وفاقی وزیر عمر ایوب نے بھی کیا جن کے بقول عالمی مارکیٹ میں پٹرولیم نرخ 112 فیصد بڑھے ہیں۔ ہم نے تو پھر بھی محض 24 فیصد بڑھائے ہیں۔ انہوں نے بھارت' بنگلہ دیش' کوریا' جاپان کا حوالہ دیتے ہوئے لگے ہاتھوں یہ دعویٰ بھی فرما دیا کہ اس خطے میں آج بھی سب سے کم پٹرولیم نرخ پاکستان میں ہیں۔ تو حضور! اس معاملہ میں بھی ہر دعوے کی انٹرنیٹ پر تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اگر عالمی مارکیٹ میں گزشتہ چند ماہ کے دوران پٹرولیم نرخ

112 فیصد بڑھے ہیں تو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر قوم کو یہ بھی بتا دیجئے کہ عالمی مارکیٹ میں کس کم سطح سے پٹرولیم نرخ اٹھنا شروع ہوئے ہیں۔ نیٹ پر سارا گراف موجود ہے۔ بے شک کرونا بحران کے باعث ہی سہی مگر پٹرولیم نرخ تو گرتے گرتے منفی کی سطح پر چلے گئے تھے اور اب اس سطح سے اٹھ کر عالمی مارکیٹ میں پٹرولیم نرخ 40 ڈالر فی بیرل تک پہنچے ہیں جو پٹرولیم کے دس سال پرانے نرخ ہیں جبکہ 26 جون کو پٹرولیم نرخوں میں 25 روپے فی لٹر تک اضافے کرتے وقت عالمی مارکیٹ میں صرف چار ڈالر فی بیرل نرخ بڑھے تھے۔ اب میں پٹرولیم نرخوں کے معاملہ میں بھارت اور بنگلہ دیش کے نرخوں کا حوالہ دوں تو جبیں نیاز کہیں شکن آلودہ نہ ہو جائے۔ حضور! بھارت میں اس وقت 86 روپے فی لٹر اور بنگلہ دیش میں 66 ٹکے فی لٹر پٹرول دستیاب ہے۔ اگر ہم ان نرخوں کا اپنے ملک کی کرنسی کے ساتھ تقابلی جائزہ لینے بیٹھ گئے تو بات کہیں سے کہیں جا پہنچے گی جس میں ڈالر کے مقابلے میں ہمارے ملک کی کرنسی کے ٹکے ٹوکری ہونے کی وجوہات بھی بات سے بتنگڑ بناتی نظر آئیں گی۔ آپ کا تو ماٹو ہی سابقین کی لوٹ مار کے احتساب اور عوام کو انکے پیدا کردہ غربت، مہنگائی، روٹی روزگار کے مسائل میں ریلیف دینے کا تھا۔ اگر اس عہد میں بھی غریبوں کی ہی کمائی لٹ رہی ہے تو جناب فقیر منش شاعر ساغر صدیقی کے معصومانہ استفسار کا تو جواب دے دیجئے کہ......

''بھول کس سے ہوئی ہے''

آ گے آپ خود سمجھدار ہیں

جمہوریت کوئی حرفِ آخر تو نہیں، نہ ہی کوئی صحیفۂ آسمانی ہے کہ اسکے زبر زیر میں بھی کوئی تبدیلی نہ کی جا سکے اور میں تو خود اپنے اس موقف کا گاہے بگاہے اظہار کرتا رہتا ہوں کہ وفاقی پارلیمانی جمہوریت عوام کی حقیقی معنوں میں نمائندگی کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی تو کسی بھی ایسے دوسرے نظام کو اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں جس کے ذریعے سسٹم کے ثمرات حقیقی معنوں میں عوام تک پہنچائے جا سکتے ہوں۔ مگر یہ کام مروجہ آئین اور کسی قاعدے قانون کے مطابق تو ہو نہ......! گڑ بڑ تبھی ہوتی ہے جب سب کچھ تہس نہس کر کے ملک اور سسٹم کو محض اپنی رضا سے چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر میں سسٹم کی بقاء کے حوالے سے فکر مند ہوتا ہوں تو عوام کے نمائندہ آئینی سسٹم کے مقابل ''شہنشاہ و عالیجاہ ذی وقار کی شاہی سواری آتی ہے'' کی سوچ کے پروان چڑھنے پر ہوتا ہوں۔ ارے بھئی، آپ شاہِ معظم'' والے سسٹم کی آئین میں گنجائش پیدا کر لیں یا آئین کو مروجہ طریقِ کار اختیار کر کے اسکے مطابق ڈھال لیں تو پھر اس پر کسی اعتراض کی گنجائش بھی نہیں نکل پائے گی۔ پارلیمانی جمہوری نظام نے راندۂ درگاہ عوام کی سات پشتیں تھوڑی سنوار دی ہیں کہ اسکے بغیر موت و حیات کا مسئلہ بن جائے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی تو جمہوری نظام کے حوالے سے گڑ بڑائے ہی رہے ہیں۔ ایک وقت میں انکی یہ سوچ تھی کہ......

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

یعنی جمہوریت کو انسان کی عقل رسا اور فہم و فراست سے نہیں بلکہ اسے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر اور انسانوں کی محض گنتی کر کے عددی اکثریت کے سہارے مسلط کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس شعر میں جمہوریت کے کسی دل کش تصور کی ہرگز عکاسی نہیں کی مگر پھر انہوں نے یہ کہہ کر

کہ......

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے' مٹا دو

جمہوریت کے ڈنکے بجائے ہیں۔ ارے بھائی صاحب! نئے پاکستان کا تصور اقبال کے اسی شعر کی بنیاد پر ''ہر نقشِ کہن'' کو ملیامیٹ کرنے کے فلسفہ پر ہی پروان چڑھایا گیا اس لئے نئے پاکستان والوں کو تو سلطانی جمہور سب سے زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔ مگر یہ کیا کہ نئے پاکستان میں اقبال کے پہلے فلسفہ کی بنیاد پر جمہوریت کا ''ملکو ٹھپنے'' کی سوچ پروان چڑھائی جاتی نظر آ رہی ہے۔ حضور یہ اسی جمہوریت کا فیض ہے کہ وفاق اور دو صوبوں میں عددی اکثریت نہ ہونے کے باوجود حکومت سازی کے مروجہ طریق کار کو بروئے کار لا کر آپ کے اقتدار کی راہ ہموار کی گئی۔ اگر اسکے بجائے مشرف جیسی یا اس سے پہلے والی جرنیلی آمریت رائج ہوتی تو ان کیلئے ریشہ خطمی ہو کر یا رطب اللسانی کا راستہ اختیار کر کے ہی شہنشاہِ معظم کے اقتدار میں محض ہلکی پھلکی شراکت کی گنجائش ہی نکلوائی جا سکتی تھی۔ خود شہنشاہِ معظم بننے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جنرل مشرف نے خود اپنے ایک انٹرویو میں عمران خان صاحب کی اس سوچ کے حوالے سے جو بھد اڑائی وہ ماورائے آئین اقدام کے تحت جمہوریت کو تاراج کرانے والی سوچ کی پیش بندی کیلئے کافی ہونی چاہیے۔

آپ کے پاس اتنی سیاسی قوت و صلاحیت ہے تو آپ منتخب ایوانوں کے ذریعے آئین کو اپنی سوچ سے مطابقت رکھنے والے سسٹم میں ڈھال لیں۔ آپ بے شک امریکہ جیسے صدارتی نظام کا بھی تجربہ کر سکتے ہیں۔ متناسب نمائندگی والے مخلوط پارلیمانی جمہوری نظام کو بھی رائج کر سکتے ہیں جس میں آپ اپنے بل بوتے پر منتخب ہو کر آئے ہوئے ارکان کی بلیک میلنگ سے بچ سکتے ہیں مگر یہ سب کچھ قاعدے قانون کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ صدارتی نظام کیلئے تو یکسر نیا آئین لانا پڑیگا جو پارلیمانی جمہوری کے بجائے صدارتی جمہوری نظام پر مبنی ہوگا۔ اسی طرح متناسب نمائندگی والے مخلوط سسٹم کیلئے بھی آئینی ترمیم درکار ہوگی جس کیلئے تمام پارلیمانی جماعتیں متفق ہوں تو آرمی چیف کے منصب کی میعاد کے حوالے سے موجودہ ہاؤس میں ہی پلک جھپکتے میں کرائی گئی ترمیم جتنی ہی دیر لگے گی۔

قاعدے قانون کے تحت سسٹم کو چلانے اور چلائے رکھنے کے معاملات تو آپ کے اپنے

ہاتھ میں ہیں۔ اسے اپنے ہاتھ میں ہی رکھیں گے تو سلطانی جمہور کے ثمرات کبھی نہ کبھی جمہور (عوام) تک پہنچ ہی جائینگے مگر آپ ماضی کے تلخ تجربات کی طرح ''میں نہیں تو کوئی بھی نہیں'' کی سوچ کے تحت جمہوریت کا پھلکا اڑانے کیلئے کسی ماورائے آئین اقدام کی دعوت دینگے تو معاف کیجئے! آج کی لاٹ کے محترم سیاست دانوں میں اتنے کون ہیں جو اگلے دس بیس سال تک جبر کے دور کی مزاحمت کا راستہ اختیار کر پائیں گے اور پھر اسکے بعد سلطانی جمہور کی منزل حاصل ہونے کی صورت میں بھی موجودہ قومی سیاسی قائدین میں سے کوئی بقید حیات بھی ہوگا یا نہیں۔ اور بقید حیات ہوگا تو کیا غالب کے اس شعر کے تصور میں نہیں ڈھل چکا ہوگا کہ......

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب

اب عناصر میں اعتدال کہاں

سو حضور! اس سسٹم میں رہتے ہوئے بے شک آپس میں لڑتے بھڑتے رہیے مگر اپنی صفوں میں اس سوچ کی ہرگز حوصلہ افزائی نہ کیجئے کہ عمران خان مائنس ہوئے تو پھر جمہوریت بھی مائنس ہو جائیگی۔ یہ سوچ تو اپنے ہاتھ کاٹ کر انکے حوالے کرنے کے مترادف ہے جنہیں آئین کاغذ کا محض ایک ٹکڑا نظر آتا ہے جسے وہ پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینکنے کے داعی ہوتے ہیں اور ہر نوع کے سیاست دانوں کے بارے میں اس زعم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ''میں جب بھی انگلی سے اشارہ کروں یہ کتوں کی طرح بھاگ کر میرے پاس چلے آئینگے اور میرے تلوے چاٹنے لگیں گے'' ایسی بے توقیری سے تو حضور۔ اسی سسٹم میں لڑ بھڑ کر گزارا کر لینا ہی بھلا ہے۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔

پانچ جولائی کا جواز اور سبق

ابھی ہم دو دن پہلے ہی 43 سال پہلے کے پانچ جولائی کی یادوں سے گزرے ہیں مگر اس دن سے جن لوگوں نے سبق حاصل کرنا ہے وہ آج بھی ایسا ہی ''سعد'' دن طلوع کرنے کی تگ ودو میں نظر آتے ہیں۔ بدقسمتی سے ذاتی مفادات اتنے گہرے ہوگئے ہیں کہ انکی خاطر دوسروں کے ساتھ ساتھ ملک کے نقصان کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ چنانچہ جس پانچ جوائی سے آئندہ کیلئے بچنے کا تردد اور قومی سیاست میں یکسوئی ہونی چاہیے تھی اس پانچ جولائی کو آج بھی اپنے اپنے فائدے اور اپنے اپنے نقصان کے تناظر میں جانچا جارہا ہے۔ ہمارے بھائی اعجاز الحق (فرزندِ ضیاء الحق) خود ایک سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں اور اپنے والد کے انتقال کے بعد سے اب تک قومی سیاست میں اپنا کردار سنبھالے ہوئے ہیں مگر اپنے والد مرحوم کے پانچ جولائی 1977ء کے ''اپریشن فیئر پلے'' کے جواز میں انہیں قومی سیاست اور سیاست دانوں کو رگیدنے اور جمہوریت کا لفظ بطور گالی استعمال کرنے کی ہر کسی کی ''ادا'' بھلی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی قبیل ہمارے آج کے اہل قلم میں بھی موجود ہے جنہیں میاں نواز شریف کیخلاف 12 اکتوبر 1999ء کا ماورائے آئین اقدام تو زہر لگتا ہے اور وہ نواز شریف کے ''ووٹ کو عزت دو'' والے بیانیہ کو بھی نقارۂ حق گردانتے ہیں مگر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حکومت کیخلاف جنرل ضیاء الحق کے پانچ جولائی 1977ء والے ماورائے آئین اقدام کیلئے وہ رطب اللسان نظر آتے ہیں اور اسے ''یوم نجات'' سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ وددود قریشی صاحب نے اپنے گزشتہ روز کے مضمون میں پانچ جولائی 1977ء کے ماورائے آئین اقدام کے ترانے گائے ہیں اس لئے جب تک ہم اپنے ذاتی اور قومی مفادات میں امتیاز نہیں کر پائیں گے تب تک ہماری ذات اور قومی سیاست و ترجیحات میں دو عملی ہمارا خاصہ بنی رہے گی۔

آج ''مائنس ون'' کی شوراشوری میں اس بیانیے والے بھی قومی سیاست کو دھکیل کر تینتالیس سال قبل والے پانچ جولائی کے حالات کی طرف لے جانے کی کوششوں میں ہیں اور ''مائنس ون'' کو اپنے لئے گالی سمجھنے والے تو اب ہاتھوں میں گلدستے لئے اور ''جی آیاں نُوں'' کا ورد کرتے ہوئے پانچ جولائی جیسے ماورائے آئین اقدام کے استقبال کی تیاریاں کرتے نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنے گزشتہ کالم میں اسی تناظر میں وزیرمملکت علی محمد خان کا نام لئے بغیر انکے ان الفاظ پر فکرمندی کا اظہار کیا تھا کہ اگرعمران خان مائنس ہوئے تو پھر جمہوریت بھی مائنس ہوجائیگی۔ آج اسی کابینہ کے ایک معتبر رکن غلام سرور خان (وزیرہوابازی) کے بیان نے مجھے عملاً لرزکھڑا دیا ہے کیونکہ وزیرموصوف نے جمہوریت کو وہی گالی دی ہے جو پانچ جولائی 1977ء کے اقدام کا دفاع کرنیوالے ہمارے معتبرین و معززین اس اقدام کے جواز میں جمہوریت کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ موصوف نے کراچی ایئرکریش کی انکوائری رپورٹ میں ''گل افشانیاں'' کرکے بیرونی دنیا کیلئے پی آئی اے کے ساتھ ساتھ وطن عزیز کو بھی نامعتبر بنایا اوراب وہ مزید گل افشانی یہ کررہے ہیں کہ پی آئی اے اورسٹیل مل 2008ء تک تو منافع میں چل رہی تھیں' ان دونوں کو جمہوریت نے تباہ کیا۔ یعنی مشرف کے ماورائے آئین دوراقتدار تک ان دونوں قومی اداروں میں بھی اور اسی سوچ کے تحت دیگر تمام ملکی اور قومی معاملات میں سب اچھا تھا' بیڑہ غرق تو اسکے بعد آنیوالی جمہوریتوں نے کیا ہے۔ حضوروالا! اسی بیڑہ غرق کرنیوالی جمہوریت کا آپ پھل کھارہے ہیں۔ آپ جس درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہیں اسی کو آرے چلا کر کاٹنے کے درپے ہیں تو ایسا یقیناً ماورائے آئین اقتدار سے بھی شیرینی حاصل کرنے کی راہ ہموار کرنے کیلئے کیا جارہا ہے۔ اگر آج اہل اقتدار کی صفوں میں سے جمہوریت کا پھلکا اڑانے والی سوچ کی بہار لگی ہوئی ہے تو ''مائنس ون'' کے بیانیے کے ذریعے کہیں پرڈوریاں ہلانے کا اہتمام تو نہیں ہورہا ہے۔

جمہوریت کو گالی دے کر راندۂ درگاہ بنانے والی ''پوتر'' سوچ کے پس پردہ محرکات کا اندازہ مجھے اپنے گزشتہ کالم ''آگے آپ خود سمجھدار ہیں'' پر محمد رضوان نامی کسی شخص کی موصولہ ای میل کے ذریعے بخوبی ہوگیا جس میں میرے الفاظ کے چناؤ کی بھی پاسداری نہیں کی گئی اور میری ناکردہ گناہی بھی میرے گناہوں کے کھاتے میں ڈال دی گئی۔ بذریعہ ای میل مجھ سے مخاطب ہونیوالے یہ صاحب پپٹ ہیں یا پپٹ ساز' اس کا بھی مجھے کچھ نہ کچھ اندازہ ہورہا ہے مگر ماورائے

آئین اقدام کے جواز میں انہوں نے جس لب و لہجے میں جمہوریت اور آئین کی بھد اڑائی ہے اس سے باہم درست دگریباں ہمارے آج کے حکومتی اور اپوزیشن قائدین کو جمہوریت کو مائنس کرنے کیلئے پکائی جانیوالی اس کھچڑی کا ادراک ہونا چاہیے جس کا میں نے کسی کی جبینِ نیاز شکن آلود ہونے کا باعث بننے والے اپنے گزشتہ کالم میں بھی تذکرہ کیا تھا۔ ای میل بھجوانے والے صاحب کی دراز زبان ملاحظہ فرمایئے:

''تو بھائی صاحب! آپ یہ بتانا پسند کرینگے کہ بوٹ والوں میں کہاں خرابی ہے۔ اور کیا انسان کے پلید ہاتھوں کا لکھا ناپاک آئین کوئی آسمانی صحیفہ ہے جس کی تکریم تم جیسے لوگ قرآن سے زیادہ کرتے ہو۔ لعنت ایسی جمہوریت اور آئین پر جس سے خلق خدا عذاب میں مبتلا ہو۔ جب پولیس عوام کے پیسے پر پل کر عوام کو جوتے مارے اور ''سیاہ ست دان'' عوام کے پیسے سے تنخواہیں اور مراعات لیں اور عوام کو غلام بنالیں تو ایسے نظام کو بھی آگ لگا دینی چاہیے۔ قرآن میں کہیں نہیں لکھا کہ حکومت سویلین کا کام ہے اور فوج پر حرام ہے۔ یہ تم جیسے مغرب پرستوں کے فلسفے ہیں جس نے خلق خدا کو عذاب میں ڈال رکھا ہے۔''

ای میل بھیجنے والے ان صاحب کو میں مشورہ دوں گا کہ میرے جس کالم پر انہوں نے خامہ فرسائی کی ہے، وہ اس کا ایک بار پھر مطالعہ فرمالیں' ارے میں نے تو خود اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ آئین کے ماتحت رائج پارلیمانی جمہوری نظام کوئی حرف آخر نہیں' نہ صحیفۂ آسمانی ہے کہ اس میں زیر زبر کا بھی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔ میرا تجسس صرف ماورائے آئین اقدام اور اقتدار کے حوالے سے ہے۔ میں تو خود اس سوچ کا حامی و حامل ہوں کہ اگر جمہوری نظام جمہور تک براہ راست اپنے ثمرات نہیں پہنچا پا رہا تو قاعدے قانون کے تحت ایسا کوئی بھی نظام لے آئیں جس سے ملک اور قوم کیلئے بہتری کی گنجائش نکل سکتی ہو۔ مگر اس کیلئے ماورائے آئین اقدام کے بجائے آئینی طریق کار اختیار کرلیں۔ ترکی میں کنعان ایورن کے دور میں آئین کے تحت ہی فوج کی شراکت اقتدار کی گنجائش نکالی گئی تھی۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ ترک صدر رجب طیب اردوان کے موجودہ دور میں اس سوچ کا کیا حشر ہوا مگر ہماری دوطرفہ رطب اللسانی کی فضا تو موجودہ اسمبلی کے ذریعے بھی اسی طرح آئین میں شراکت اقتدار کی گنجائش نکلوا سکتی ہے جیسے آرمی چیف کے منصب کی میعاد پہ پلک جھپکتے میں مفاہمت کرکے آئینی ترمیم منظور کرالی گئی تھی۔ اس طرح جو بھی سسٹم لایا

جائے، کم از کم قاعدے قانون کے مطابق اور آئین کے ماتحت تو لایا جائے۔ اگر یہ آئین صحیفۂ آسمانی ہوتا تو کیا اسکی کسی شق میں ہلکے سے ردوبدل کی گنجائش بھی نکل سکتی تھی۔ آپ آئین کے ذریعے شراکت اقتدار یا مکمل اقتدار کی اجازت لے لیں تو کم از کم یہ اقدام قاعدے قانون کے مطابق تو ہوگا جس کے جواز کیلئے آپ کو اپنے کسی رطب اللسان سے جمہوریت اور آئین کی مٹی پلید کرانے کی ضرورت بھی نہیں پڑیگی۔ میرا تو اتنا سا ہی تجسس ہے کہ مروجہ آئین اور قاعدے قانون سے ماورا کوئی اقدام نہیں ہونا چاہیے۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

دہری شہریت

آ ئین وقانون کی حکمرانی یا جنگل کا معاشرہ؟

اس بارے میں تو بعد میں بحث کرلیں گے کہ دہری شہریت کا حامل کوئی فرد پاکستان میں کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا اور آیا وہ مشیر اور معاون خصوصی جیسے اہم اور حساس منصب پر فائز ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہمیں پاکستان کی شہریت کے حوالے سے سب سے پہلے پاکستان سٹیزن شپ ایکٹ مجریہ 1951ء کو مدنظر رکھنا ہوگا جس کی دفعہ 14 ذیلی دفعہ ایک میں واضح طور پر تعین کردیا گیا ہے کہ پاکستان کا کوئی شہری کسی دوسرے ملک کی شہریت حاصل کرتے ہی پاکستان کی شہریت سے محروم ہو جاتا ہے اور اگر کوئی پاکستان کی شہریت برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اسے پاکستان مشن کی وساطت سے ڈائریکٹر جنرل امیگریشن و پاسپورٹ کو فارم ''ایکس'' پر باقاعدہ ڈیکلریشن دینا ہوگا کہ اس نے دوسرے متعلقہ ملک کی شہریت چھوڑ دی ہے۔ بصورت دیگر اسکی شہریت ختم تصور کی جائیگی۔ اسی طرح ہم نے آئین کی دفعہ پانچ' ذیلی دفعہ ایک کو بھی مدنظر رکھنا ہے جس کے تحت پاکستان کے ہر شہری کیلئے ریاست کا وفادار اور آئین وقانون کا تابع فرمان ہونا لازمی تقاضا گردانا گیا ہے۔

دہری شہریت کا معاملہ عدلیہ میں آج کا نہیں چل رہا' اس حوالے سے اعلیٰ عدلیہ (سپریم کورٹ' ہائیکورٹ) کے بے شمار فیصلے بطور نظیر موجود ہیں جن میں اپنی سہولت کیلئے کوئی تاویل نکالنا واضح حرام ٹھہرائی گئی کسی چیز کو حلال قرار دینے کے ہی مترادف ہوگا۔ آئین کے تحت ریاست کا ہر شہری ریاست کا وفادار اور آئین و قانون کا پابند ہے اور آئین و قانون کی حکمرانی انصاف کی عملداری سے قائم ہوتی ہے۔ پھر جو قد غنیں آئین وقانون اور عدالتی فیصلوں کے ذریعے دہری

شہریت کے حوالے سے لگائی گئی ہیں' ملک کے وفادار شہری ہونے کے ناطے ہمیں انکی تعمیل اور پاسداری کرنی ہے۔ انہی دوٹوک اصولوں کی بنیاد پر ''قائد تحریک انقلاب'' علامہ طاہر القادری اپنی کینیڈین شہریت کے باعث پاکستان کے انتخابات اور انتخابی عمل میں حصہ لینے سے محروم ہوئے اور سپریم کورٹ میں اپنی دہری شہریت کا دفاع کرنے میں ناکام ہو کر انہیں اپنے ملک کینیڈا واپس جانا پڑا کیونکہ وہ کینیڈین شہریت سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح موجودہ گورنر پنجاب چودھری محمد سرور کو پاکستان میں سیاست کرنے کیلئے اپنی برطانوی شہریت سے باضابطہ طور پر دستبردار ہونا پڑا جس کیلئے انہوں نے فارم ''ایکس'' پر ڈیکلریشن جمع کرایا۔ اس حوالے سے پوچھا جا سکتا ہے کہ دہری شہریت کے حامل موجودہ حکومتی مشیروں اور معاونین خصوصی میں سے کتنوں نے پاکستان کی سیاست میں حصہ لینے سے پہلے باضابطہ طور پر فارم ''ایکس'' پر ڈیکلریشن جمع کرایا ہے۔

پاکستان کے شہریت ایکٹ اور اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں میں دہری شہریت کو معیوب کیوں گردانا گیا ہے۔ بھئی! سیدھا سیدھا اصول ہے۔ ملک کے ایک شہری کیلئے ملک سے وفاداری بنیادی آئینی تقاضا ہے۔ اگر وہ بیک وقت کسی دوسرے ملک کا شہری بن کر اس سے وفاداری کا بھی حلف اٹھا لیتا ہے تو وہ دہری شہریت کے ساتھ وفاداری کا تقاضا کس ملک کے ساتھ نبھائے گا۔ اگر پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے اسے اس ملک کیخلاف بندوق اٹھانا پڑے جس کی اس نے بعد میں شہریت حاصل کی ہے تو کیا وہ آئین و قانون کی اس تابع فرمانی کو قبول کریگا؟

یہی سوال سپریم کورٹ نے ڈاکٹر طاہر القادری کے کیس میں اٹھایا تھا کیونکہ آئین کی دفعہ 63 ذیلی دفعہ ایک' سی کے تحت دہری شہریت کے حامل کسی شخص کو پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے سے اس تصور کے تحت ہی نااہل قرار دیا گیا ہے کہ وہ رکن منتخب ہو کر اہم مناصب پر فائز ہو سکتا ہے جو ملکی سلامتی اور قومی مفادات کے حوالے سے حساس ہو سکتے ہیں۔ اس لئے دہری شہریت کے ساتھ وہ اس منصب کا ریاست کے وفادار شہری ہونے کے ناطے کیسے تقاضا نبھا سکتا ہے۔ پھر سپریم کورٹ نے پاکستان کے سابق سفیر حسین حقانی کی اہلیہ فرح ناز اصفہانی' فیصل واوڈا اور زلفی بخاری کی دہری شہریت کے معاملہ کا اپنے ازخود اختیارات کے تحت نوٹس لیا جس کی اس وقت کے چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر جسٹس میاں ثاقب نثار' مسٹر جسٹس عمر عطاء بندیال اور مسٹر جسٹس

اعجاز الحسن پر مشتمل عدالت عظمیٰ کے خصوصی بنچ کے روبرو سماعت ہوئی اور فاضل عدالت نے 14 ر دسمبر 2018ء کو باون صفحات پر مشتمل اپنے فیصلہ میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ ملک کی سول سروسز میں جو بھی دہری شہریت رکھتے ہیں انکی فہرستیں مرتب کی جائیں اور ایک میعاد مقرر کر کے انہیں پابند کیا جائے کہ اس عرصہ کے دوران وہ یا تو اپنی دہری شہریت ترک کر دیں یا ملازمت چھوڑ دیں۔ اگر وہ مقررہ میعاد کے اندر ایسا نہیں کرتے تو پھر ان کیخلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ اس معاملہ میں فاضل عدالت عظمیٰ نے حکومت کو پارلیمنٹ کے ذریعے باقاعدہ قانون سازی کی بھی ہدایت کی، فاضل عدالت کا یہ فیصلہ صادر ہوئے بھی ڈیڑھ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میرے ذہن کے کسی کونے میں اس عرصے کے دوران کیا گیا حکومت کا کوئی ایسا فیصلہ محفوظ نہیں جس کے تحت سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق پارلیمنٹ میں اس حوالے سے کوئی قانون سازی کی گئی ہو۔

کیا اس سے یہ پیغام دینا مقصود ہوتا ہے کہ عدل گستری کے کسی سربراہ کے اپنے منصب سے رخصت ہو جانے کے بعد انکے صادر کردہ فیصلے بھی رخصت ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ ساری تمہید باندھنے کی ضرورت وزیراعظم کے معاون خصوصی برائے احتساب شہزاد اکبر کی جانب سے پیش کی گئی اس ''منطق'' کی بنیاد پر محسوس ہوئی کہ دہری شہریت کا قانون منتخب ارکان پارلیمنٹ پر لاگو ہوتا ہے، غیر منتخب مشیروں اور معاونین خصوصی پر نہیں۔ انکی اس منطق کا آئین و قانون اور عدالتی فیصلوں کی روشنی میں جواب دینا بھی شاید بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوگا کہ بیرسٹر ہو کر وہ ''دو سو کیس'' کے مقابلے میں ''پنج سو کیس'' پیش کر رہے ہیں۔ ارے بندۂ خدا! اول تو پاکستان شہریت ایکٹ کی دفعہ 14۔الف کے تحت دوسرے ملک کی شہریت حاصل کرنیوالا کوئی شخص پاکستان کا شہری ہی نہیں رہتا تو پھر پارلیمنٹ کی رکنیت ہو یا غیر منتخب مشاورتی منصب، وہ پاکستان میں کسی بھی منصب پر فائز ہونے کا اہل نہیں رہتا۔ سپریم کورٹ نے اپنے دسمبر 2018ء کے فیصلہ میں کسی بھی پبلک آفس کیلئے دہری شہریت کے حامل افراد کو نااہل قرار دیا ہے اور اس میں بطور خاص عدلیہ کے ارکان کو بھی شامل کیا ہے۔ پھر آپ ہاتھ گھما کر کسی چھو منتر کے ذریعے دہری شہریت کے حامل کسی فرد کو مشیر اور معاون خصوصی بنانے کی گنجائش کیسے نکال سکتے ہیں۔ اگر سیاست بازی میں آپ اپنے مخالفین پر آئین و قانون کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری لاگو ہوتی

دیکھنا چاہتے ہیں اوراس بنیاد پرانکی تاحیات نااہلی بھی ہو جاتی ہےتو پھرآئین وقانون کے ہوتے ہوئے اور انصاف کی عملداری میں دہری شہریت آپ کیلئے شیرینی کیسے بن سکتی ہے؟ ریاست کے معاملات بہرصورت آئین اور قانون کے مطابق ہی چلتے ہیں اور ریاست کے ہر شہری کو اپنے حقوق وذمہ داریوں کے معاملہ میں آئین وقانون کا پابند ہونا ہوتا ہے۔ آئین وقانون کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری ہی میرا ہمیشہ کا تجسس رہا ہے جس پر کچھ ''فیڈ ڈ'' حلقے ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں اور آئین کی بھد بھی اڑاتے ہیں مگر ہم نے بہرصورت آئین کے تابع رہنا ہے ورنہ ہم ریاست مدینہ کا خواب تو کیا شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھیں گے، جنگل کا معاشرہ ہم پر ضرور غالب آجائیگا۔

لاشوں پر حکومت

خیال تو یہی تھا کہ سوشل میڈیا پر اظہار رائے کی شتر بے مہار آزادی پر سپریم کورٹ کے گزشتہ روز کے ریمارکس پر اپنی ناقص عقل کے مطابق خامہ فرسائی کی جائے اور آزادیٔ اظہار رائے کے ڈھنڈورے پیٹنے والوں کو آئین پاکستان کی دفعہ 19 کا آئینہ دکھایا جائے مگر گزشتہ دنوں شائع ہونیوالی دو خبریں میرے ذہن میں کھبی ہوئی ہیں چنانچہ ''لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے'' کے مصداق ان خبروں میں موجود زندگی کے تلخ حقائق سے صرفِ نظر میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ ان میں سے ایک خبر نوائے وقت میں شائع ہوئی جس میں پنجاب کے مختلف شہروں میں ایک ہی روز ہونیوالی دس خودکشیوں کی تفصیلات موجود تھیں اور اس سے اگلے روز ''جنگ'' میں ایک ہی روز پانچ خودکشیوں کے حوالے سے خبر شائع ہوئی۔ خودکشی جیسا انتہائی اقدام اٹھانے والے یہ خواتین و حضرات بشمول نوجوان اپنے گھریلو حالات، مالی مجبوریوں اور بے روزگاری سے زچ ہوتے ہوئے مایوسی کی اس انتہاء کو پہنچے جنہوں نے یقیناً یہ سوچ کر موت کو گلے لگایا ہوگا کہ شاید انکے اس اقدام سے ہی دنیاوی تفکرات سے نجات مل جائے۔

خودکشی بلاشبہ حرام موت ہے جس کی ہمارے سلامتی والے دین اسلام میں بھی ممانعت ہے اور تعزیرات پاکستان کے تحت یہ تعزیری جرم بھی ہے۔ مگر جس انسان نے خود کو مار کر اپنے آپ کو خود ہی سزا دے لی ہو تو اسکے اس تعزیری جرم کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ میرا آج کا استفسار یہی ہے کہ خودکشی کے سنگین جرم کا مقدمہ کس کیخلاف درج اور دائر ہونا چاہیے۔ کاش! ہمارا بھی ایسا مثالی معاشرہ اور نظام عدل موجود ہو جس میں مغربی معاشرے کا ایک جج ایک سٹور سے ڈبل روٹی چرا کر کھانے کے جرم میں گرفتار بچے کے اس جرم کی سٹور کے مالک، حکومت اور پورے معاشرے بشمول خود کو یہ کہہ کر بھاری جرمانے کی سزا دیتا ہے کہ چوری کرنیوالے بچے کے اس جرم میں ہم

سب برابر کے شریک ہیں کیونکہ ملزم بچے نے یہ جرم بھوک سے عاجز آ کر کیا ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں ناانصافی نہ ہو رہی ہوتی تو اس بچے کو بھوک سے عاجز آ کر ڈبل روٹی چوری کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی۔

ارے۔ ہمارے معاشرے میں تو مجبُور انسانوں کیلئے پل پل ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ وہ جسم کے ساتھ تنفس کا سلسلہ برقرار رکھنے کیلئے لوٹ مار، چھینا جھپٹی اور قتل و غارت گری شروع کر دیں یا اپنی جان سے ہی گزر جائیں۔ بقول مجید امجد، ہمارے معاشرے میں بے حسی کی فضا ایسی بن گئی ہے کہ......

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا

تو بھائی صاحب پھر زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا۔ ریاست مدینہ کے تصور والے ہمارے معاشرے میں تو خود ریاست نے اپنے شہریوں کو صحت، تعلیم اور روزگار فراہم کرنے کی بنیادی آئینی ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور خود حکمران طبقات یہ باور کرا رہے ہیں کہ روزگار فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر ہمارے آئین کی بنیادی انسانی حقوق کی دفعات بالخصوص دفعہ 25, 26 اور 27 کی یہی تشریح ہے تو پھر اس آئین کو بھی علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق نذرِ آتش کر دینا چاہیے کہ......

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اگر آج ریاست کی جانب سے ہی کسی نہ کسی جواز کے تحت اسکے شہریوں کیلئے ملازمتوں کے دروازے بند کئے جا رہے ہیں اور ملازم پیشہ طبقات کو بھی مختلف پالیسیاں وضع کر کے بے روزگاری کی جانب دھکیلا جا رہا ہے اور انکے بچوں کے مستقبل کے ساتھ ساتھ ان کا بڑھاپا بھی خراب کیا جا رہا ہے تو حضور ذرا سوچئے۔ پھر ''کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد''۔ سوچ لیجئے کہ ریاست کے ایسے اقدامات اور پالیسیوں کے اس انسانی معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہونگے اور غربت و پسماندگی کی جانب دھکیلے جانے والے انسان کیا چلن اختیار کرینگے۔ جناب ایسا نہیں ہو

سکتا کہ......

آپ تے پویں بُکاں شربت
سانوں گھٹ گھٹ زہر پلاویں

بزرگ شاعر بابا فرید گنج شکر نے روٹی کو اسلام کا چھٹا رکن قرار دیکر بھوک کے ناطے سے فلسفۂ زندگی کی ساری پرتیں کھول دی ہیں اور ساحر لدھیانوی نے یہ کہہ کر اس فلسفے کو مہمیز لگائی ہے کہ......

مفلسی حسن لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک اطوار کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی

آج ہمارے معاشرے میں حسن لطافت کو مٹانے والی اقدار ہی پروان چڑھائی جا رہی ہیں جس کا اہتمام معاشرتی گراوٹ کے سوا بھلا اور کیا نکلے گا۔ اگر آج ہر گھر میں بے روزگاری پھن پھیلا کر ناچ رہی ہے' میرٹ کے قتل عام کے کھلے عام میدان سجائے جا رہے ہیں' اقربا پروری کی رونقیں پہلے سے بھی زیادہ جگمگا رہی ہیں' کرپشن کا کاروبار مزید مستحکم ہو گیا ہے اور داد و فریاد سے محروم راندۂ درگاہ طبقات کیلئے ناصر کاظمی کے اس شعر والا ماحول بن گیا ہے کہ......

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

تو حضور ذرا خبر لیجئے۔ ایسے حالات شتر بے مہار معاشرے کی راہ نکالیں گے تو کس کے پلّے کیا بچے گا۔ اگر آپ بے روزگاری پھیلا کر خود کمانے اور خود کھانے کی دعوت دے رہے ہیں تو آپ کرپشن فری سوسائٹی نہیں' کرپشن میں بال بال اور ناخن ناخن لتھڑے معاشرے کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ پھر جس کا جو زور لگے گا اور جس کا جو داؤ چلے گا وہ کرتا پھرے گا۔ آپ لوگوں کے دلوں میں انکی ٹوٹنے والی امیدوں کے قبرستان بنائیں گے تو پھر آپ کو زندہ انسان نہیں' لاشے ہی نظر آئیں گے۔ کیا آپ ان لاشوں پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں؟ حضور اپنی سوچ بدلئے۔ ان لاشوں نے اپنی سوچ بدل لی تو پھر ان پر حکومت کرنا ایک ڈراؤنا خواب بن جائیگا۔

سابق حکمرانوں کی ''خرابیاں''

نئے پاکستان کی خالق پی ٹی آئی نے اپنے اقتدار کے گزرے ہوئے دو سال کے دوران پہلے سو دن والے منشور کو عملی جامہ پہنایا ہے یا نہیں' اسکے بارے میں تو بعد میں بحث ہوتی رہے گی کہ ابھی نئے پاکستان کے اقتدار کو ''جمعہ جمعہ آٹھ دن'' ہی تو ہوئے ہیں البتہ ان دو سالوں کے دوران پی ٹی آئی کے قائدین اور ہر سطح کے عہدیداروں نے پی ٹی آئی دور میں درآنیوالی ہر خرابی کا ملبہ سابق حکمرانوں پر ڈالنے اور اسے انکے ''کرتوتوں'' کا شاخسانہ قرار دینے میں مشاقی ضرور حاصل کرلی ہے۔ اس مشاقی نے پی ٹی آئی قائدین کو بھارتی جاسوس دہشت گرد کلبھوشن یادیو کے کیس میں عالمی عدالت انصاف میں ہونیوالی پاکستان کی ''ہزیمت'' کا ملبہ بھی سابق حکومت پر ڈالنے کی راہ دکھا دی چنانچہ جب اپوزیشن اور ملکی استحکام کیلئے فکرمند دانشوروں کے حلقوں کی جانب سے کلبھوشن کو بار بار قونصلر رسائی دینے کی حکومتی پیشکش اور اس تناظر میں حکومت کی جانب سے دو ماہ قبل جاری کئے گئے آرڈی ننس پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یہ معاملہ پارلیمنٹ میں لانے کا تقاضا کیا گیا تو انسانی حقوق کی وفاقی وزیر ڈاکٹر شیریں مزاری اور پھر انکی پیروی میں متعدد دوسرے وزراء نے بھی ٹھک سے بیانات داغ دیئے کہ سابق حکومت نے کلبھوشن کیس میں عالمی عدالت انصاف سے رجوع کر کے غلطی کی۔ انکے بقول پاکستان کو عالمی عدالت انصاف میں نہیں جانا چاہیے تھا کیونکہ اب ہم عالمی عدالت انصاف کے فیصلہ میں پھنس گئے ہیں۔ اور تو اور ''جمعہ جمعہ آٹھ دن'' کے اقتدار میں تیسری بار وزیر قانون بننے والے دانشور قانون دان بیرسٹر فروغ نسیم نے اپنی وزارت کا حلف اٹھاتے ہی اسمبلی کے فلور پر قونصلر رسائی سے متعلق جاری کردہ آرڈی ننس کا دھواں دار دفاع کرتے ہوئے اسے حکومت کا بڑا کارنامہ قرار دیا کہ اس آرڈی ننس کے ذریعے ہم نے عالمی عدالت انصاف کے فیصلہ پر عملدرآمد کا یقین دلا کر پاکستان پر پابندیاں لگوانے کی بھارتی سازش ناکام بنادی ہے۔ پھر دھڑلے سے یہ بھی باور کرادیا کہ کسی آرڈی ننس

کیلئے اپوزیشن سے مشاورت کرنا یا اسے پارلیمنٹ میں پیش کرنا قطعاً ضروری نہیں۔ ہم نے اس آرڈی ننس کے ذریعے دنیا کو مطمئن کر دیا ہے جبکہ ہمیں اس معاملہ میں سابقہ حکومت نے ہی پھنسایا ہے۔

حضور۔ ایسی تاویلات اگر محض سیاست برائے سیاست کیلئے پیش کی جارہی ہیں تو پھر نئے پاکستان کی حکمت کا کوئی جواب نہیں ورنہ اس منطق کو کون قبول کریگا کہ پاکستان کو کلبھوشن کا معاملہ عالمی عدالتِ انصاف میں نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ ارے صاحب! عالمی عدالت انصاف میں کلبھوشن کی سزائے موت کیخلاف اپیل پاکستان نے دائر کی تھی یا بھارت نے؟ آپ کے استدلال کے مطابق تو پاکستان کو اس بھارتی اپیل میں عالمی عدالت انصاف کے روبرو اپنے کیس اور فیصلہ کا دفاع کرنے کیلئے بھی نہیں جانا چاہیے تھا جبکہ پاکستان نے عالمی عدالت انصاف کے روبرو کلبھوشن اور اسکے سرپرست بھارت کیخلاف اپنے کیس کا دفاع کر کے ہی اسے بھارتی دہشت گرد تسلیم کرایا اور اسے بھارت کے حوالے کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اگر ہم عالمی عدالتِ انصاف میں اپنے کیس کا دفاع نہ کرتے تو عدالت یکطرفہ بھارتی موقف سن کر اسکے حق میں یکطرفہ فیصلہ صادر کر دیتی اور بھارت کو اقوام عالم میں ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا خوب موقع ملتا۔

پھر سابق حکومت نے بھارتی اپیل کیخلاف پاکستان کے دفاع کیلئے عالمی عدالت انصاف میں جا کر یہی خرابی پیدا کی ہوگی کہ اس نے اسی وقت کلبھوشن کو عدالت کے ذریعے بھارت کے حوالے کیوں نہ ہونے دیا۔ نہ آج کلبھوشن ہماری تحویل میں ہوتا اور نہ ہی ہمیں بار بار اسے قونصلر رسائی دینے کا تردد کرنا پڑتا۔ آخر پی ٹی آئی حکومت نے پاکستان پر حملہ آور ہونے والے بھارتی جہازوں کے گرفتار کیے گئے پائلٹ ابھی نندن کو بھی تو اگلے ہی روز بھارت کے حوالے کر کے اس معاملہ کو طول اختیار کرنے سے ''دانشمندی'' کے ساتھ روک دیا تھا۔ سو کلبھوشن کے معاملہ میں بھی نہ ''مدعا'' ہوتا نہ ہمیں آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا۔ ''خس کم جہاں پاک''۔ ہمیں تو اب سابقہ حکومت کا گند ہی اٹھانا اور صاف کرنا پڑ رہا ہے۔

اب فروغ نسیم صاحب کی منطق پر کیا کہا جائے کہ انہوں نے تو قونصلر رسائی کا باقاعدہ آرڈی ننس جاری کرا کے بھارت کا منہ بند کر دیا ہے اور اقوام عالم کو یقین دلا دیا ہے کہ ہم نے تو اپنی سرزمین پر دشمن کا ننگی دہشت گردی کا نیٹ ورک پھیلانے والے سفاک مجرم کلبھوشن کو بار بار قونصلر رسائی دیکر اور پھر اسے اور بھارت دونوں کو انکی منشاء کے مطابق قونصلر رسائی کی پیشکش

کر کے عالمی عدالت کے فیصلہ پر عملدرآمد کیلئے کوئی نیا عذر سامنے لانے کی گنجائش ہی ختم کر دی ہے۔ اب آپ اس سے ہرگز یہ تاثر نہ لیں کہ ہم نے عالمی دباؤ سے بچنے کیلئے بھارت کے ساتھ فدویانہ طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے۔

مگر جناب! عالمی عدالت انصاف کا فیصلہ حرف بحرف پڑھ کر ذرا مضطرب قوم کو یہ تو بتا دیجئے کہ اس فیصلہ میں کہاں لکھا گیا ہے کہ جب تک کلبھوشن اور بھارت مکمل مطمئن نہیں ہو جائیں انہیں قونصلر رسائی دی جاتی رہے۔ عدالت نے پاکستان کو قونصلر رسائی دینے کا کہا اور پاکستان نے اس فیصلہ پر عملدرآمد کرتے ہوئے فیصلہ کے ایک ہفتے بعد ہی کلبھوشن کیلئے قونصلر رسائی کا اہتمام کر دیا۔ اس فیصلے کی منشاء بار بار قونصلر رسائی دینا تو ہرگز نہیں۔ ہم عدالت میں کلبھوشن کو قونصلر رسائی دینے کے ثبوت فراہم کر دیں تو پھر عدالت کے پاس ہم پر عالمی پابندیاں لگوانے کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے اور لگے ہاتھوں قوم کو ذرا یہ بھی بتا دیجئے کہ عالمی عدالت انصاف نے اپنے کسی فیصلہ پر عملدرآمد نہ ہونے کی صورت میں کیا کسی ملک پر کبھی عالمی پابندی لگوائی ہے؟ آپ کی یہ منطق تو "آ بیل مجھے مار" والی ہے۔ آپ اپنے دشمن بھارت کو آسان راستہ دکھا رہے ہیں کہ ہم پر عالمی پابندیاں لگوانے کیلئے عالمی عدالت انصاف سے رجوع کرو۔ اور کیا خیال ہے جناب! ہم کلبھوشن کو بار بار قونصلر رسائی دیکر بھارت کو مطمئن کر لیں گے؟ بھارت تو ویسے ہی ہم پر عالمی پابندیاں لگوانے کی سازشوں میں مصروف رہتا ہے۔ وہ آپ کے جاری کردہ آرڈی ننس کی بنیاد پر ان سازشوں سے ٹل تو نہیں جائیگا۔ آپکے کرنے کا کام تو اہل پاکستان کے سفاک قاتل کلبھوشن کو کیفرِ کردار کو پہنچانے کا ہے تاکہ اس سوراخ سے اس جیسے دوسرے سفاکوں کو ہمارے بے گناہ لوگوں کو ڈسنے کا موقع نہ مل سکے۔

جہاں تک آپ کے اقتدار کے ابتدائی سو دن والے منشور کو عملی جامہ پہنانے کا معاملہ ہے وہ آپ کے اقتدار کے گزرے ہوئے دو سال میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا تو اس سو دن کے منشور کی خاطر آپ کا اگلے دس سال تک کا اقتدار بھی ناکافی ہوگا اس لئے میں قوم سے دست بستہ اپیل کروں گا کہ وہ پی ٹی آئی کو کم از کم اگلے دس سال کیلئے تو ضرور قبول کئے رکھے اور اسکے مخالف سازشی عناصر کو پھٹکار دے تاکہ یہ اپنے کسی ایک وعدے کو عملی جامہ پہنانے میں تو سرخرو ہو سکے۔ اس عرصے میں اگر کسی نے اپنے اچھے مستقبل کا سوچا تو انکے دلوں میں پیدا ہونیوالا یہ "خناس" بھی سابق حکمرانوں کی ہی غلطی سمجھی جائیگی۔

پاکستان کا سیاسی نقشہ اور ریڈکلف ایوارڈ

ہماری سرحدوں کا جھگڑا تو نہرو، ماؤنٹ بیٹن گٹھ جوڑ کے باعث تقسیم ہند کے وقت ہی شروع ہو گیا تھا۔ وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 3/جون 1947ء کو تقسیم ہند کا پلان دیا جس کے تحت 15/اگست 1947ء کو ہندوستان کو تقسیم ہو کر دو نئی ریاستوں پاکستان اور بھارت کے وجود میں سمٹ جانا تھا۔ اس پلان کے مطابق دونوں مجوزہ نئی ریاستوں کی حد بندی کیلئے ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کی سربراہی میں کمیشن تشکیل دیا جس میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی نمائندگی کیلئے چار جج صاحبان کو بطور رکن نامزد کیا گیا۔ ان میں جسٹس دین محمد اور جسٹس منیر مجوزہ پاکستان اور جسٹس مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ مجوزہ ریاست بھارت کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ بلاشبہ قائداعظم محمد علی جناح کی انتھک جدوجہد، فہم و بصیرت اور قائداعظم کی آواز پر لبیک کہنے والے برصغیر کے مسلمانوں کے جوش و ولولہ کا ہی ثمر تھا کہ برطانوی وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی کوکھ میں سے ایک نئی ریاست پاکستان کے نام سے تشکیل دینے پر آمادہ ہو گئے تھے جو فی الواقع مہابھارت کے ایجنڈے پر ضرب کاری تھی۔ ہندو بنیاء نے طوعاً و کرہاً تقسیم ہند کا پلان قبول تو کر لیا مگر اسکے سازشی ذہن نے پاکستان کی تشکیل دل سے قبول نہ کی کیونکہ اس سے ہندو بنیاء کے اکھنڈ بھارت کے خواب چکنا چور ہو رہے تھے۔ چنانچہ نہرو نے پاکستان کو شروع دن سے ہی کمزور کرنے کیلئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ ریڈکلف نے تو اپنا فریضہ نبھایا اور کمیشن کے ارکان کی معاونت سے دیانتداری کے ساتھ سرحدوں کا تعین کیا اور فیروز پور، گورداسپور اور انکے نواحی علاقے پاکستان میں شامل کرنے کا واضح عندیہ دے دیا مگر ہندو بنیاء کا سازشی ذہن اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا کیونکہ نہرو نے تو پہلے ہی پاکستان کو کمزور کرنے کیلئے فیروز پور ہیڈ ورکس پر اپنا تسلط جمانے کی منصوبہ بندی کی ہوئی تھی تاکہ وہاں سے پاکستان کیلئے پانی کو روک کر اسے بھوک پیاس سے تڑپایا جا سکے۔ سابق صدر لاہور ہائیکورٹ بار، سابق وفاقی وزیر قانون اور سابق جج وفاقی شرعی عدالت سید افضل حیدر جو ریڈکلف باؤنڈری کمیشن میں آل انڈیا

مسلم لیگ کے وکیل ظفراللہ خان کی معاونت کرنیوالے نامور قانون دان سید محمد شاہ کے صاحبزادے ہیں اور اپنے والد مرحوم کی جمع شدہ دستاویزات کی بنیاد پر ریڈکلف ایوارڈ کی لمحہ لمحہ کی داستان پر مبنی کتاب مرتب کر رہے ہیں، پاکستان اور بھارت کی حد بندی کے معاملہ میں معلومات و حقائق کا خزانہ رکھتے ہیں۔ انکے بقول (اور حقائق بھی یہی ہیں کہ) لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 17/ اگست 1947ء کو ریڈکلف ایوارڈ جاری کیا تو اس میں انہوں نے خود رد و بدل کر کے فیروز پور اور گورداسپور کو بھارت میں شامل کر دیا تھا۔

یہی ڈنڈی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خودمختار ریاست جموں و کشمیر کے معاملہ میں ماری اور اس پر تقسیم ہند کا فارمولہ لاگو ہی نہ ہونے دیا جس کے تحت خودمختار ریاستوں کی اکثریتی آبادی کو پاکستان یا بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرنا تھا۔ مسلمانوں پر مشتمل ریاست جموں و کشمیر کی اکثریتی آبادی چونکہ قیام پاکستان سے بھی پہلے اسکے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر چکی تھی اس لئے اسکے پاکستان کا حصہ بننے کے بارے میں کوئی دورائے ہو ہی نہیں سکتی تھی اور قائداعظم نے بھی اسی تناظر میں کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا مگر سازشی ہندو بنیاء تو کٹا پھٹا اور کمزور پاکستان قائداعظم کے حوالے کرانا چاہتا تھا اس لئے نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے کشمیر کا پاکستان سے الحاق مؤخر کرا دیا اور پھر اپنی سازشی منصوبہ بندی کے تحت ریاست جموں و کشمیر کے والی مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ چند ''ٹکوں'' کا معاہدہ کر کے ان سے کشمیر خریدنے کا اعلان کر دیا اور پھر اسی معاہدے کی آڑ میں 27/اکتوبر 1947ء کو کشمیر میں بھارتی افواج داخل کر دیں۔ کشمیر پر ہندو بنیاء کا یہ تسلط آج کے دن تک قائم ہے اور پاکستان کی سلامتی کمزور کرنے کی نیت سے ہی بھارت نے اسکی شہ رگ کشمیر کو گزشتہ 72 سال سے دبوچ رکھا ہے۔

مجھے یہ ساری تمہید پانچ اگست کو حکومت پاکستان کے جاری کردہ پاکستان کے سیاسی نقشے پر سوشل میڈیا پر ہونیوالی ''الم غلم'' تنقید کی ہڑبونگ کے حوالے سے باندھنا پڑی ہے۔ جی حضور! یہی نقشہ اصل پاکستان کا نقشہ ہے جس کے خدوخال ریڈکلف کمیشن نے پاکستان اور بھارت کی حد بندی کرتے وقت نمایاں اور اجاگر کئے تھے۔ اس حد بندی کی داستان مجھے اپنے والد مرحوم میاں محمد اکرم (گولڈ میڈلسٹ کارکن تحریک پاکستان) کی زبانی بھی سننے کا موقع ملتا رہا ہے جو اراضی کے ریکارڈ کے ساتھ حد بندی کے کیس میں سید محمد شاہ ایڈووکیٹ کی معاونت کیا کرتے تھے اس لئے میں اپنی جذباتی وابستگی کے ناطے سے بھی پاکستان کے جاری کردہ نئے سیاسی نقشے کو پاکستان

کا اصل اور مستند نقشہ سمجھتا ہوں جس سے پوری وادی کشمیر ہی نہیں، ریڈکلف کی جانب سے پاکستان کا حصہ بنائے گئے بھارتی علاقوں پر بھی ہمارا کیس مضبوط ہوا ہے اور ہم ریاست جونا گڑھ پر بھی اپنا کلیم تسلیم کرانے کی پوزیشن پر آ گئے ہیں۔ آج سلامتی کونسل میں کشمیر کا معاملہ مصلحتوں کا شکار ہو کر اٹکا اور لٹکا ہوا ہے کہ اسکی ٹھوس قراردادوں کے باوجود پاکستان کے ساتھ الحاق کی تمنا رکھنے والے کشمیری عوام کو گزشتہ 72 سال سے استصواب کا حق نہیں مل سکا۔ اس طرح انکے ساتھ ایک ڈنڈی تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف ایوارڈ جاری کرتے وقت ماری کہ ریاست جموں و کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان نہ کیا گیا اور دوسری ڈنڈی انکے ساتھ سلامتی کونسل کی قراردادیں روبہ عمل نہ لا کر ماری جا رہی ہے۔ پاکستان کے مفادات اور کشمیریوں کے جذبات کے ہم آہنگ پاکستان کا سیاسی نقشہ بھی دنیا کو یہی باور کرا رہا ہے کہ کشمیر ہمارا ہے اور سارے کا سارا ہے۔ اس حوالے سے ڈوگرہ مہاراجہ کے ساتھ کئے گئے نہرو کے معاہدے کی پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں کہ کسی ریاست کو اسکے عوام سمیت چند ٹکوں کے عوض خرید لینا ناممکنات میں شامل ہے۔ اگر کشمیری ہندو بنیاء کے زرخرید غلام ہوتے تو 72 سال سے بھارتی تسلط سے اپنی آزادی کی جدوجہد کیوں جاری رکھتے اور اس عظیم جدوجہد میں اپنے لاکھوں پیاروں کی قربانیاں کیوں دیتے۔ قربانیوں سے معمور انکی جدوجہد کا یہ سفر تو آج بھی جاری ہے۔ جنونی ہندو مودی سرکار نے پاکستان کے حقیقی نقشے کو جھٹلانے کیلئے ہی گزشتہ سال 5 اگست کو مقبوضہ وادی پر آئینی شب خون مارا تھا اور اسی کی آڑ میں جنونی ہندو بنیاء پاکستان سے ملحقہ آزاد جموں و کشمیر اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر بھی اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت للچائی نظریں گاڑے بیٹھا ہے جبکہ تلخ حقائق سے نابلد ہمارے ''لبرلز'' نے سوشل میڈیا پر پاکستان کے سیاسی نقشے کو الم غلّم تنقید کے ہدف پر رکھا ہوا ہے جس سے ہماری شہ رگ پر انگوٹھا رکھنے والے ہمارے دشمن بھارت کو حظ اٹھانے اور ہمارا مضحکہ اڑانے کا خوب موقع مل رہا ہے۔ اگر ہم نے اس معاملہ میں بھی آئین کی دفعہ 19 کی پاسداری نہیں کرنی اور ہمارے ذمہ دار اداروں نے سوشل میڈیا پر غل غپاڑہ کرنیوالوں کیخلاف یہ آئینی دفعہ بروئے کار نہیں لانی تو پھر حضور!......

قیامت بھیج دے کچھ روز پہلے
اگر کٹتا نہیں وقتِ غلامی

بنی اسرائیل۔ مشیت ایزدی اور ہماری آزمائش

اگر بنی اسرائیل کے حوالے سے خالق کائنات رب کریم کی منشاء اور کتاب ہدایت قرآن مجید میں جا بجا موجود احکام وارشادات خداوندی پر بات کی جائے تو اسے ایک کالم کے حجم میں ہرگز نہیں سمویا جا سکتا اس لئے میں صیہونیوں اور اسرائیل کے پس منظر کا مختصر تذکرہ کر کے اصل موضوع کی طرف آؤں گا۔ آپ قرآن مجید کی سورہ النحل' سورہ انعام' سورہ آل عمران' آیات 38, 72, 181 کا مطالعہ فرمائیں۔ آپ کو بنی اسرائیل (اسرائیل کی اولاد) کیلئے ذات باری تعالیٰ کی ناراضگی اور پھٹکار کے مظاہر نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔ یہ وہ واحد قوم ہے جسے رب کائنات نے سب سے زیادہ ملعون ٹھہرایا ہے۔ اگر ایک وقت میں یہ انسانی مخلوق خالق کائنات کی اتنی محبوب مخلوق تھی کہ اس کیلئے آسمانوں سے من وسلویٰ اتارا گیا تو ذرا سوچیئے حضور کہ اپنے کن ''کرموں'' کے باعث یہ خدا کے عتاب کی زد میں آئی اور اسے فلسطین کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم صادر ہوا۔ بنی اسرائیل وہ قوم ہے جو تمام انبیاء کرام کی گستاخ اور انکے قتل تک کی نوبت لانے میں کوئی حجاب و ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی تھی جس نے دو بار زمین پر فساد عظیم برپا کیا۔ حضرت نبیٔ آخر الزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدترین مخالف اور جانی دشمن تھی اس لئے رب کائنات کی جانب سے راندۂ درگاہ ٹھہری۔ اگر اس کرۂ ارض پر فتنہ و فساد' شیطنت' شرارت' شرانگیزی کا جائزہ لیا جائے تو یہ سارے عناصر صیہونیوں (بنی اسرائیل) کے ساتھ منسوب نظر آئیں گے۔ فلسطین کی سرزمین جو درحقیقت انبیاء کی سرزمین ہے اس قوم کے وجود کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے رب کائنات نے بنی اسرائیل کو فلسطین سے نکل جانے کا حکم صادر فرمایا اور پھر یہ دنیا کے مختلف خطوں میں جائے پناہ ڈھونڈتے رہے۔ 18 ویں صدی کے آغاز میں برطانیہ کی سازش اور شرارت کے تحت فلسطین میں صیہونی بستی بنانے کی منصوبہ بندی ہوئی جس کیلئے چار مراحل طے

کئے گئے۔ ایک مرحلہ فلسطینیوں سے زمین خریدنے کا تھا جسے فلسطینیوں نے فوری طور پر مسترد کر دیا۔ اسکے باوجود 1880ء میں ایک فرضی دستاویز تیار کر کے اسکے ذریعے فلسطینیوں سے اراضی خریدنے کا دعویٰ کر دیا گیا۔ اگر یہ دستاویز اصل بھی تسلیم کر لی جائے تو بھی مبینہ طور پر خریدی گئی اراضی فلسطین کا پانچ فیصد بھی نہیں بنتی مگر صیہونی پورے فلسطین پر قابض ہو گئے اور پھر 1948ء میں اقوام متحدہ نے اسرائیل کو باقاعدہ ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا جس کے بعد امریکی سرپرستی میں فلسطین کو اسکے اصل مکینوں (فلسطینیوں) سے جبراً خالی کرانے کا سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے اور اب تک لاکھوں فلسطینی عوام اپنی سرزمین کی اسرائیلی اور امریکی تسلط سے آزادی کی جدوجہد میں اپنی جانیں نچھاور کر چکے ہیں۔ گزشتہ سال اسرائیلی پارلیمنٹ نے جو 102 قوانین منظور کئے وہ تذلیل و تحقیر انسانیت کا شاہکار ہیں۔ ان میں سے ایک قانون کے مطابق ہر فلسطینی بچے کے ہاتھ چیک کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی بچے کا ہاتھ گدلا نظر آئے تو اس سے خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے کہ یہ بچہ کسی اسرائیلی فوجی کیمپ پر پتھراؤ کر کے آیا ہے چنانچہ اسے جیل میں ڈالنے یا گولی مارنے کا اقدام جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی طرح ایک قانون کے تحت اسرائیلی فوجیوں کو ہر اس فلسطینی کو گولی مارنے کا اختیار دیا گیا ہے جس کے بارے میں یہ شک ہو کہ وہ اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔

ایسے ننگ انسانیت قوانین و جرائم کا کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے حوالے سے بھارت کی ہندو انتہاء پسند مودی سرکار کے وضع کردہ قوانین و اقدامات کے ساتھ موازنہ کرنے سے پہلے آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ دنیا کے 30 ممالک نے آج تک اسرائیل کو ایک ریاست کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ ان میں کیوبا اور شمالی کوریا سمیت متعدد غیر مسلم ممالک بھی شامل ہیں جبکہ 52 ممالک ایسے ہیں جنہوں نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے باوجود سرزمین فلسطین پر اسرائیل کی ریاست قائم کرنے کی راہ ہموار کرنے والی اقوام متحدہ کی 1948ء کی قرارداد کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور اسرائیل کو ہمیشہ غاصب ٹھہرایا۔ ڈھٹائی اور دیدہ دلیری اس انتہاء کی ہے کہ اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو اقوام متحدہ کے روبرو عالمی قیادتوں کے سامنے کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ ایسے کسی عالمی قانون کو نہیں مانتے جو انکے راستے اور توسیع پسندانہ عزائم میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہو۔ امریکی ٹرمپ انتظامیہ نے مقبوضہ بیت المقدس کو اسرائیلی دارالحکومت تسلیم

اور وہاں امریکی سفارتخانہ قائم کر کے اس بدمست ہاتھی کو طاقت کا نشہ اور بھی چڑھا دیا ہے۔ یہی کچھ بھارت کی مودی سرکار کا کشمیریوں اور بھارت کی مسلمان اقلیتوں کے ساتھ طرز عمل ہے جس نے کشمیریوں کے حق خود ارادیت کیلئے اقوام متحدہ کی قراردادوں کو پر کاہ کی بھی اہمیت نہیں دی۔

اب آتے ہیں متحدہ عرب امارات کی جانب سے اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اسکے ساتھ تعاون کا معاہدہ کرنے کی جانب۔ اس میں کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتی کہ یہ معاہدہ سراسر امریکی ایماء پر اور اسی کی سرپرستی میں ہوا ہے جس پر امریکی صدر ٹرمپ اور سیکرٹری آف سٹیٹ پومپیو کا اظہار اطمینان امریکی سرپرستی کا ہی واضح عندیہ ہے۔ اب تو باضابطہ طور پر یہ امریکی دعویٰ بھی سامنے آچکا ہے کہ اسرائیل اور یو اے ای کے مابین معاہدہ سعودی عرب کی رضامندی حاصل کر کے کرایا گیا ہے۔ اس کیلئے ''قوے فروختند وچہ ارزاں فروختند'' کی مثال ہی صادق آتی ہے۔

اب ہمارے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ ہم نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کیلئے پڑنے والا اندرونی اور بیرونی دباؤ قبول کرنا ہے یا نہیں اور اس حوالے سے ہمارے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے بھی ہیں یا نہیں۔ ہمارے ''لبرلز'' اس وقت خودرو پودوں کی طرح سر نکال کر سوشل میڈیا کا محاذ سنبھالے بیٹھے ہیں اور پراپیگنڈہ کئے جا رہے ہیں کہ ہم بدلتی دنیا کے تقاضوں سے خود کو الگ تھلگ کیسے رکھ سکتے ہیں۔ ایک پراپیگنڈہ یہ بھی چل رہا ہے کہ ہم اسرائیل کے ایجاد کردہ موبائل سیل فون سے تو خود کو ایک لمحہ بھی الگ نہیں کر سکتے مگر اسرائیل کو تسلیم کرنا ہمیں قبول نہیں۔ اس نوعیت کے پراپیگنڈے لوگوں کو جذباتی طور پر موٹیویٹ کر کے اپنے مقاصد کیلئے قائل کرنے کی خاطر کئے جاتے ہیں چنانچہ مجھے اے این پی کے سیکرٹری جنرل میاں افتخار کو جمعیت علماء اسلام کے امیر مولانا فضل الرحمان کو اپنے پہلو میں بٹھا کر یہ پراپیگنڈہ کرتے ہوئے دیکھ کر قطعاً حیرت نہیں ہوئی کہ ہمیں یو اے ای اور اسرائیل کے معاہدے کو بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کے تناظر میں دیکھنا اور اس حوالے سے قومی سیاسی قیادتوں کی مشاورت کے ساتھ قومی پالیسی وضع کرنا ہوگی۔ گویا جیسے ایف اے ٹی ایف کی پابندیوں سے بچنے کیلئے یکا یک ''قومی مشاورت'' کر کے انسداد دہشت گردی کے قوانین میں متفقہ ترامیم کرائی گئیں، ویسے ہی اب بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ رہنے کیلئے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا تقاضا بھی نبھا لیا جائے۔

ارے بھلے لوگو! یو اے ای اسرائیل معاہدے کے بعد یو اے ای کی جانب سے دعویٰ کیا گیا

ہے کہ اب اسرائیل مزید فلسطینی علاقوں پر قابض نہیں ہوگا' یعنی مسلمانوں کے قبلۂ اول مقبوضہ بیت المقدس سمیت اسرائیل اب تک جتنے فلسطینی علاقوں پر قابض ہو چکا ہے' وہ سب جائز ہے۔ اسرائیل کو تو یواے سی کا یہ دعویٰ بھی گوارا نہیں ہوا اور اسکی جانب سے جھٹ سے یہ وضاحت جاری کر دی گئی کہ ہم فلسطینی اراضی پر اپنے حق سے کبھی دستبردار نہیں ہونگے۔ اس پر بھی ''قومے فروختند چہ ارزاں فروختند'' والی بات ہی صادق آتی ہے۔ کیا ایسے ہی عزائم مقبوضہ و آزاد جموں و کشمیر کے حوالے سے بھارت سرکار کے بھی نہیں ہیں۔ یواے ای اسرائیل معاہدے سے یقیناً پورے کشمیر کو ہڑپ کرنے کیلئے بھارت کے حوصلے بھی مزید بلند ہوئے ہونگے اور اگر ہم خدانخواستہ خود بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیں تو پھر ہم آزاد و مقبوضہ کشمیر پلیٹ میں رکھ کر ہی بھارت کے حوالے کرینگے۔ اس سب سے بڑھ کر میرا تجسس یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ہم نے احکامِ خداوندی کی تعمیل و پاسداری کرنی ہے یا بدلتی دنیا کے تقاضوں کا ساتھ دینا ہے؟ بھائی صاحب! ایسا ہو گیا تو ہماری مسلمانی چہ معنی دارد اور ہم اپنی شہ رگ کے محافظ کیونکر......

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

قومی حمیت اور قومی تشویش

اپوزیشن نے تو سرکاری بنچوں کے ہاتھوں اپنی ہمہ وقت کی تضحیک سے زچ ہو کر سینٹ میں ENOUGH IS ENOUGH کا نعرہ لگایا اور بیک زبان ہو کر اینٹی منی لانڈرنگ ترمیمی بل اور اسلام آباد دارالحکومت وقف املاک کے ترمیمی مسودہ قانون کو مسترد کر دیا جس پر حکومتی عہدیداران بشمول وزراء اور مشیران کرام لٹھ لے کر اپوزیشن کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور اسکے اس اقدام کو قومی مفاد کے منافی قرار دیکر اسے مطعون کیا جا رہا ہے کہ اس نے متعلقہ ترمیمی بل کو مسترد کر کے ایف اے ٹی ایف کی گرے لسٹ سے پاکستان کا نام نکلوانے کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔ اپوزیشن کے زچ ہونے کا معاملہ سرکاری بنچوں کے ہاتھوں صرف اسکی تضحیک کا نہیں بلکہ اس نامعلوم یا خفیہ ایجنڈے سے بھی تعلق رکھتا ہے جس کے تحت قومی مفاد کی آڑ میں ایف اے ٹی ایف کیلئے ترمیم کے متقاضی قوانین میں بعض ایسی ترامیم بھی تجویز کر دی گئیں جو قانون کی شکل میں نافذالعمل ہو جائیں تو ہر پاکستانی شہری بیٹھے بٹھائے قعر مذلت میں جا گرے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اپوزیشن منی لانڈرنگ کے قانون میں ترمیم کے بدلے اپنے لئے این آر او چاہتی ہے جس کیلئے اسکی جانب سے نیب کے قانون میں ترامیم کی ایسی تجاویز پیش کی گئیں کہ انکی بنیاد پر نیب کے ذریعے چور ڈاکو کو پکڑنے کا تصور ہی بے معنی ہو جائے مگر اسکے برعکس اپوزیشن کی جانب سے حکومتی کمیٹی کی پیش کی گئی جن مجوزہ ترامیم کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اس خودمختار ریاست کی عزت و آبرو پر بٹہ لگانے کے مترادف تھیں۔ اس معاملہ کو سب سے پہلے مسلم لیگ (ن) کے خواجہ آصف نے اٹھایا اور نشاندہی کی کہ حکومت مجوزہ ترمیمی بل میں ایک شق یہ بھی شامل کرنا چاہتی تھی جس کے تحت ملک کے کسی بھی شہری کو بلاتحقیق اٹھا کر چار ماہ کیلئے غائب کیا جا سکتا ہے اور متعلقہ ایجنسی کی جانب سے یہ اختیار ریاست پاکستان کے نام پر استعمال کیا جانا مقصود تھا۔ یہی نشاندہی دو روز قبل سینٹ میں

انسداد منی لانڈرنگ ترمیمی بل پیش ہونے کے موقع پر پیپلز پارٹی کے عہدیداروں اور سینیٹروں رضا ربانی خان اور شیری رحمان نے تشویشناک لہجے میں کی اور ایسا قانون تجویز کرنیوالے حضرت یا حضرات کے ذہن میں موجود اصل کہانی کا کھوج لگانے کا تقاضا کیا۔

ایسی مخصوص ذہنیت والے عناصر جنہیں ''لبرلز'' کا بھی ٹائٹل مل چکا ہے، ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں موجود ہیں۔ مشرف کے دور میں ایسی ذہنیت کے حامل عناصر کی جانب سے انسداد دہشت گردی ایکٹ میں ایک ترمیمی شق ڈلوادی گئی جس کے تحت امور حکومت پر اختلاف رائے کا تحریر وتقریر کے ذریعے اظہار کرنے اور شائع کرنیوالے افراد کیخلاف دہشت گردی کا مقدمہ درج کرنے کی گنجائش نکال لی گئی۔ میں اس وقت پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (دستور) کا صدر تھا چنانچہ میں نے اس پر مختلف فورمز پر صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ آزادی صحافت اور آزادئ اظہار رائے کو سلب کرنے کا انتہائی کرخت ہتھکنڈہ تھا۔ اس پر سوسائٹی کے دوسرے طبقات کی جانب سے بھی آواز اٹھی تو متعلقہ ترمیمی شق واپس لے لی گئی۔

ابھی ایک سنگین معاملہ پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کے سبکدوش ہونیوالے مینجنگ ڈائریکٹر رائے ناصر منظور نے اٹھایا ہے جو ''لبرلز'' کے ایجنڈے پر قومی غور وفکر اور ٹھوس تحقیق کا متقاضی ہے۔ انہوں نے اوکسفورڈ اور کیمبرج جیسے 31 غیر ملکی طباعتی اداروں کی مرتب کردہ ایک سو سے زائد کتب اپنی گرفت میں لیں جو ہمارے ''اعلیٰ پائے'' کے نجی تعلیمی اداروں کے نصاب میں بطور درسی کتب شامل ہیں جن میں حضرت نبیؑ آخرالزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبین ہونے کی خدا تعالیٰ کی جانب سے گواہی دینے والی آیات قرآنی کو یکسر نکال دیا گیا یا ان میں ردوبدل کر دیا گیا۔ یہ جرم سیدھا سیدھا توہین رب کائنات اور توہین رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرے میں آتا ہے اور مسلمانوں کے ایمان اور عقیدہ پر حملہ آور ہونے کے مترادف ہے۔ اسی طرح نشان زدہ کتب میں انبیاء وصحابہ کرام کی شان میں گستاخانہ الفاظ شائع کئے گئے ہیں اور نعوذ باللہ اذان کی آواز کو آلودگی پھیلانے والی آواز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شعائر اسلامی کو ایسے نجس اور گھٹیا انداز میں تحقیر کا نشانہ بنانے کا اسلام دشمن طاغوتی طاقتوں کا ایجنڈا تو کوئی ڈھکا چھپا نہیں مگر ہمیں تشویش تو ملک میں موجود ان عناصر کے حوالے سے ہے جو الحادی قوتوں کے اس ایجنڈے کو یہاں درسی کتب کے ذریعے فروغ دینے کی مذموم کوششوں میں مگن ہیں۔ کیا اندازہ لگایا جا سکتا

ہے کہ ایسی درسی کتب کا مطالعہ کرنیوالے طلبہ و طالبات کے ذہنوں میں دین اسلام اور شعائر اسلامی کا کیا خاکہ بنتا اور محفوظ ہوتا ہوگا۔ رائے ناصر منظور نے اسی تناظر میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل متعلقہ کتب پکڑیں اور ان میں شعائر اسلامی کے منافی مواد نکال کر از سرنو مرتب کرنے کی ہدایت کی جو الحادی ایجنڈے کے اسیر عناصر کو گوارا نہیں ہوا اور انہوں نے نشان زدہ مواد متعلقہ درسی کتب سے نکالنے کے بجائے اپنے اثر ورسوخ سے اس حکومت کو رائے ناصر منظور کو انکے عہدے سے جھٹ پٹ فارغ کرنے پر مجبُور کر دیا جس کے وزیر اعظم ملک میں یکساں قومی نصاب کیلئے متحرک ہیں اور وطن عزیز کو ریاست مدینہ کے قالب میں ڈھالنے کیلئے فکرمند رہتے ہیں۔ اگر نجی تعلیمی اداروں کے نصاب میں یہ کتب بدستور شامل رہتی ہیں تو اس سے شعائر اسلامی میں غتر بود کا بیڑہ اٹھانے والی فارن فنڈڈ این جی اوز کو کھل کھیلنے کا مزید نادر موقع ملے گا اس لئے رائے ناصر منظور کی جانب سے اپنی نوکری کو داؤ پر لگا کر اٹھائے گئے اس سنگین معاملہ پر قومی حمیت کے تقاضوں کے تحت قومی تشویش کی فضا ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے بدطینت عناصر کو حکومتوں کی سرپرستی میں یا انکی معنی خیز خاموشی کے باعث قومی حمیت وخودداری کو بٹہ لگانے والے اپنے ایجنڈے کو پھیلانے اور بطور قانون رائج کرانے کا موقع ملتا ہے تو پھر آج کے دورِ ناپُرساں میں اس تاسف ہی کا اظہار کیا جاسکتا ہے کہ.....ع

حمیت نام تھا جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

''یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو''

ان دنوں سوشل میڈیا پر بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کی ایک رعونت بھری تقریر کی ویڈیو وائرل ہو رہی ہے۔ یہ تقریر انہوں نے یقیناً ایک خالصتاً ہندو اجتماع میں ہندوتوا پر مبنی اپنے عزائم اجاگر کرنے اور اپنے ہندو انتہاء پسندی پر مبنی ایجنڈا پر ہندوؤں کو خوش اور مطمئن کرنے کیلئے کی ہے جس میں وہ بالخصوص وادیٔ کشمیر کو ہندو ریاست کا حصہ بنانے کیلئے سرانجام دیئے گئے اپنے ''کارنامے'' گنوا کر اپنے اگلے عزائم کا اشارہ دے رہے ہیں۔ اس اجتماع میں وہ یہ کہہ کر ہندو برادری سے اپنے لئے تالیاں پٹوانے کا اہتمام کرتے ہیں کہ ''رام مندر ٹرسٹ بنانے کا کام۔ ڈن' دفعہ 370 ہٹانے کا فیصلہ ڈن' جموں و کشمیر و لداخ کو پردیش بنانے کا کام۔ ڈن اور سٹیزن شپ ترمیمی ایکٹ کی دفعہ 3۔ ڈن۔'' اسکے بعد وہ رعونت کے ساتھ بڑ مارتے ہیں کہ یہ تو ایک سیمپل ہے اور اس سیمپل سے آپ کو پتہ لگ گیا ہو گا کہ ہم اصل کام کیا کرنا چاہتے ہیں۔ بھئی یہ کام اب کسی سے ڈھکا چھپا تو نہیں رہا' بس ہم نے ہی اپنی آنکھوں پر موٹی تہہ کی پٹی باندھ رکھی ہے۔

''جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے
باغ تو سارا جانے ہے''

کشمیر کو ہڑپ کرنے کا کام تو ہندو بنیاء قیادتوں نے تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی شروع کر دیا تھا۔ وہ کشمیر جو ہماری لائف لائین ہے' بانیٔ پاکستان قائداعظم کی اعلان کردہ شہ رگِ پاکستان ہے جس کے ساتھ ہماری زرعی' اقتصادی ترقی اور ہمارا مستقبل وابستہ ہے' جس کا پاکستان کے ساتھ الحاق تقسیم ہند کے وضع کردہ اور تسلیم شدہ فارمولے کے تحت مسلم اکثریتی آبادی ہونے کے ناطے ہمارے یقین کی حد تک نوشتۂ دیوار ہے اور جس کے باسی خود ہی اپنا مستقبل اور مقدر

پاکستان کے ساتھ وابستہ کر چکے ہیں۔ ارے بھائی صاحب! وہ کشمیر تو قیام پاکستان کے وقت سے ہی پنجۂ ہنود میں ہے اور آج یہ پنجہ انتہائی شاطر، مکروہ، جنونی، مکار و عیار اور کینہ پرور نریندر مودی کا پنجہ بن چکا ہے جو اپنے ناجائز زیر تسلط کشمیر ہی نہیں، پاکستان کے ساتھ ملحقہ آزاد جموں و کشمیر اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات پر بھی اپنی بد نظریں گاڑے بیٹھا ہے۔

مودی کی یہ سوچ اکیلے مودی کی تو نہیں، مہا بھارت کے ایجنڈے پر کاربند ہر جنونی ہندو کی سوچ ہے اس لئے ہمیں بھارت کی جانب سے مودی کا نہیں بلکہ ہندوتوا کا سامنا ہے اور پاکستان کو دوبارہ اپنا حصہ بنانا اسکے ایجنڈے کا بنیادی نکتہ ہے۔ آپ اس ارض وطن اور کشمیر کے حوالے سے ہندوتوا کی تاریخ کا جائزہ لیں تو اسکے سارے عزائم کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ تقسیم ہند کے مراحل میں کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق کسی شک وشبہ سے بالاتر تھا مگر اس خطے کی اہمیت کا ادراک رکھنے والی ہندو بنیاء لیڈر شپ نے قیام پاکستان کے ساتھ ہی کشمیر کا اسکے ساتھ الحاق ناممکن بنا دیا اور اس کیلئے ڈوگرہ مہاراج کے ساتھ ایک جعلی معاہدۂ بیع کو اچھالا گیا۔ یہ ایسا ہی من گھڑت معاہدہ ہے جیسا اٹھارہویں صدی میں صیہونیوں کو ارضِ فلسطین پر آباد کرانے کیلئے طے پانے کا دعویٰ ہوا تھا۔ آج فلسطین پنجۂ یہود میں ہے تو اسی تناظر میں کشمیر پنجۂ ہنود میں ہے اور امتِ واحدہ کی سوچ ہنود و یہود گٹھ جوڑ کی اسیر ہو چکی ہے۔ سو ہماری ''کردنیاں'' ایسی ہیں کہ ''انہیں دیکھ کے شرمائیں یہود''۔

مودی تو آج چٹے ننگے للکارے مار رہا ہے مگر اس سے پہلے کے کانگرسی ہندو بنیاء لیڈروں نے بھی کچھ کم تو نہیں کیا۔ قیام پاکستان کے بعد کشمیر کو متنازعہ بنانا پنڈت جواہر لال نہرو کی خانہ ساز سازش تھی جو مہاراجہ ہری سنگھ کے جعلی معاہدے کے ساتھ اقوام متحدہ جا پہنچا۔ پھر بھی سلامتی کونسل نے کشمیریوں کے بے پایاں عزم کے ناطے ان کا استصواب کا حق تسلیم کیا اور نہرو کو کشمیر میں رائے شماری کے اہتمام کی ہدایت کی تو اقوام متحدہ کے فورم پر اس کا وعدہ کرنے کے باوجود نہرو نے واپس آکر کشمیر کے بھارتی اٹوٹ انگ ہونے کا پراپیگنڈہ شروع کر دیا اور پھر اس ہٹ دھرمی کو مزید پختہ کرتے ہوئے بھارتی آئین کی دفعہ 370 میں ایک ترمیمی شق ڈال کر اپنی زیر قبضہ ریاست جموں

و کشمیر کو خصوصی حیثیت کے ساتھ بھارتی ریاست کا درجہ دے دیا۔ کشمیری عوام اس بھارتی تسلط سے آزادی کیلئے بھارتی فوجیوں کی سنگینوں اور گولیوں کے آگے سینہ سپر ہو کر اپنی جانیں مادر وطن پر نچھاور کرتے رہے مگر ہندو جنونیت میں کوئی کمی آئی نہ بنیا لیڈر شپ کی جبینوں پر خجالت کا کوئی قطرہ نمودار ہوا۔ نہرو کے جانشین لال بہادر شاستری نے گیدڑ والی کینہ پروری کے تحت پاکستان پر ستمبر 1965ء میں جنگ مسلط کر دی اور پھر نقصان اٹھا کر اقوام متحدہ کے ذریعے پاکستان کے ساتھ امن معاہدہ کر لیا مگر کشمیریوں کے استصواب کے حق کیلئے اقوام متحدہ کی قراردادوں سے انحراف کی پالیسی برقرار رکھی۔ نہرو کی لاڈلی اندرا گاندھی نے ''موراوور'' کیا۔ پاکستان پر دسمبر 1971ء میں جنگ مسلط کی۔ مکتی باہنی کی کمک حاصل کی اور اسکی مدد سے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ ساتھ ہی یہ بڑ ماردی کہ آج ہم نے دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے۔

یہ پاکستان کیلئے بہت کڑا وقت تھا۔ اسکی 90 ہزار سے زائد فوجیں بھارت کی قید میں تھیں، مشرقی پاکستان تو کٹ گیا تھا، مغربی پاکستان کے بھی بہت سے علاقے بھارت کے زیر تسلط آ چکے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو بچے کھچے پاکستان کے صدر بن کر اسکی تعمیر نو کیلئے فکر مند تھے اور انہی نامساعد حالات سے فائدہ اٹھانے کیلئے اندرا گاندھی نے ایک نئی سازش کا جال پھینکا۔ بھٹو کو انکی فیملی اور کابینہ سمیت سرکاری دورے پر بھارت مدعو کیا اور شملہ لے جا کر انکے ساتھ 1972ء کا معاہدہ طے کر لیا جس کا مقصد کشمیریوں کے حق رائے سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادیں غیر مؤثر بنانا تھا۔ اس معاہدے کے تحت پاکستان کو پابند کر دیا گیا کہ وہ کسی دوطرفہ تنازعہ کے حل کیلئے کسی علاقائی یا عالمی فورم سے رجوع نہیں کریگا اور پاکستان بھارت خود دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے باہمی تنازعات حل کرینگے۔

بھارت اس شملہ معاہدہ کو ہی ڈھال بنا کر اقوام متحدہ اور سارک سربراہ کانفرنس سمیت ہر عالمی اور علاقائی فورم پر کشمیریوں کے حق خودارادیت سے متعلق سلامتی کونسل کی قراردادوں کی اب تک مخالفت کرتا رہا ہے جبکہ اس نے تنازعہ کشمیر کے حل کیلئے شملہ معاہدہ کی بنیاد پر کبھی دوطرفہ مذاکرات کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔ مودی سرکار نے تو اب کشمیر کو مستقل ہڑپ کرنے کیلئے

بھارت کی سابقہ ہندو بنیاء قیادتوں کے مشن کو مہمیز لگائی ہے اور مزید یہ کیا ہے کہ مسلم اکثریتی آبادی ہونے کے ناطے کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا ہمارا کیس غارت کرنے کی سازش کی ہے۔ اس خانہ ساز سازش کے تحت مودی سرکار نے گزشتہ سال پانچ اگست کو وادی کشمیر پر بھارتی پارلیمنٹ کا سہارا لے کر شب خون مارا اور آئین میں موجود اسکی خصوصی حیثیت ختم کرادی۔لداخ کو جموں سے کاٹا اور پھر ان دونوں کو الگ الگ طریق کار کے تحت بھارتی سٹیٹ یونین کا حصہ بنالیا۔اس کیلئے مودی سرکار نے دنیا بھر میں ہونیوالے کسی احتجاج اور کسی مذمت وتشویش کی پرواہ نہیں کی۔

اسکی جنونیت یہیں پر نہیں رکی بلکہ اس نے بھارتی شہریت ایکٹ میں ترمیم کر کے ہر اس ہندو کو اپنی مقبوضہ ریاستوں جموں اور لداخ کا ڈومیسائل حاصل کرنے کا حق دے دیا جو وہاں ملازمت کرتا رہا ہو یا کر رہا ہو اور کسی بھی دوسری حیثیت میں ان مقبوضہ ریاستوں میں مقیم رہا ہو۔ جی جناب! یہی وہ اصل کام ہے جس کے کرنے کا مودی نے اپنی رعونت بھری تقریر میں حوالہ دیا تھا۔ یہ کام وادئ کشمیر کو مسلم اکثریتی آبادی کے سٹیٹس سے نکال کر ہندو اکثریتی آبادی میں تبدیل کرنے کا ہے اور مودی سرکار سرعت کے ساتھ یہ کام کئے جا رہی ہے مگر ہم ایسے خوش فہم ہیں کہ کشمیریوں کی بھارتی تسلط سے آزادی کی منزل حاصل ہوتی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ حضور! آنکھوں سے دبیز تہوں والی پٹی اب اتار دیجئے۔ ہندوتوا کی سوچ اب ارض فلسطین پر غالب ہونیوالی صیہونی سوچ کی طرح ارض کشمیر پر غالب ہوتی نظر آ رہی ہے..... ؎

گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

اور خیالوں، خوابوں، سرابوں سے باہر نکل کر حقائق کا سامنا کیجئے اور کشمیر کو بچانے کا خیالی پلاؤ مت پکائیے۔اپنے ہاتھوں لٹنے کے بعد کس کو دوشی ٹھہراؤ گے۔

''اے چاند یہاں نہ نکلا کر''

سانحۂ موٹروے میں وحشیانہ زیادتی کا شکار ہونیوالی فرانسیسی نژاد خاتون کے دلدوز واقعہ پر قومی سوگ کی فضا طاری تھی اور اس فضا میں بھی ''محافظ'' لاہور (سی سی پی او) دیدہ دلیری کے ساتھ اس مظلوم خاتون کو ہی اپنے ساتھ ہونیوالی درندگی پر ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے اور اس بیان کے ردعمل میں ملک بھر میں مختلف حلقوں کی جانب سے اور سوشل میڈیا پر سخت تنقید کی زد میں آنے کے باوجود حکمرانوں کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے کہ گھمبیر ہوتی اداسی و وحشت کے اس ماحول میں قوم کی انتہائی مظلوم و بے بس بیٹی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بہن ڈاکٹر فوزیہ صدیقی کا غم واندوہ میں ڈوبا ہوا ایک مراسلہ مجھے اپنی ای میل سے موصول ہوا۔ میں نے کپکپاتے ہاتھوں اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ اس مراسلہ کا مطالعہ کیا' ماحول پر پہلے ہی وحشت طاری تھی اور اداسی کی چادر تنی ہوئی نظر آرہی تھی۔ مراسلہ پڑھنے لگا تو اس کا ایک ایک لفظ پتھر کی طرح برس کر دل ودماغ کو زخمی کرتا گیا۔ اس مراسلے کے چیدہ چیدہ حصے اس امید کے ساتھ آپکے سامنے رکھ رہا ہوں کہ شاید آپ میرا غم بانٹنے میں مددگار ہوسکیں۔ ڈاکٹر فوزیہ یہ کہہ کر میرے ساتھ اپنا غم شیئر کررہی ہیں کہ اس ماہ ستمبر میں اس دعا کے ساتھ میں ایک مرتبہ پھر آپ سے مخاطب ہوں کہ آپ کے مؤقر روزنامہ کی کاوشوں اور آپ کی تحریروں کی بدولت امریکی جیل میں پاکستان کی بیٹی ڈاکٹر عافیہ کی اذیتوں' صعوبتوں کا عرصہ شاید کچھ کم ہوجائے۔ اس مراسلہ میں سانحۂ موٹروے پر کڑھنے والی قوم کو اطلاع دی گئی ہے کہ جرم بے گناہی کی پاداش میں اس ماہ 23 ستمبر کو ڈاکٹر عافیہ کی ناانصافی پر مبنی 86 سالہ سزا کے دس سال مکمل ہوجائیں گے جبکہ 2003ء کو وحشیانہ انداز میں کی گئی اسکی گرفتاری سے اب تک وہ گوانتاناموبے کے عقوبت خانے اور امریکی جیل میں ناروا قید کے 17 سال چھ ماہ گزر چکی ہے۔ اسکی گرفتاری کا زمانہ وہ ذلت آمیز زمانہ تھا جب امریکی فرنٹ لائن اتحادی ہونے کے ناطے

ہمارے شہریوں کو معمولی ڈالروں کے عوض امریکہ کے حوالے کردیا جاتا تھا جس پر ایک امریکی صحافی نے پھبتی کسی تھی کہ پاکستانی تو چند ڈالروں کے عوض اپنی ماں کو بھی فروخت کردیتے ہیں اور ہمارے اس وقت کے کمانڈو جرنیل صدر مشرف نے تو اپنی کتاب ''ان دی لائن آف فائر'' میں ہزیمتوں میں ڈوبے اس کردار کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔

اگر اس قوم کے ذہنوں سے ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر ٹوٹنے والی قیامت محو ہوگئی ہے تو میں ڈاکٹر فوزیہ صدیقی کے اس مراسلے میں آہ و بکا کرتے الفاظ کے ذریعے ہی ڈاکٹر عافیہ پر غم و اندوہ کے پہاڑ توڑنے والے اس لمحے کی یاد تازہ کردیتا ہوں۔ جب 2003ء میں اسے اسکے بچوں سمیت کراچی سے حراست میں لے کر غائب کیا گیا اور وحشیانہ تشدد کی بھینٹ چڑھا کر افغانستان کی بگرام جیل میں گلنے سڑنے کیلئے پھینک دیا گیا۔ امریکہ ہی سے فارغ التحصیل ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نفیس خاتون پر ایک امریکی فوجی کی بندوق چھین کر اسے مارنے کی کوشش کرنے کا بے سروپا الزام لگایا گیا۔ عقوبت خانے میں اسکے ساتھ امریکی ''مہذب'' معاشرے کے بندوق بردار باوردی انسانوں نے انسانیت کو شرما دینے والا جو سلوک روا رکھا اور جس طرح اسکے معصوم بچوں کو اس سے چھین کر غائب کیا گیا' وہ ہمارے ''وحشی'' اور ''جانگلی'' معاشرے میں رونما ہونیوالے ننگ انسانیت واقعات سے کچھ کم تو نہیں ہے اور ہماری حمیت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر عافیہ پر ٹوٹنے والی اس قیامت پر انسانی حقوق بالخصوص خواتین کے حقوق کی دہائی دینے والی موم بتی فیم کسی ایک بھی تنظیم کو آج تک کسی ہلکے سے احتجاج یا مذمتی بیان جاری کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ ایک بے گناہ خاتون کو چھیاسی سال کی قید کی سزا ملنے پر تو عرش کے کنگرے بھی ہل گئے ہونگے کہ...... ''افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر'' مگر ہمارے معاشرے میں انسانیت کی دہائی دینے والوں میں سے کسی کا دل نہیں پسیجا۔

ڈاکٹر عافیہ کو 2010ء میں مقدمہ کی کارروائی کے دوران زخمی حالت میں امریکی عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے بھری عدالت میں جج سے مخاطب ہوتے ہوئے فریاد کی تھی کہ ''میں پاگل نہیں ہوں' میں ایک مسلمان عورت ہوں' مجھے مرد فوجی برہنہ کرکے تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور میرے قدموں میں قرآن ڈالا جاتا ہے''۔ اگر عدالت میں موجود کسی انسان کے سینے میں دل ہوتا تو عافیہ کی فریاد سن کر شدت جذبات سے پھٹ جاتا مگر وہاں تو انسانوں کے روپ میں موجود یا وحشی

بھیڑیے تھے یا ایک نہتی عورت سے خوف کھانے والے پینٹا گون کے اشاروں پر ناچنے والی پتلیاں گویا......

اسی کا شہر' وہی مدعی' وہی منصف
مجھے یقین تھا میرا قصور نکلے گا

انہوں نے تو اپنی کر لی مگر بھائی صاحب! ہم نے کیا کیا؟ جناب! ادھر بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا کہ......

سارے اس کے ہمجولی تھے
کرتا کون بغاوت یارا

حضور! مشرف تو مشرف' سابق صدر آصف علی زرداری اور سابق وزیر اعظم نواز شریف کی حکومتوں نے بھی اقتدار کے پانچ پانچ سال گزار لئے مگر پاکستان کی بیٹی عافیہ کی ناروا قید پر کسی کی جبینِ نیاز پر عرق انفعال کا کوئی ایک قطرہ بھی نمودار نہیں ہوا۔ آج ریاست مدینہ کے عزم والا دور ہے اور ریاستی ادارہ جاتی ہم آہنگی والے اس مثالی دور میں بھی ڈاکٹر عافیہ کے دو سال امریکی جیل میں گزر گئے ہیں جس کے ساتھ اسکے اہلخانہ کا ٹیلی فونک رابطہ بھی ممکن نہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ کے بقول اس نے امریکی جیلوں میں کووڈ۔19 کے پھیلاؤ کی تشویشناک اطلاعات موصول ہوتے ہی فوری طور پر 12/ مارچ 2020ء کو صدر مملکت ڈاکٹر عارف علوی' وزیر اعظم عمران خان' وزیر خارجہ مخدوم شاہ محمود قریشی' وزیر برائے انسانی حقوق ڈاکٹر شیریں مزاری اور گورنر سندھ عمران اسماعیل کو مراسلے بھجوائے کہ ڈاکٹر عافیہ کی خیریت معلوم کی جائے اور اسے جیل سے آزاد کرانے کا تردد کیا جائے۔ اس بارے میں اب تک یاد دہانی کے 159 خطوط بھجوا چکی ہیں مگر کوئی محمد بن قاسم کہاں سے آئے جو سندھ کی ایک بیٹی کی فریاد سن کر لاؤ لشکر کے ساتھ مدد کو آ پہنچے اور بیڑا پار ہے۔ امرتا پریتم کی اس نظم پر بھی سارے ہمجولیوں کا دل کیوں پسیجے کہ......

آج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول
توں اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول

اک روئی سی دھی پنجاب دی، تو لکھ لکھ مارے وین

اج لکھاں دھیاں روندیاں، تینوں وارث شاہ نوں کہن

ہمیں اپنے وحشی، جنگلی اور ننگ انسانیت معاشرے میں سانحۂ موٹر وے پر گھن آتی ہے اور آنی بھی چاہیے کہ اپنے ساتھ ہونیوالی درندگی پر آج حوا کی بیٹی بین ڈالنے کی سکت سے بھی محروم ہو چکی ہے اور ہر ایک سے ایک ہی فریاد کر رہی ہے کہ مجھے گولی مار دو مگر اس پر بھی محافظ لاہور اس کا ٹھٹھہ مذاق اڑاتے ہیں اور حکمرانوں کو انکی یہ ''ادا'' بھی بھلی محسوس ہوتی ہے تو جناب ایسے سفاک معاشرے میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے ساتھ درندگی کا مظاہرہ کرنے اور اسکے بے بس جسم کو نوچنے، چچوڑنے والے ہمجولیوں سے اسے چھڑانے کے تردد کی توقع کرنا بھائی صاحب! بھینس کے آگے بین بجانا ہی تو ہے......

یہ دیس ہے اندھے لوگوں کا

اے چاند یہاں نہ نکلا کر

''دامن کو ذرا دیکھ' ذرا بند قبا دیکھ''

میرا خیال تھا کہ ماضی کے تلخ تجربات سے سبق سیکھتے ہوئے ہمارے قومی سیاسی قائدین بارہ اکتوبر کو یکجہت ہو کر جمہوریت کے استحکام و عملداری کا تردد کرینگے مگر یہ تو ابھی تک اپنے اپنے پانچ جولائی اور بارہ اکتوبر ہی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بھئی! اگر آپ کو پانچ جولائی 1977ء کا مارشل لائی ماورائے آئین اقدام اب بھی جائز نظر آتا ہے اور آپ اس اقدام کو اپنے تئیں سول آمریت سے نجات سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی طرح پانچ جولائی کے ڈسے ہوؤں کو بارہ اکتوبر 1999ء والے جرنیلی ماورائے آئین اقدام میں اپنے تئیں ہی سول آمریت سے چھٹکارا ملتا نظر آیا تھا تو پھر آپ نے تاریخ سے سبق کیا حاصل کیا۔ تاریخ کا سبق تو یہ ہوتا کہ آپ پانچ جولائی اور بارہ اکتوبر کو متحد اور متفق ہو کر یوم سیاہ سے تعبیر کرتے اور جمہوریت کی عملداری کو اپنی جانب سے کوئی گزند نہ پہنچنے دینے کا عہد کرتے۔ آپ تو ان دونوں دنوں کے ڈسے ہوئے سارے قائدین آج پی ڈی ایف کے پلیٹ فارم پر اکٹھے بھی ہیں اور مشترکہ احتجاجی تحریک کا شیڈول بھی طے کر چکے ہیں مگر 12 / اکتوبر کو کوئی مشترکہ احتجاجی پروگرام رکھنے کی آپ کو اب بھی توفیق نہیں ہوئی۔ بس مسلم لیگ (ن) کی جانب سے بارہ اکتوبر کو بطور یوم سیاہ منانے کا اعلان ہوا اور ماورائے آئین اقدامات کا سیاپا کرنے والے کسی دوسرے جمہوریت پرست کے ماتھے پر بل تک نہیں پڑا۔ حضور! اگر آج بھی پانچ جولائی اور بارہ اکتوبر آپ کے اپنے اپنے ہیں تو اس میں جمہوریت کو کشید کرنیوالا نسخہ کیسے کارگر ہو سکتا ہے......

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

اور یہ کیا کمال ہوا ہے کہ ماورائے آئین اقدامات کے موردالزام ٹھہرنے والوں نے خود ہی

آئین و قانون کی عملداری و تابع فرمانی کا راستہ چن لیا ہے اور اس پر سختی سے کاربند بھی ہونگے۔ ہیں۔ اس عملداری و تابع فرمانی میں عساکر پاکستان نے بطور ادارہ حکومت کی چھتری کے نیچے کام کرنا ہوتا ہے اور اپنے لئے وقتاً فوقتاً صادر ہونیوالے اسکے احکام کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ حکومت کس کی ہے' اس سے انہیں غرض نہیں ہوتی' انہوں نے ملک کے اندرونی اور بیرونی استحکام کیلئے حکومت کو معاونت فراہم کرنا ہوتی ہے جس کیلئے آئین کی دفعہ 245 اور آئین کے تھرڈ شیڈول میں شامل عساکر پاکستان کے حلف نامہ کی عبادت عساکر پاکستان کے فرائض کی انجام دہی کے معاملہ میں مکمل واضح ہے۔

عساکر پاکستان اپنی قیادتوں کے ماتحت گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے آئین و قانون کی عملداری اور تابع فرمانی میں رہ کر ہی تو فرائض سرانجام دے رہی ہیں تو حضور! آپ کیلئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے' ماورائے آئین اقدام کا ماضی والا تصور اب قابل عمل اور قابل پذیرائی ہی نہیں رہا۔ آپ 2005ء سے اب تک کے اپنے معاملات کا تو جائزہ لیجئے۔ آپ نے اے آر ڈی کے پلیٹ فارم پر خود کو میثاق جمہوریت کے ساتھ باندھ کر اپنی مخالف حکومت کو گرانے کیلئے ماورائے آئین اقدام والوں کو آئندہ اپنا کندھا فراہم نہ کرنے کا عہد کیا۔ اے پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم پر جمہوریت پر کوئی مفاہمت نہ کرنے کا عہد کرتے ہوئے جرنیلی آمریت کے ماتحت ہونیوالے انتخابات کے بائیکاٹ کے فیصلہ تک آ پہنچے۔ مگر آپ کی جانب سے بدعہدی میثاق جمہوریت کے ساتھ بھی ہو گئی اور انتخابات کے بائیکاٹ کے فیصلہ کے ساتھ بھی۔ پھر 2008ء سے اب تک کے اپنے معاملات کا آپ جائزہ لیں تو آپ کی جانب سے ماضی والی محاذ آرائی کی طرح ہر منتخب حکومت کیلئے صبح گیا یا شام گیا والی استوار کی گئی فضا میں جمہوریت کو فروغ و استحکام دینے کی کوشش ہوئی ہے یا گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو کا اہتمام بالالتزام ہوا ہے؟

کیا اسے ماضی کے تلخ تجربات سے سبق سیکھنے سے تعبیر کیا جائے کہ 2008ء کی جمہوریت میں عدالتی فعالیت کے راستے نکلوا کر کسی ماورائے آئین اقدام کی سرعام دعوت جاتی رہی اور 2013ء کی جمہوریت میں امپائر کی انگلی اٹھوانے کا شدومد کے ساتھ ماحول گرمایا جاتا رہا مگر جنرل پرویز کیانی نے فوج کو سیاست سے دور رکھنے کا عہد نبھایا اور جنرل راحیل شریف نے سامنے موجود ترغیبات کے باوجود اس عہد کو نہ صرف تھامے رکھا بلکہ آگے بھی بڑھایا۔ اب جنرل

قمر جاوید باجوہ بھی اپنے پیشرو جرنیلوں کے اسی عہد کی پاسداری کر رہے ہیں۔ اس عہد کی پاسداری میں دو جمہورتیں اپنی پانچ پانچ سال کی آئینی معیاد مکمل کر چکی ہیں اور تیسری جمہوریت اس عہد کی چھتری تلے رواں دواں ہے۔ تو بھائی صاحب! ماضی کے تلخ و حسیں تجربات یا غلطیوں سے سبق آپ نے سیکھا یا ماورائے آئین اقدام والوں نے۔ ''دامن کو ذرا دیکھ' ذرا بند قبا دیکھ''۔

آپ تو پانچ جولائی اور بارہ اکتوبر باہم مل کر منانے کے بھی روادار نہیں ہو رہے اور اُدھر منتخب جمہوری حکومت کا ساتھ دیتے رہنے اور جمہوریت کو کوئی گزند نہ پہنچنے دینے کا عہد ہو رہا ہے اور اس عہد کو عملی جامہ بھی پہنایا جا رہا ہے۔ حضور آپ کو تو ملک کی 73 سالہ تاریخ میں پڑنے والی اس نئی اور خوش آئند روایت پر سرشار ہونا چاہیے کہ ماورائے آئین اقدام والوں نے آئندہ ایسے کسی اقدام کیلئے اپنے اپنے اقتدار کا گندہ کھیل کھیلنے والوں کا کندھا حاصل کرنے سے خود ہی معذرت کر لی ہے اور خود کو اپنی آئینی اور قانونی ذمہ داریوں تک محدود کر لیا ہے۔ آج ایک جماعت اور اتحاد کی حکومت ہے۔ کل آپ کی یا کسی اور کی حکومت ہوگی تو عساکر پاکستان اپنے عہد اور آئینی و قانونی ذمہ داریوں کے تابع حکومت کے وقتاً فوقتاً جاری ہونیوالے احکام کی ہی تعمیل کریگی۔ پھر آپ اودھم کیوں مچا رہے ہیں اور تحریک چلا کر آخر کس پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ادھر سے تو اب کسی حکومت کو گرانے کیلئے اودھم مچانے والوں کو لال جھنڈی دکھائی جا چکی ہے۔ آپ حکومت کی پالیسیوں پر مطمئن نہیں اور حسن اتفاق سے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو چکے ہیں تو آپ کے پاس حکومت کی تبدیلی کا جائز' قانونی اور آئینی آپشن موجود ہے' اسے آزمائیں۔ اسمبلیوں میں اپنے مخالف صدر' وزیراعظم' وزرائے اعلیٰ اور قومی و صوبائی سپیکروں کیخلاف مواخذہ اور عدم اعتماد کی تحریکیں لائیں اور اپنی عددی اکثریت دکھا کر تبدیلی لے آئیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ مگر صاحب! آپ جمہوریت کی پاسداری کے دوسروں سے متقاضی ہو کر خود پانچ جولائی اور بارہ اکتوبر بھی باہم مل کر نہیں منا سکتے تو آپ کے میثاق جمہوریت اور میثاق پاکستان کس کام کے۔ جمہوریت اگر ٹریک پر چل نکلی ہے تو اسے ٹریک پر ہی رہنے دیں اور ماضی کی غلطیوں سے کچھ سبق بھی سیکھ لیں۔ اب کی بار کوئی غلطی آپ کو سنبھلنے کی مہلت بھی نہیں دیگی اور لمحوں کی خطا صدیوں کی سزا پر محیط ہو جائیگی۔

میکرون کی مکروہ حرکت

سرور کائنات، رحمت للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت والے مقدس مہینے ربیع الاول کے آغاز ہی میں اگر فرانس کے صدر میکرون فرانسیسی جریدے میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کی ستائش کرتے ہیں اور پھر یہ خاکے فرانس کی دیواروں پر چسپاں کرنے کی بھی اجازت دے دیتے ہیں تو کیا یہ محض آزادیٔ اظہار کے تحفظ کی یقین دہانی کا گھسا پٹا ڈرامہ ہے یا اسکے پیچھے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خلاف الحادی قوتوں کے بغض کا عملی مظاہرہ مقصود تھا؟۔ ہمارے لبرل (درحقیقت بغض دین اسلام سے معمور) مادر پدر آزاد طبقات کو تو فرانس میں سرکاری سرپرستی میں ہونے والی اس مذموم و مکروہ حرکت بھی آزادیٔ اظہار کے تحفظ کی کوشش ہی نظر آتی ہے جنہوں نے سوشل میڈیا پر اس دانستہ تخریب کاری اور شان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہونے والی اس گستاخی پر مسلم اُمہ بالخصوص ترک صدر رجب طیب اردوان کے سخت ردعمل کو اپنی عاجلانہ تنقید کے ہدف پر رکھا ہوا ہے۔ میکرون کا مذہب مسیحیت بتایا جاتا ہے مگر ہماری مسیحی برادری بھی اس کی اس قبیح حرکت پر برافروختہ اور شرمندہ ہے۔ اگر شرم نہیں آتی تو شہری آزادیوں کے نام نہاد چیمپئن ہمارے ''آزاد خیال'' لبرل طبقات کو۔ بھئی آپ فرانس یا دوسرے مغربی معاشروں میں جہاں مسیحی، یہودی یا دوسرے غیر مسلم طبقات اکثریت میں ہیں، حضرت عیسیٰ، مسیحیت، صیہونیت اور ان کی مقدس کتابوں کے بارے میں ہلکے سے بھی گستاخانہ کلمات ادا کر کے تو دیکھیں، آپ کا آزدیٔ اظہار کا فلسفہ بتی بنا کر آپ کو گھسیٹر دیا جائے گا۔ کبھی سیکولر بھارت میں گاؤ ماتا کی شان میں گستاخی کر کے دیکھیں۔ آپ کو آپ کے آزادیٔ اظہار کے ساتھ ہی چیتھڑوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اگر رحمت للعالمین کی شان میں گستاخی پر آپ کا دل بلیوں اچھلتا ہے تو آپ کے دل میں چھپا دین اسلام کے خلاف کوئی نہ کوئی خناس ہی آپ کی سرخوشی کا اہتمام کرتا ہے۔

میکرون کی اس قبیح حرکت کے بعد اگر فرانس میں اب مسلم کش فسادات کی بھی سرپرستی کی جا

رہی ہے جس کے دوران پیرس کی سب سے بڑی مسجد پر حملہ ہو چکا ہے اور مسلمانوں کو چن چن کر زد وکوب کرنے کا سلسلہ جاری ہے تو بھائی صاحب! کیا یہ محض آزادیٔ اظہار کے تحفظ کے لئے ہو رہا ہے۔ ہمارے دین نے تو ہمیں رواداری کا درس دیا ہے اور تمام انبیاء کرام اور ان کے مذاہب کا احترام ہمارے ایمان کا حصہ ہے جن کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر کیا کوئی عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیارے آقا کی شان میں گستاخی اور عمداً صریحاً گستاخی کو آزادیٔ اظہار کی منطق کی بنیاد پر برداشت کر لے۔ آپ ایسے مکروہ فلسفوں کو اپنے پراگندہ ذہن میں ہی سنبھال کر رکھیئے۔ شمعِ رسالتؐ پر مر مٹنے والے پروانوں کو حرمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تحفظ و دفاع کرنا آتا ہے۔ انہیں چیلنج مت کیجئے۔ شرفِ انسانیت محسنِ انسانیتؐ سے ہی منسوب ہے۔ ان کے حوالے سے کہیں کوئی اپنی گندی سوچ کا اظہار اور ذہنی خلجان کا مظاہرہ کرے گا تو بدبخت میکرون اور اس قبیل کے دوسرے جنونیوں کی تواضع گندے انڈوں سے بھی ہو گی اور ایسے گندے انڈوں کی دوسرے طریقوں سے خبر لینا بھی جائز ہوگا۔

اس سوچ کے حامل لوگ ہی زمین پر فتنے اُٹھانے اور فساد برپا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر کسی ملک کا صدر بھی ایسے فسادیوں کی صف میں شامل ہو تو وہ بین المذاہب ہم آہنگی کے بجائے تصادم کی راہ ہی ہموار کرے گا اس لئے فرانسیسی صدر کی اس حرکت پر مسلم دنیا کے رسمی مذمتوں والے نہیں، مؤثر اور عملی ردِعمل کی ضرورت ہے جس کا آغاز ترک صدر اردوان نے فرانس کی مصنوعات کے بائیکاٹ کا اعلان کر کے اور ترکی کے سفیر کو فرانس سے واپس بلوا کر کیا۔ ساتھ ہی میکرون کو اپنے دماغی علاج کا مشورہ بھی دیا۔ مگر مجموعی طور پر تو مسلم اُمہ کی قیادتیں منافقانہ مصلحتوں کے لبادے میں ہی لپٹی نظر آتی ہیں۔ ابھی تک او آئی سی کے ہنگامی اجلاس اور مسلم دنیا کی نمائندہ اس تنظیم کی جانب سے رسمی مذمتی قرارداد کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔

ہماری اپنی قومی قیادتوں کا یہ عالم ہے کہ وزیراعظم عمران خان نے احتجاجی مراسلہ بھجوا کر رسمی مذمت کا فرض ادا کیا مگر منتخب ایوانوں کے ذریعے فوری اور سخت ردِعمل کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی۔ میکرون کی گستاخانہ حرکت کے ایک ہفتے بعد سینٹ اور قومی اسمبلی کے اجلاس بلائے گئے تو ان میں حکومتی اور اپوزیشن بنچوں کی غیر سنجیدگی دیکھنے کے لائق تھی۔ قومی اسمبلی میں حکومتی اور اپوزیشن قائدین گستاخانہ خاکوں کے خلاف مؤثر احتجاج کی کوئی متفقہ حکمت عملی سوچنے اور طے کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف بلیم گیم والی سیاست کو ہی فروغ دیتے نظر آئے۔

اپوزیشن کی جانب سے خواجہ آصف اور حکومتی بنچوں کی جانب سے وزیر خارجہ مخدوم شاہ محمود قریشی اپنی اپنی قرارداد لیکر آ گئے۔ پہلے مرغوں جیسی لڑائی میں اپنے سروں پر مٹی ڈالنا ضروری سمجھا اور بطور خاص اس کا اہتمام کیا گیا کہ اس موقع پر بھی اپوزیشن کو ''مودی کا یار'' کا طعنہ دینا کہیں رہ نہ جائے۔ سو وزیر خارجہ کو اپنی پیش کردہ مذمتی قرارداد کی منظوری سے پہلے اپوزیشن بنچوں میں مودی کی روح حلول ہوتی نظر آ گئی۔ جس پر وہ خوب گرجے برسے اور اپوزیشن نے ان کی ہوٹنگ کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ خواجہ آصف کی پیش کردہ قرارداد میں حکومت سے پاکستان کا سفیر فرانس سے واپس بلوانے کا تقاضا کیا گیا اور شاہ محمود قریشی نے اپنی پیش کردہ طویل قرارداد میں اردوان جیسے کسی سخت ردعمل کا اشارہ تک نہ دیا۔ بس او آئی سی سے یہ تقاضا کر دیا کہ 15 مارچ کے دن کو اسلاموفوبیا کے خلاف دن قرار دیا جائے۔ ارے۔ ہمارے محض رسمی مذمتوں والے اس کردار نے ہی تو بدبختوں کو شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کی کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے اور وہ اپنی اسی گندی سوچ اور قبیح جرم کو اظہار رائے کی آزادی کے مجہول تصور و فلسفہ کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور تف ہے ہمارے ان آزاد خیال طبقات پر جو اس وقت بھی اس گندی سوچ کی ہی وکالت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ سو......ع

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

حضور! آپ اور کچھ نہ کیجئے۔ فرانسیسی مصنوعات کے مکمل بائیکاٹ کیلئے ترک صدر اردوان کا فیصلہ پوری مسلم دنیا میں صدق دل کے ساتھ لاگو کر دیجئے۔ مکروہ میکرون اپنی معیشت کو تباہی سے بچانے کیلئے اپنی غلیظ حرکت سے تائب ہوتا مسلم قیادتوں کے آگے گڑگڑاتا نظر آئے گا۔ مگر وہ کیا ہے کہ......ع

حمیت نام تھا جس کا
گئی تیمور کے گھر سے

ہم سے تو وہ سوڈانی بدو ہی اچھے ہیں جنہوں نے فرانسیسی سفارتخانے کے بخیے ادھیڑ کر مکروہ میکرون کو دن میں تارے دکھا دیئے ہیں۔ کیا تحفظ حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاسبان تب جاگیں گے جب......ع

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پوائنٹ سکورنگ کی ظالم سیاست

ہمارے سیاسی کلچر میں در آنیوالی بلیم گیم اور ایک دوسرے پر پوائنٹ سکورنگ کی روش اب کافی پختہ ہو چکی ہے اور بد قسمتی سے اس روش کو آگے بڑھاتے ہوئے ملکی و قومی مفادات اور قومی پالیسیوں کی بھی پاسداری نہیں کی جاتی۔ اس روش میں آئین اور قانون کو موم کی ناک بنا کر انکے ساتھ کھیلنا تو اب بازیچۂ اطفال بن چکا ہے۔ اسی روش میں صوبوں پر سیاست کرنا بھی ہماری قومی سیاسی جماعتوں اور انکی قیادتوں کا مشغلہ بن چکا ہے۔ آئین پاکستان کی دفعہ 239' ذیلی دفعہ 4 کے تحت کسی صوبے میں سے نئے صوبے کی تشکیل کا طریق کار متعین ہے جس کے تحت متعلقہ صوبے کی اسمبلی اپنے مجموعی ارکان کی کم از کم دو تہائی اکثریت کے ساتھ نئے صوبے کی قرارداد منظور کریگی جو قومی اسمبلی کو بھیجی جائیگی اور قومی اسمبلی تین چوتھائی اکثریت کے ساتھ اس قرارداد کی منظوری دیگی جس کے بعد آئین میں نئے صوبے کی گنجائش نکلے گی جو درحقیقت ملک کے وفاقی پارلیمانی ڈھانچے کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلی ہوگی۔ اس وقت ملک کا آئین وفاق اور اسکی چار اکائیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اگر اس وفاقی پارلیمانی ڈھانچے میں کسی نئے صوبے کو شامل کرنا مقصود ہو تو اس کیلئے بنیادی طور پر آئین میں ترمیم کرنا ہوگی جو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت کے ساتھ ہی ممکن ہوتی ہے۔

بے شک نئے صوبوں کیلئے سیاست بہت دیر سے چل رہی ہے اور 80ء کی دہائی سے اب تک کبھی جنوبی پنجاب' کبھی بہاولپور' کبھی ہزارہ اور کبھی جناح پور کے نام سے پنجاب' سرحد اور سندھ میں سے نئے صوبے نکالنے کا ہماری سیاست میں شور و غوغا رہا ہے مگر متعلقہ صوبائی اسمبلی اور پھر قومی اسمبلی میں مطلوبہ اکثریت نہ ہونے کے باعث پیپلز پارٹی' مسلم لیگ (ن) اور ایم کیو ایم متحدہ سمیت کوئی بھی جماعت اب تک نئے صوبے کا کریڈٹ اپنے کھاتے میں نہیں ڈال سکی۔ مسلم

لیگ (ن) کے گزشتہ دور میں دوتہائی اکثریت کے بل بوتے پر پنجاب اسمبلی میں صوبہ جنوبی پنجاب کیلئے قرارداد منظور بھی کرالی گئی تھی مگر اسے قومی اسمبلی میں لے جانے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ پیپلز پارٹی نے اپنے دور حکومت میں گلگت بلتستان کو انتظامی فیصلے کے تحت آئین میں ترمیم کے بغیر اس لئے صوبے کا درجہ دیا کہ شمالی علاقہ جات کسی صوبے کا حصہ نہیں تاہم اس وقت بھی یہ سنگین آئینی ایشو پیدا ہوا تھا کہ ہم کشمیر کے متنازعہ علاقہ ہونے کے اپنے دیرینہ اصولی موقف سے ہٹ کر کشمیر کے کسی علاقے کو اس مسئلہ کے تصفیہ کے بغیر کیسے پاکستان کا حصہ بنا سکتے ہیں۔

بے شک کشمیر بنے گا پاکستان ہمارا ماٹو ہے اور تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت مسلم اکثریتی آبادی کے ناطے کشمیر کا پاکستان کے ساتھ ہی الحاق ہونا تھا جس کے بغیر پاکستان کا وجود ادھورا ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم نے اسی تناظر میں کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا اور بے شک کشمیری عوام نے بھی تقسیم ہند سے قبل ہی چودھری غلام عباس کی زیرقیادت اپنے نمائندہ اجتماع میں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرلیا تھا مگر قیام پاکستان کے بعد ہندو لیڈر شپ نے ایک سازش کے تحت کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہ ہونے دیا اور اسکے بڑے حصے پر اپنا فوجی تسلط جمانے کے بعد وادی کشمیر کو متنازعہ علاقہ بنا دیا اور پھر اسکے تصفیہ کیلئے اقوام متحدہ سے رجوع کرلیا تو ہمارا اس وقت سے ہی یہ اصولی موقف طے ہوا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کو خود کرنے دیا جائے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھی پاکستان اور کشمیریوں کے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے کشمیریوں کو اپنے مستقبل کے تعین کیلئے استصواب کا حق دیا اور بھارت کو مقبوضہ وادی میں استصواب کے اہتمام کی ہدایت کی۔ بھارت نے اقوام متحدہ کے روبرو تو کشمیریوں کے استصواب کا حق تسلیم کرلیا مگر بعدازاں کشمیر پر اٹوٹ انگ کی ہٹ دھرمی اختیار کرلی اور پھر اپنے آئین میں ترمیم کرکے دفعہ 370 کے تحت مقبوضہ وادی کو خصوصی آئینی حیثیت کے ساتھ بھارتی ریاست کا درجہ دے دیا۔

یقیناً کشمیری عوام اور پاکستان نے اس بھارتی ہٹ دھرمی کو شروع دن سے تسلیم نہیں کیا' کشمیری عوام نے 1948ء میں ہی بھارتی تسلط سے آزادی کی جدوجہد کا آغاز کیا جو لاکھوں جانوں کی قربانیوں کے ساتھ آج بھی شدومد کے ساتھ جاری ہے اور گزشتہ سال 5 راگست کو بھارت کی مودی سرکار کی جانب سے مقبوضہ وادی کی خصوصی آئینی حیثیت ختم کرنے اور اسے دو

حصوں میں تقسیم کر کے بھارت میں ضم کرنے کے اقدام کے بعد کشمیریوں کی اس جدوجہد میں شدت پیدا ہو چکی ہے جسے دبانے کیلئے مودی سرکار نے گزشتہ ڈیڑھ سال سے لاک ڈاؤن کے ذریعے کشمیریوں کو گھروں میں محصور کر رکھا ہے۔ اسکے برعکس پاکستان شروع دن سے اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کے استصواب کے ذریعے حل پر زور دے رہا ہے اور اس موقف کے تحت ہی کشمیر کی متنازعہ حیثیت برقرار رکھی گئی ہے جس کے علاقوں بشمول گلگت بلتستان میں کشمیری عوام کی اپنی حکومت' اپنی اسمبلی' اپنی عدالت عظمیٰ اور اپنا آئین و قانون ہے جس کے ماتحت آزاد جموں و کشمیر کے انتظامی معاملات چلائے جا رہے ہیں جبکہ بھارت نے کشمیریوں کو استصواب کا حق دیئے بغیر مقبوضہ وادی کو اپنے اندر ضم کر کے جہاں کشمیریوں کو مضطرب اور برافروختہ کیا ہے وہیں دنیا بھر سے اپنے خلاف ردعمل کو بھی دعوت دی ہے۔ اس بنیاد پر آج مودی سرکار کا پوری دنیا میں عملاً ناطقہ تنگ ہے جبکہ پاکستان' چین اور سلامتی کونسل کے دوسرے ارکان گزشتہ ڈیڑھ سال کے دوران سلامتی کونسل کی تین ہنگامی نشستوں کے ذریعے بھارت پر سلامتی کونسل کی قراردادوں کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کے حل پر زور دے چکے ہیں۔

کشمیر کے متنازعہ ہونے کا اصولی موقف رکھتے ہوئے اگر اب گلگت بلتستان کو باقاعدہ صوبے کا درجہ دے دیا جاتا ہے تو اس سے کشمیر پر محض ہمارا موقف ہی کمزور نہیں ہوگا بلکہ مودی سرکار کیلئے مقبوضہ وادی کو بھارت میں ضم کرنے کے پانچ اگست 2019ء کے ناجائز اقدام کا جواز بھی نکل آئیگا جس کی بنیاد پر وہ دنیا کو باور کرائے گا کہ کشمیر تو ہمارا اٹوٹ انگ ہی ہے۔ یہ درحقیقت مسئلہ کشمیر کا ٹنٹا ختم کرنے کا فارمولا ہے مگر یاد رکھیے کہ مکار ہندو بنیاء ہمیں ڈنک مارنے سے پھر بھی باز نہیں آئیگا جو پہلے ہی گلگت بلتستان اور دوسرے شمالی علاقہ جات سمیت آزاد کشمیر کو بھی اپنے توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ہڑپ کرنے کی منصوبہ بندی کئے بیٹھا ہے۔

اب گلگت بلتستان کے انتخابات کے موقع پر اسے باضابطہ طور پر پاکستان کے صوبہ کا درجہ دینے کے اعلانات ہو رہے ہیں جس پر وزیراعظم آزاد کشمیر راجہ فاروق حیدر کی جانب سے کشمیر کی متنازعہ حیثیت کے تناظر میں ہی تشویش کا اظہار سامنے آچکا ہے تو خدارا پوائنٹ سکورنگ کی سیاست سے ہٹ کر اسکے ممکنہ مضمرات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیجئے۔ اگر بھارت کو ہماری اس سیاست کی بنیاد پر کشمیر پر اپنی ہٹ دھرمی دنیا سے تسلیم کرانے کا موقع مل گیا تو پاکستان کے

ساتھ الحاق کی تمنا اور جدوجہد میں اپنے لاکھوں پیاروں کی جانیں قربان کرنیوالے کشمیریوں کا بھارتی تسلط سے آزادی کا اب تک کا سفر کھوٹا نہیں ہو جائیگا؟ بے شک بلیم گیم اور پوائنٹ سکورنگ والی سیاست برقرار رکھیے مگر پاکستان کے ساتھ الحاق کیلئے کشمیریوں کی سہانے سپنوں سے لبریز آنکھیں ویران نہ ہونے دیجئے۔ انکے یہ خواب پاکستان کی بقاء اور استحکام کے خواب ہیں جو ہمارے کسی فعل کے نتیجہ میں ٹوٹ گئے تو ان خوابوں کی جگہ وحشت کشمیریوں کی آنکھوں میں بسیرا کرسکتی ہے۔ اگر کشمیر کا ٹنٹا ختم کرنے کا یہ کوئی عالمی ایجنڈا ہے تو پھر ہمیں اپنے وجود کی سلامتی کیلئے بھی فکرمند ہو جانا چاہیے کیونکہ اگلا وار ہماری سلامتی پر ہی ہوگا۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

مسلم دنیا اور اقوام متحدہ کی افادیت کا سوال

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم عمران خاں نے بلاشک وشبہ عالمی میلہ لُوٹا ہے اور مسئلہ کشمیر کے ساتھ ساتھ اسلاموفوبیا کو بھی فوکس کرکے اقوام متحدہ کی طرح مسلم دنیا کو بھی امتحان میں ڈالا ہے۔ ہمیں انہی دو موضوعات پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ عمران خاں نے بجا طور پر اقوام متحدہ اور اسکے رکن ممالک کی قیادتوں کو باور کرایا کہ بھارت کی مودی سرکار نے جو درحقیقت دہشت گرد بھارتی تنظیم آر ایس ایس کی نمائندہ اور ترجمان حکومت ہے، مقبوضہ کشمیر میں 80 لاکھ انسانوں کو مسلسل محصور رکھ کر اور انہیں اقوام متحدہ کے ودیعت کردہ حق خودارادیت سے محروم کرکے ان پر جن مظالم کی انتہاء کی ہے وہ خود اقوام متحدہ کی حیثیت وافادیت کا امتحان ہے کیونکہ اس کا تو وجود ہی ریاستوں کے انسانوں پر ایسے مظالم کے تدارک کیلئے قائم ہوا ہے۔ اگر بھارت اپنی جنونیت میں پاکستان کی سلامتی کو بھی چیلنج کر رہا ہے تو اس سے سات گنا زیادہ جنگی برتری رکھنے والے اس ملک کیخلاف اپنے دفاع کیلئے پاکستان کے پاس اپنی ایٹمی ٹیکنالوجی بروئے کار لانے کے سوا اور کیا چارۂ کار رہے گا۔ پھر آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ دو ایٹمی ممالک کے مابین روایتی جنگ کا آغاز ہوگا تو اسکے نقصانات کہاں کہاں تک جائیں گے۔

یہی وہ ٹرننگ پوائنٹ ہے جس کی بنیاد پر وزیراعظم نے اقوام متحدہ کی اہمیت وافادیت کا سوال اٹھایا ہے۔ اگر وہ ایٹمی جنگ کی نوبت لانے والے بھارت کے جنونی ہاتھ روکنے میں کوئی کردار ادا نہ کر پایا تو 24 اکتوبر 1945ء کو جس مقصد کے تحت اس عالمی ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا تھا وہ فوت ہو جائیگا اور پھر اس کا انجام بھی لیگ آف نیشنز جیسا ہوگا جو اپنے رکن ممالک ... شروع ہونے والی دو عالمی جنگیں رکوانے میں یکسر ناکام رہی تھی۔

ویسے تو اس عالمی ادارے کا امریکی صدر ٹرمپ نے گزشتہ سال پوری رعونت کے ساتھ بھاکا اڑا دیا ہے جب ان کی جانب سے مقبوضہ بیت المقدس میں اسرائیل کیلئے امریکی سفارتخانہ کھولنے کے اقدام کیخلاف دنیا بھر میں خوفناک ردعمل سامنے آیا اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ٹرمپ کے اس اقدام کیخلاف مسلم دنیا سمیت 138 سے زائد ارکان کی پیش کردہ قرارداد منظور کر کے ٹرمپ سے یہ فیصلہ واپس لینے کا تقاضہ کیا تو ٹرمپ نے جنرل اسمبلی کی اس قرارداد کو جوتے کی نوک پر رکھا اور اس نمائندہ عالمی ادارے کی گرانٹ بند کرنے کی بھی دھمکی دے دی۔ ٹرمپ کی اس فرعونیت کا اقوام متحدہ کچھ نہیں بگاڑ پائی تو اس کے چارٹر کی کیا افادیت برقرار رہ گئی ہے جس کے تحت اسکے رکن ممالک نے دو عالمی جنگوں سے انسانیت کو پہنچنے والے نقصانات سے بچنے کیلئے آئندہ ایسی نوبت نہ آنے دینے کا عہد کیا تھا۔

آج بھارت مقبوضہ کشمیر پر جن ننگ انسانیت جرائم کا مرتکب ہو رہا ہے اور جس رعونت کے ساتھ پاکستان پر جنگ مسلط کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے، وہ درحقیقت پہلی دونوں عظیم جنگوں میں ہونے والی انسانیت کی تباہی جیسی بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک تباہی کا اہتمام کر رہا ہے۔ اگر اقوام متحدہ ان بھارتی عزائم کو روکنے میں کوئی کردار ادا نہ کر سکی تو پھر لامحالہ یہ ادارہ اپنی افادیت کھو بیٹھے گا اور اس کا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھے گا۔ اب دیکھنا یہی ہے کہ اقوام متحدہ اپنی قراردادوں کی روشنی میں مسئلہ کشمیر حل کرانے اور کشمیریوں کو حق خودارادیت دلانے میں کوئی موثر کردار ادا کرتا ہے یا ٹرمپ جیسی دھمکی کی طرح مودی کی کسی دھمکی پر بھی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ غالب امکان اس معاملہ میں اقوام متحدہ کے قطعی طور پر غیر موثر ہونے کا ہی نظر آتا ہے کیونکہ ٹرمپ ہی مودی کو تھپکی دینے والا ہے اور دونوں نے مل کر اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح بھی استعمال کر لی ہے اور اس کیخلاف مشترکہ طور پر لڑنے کا عہد بھی کر لیا ہے۔ عمران خان نے یہ سارا پس منظر بیان کر کے درحقیقت مسلم دنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر اسکے حقوق کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے مسلم دنیا کو اپنے تحفظ و دفاع کے لیے خود ہی منظم اور فعال ہونا پڑے گا۔

اسلاموفوبیا بھی ہنود و یہود گٹھ جوڑ کی ہی ایک سازش ہے جس کے تحت انہیں مسلم دنیا کے چہرے پر دہشت گردی کی کالک ملنے کی سہولت مل رہی ہے اور مسلم دنیا اپنے باہمی تنازعات اور

فروعی مسائل میں الجھ کر ہنود و یہود کی اس سازش کا خود ہی شکار ہو رہی ہے۔ اگر ہنود و یہود گٹھ جوڑ مسلم ممالک کو ایک دوسرے سے برسر پیکار کئے رکھتا ہے جیسا کہ آج سعودی عرب، یمن اور ایران کا معاملہ بنا ہوا ہے جس کے باعث دوسرے ممالک بھی آزمائش میں پڑے ہیں کہ ان میں سے کس کا ساتھ دیں اور کس کا ساتھ نہ دیں اور اسی طرح امریکہ بھارت کی سرپرستی کر کے پاکستان کی سلامتی کیخلاف اسکے حوصلے بڑھائے رکھتا ہے اور اسلامی دہشت گردی کے خاتمہ کے نام پر پاکستان پر چڑھائی کر دی جاتی ہے تو ہنود و یہود گٹھ جوڑ کو مسلم دنیا سے خلاصی پانے میں آسانی ہو جائے گی۔ پھر جناب! کیا یہ مسلم ممالک کے اپنے سوچنے کا مقام نہیں کہ وہ خود کو بے وجہ کے باہمی تنازعات اور فروعی مسائل سے باہر نکال کر اقوام متحدہ کی طرز کا کوئی متحدہ مسلم فورم قائم کر لیں اور اپنے ہر معاملہ کا اسی فورم پر تصفیہ کرنے کا عہد کر لیں، پھر دیکھیں ہنود و یہود کے مقابل اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کیسے احیا ہوتا ہے۔ عمران خاں کا اسلاموفوبیا کو فوکس کرنے کا مقصد یہی تھا کہ مسلم دنیا اپنے خلاف ہنود و یہود کی سازشوں کو ناکام بنانے کیلئے پوری فعالیت کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جائے۔ پھر دیکھیں کہ ہندوؤں کی نمائندہ بھارتی مودی سرکار کشمیر پر کیسے اپنا تسلط برقرار رکھتی ہے اور اسرائیل کیسے فلسطین کا قبضہ نہیں چھوڑتا۔ مسلم دنیا کی سوا ارب سے زائد کی آبادی ایک کاز کے ساتھ متحد دیکھو ہو جائے تو کسی طاغوتی قوت کو اپنے وسائل کی لوٹ مار کی بھی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اس کیلئے پاکستان، ترکی اور ملائیشیا کی قیادتوں نے دین اسلام کیخلاف غیر مسلم قوتوں کی سازشوں کے توڑ کیلئے جس فعال باہمی کردار پر اتفاق کیا ہے اسے عملی قالب میں ڈھال کر امتِ واحدہ کو بلاشبہ پوری دنیا پر غالب ہونے والی قوت بنایا جا سکتا ہے۔ جنرل اسمبلی کے اجلاس کو آپ ماضی جیسی گفتند، نشتند، برخاستند والا اجلاس ہی سمجھیں، اس سے مسئلہ کشمیر کے حل کا کوئی راستہ نکلے گا، نہ فلسطینی اور روہنگیا مسلمانوں پر آئے روز کی کمبختیاں ختم ہوں گی اور نہ ہی ہمارے لیے علاقائی امن و سلامتی کی کوئی گنجائش پیدا ہو گی۔ بس ضرورت اس امر کی ہے کہ جنرل اسمبلی کے پلیٹ فارم پر عمران خاں، رجب طیب اردوان اور مہاتیر محمد کے ادا شدہ کلمات کو ایک باقاعدہ تحریک کی شکل دے کر اتحاد امت کی بنیاد رکھ دی جائے۔ قدرت آپ کا مقدر خود ہی سنوار دے گی۔ اس تناظر میں مجھے ایک بھارتی مسلمان شاعر ہاشم فیروز آبادی کی نظم شدت سے یاد آ رہی ہے۔ اس کو حرزِ جاں بنایئے اور طاغوتی قوتوں کے مقابل اتحاد امت کی ضمانت لیجئے، اس نظم کے کچھ اشعار پیش

خدمت ہیں۔

دیوبندی، شیعہ سنی، بریلوی میں بٹ گئے
اپنے اپنے مقصدوں سے اسی لئے ہٹ گئے
اپنی اپنی مسجدوں میں اپنے اپنے پیر ہیں
ترکشوں میں زنگ کھائے سارے ٹوٹے تیر ہیں
سینکڑوں خدا ہیں جن کے، ایک جگہ کھڑے ہیں
ایک خدا والے سارے بکھرے ہوئے پڑے ہیں
فوج پہ ہزاروں کی، 72 کبھی بھاری تھے
دشمنوں کے چہروں پہ تمہارے خوف طاری تھے
تم نے کبھی ساحلوں پر کشتیاں جلائی تھیں
تم نے اپنے بازوؤں کی تلواریں بنائی تھیں
دشمنوں کو کس نے جنگِ بدر میں پچھاڑا تھا
کون تھا وہ جس نے درِ خیبر کو اکھاڑا تھا
وہ تمہی تھے، یہ تمہیں بتانے آج آیا ہوں
سوئے ہوئے شیروں کو جگانے آج آیا ہوں
کاش، اے کاش، آج یہ شیر جاگ اٹھیں

گورننس کا چیلنج اور عوام کا اضطراب

بے شک ہمیں اندرونی اور بیرونی طور پر بہت بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے اور ہر چیلنج سے عہدہ براء ہونا حکومت ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بیرونی چیلنجوں میں آج سب سے بڑا چیلنج کشمیر پر بھارت کا پیدا کردہ بحران اور اسی تناظر میں جنونی بھارتی حکمرانوں اور ان کی عسکری قیادتوں کی جانب سے پاکستان کو اس کی خودمختاری اور سلامتی کے حوالے سے دی جانے والی سنگین نوعیت کی دھمکیاں ہیں جنہیں کنٹرول لائین پر اور وادیٔ کشمیر میں عملی جامہ بھی پہنایا جارہا ہے۔ بے شک حکومت بالخصوص وزیراعظم عمران خاں اس بحران سے پامردی اور استقامت کے ساتھ عہدہ براء ہورہے ہیں جنہوں نے یواین جنرل اسمبلی کے پلیٹ فارم پر عالمی قیادتوں کے روبرو کشمیر ہڑپ کرنے اور پاکستان کی سلامتی تاراج کرنے کے بھارتی عزائم بے نقاب کئے اور ساتھ ہی انہیں یہ باور بھی کرادیا کہ اگر بھارتی ہٹ دھرمی کا ازالہ نہ کیا گیا، کشمیریوں کو استصواب کا حق نہ دیا گیا، وہاں سے ظالمانہ کرفیو نہ ہٹایا گیا اور پاکستان پر چڑھائی کرنے کی جنونی منصوبہ بندی پر بھارتی ہاتھ نہ روکے گئے تو دوایٹمی ممالک کے باہم ٹکرانے سے اس خطے اور پورے کرۂ ارض کی جو تباہی ہوگی، آپ اس کی ذمہ داری سے خود کو نہیں بچا پائیں گے۔ بے شک وزیراعظم نے عالمی قیادتوں کے ساتھ ساتھ اسلاموفوبیا کے حوالے سے مسلم دنیا کو بھی جھنجوڑا اور موسمی تبدیلیوں سے خطے پر پڑنے والے منفی اثرات سے بھی عالمی قیادتوں کو آگاہ کیا چنانچہ ان کی ہمہ جہت تقریر پاکستان کی اپنے اصولی کشمیر کاز اور مسلم دنیا کے حوالے سے مغربی دنیا کی قیادتوں کے مجہول پراپیگنڈے کے مسکت جواب پر منطبق ہوئی اور وزیراعظم نے اپنے ملک میں ہی نہیں، اقوام عالم میں بھی دادوتحسین کے برستے ڈونگرے سمیٹے۔ اب کشمیر اور اسلاموفوبیا کے حوالے سے عمران خاں کی جانب سے عالمی اور مسلم قیادتوں پر ڈالی گئی ذمہ داری کو متعلقہ قیادتوں نے ہی نبھانا ہے۔

عساکر پاکستان بہرصورت بھارت کی کسی بھی جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے اوراس کے بارے میں کسی کو غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ ڈنکے کی چوٹ پر باور کرا چکے ہیں کہ ہم پر بھارتی جارحیت اوراس کے جارحانہ عزائم کا مکمل توڑ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اوراس معاملہ میں اسے 27۔فروری جیسا جواب ہی ملے گا۔

دفاع وطن کی ذمہ داری تو یقیناً عساکر پاکستان نے اٹھائی ہوئی ہے جن کی پیشہ ورانہ استعداد وصلاحیت کی پوری دنیا قائل ہے۔ اس لیے ہمیں بھارت کے دیئے گئے اس چیلنج پر کوئی فکر مندی نہیں ہونی چاہئے۔ ہم محفوظ ہاتھوں میں ہیں اوراس وطن عزیز کا دفاعی حصار توڑنا یا اس میں نقب لگانا ہم سے سات گنا زیادہ اسلحہ اور جنگی ساز وسامان رکھنے والے ہمارے دشمن بھارت کے لیے عملاً ممکن نہیں اوراس حوالے سے قوم بھی مطمئن ہے۔ عالمی سطح پر بھارت کی ہزیمتوں کا اہتمام ہو چکا ہے جس کے جنونی عزائم کے آگے اقوام عالم کی جانب سے بند نہیں باندھا جائے گا تو اس کا خمیازہ پاکستان اور بھارت سمیت اس خطے کے ممالک ہی کیا پوری دنیا بھگتے گی مگر ہمیں آج اندرون ملک جس بڑے چیلنج اور سنگین بحران کا سامنا ہے وہ غربت، مہنگائی، روٹی روزگار کے حوالے سے عوام کے دلوں میں پیدا ہونے والے اضطراب اور بے چینی کا ہے جس سے عہدہ براء ہونے کے فوری اور موثر اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس اضطراب کی ایک جھلک پچھلے دنوں پنجاب حکومت کے پرائس ٹاسک کمیشن کے سربراہ محمد اکرم چودھری نے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں دکھائی جو ڈھکے چھپے نہیں بلکہ واشگاف الفاظ میں اپنی پارٹی کی حکومت اور قیادت کو باور کرا رہے تھے کہ عوام اپنے روزمرہ کے مسائل بالخصوص مہنگائی اور بے روزگاری پر سابق حکمرانوں کو ان کے ادوار حکومت میں ہاتھ اٹھا کر بددعائیں دیتے تھے مگر ہمیں عوام جھولیاں اٹھا کر بددعائیں دے رہے ہیں۔ وہ اشیائے صرف کے نرخوں کی گرانی پر کنٹرول رکھنے کے معاملہ میں اپنی بے بسی کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ نہ جانے وزیراعظم تک ان کی دادفریاد پہنچی ہے یا نہیں مگر انہوں نے عوام کے جذبات کی خوب ترجمانی کر دی ہے۔

کچھ ایسا ہی ماحول گزشتہ ہفتے حکمران پی ٹی آئی کی پارلیمانی پارٹی اور وفاقی کابینہ کے اجلاس میں بنا ہوا نظر آیا جہاں حکومتی پارٹی کے ایک رکن عوامی مسائل کے حل کے معاملہ میں اپنی بے بسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے اور کہا کہ ہم عوام کو جواب دینے کی بھی پوزیشن

میں نہیں ہیں۔ کچھ ایسی ہی بے بسی کا اظہار وفاقی کابینہ کے ایک رکن نے بھی کیا جس کا وزیراعظم نے عمران خاں نے سخت نوٹس لیا اور انہیں مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ جب سابق حکمران لوٹ مار کر رہے تھے تو اس وقت تو آپ ایسا کوئی احتجاج نہیں کرتے تھے۔ وزیراعظم کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں بہرحال عوام کی شکایات کے ازالہ کے لیے کوئی اقدام نہ اٹھانے والی بیوروکریسی کے معاملات کا ضرور نوٹس لینا پڑا جنہیں انہوں نے باور کرایا کہ سرکاری افسران کے پاس عوام کی جانب سے جو بھی درخواست آتی ہے، اس پر کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جاتی جس کا اثر حکومتی گورننس پر پڑ رہا ہے۔ اس معاملہ میں وزیراعظم عمران خاں نے بیوروکریسی کو عوام کی شکایات کے ازالہ کی سختی سے ہدایت بھی کی اور اس کا ایک طریق کار بھی وضع کر کے دے دیا مگر جو بیوروکریسی اپنے کچھ ساتھیوں کے خلاف نیب کی کارروائیوں سے خوفزدہ ہو کر بیٹھی ہے اور احتساب کے خوف سے لوگوں کے جائز کام کرنے سے بھی کنی کترا رہی ہے نتیجتاً سارے ترقیاتی کام اور منصوبے ٹھپ پڑے ہیں جس پر عوام اکرم چودھری کے بیان کردہ حقائق کے عین مطابق حکومت کو جھولیاں اٹھا کر بددعائیں دے رہے ہیں۔ وہ بیوروکریسی اپنے تحفظات کے ازالہ کے بغیر وزیراعظم کے احکامات کو بھلا کیوں خاطر میں لائے گی۔ ان پر تو اپنے ساتھی بیوروکریٹس کی گردنوں پر پھندا پڑتے دیکھ کر ہی لرزا طاری ہو جاتا ہے سو ان حالات میں اچھی گورننس کا تاثر کیسے پختہ ہو سکتا ہے۔

بیوروکریسی ہی نہیں، عوام کے مختلف طبقات کو بھی نیب اور ایف بی آر کے سخت اور ان کے بقول ناروا اقدامات پر تحفظات ہیں جس پر ان کی حکومتی سرکل میں کوئی شنوائی اور کوئی ازالہ ہونے کے آثار بھی نظر نہیں آتے تو ان کی مایوسیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ تاجروں کے وفد کی آرمی چیف سے ملاقات کا یہی پس منظر تھا کہ انہیں دادفریاد کے لیے یہی فورم زیادہ موثر نظر آیا۔ آپ دیکھ لیجئے، آرمی چیف سے ملاقات کے بعد ان کی وزیراعظم اور چیئرمین نیب سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وزیراعظم نے انہیں ٹیکسوں کی ادائیگی کی مد میں سہولتیں فراہم کرنے کا اعلان کر دیا اور چیئرمین نیب نے بے لاگ احتساب کے دعوے کرتے کرتے گزشتہ روز اپنی پریس کانفرنس میں اپنی بے بسی کا عندیہ دینے والا یہ اعلان بھی کر دیا کہ اب ہمارا کوئی افسر کسی تاجر کو کال نہیں کرے گا اور نیب ٹیکس مقدمات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔ حضور والا اب ذرا دل بڑا کر کے قوم کو یہ بھی بتا دیں کہ نیب نے اب کارروائی کس کیخلاف کرنی ہے اور ان کے بلاامتیاز احتساب کے دعوؤں کو اب

کس کھاتے میں ڈالا جائے۔ یہی وہ عوامی احساسات اور اضطرابات کی کہانیاں ہیں جو ملک کے اندر حکومتی گورننس کے حوالے سے بہت بڑے اندرونی چیلنج اور بحران کی عکاسی کر رہی ہیں۔ حضور! عوام کو عملی اقدامات کے ذریعے مطمئن کیجئے اور ہر خرابی و برائی کا ملبہ رفتگان پر ڈالنے کی حکومتی پالیسی سے اب رجوع کر لیجئے تا کہ آئندہ عوامی طبقات میں سے کسی اور کو بھی داد فریاد کے لیے آرمی چیف کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ سسٹم کو مستحکم اور محفوظ کرنا تو بہر حال قومی سیاسی قائدین کی ذمہ داری ہے چاہے وہ حکومت میں ہوں یا اس سے باہر۔ آپ گورننس کا درپیش چیلنج قبول کیجئے اور رائندۂ درگاہ عوام کی داد سمیٹیے کہ اس داد کی آپ کو آج زیادہ ضرورت ہے۔

ٹرمپئی ثالثی اور افغان امن عمل کا کباڑہ

جناب۔ ایسی ٹرمپئی سیاست کے تو صدقے واری جانے کو جی چاہتا ہے کہ ایک جانب وہ علاقائی امن وسلامتی کی خاطر مسئلہ کشمیر حل کرانے کو بے تاب نظر آتے ہیں اور اس مسئلہ کے حل کے لیے انہوں نے پاکستان اور بھارت کے مابین ثالثی کی مسلسل چوتھی بار پیش کش کر دی ہے اور دوسری جانب حتمی معاہدہ کو پہنچے ہوئے افغان امن عمل کی بساط محض ایک امریکی باشندے کی ہلاکت کا بہانہ تراش کر لپیٹ دی۔ جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی، پھر کیوں نہ کشمیر پر ثالثی کی بار بار کی پیشکش کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''۔ جناب اصل مقصد تو علاقائی امن واستحکام کا ہے اور یہ امن واستحکام کس کے ہاتھوں داؤ پر لگا ہوا ہے۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی تو نہیں رہی کہ آج پوری دنیا میں ہاہا کار مچی ہے۔ زمانے بھر کی جانب سے انگلیاں اٹھ رہی ہیں، آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ قراردادیں پاس کی جا رہی ہیں۔ مراسلات بھجوائے جا رہے ہیں۔ یادداشتیں پیش کی جا رہی ہیں مگر ٹرمپ کے یار مودی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ اس نے پاکستان اور مسلم دشمنی کی انتہا کرتے ہوئے مقبوضہ کشمیر کو 40 روزے بدترین کرفیو میں جکڑ رکھا ہے اور انسانی حقوق کی پامالیاں اس وحشیانہ انداز میں کی جا رہی ہیں کہ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کی کمشنر میڈیم میچل بھی چلا اٹھی ہیں اور جنیوا میں منعقدہ انسانی حقوق کونسل کے 42 ویں اجلاس میں اس کونسل کے ارکان دنیا کے پچاس سے زیادہ ممالک کے سفیروں نے ایک مشترکہ اعلامیہ کے ذریعے یک زبان ہو کر مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجوں کے مظالم کی دہائی دی ہے۔ ہر عالمی ادارے اور ہر عالمی قیادت کی جانب سے کشمیر میں لاک ڈاؤن اور کرفیو کی پابندیاں ختم کرنے کا تقاضہ کیا جا رہا ہے مگر علاقائی اور عالمی امن وسلامتی کے درپے جنونی مودی ٹس سے مس نہیں ہو رہا۔

ٹرمپ نے اسی مودی کو سب سے پہلے ثالثی کی پیشکش کی تھی اور یہ پیشکش بھی مسئلہ کشمیر حل کرانے کے لیے ان کی اپنی درخواست پر کی گئی جس سے ٹرمپ نے وزیر اعظم عمران خاں کو ان سے ملاقات کے موقع پر آگاہ کیا اور ثالثی کی پیشکش کا اعادہ کیا تو مودی کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی تصویر بن کر کشمیر کے بخیئے ادھیڑنے پر اُتر آیا۔ مودی سرکار نے گزشتہ ماہ پانچ اگست کو کشمیر کی خصوصی حیثیت کے بارے میں بھارتی آئین کی دفعہ 370، اور 35اے کو آئین سے نکال کر درحقیقت ہمارے اس موقف کی تصدیق کی تھی کہ بھارت نے دفعہ 370 کے تحت کشمیر کو اپنی ریاست کا درجہ دے کر اسے مستقل طور پر ہڑپ کرنے کی سازش کی ہے۔ اب مودی سرکار نے دہری چال یہ چلی کہ مقبوضہ کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت تو ختم کر دی مگر اس سے ملحقہ علاقے لداخ کو ریاست جموں و کشمیر سے نکال کر مکمل طور پر بھارت کا حصہ بنا دیا اور یہ کام اس نے چین کے علاقے اروناچل پردیش میں دوبارہ 60ء کی دہائی جیسی نقب لگانے کے لیے کیا۔ اب جو بھارت پر پرزے نکال کر چین کی سرحدوں کے اندر بھی جگالی کا سوچ رہا ہو اور اس نے پاکستان کے ساتھ بھی کنٹرول لائین پر مستقل طور پر متھا لگایا ہوا ہو جبکہ مقبوضہ کشمیر میں اپنی 9 لاکھ فوج کو جھونک کر اس نے اس جنت نظیر وادی کو جہنم زار میں تبدیل کر دیا ہو، سب سے پہلے تو اس کی خبر لینے کی ضرورت ہے کیونکہ علاقائی اور عالمی امن تاراج کرنے کی راہ پر تو وہی گامزن ہے جس کی ہندو انتہا پسند جنونی مودی سرکار نے دنیا کا کوئی دباؤ قبول نہ کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے۔

اگر مودی نے ٹرمپ کی جانب سے وزیر اعظم پاکستان کو ثالثی کی پیش کش کے محض اعادہ پر اس پورے خطہ میں انسانی تباہی کے اہتمام والے اقدامات اٹھا لیے ہیں تو اب مودی کے لیے تیسری اور چوتھی بار لجاجت بھرے لہجہ میں ثالثی کی پیشکش کے اعادہ کی ضرورت ہے یا اس کے پیدا کردہ حالات اسے دوٹوک انداز میں شٹ اپ کال دینے کے متقاضی ہیں؟ پھر مسئلہ کشمیر تو سیدھے سبھاؤ سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی قراردادوں کے مطابق حل ہونا ہے جس کے لیے اب خود سلامتی کونسل کی جانب سے تقاضہ بھی کیا جا چکا ہے اس لیے ٹرمپئی سیاست تو بھارت سے یو این قراردادوں پر عملدرآمد کرانے کی ہونی چاہیے چہ جائیکہ اسے ثالثی کا دانہ ڈال کر سلامتی کونسل کی قراردادوں سے دوبارہ انحراف کا راستہ دکھایا جائے۔ تو جناب یہی سیاست جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی والی ہے جس میں مودی یار کی سہولت کو بہر صورت پیش نظر رکھا جا رہا ہے۔

یہ سیاست علاقائی اور عالمی امن وسلامتی کو یقینی بننے والی تو ہرگز نہیں۔ اپنے مفادات نکالنے والی ضرور ہے اور امریکی قیادت تو بس اپنے مفادات کی ہی اسیر ہوتی ہے جس کے تحت وہ کسی کی دوست بنتی ہے اور کسی سے دشمنی مول لیتی ہے اور پھر طوطا چشمی میں بھی ذرہ بھر دیر نہیں لگاتی۔

کیا ایسا ہی افغان عمل کے لیے گزشتہ دس ماہ سے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دوحہ میں جاری امریکہ طالبان مذاکرات کا حشر نہیں کیا گیا، یہ تو سراسر امریکی مفادات کا معاملہ ہی آڑے آیا ہے۔ امریکہ کو احساس ہوا کہ افغان دھرتی کو تورا بورا بنانے اور لاکھوں افغانیوں کو اپنے مفادات کی جنگ کی بھینٹ چڑھانے کے باوجود امریکی فوجیوں کی افغانستان سے بحفاظت اور زندہ واپسی ممکن نہیں رہی تو اس نے پاکستان کے پاؤں پکڑ لئے۔ اس پر ریشہ خطمی ہوتے ہوئے ڈومور کے تقاضوں میں بھی نرمی پیدا کر لی اور اس کی معطل کی گئی سول اور فوجی گرانٹ بھی بحال کر دی۔ وزیر اعظم پاکستان کو وائٹ ہاؤس مدعو کر کے پورا پروٹوکول دیا اور اس طرح پاکستان کی معاونت سے دوحہ میں جاری افغان امن مذاکرات کامیابی سے ہمکنار ہوتے نظر آئے۔ مگر ٹرمپ نے ایک وعدہ اپنی انتخابی مہم کے دوران ہندوؤں اور ان کے ہندوستان کو اپنے عہد اقتدار میں عزیز تر رکھنے کا بھی کیا ہوا تھا۔ پاکستان کی معاونت سے افغان امن مذاکرات کسی حتمی معاہدے پر منتج ہو جاتے تو ہندوؤں اور ہندوستان کو عزیز تر رکھنے کے وعدے کی شائد ٹرمپ پاسداری نہ کر پاتے چنانچہ اس ''پاسداری'' کا اہتمام بھی مودی سرکار نے کابل میں امریکی سفارتخانہ کے باہر خودکش حملہ کرا کے اور طالبان کا اس حملے کی ذمہ داری قبول کرنے کا خود ساختہ بیان جاری کر کے کیا۔ سو ٹرمپ کو مذاکرات کی میز الٹانے کا بہانہ مل گیا اور انہوں نے محض تین ٹویٹر پیغامات کے ذریعے پاکستان کی دس ماہ کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ تو بھائی صاحب۔ ایسے ماحول میں ثالثی کی پیشکش کے بار بار اعادے والی ٹرمپی سیاست سے علاقائی اور عالمی امن کی فصل کاشت ہونے کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ جناب ذرا ہوشیار اور خبردار رہیئے کہ ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں''

بسم اللہ کیجئے جناب!

جنونی مودی سرکار نے تو اپنے ہندو انتہاء پسندانہ ایجنڈے کے مطابق جو کرنا تھا، وہ کر گزری ہے، اب سوال یہی اٹھ رہا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ وزیر اعظم عمران خاں نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اپنے خطاب کے دوران ہندو انتہا پسندی والے بھارتی مائینڈ سیٹ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اپوزیشن بنچوں پر بیٹھے خواتین و حضرات کی جانب سوال داغا کہ کیا میں بھارت پر حملہ کر دوں، اپوزیشن لیڈر شہباز شریف صاحب تو اس سوال پر شش و پنج میں پڑ گئے مگر غالباً خواجہ محمد آصف نے یہ جواب دیا کہ اب تک آپ جو اقدامات اٹھا رہے ہیں، کیا وہ اپوزیشن سے پوچھ کر اٹھا رہے ہیں؟ آپ ملکی سلامتی اور قومی مفادات پر پہلے جن سے پوچھ کر فیصلے کرتے ہیں، اب بھی انہی سے مشاورت کر لیں۔ آصف علی زرداری نے دھیمے لہجے میں بھارتی اقدامات پر حکومتی ردعمل کو ناکافی قرار دیا اور اپنے تئیں باور کرایا کہ خدانخواستہ میرے دور حکومت میں بھارت نے کشمیر کے حوالے سے ایسا قدم اٹھایا ہوتا تو میں اسی وقت ایک جہاز سے امریکہ، دوسرے جہاز سے چین اور تیسرے جہاز سے ماسکو جاتا اور پاکستان کیلئے ان کی حمایت حاصل کرتا۔

اگر اب بھی سیاست برائے سیاست ہو تو حکمران پی ٹی آئی کی جانب سے زرداری صاحب کو یہ جواب مل سکتا ہے کہ سرکاری اخراجات پر ملکوں ملکوں گھومنے کے الزام پر ہی تو آپ پہلے ہی نیب کی زد میں آئے ہیں، مگر حضور والا! جب ملکی سلامتی کا معاملہ ہو تو وزیر اعظم عمران خاں کو بھی دنیا کی حمایت حاصل کرنے کیلئے آصف زرداری صاحب کا تجویز کردہ اقدام ہی اٹھانا چاہئے۔ ملکی سلامتی سے زیادہ تو ہمیں کوئی چیز عزیز نہیں ہو سکتی۔ اس معاملہ میں پیپلز پارٹی کے رہنما اور سابق چیئرمین سینیٹ رضا ربانی نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں جو چشم کشا نکتہ اٹھایا اس پر بھی گہری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہی کے اٹھائے گئے سوال کو آگے بڑھانا چاہئے کہ ملکی سلامتی

اور قومی مفادات کے معاملات پر فیصلے کرتے ہوئے آخر قوم کے منتخب کردہ فورم پارلیمنٹ کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا جاتا۔ کیا اس نمائندہ فورم کو ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی اور گالم گلوچ کیلئے ہی استعمال ہونا ہے۔ اگر قومی پالیسیوں کے فیصلہ کیلئے اس نمائندہ فورم کو کوئی حیثیت ہی نہیں دینی تو پھر سلطانیٔ جمہور کو کس کھاتے میں ڈالا جائے، یقیناً رضا ربانی کا تجسس بھی اسی حوالے سے تھا جس کا نتیجہ ''مرد ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر'' والا نہیں سامنے آنا چاہئے۔ وزیراعظم کی زیر صدارت قومی سلامتی کونسل نے بے شک ٹھوس فیصلے کر کے جنونی مودی سرکار کو ''جیسے کو تیسا'' والا جواب ہی دیا ہے۔ بھارت کیساتھ سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کرنے اور بھارتی اقدام کیخلاف اقوام عالم کے نمائندہ ادارے اقوام متحدہ کے پاس اپنا کیس لے جانے سے بلاشبہ بھارت کو دفاعی پوزیشن پر لے جایا جا سکے گا مگر ان فیصلوں کا اعلان مشترکہ پارلیمنٹ کی جانب سے کیا جاتا تو اس سے بھارتی جنونیت کیخلاف پوری قوم کے متحد اور یکجہت ہونے کا ٹھوس پیغام عالمی برادری کو موصول ہوتا۔

وزیراعظم عمران خاں نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں یقیناً بہت موثر تقریر کی اور مودی سرکار کی ہندو انتہا پسندی کو ہندو مائینڈ سیٹ کے ساتھ منطبق کر کے باور کرایا کہ ہمارا مقابلہ اسی مائینڈ سیٹ کے ساتھ ہے اس لیے کوئی بعید نہیں کہ مودی سرکار پلوامہ حملے جیسا واقعہ دہرا کر پاکستان پر حملہ آور ہو جائے۔ اس لیے ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں، ایک یہ کہ ہم بھارت کے آگے ہاتھ کھڑے کر دیں اور دوسرے یہ کہ ٹیپو سلطان کی طرح خون کے آخری قطرے تک اس کا مقابلہ کریں۔ ہم یقیناً یہی راستہ اختیار کرینگے۔ بلاشبہ ہماری قومی سلامتی اور غیرت کا یہی تقاضہ ہے۔ وزیراعظم نے ٹیپو سلطان کا بجا حوالہ دیا مگر قیام پاکستان کی تحریک کا ٹھوس حوالہ خود قائداعظم محمد علی جناح کی ذات ہے، وہ کتنے صلح جو انسان تھے، پوری دنیا انکے اس وصف کی قائل ہے۔ انہوں نے قیام پاکستان کی جدوجہد بھی انتہائی پرامن طریقے سے کی اور تحریک پاکستان کے پورے عرصہ میں خون خرابے کی نوبت نہ آنے دی جبکہ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد خون خرابے کی نوبت اس وقت آئی جب ہندو اور انگریز نے باہمی ملی بھگت سے تقسیم ہند اور باؤنڈری کمیشن کے فیصلہ کو سبوتاژ کرتے ہوئے پنجاب کو دو حصوں میں کاٹ دیا۔ اس طرح سکھوں اور جنونی ہندوؤں کو پاکستان سے کٹ جانیوالے پنجاب سے پاکستان آنیوالے مسلمانوں کے قتل عام کا نادر موقع مل

گیا۔ قائداعظم نے جس دوقومی نظریے کی بنیاد پر تحریک پاکستان کا آغاز کیا وہ نظریہ جنونی ہندوؤں کا اپنا پیدا کردہ تھا جنہوں نے ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا جس سے قائد اعظم اور علامہ اقبال لاچار ہو کر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوؤں کے مظالم سے نجات کی خاطر مسلمانوں کیلئے الگ خطے کا حصول ناگزیر ہے۔ یہ خطہ ہمیں ملا انگریز اور ہندو کی سازش کے تحت انتہائی کمزور حالت میں۔ چنانچہ پاکستان کیلئے کشمیر ہی لائف لائین تھی جسے قائداعظم نے اسی حوالے سے پاکستان کی شہ رگ قرار دیا کہ کشمیر کے راستے پاکستان آنیوالے دریاؤں کے پانی سے ہی پاکستان کی زرعی معیشت نے ترقی کرنا اور پاکستان کو خوشحالی سے ہمکنار کرنا تھا۔ جنونی ہندو نے بھی اسی حقیقت کو بھانپ کر پاکستان کو کمزور کرنے کے ایجنڈہ کے تحت کشمیر کا پاکستان سے الحاق روکنے کی سازش تیار کی اور اپنی فوج داخل کر کے کشمیر کے غالب حصے پر اپنا تسلط جما لیا۔ چنانچہ جنونی ہندو کی اس گھناؤنی سازش نے قائداعظم کی صلح جوئی والی سوچ تبدیل کی اور انہوں نے پاکستان کی شہ رگ کو ہندو کے خونی پنجے سے چھڑانے کیلئے پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی کو کشمیر کے مقبوضہ حصے میں پاکستان کی فوج داخل کرنے اور بھارتی فوج کو وہاں سے مار بھگانے کی ہدایت کی۔ اگر جنرل گریسی قائداعظم کے احکام کی تعمیل سے انکار نہ کرتا اور بھارتی فوج کو کشمیر سے مار بھگا تا تو پھر بھارت کو دوبارہ کبھی ایسی حرکت کی جرأت نہ ہوتی۔ اگر قائداعظم نے اپنی صلح جو طبیعت کے باوجود جنگ ہی کشمیر کو بھارتی تسلط سے چھڑانے کا قابل عمل حل سمجھا تھا تو انہی کی مثال کو پیش نظر رکھ کر آج بھی غاصب ہندو کے اسی طرح کے علاج کی ضرورت ہے، اس لیے وزیراعظم عمران خاں کو کشمیر کیخلاف حالیہ بھارتی اقدام پر پاکستان کی قومی پالیسی طے کرتے وقت بانی پاکستان قائداعظم کی اس سوچ کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے۔

گزشتہ روز پبلک ٹی وی پر اسامہ طیب کے ٹاک شو میں اسی موضوع پر فکر انگیز گفتگو ہو رہی تھی۔ حکمران پی ٹی آئی کے رکن قومی اسمبلی غلام مرتضیٰ ستی نے بہت خیال افروز نکتہ اٹھایا کہ ہم نے تو اس خطہ کے امن و استحکام کی خاطر کشمیر کی جہادی تنظیم لشکر طیبہ اور جماعت الدعوۃ اور دوسری جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کی۔ اگر بھارت صلح جوئی کی راہ پر نہیں آتا اور کشمیر کو بزور ہڑپ کرنے کی پالیسی پر کاربند رہتا ہے تو پھر ہمیں بھی اپنی جہادی تنظیموں پر پابندی کے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا ہو گی۔ بیشک ہندو جنونیت کے توڑ اور اسکے شافی علاج کا یہ بھی موثر راستہ ہے۔ تاہم ایک اور

راستہ جو میں نے اس ٹاک شو میں تجویز کیا، بھارت کو عملاً ہمارے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہے، وہ راستہ ہے مسلم امہ کے اتحاد اور یکسوئی کا۔ او آئی سی پچاس کے قریب مسلم ممالک کا نمائندہ پلیٹ فارم ہے۔ اگر اس پلیٹ فارم پر تمام مسلم ممالک فیصلہ کر لیں کہ کشمیر سے بھارتی فوجیں نکالنے اور یو این قراردادوں کیمطابق کشمیریوں کیلئے استصواب کا اہتمام کرنے تک بھارت کا کوئی جہاز کسی مسلم ملک کی دھرتی پر نہیں اُترنے دیا جائیگا۔ بھارت کے کسی باشندے کو کسی مسلم ملک کا ویزہ نہیں دیا جائیگا اور بھارت کیساتھ کسی بھی قسم کی تجارت نہیں کی جائیگی تو ایک چونی کی خاطر زمین پر گرنے والا ہندو بنیاء آپکے پاؤں پر آ پڑیگا۔ اے کاش کہ مسلم دنیا آج بھی مصلحتوں، مفاہمتوں کے لبادے اتار کر باہم یکجہت ہو جائے۔ امریکہ کی طرح صرف اپنے مفادات کی پاسداری ترجیح اول بنا لے اور مسلم دھرتی پر قدرت کے ودیعت کردہ سونے، تانبے، قیمتی دھاتوں، پانی، تیل، گیس کے بے بہا وسائل صرف مسلم دنیا کی بہبود و ترقی کیلئے بروئے کار لائے اور ان وسائل کو بیرونی دنیا کی دستبرد سے بچالے تو وہ دن ہرگز دور نہیں رہے گا جب اقوام عالم پر مسلم دنیا کا غلبہ ہو جائیگا۔ اگر ہم نے ایڑیاں رگڑ کر ہنود و یہود کی غلامی کی دی ہوئی موت ہی مرنا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ اپنے ایٹمی ہتھیاروں کو اپنے اس ازلی دشمن پر برسا کر اسکے کریا کرم کی بھی نوبت لے آئیں، بیشک ہمارے قومی ہیرو ٹیپو سلطان کا بھی یہی فلسفہ تھا کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ بسم اللہ کیجئے وزیر اعظم صاحب! آپکے سوال کا پوری قوم کیجانب سے یہی جواب ہے۔

نازشاہ کی پکاراور ہمارااحساسِ زیاں؟

مقبوضہ کشمیر میں مودی قصاب کے ننگ انسانیت اقدامات کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا ہے۔ گزشتہ 17 روز سے مودی سرکار نے پوری مقبوضہ وادی کو لاک ڈاؤن کر رکھا ہے۔ بدترین کرفیو کے باعث کشمیری عوام کی نقل وحرکت صرف ان کے گھروں کی چاردیواری تک محدود ہو چکی ہے اور گھروں میں ان کے لیے راشن تک موجود نہیں رہا۔ ان کے بچے بھوک پیاس سے بلک رہے ہیں۔ مریضوں کے لیے ہسپتالوں تک رسائی ناممکن ہو چکی ہے اور جان بچانے والی ادویات تک ان کی پہنچ سے دور ہیں۔ جو مریض ایڑیاں رگڑتے ہوئے جان سے گزر رہے ہیں، ان کے لواحقین کے لیے اگلا مرحلہ اور بھی اذیت ناک بن جاتا ہے کہ کرفیو کے باعث وہ اپنے پیاروں کی نعشیں اُٹھا کر گھر سے باہر قبرستان تک بھی نہیں لے جا سکتے اور اپنے مرے ہوؤں کو گھروں کے صحن میں ہی دفنانے پر مجبور ہیں۔ کیا اس سے بڑا انسانی المیہ کوئی اور ہو سکتا ہے کہ کسی کو گھر میں مقید کر کے اس سے روٹی، روزگار بھی چھین لیا جائے۔ اس کے بچوں کا تعلیمی اداروں میں جانا بھی ناممکن بنا دیا جائے، گلیوں بازاروں کی ہر دکان بند کرا کے کھانے پینے کی ہر چیز سے محروم کر دیا جائے اور ایسی کسمپرسی کی حالت میں کوئی رونا، چیخ وپکار کرنا چاہے تو سنگینیں تان کر اس کی آواز اس کے گلے میں ہی دبا دی جائے۔ کوئی گھر سے باہر قدم نکال بیٹھے تو پیلٹ گن اور دوسرے اسلحہ سے اسے وہیں پر ڈھیر کر دیا جائے۔ کیا اس سے بڑی انسانی بے بسی کوئی اور ہو سکتی ہے اور کیا میں کوئی افسانہ سُنا رہا ہوں۔ جی نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ مودی سرکار کے وہ مظالم ہیں جن پر انسانیت شرما ہی نہیں رہی، دھاڑیں بھی مار رہی ہے۔ مسلم اُمہ کے لیے درد دل رکھنے والے علامہ اقبال نے اپنے تجربات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ایسے ہی تو نہیں کہہ دیا تھا کہ......ع

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

آج کشمیر میں مودی قصاب کے ہاتھوں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے تو گزری کل میں آپ نے میانمار (برما) میں انسانی حقوق کی نام نہاد چیمپئن آنگ سوچی کے ہاتھوں بے بس مسلمانوں بشمول خواتین اور بچوں کے جسموں کے ٹکڑے بکھرتے دیکھے ہوں گے۔ ایسے دلدوز مناظر کی ویڈیوز سوشل میڈیا پر چلیں کہ انہیں دیکھنے کا یارانہ نہ رہا، اور کیا ایسا ہی کچھ مکروہ اسرائیلی نیتن یاہو کے ہاتھوں فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہو رہا، وہاں تو بھرپور امریکی سرپرستی میں اسرائیلی فوجوں کو فلسطینیوں کے قتل عام کا کھلا لائسنس ملا ہوا ہے اور اب مقبوضہ کشمیر میں تو انسانیت دہائی دے رہی ہے۔ جس پر پوری دنیا کی نگاہیں مودی سرکار کی جنونیت پر مرکوز ضرور ہوئی ہیں اور تاسف و تشویش کا اظہار بھی ضرور کیا جا رہا ہے مگر کشمیریوں کے زخموں پر حقیقی پھاہے رکھنے والا تو ہماری مسلم دنیا میں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا۔

پاکستان نے بے شک مودی کو للکارا بھی اور مسلم اُمہ سمیت عالمی برادری کو پکارا بھی مگر کوئی حقیقی مدد کو پہنچا تو وہ ایک ملحد ملک چین تھا جس نے نہ صرف مودی کو مقبوضہ کشمیر سے اپنی فوجیں نکالنے کی وارننگ دی بلکہ سلامتی کونسل کے ہنگامی اجلاس کا انعقاد بھی ممکن بنا دیا اور اقوام عالم کے اس نمائندہ فورم پر کشمیر کو ایک بار پھر متنازعہ علاقہ قرار دلا کے چھوڑا۔ مگر بھائی صاحب۔ چین کا یہ تجسّس اور تفکر ہم سے زیادہ اپنے مستقبل کے حوالے سے تھا کیونکہ مودی سرکار نے اپنی جنونی حرکت کے تحت لداخ کو مقبوضہ کشمیر سے کاٹ کر اور براہ راست بھارت کا حصّہ بنا کر چین کی سلامتی کو بھی چیلنج کیا تھا۔ یہی لداخ کا وہ علاقہ ہے جہاں سے بھارت نے 60ء کی دہائی میں چین کے علاقے اورناچل پردیش میں اپنی فوجیں داخل کر کے اس پر مقبوضہ کشمیر ہی طرح اپنا تسلط جمانے کی کوشش کی بھی مگر چینی فوجوں نے بروقت کارروائی کر کے بھارتیوں کو الٹے پاؤں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اب مودی سرکاری ٹرمپی سایۂ عاطفت میں آئی ہے تو خود کو علاقے کا تھانیدار سمجھ کر جگہ جگہ پھنکارے مارتی پھر رہی ہے چنانچہ اس نے ایک ہی تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی۔ مقبوضہ کشمیر پر شب خون مار کر پاکستان کی سلامتی کو چیلنج کیا اور ساتھ ہی ساتھ لداخ کے حوالے سے چین کے ساتھ بھی پنجہ آزمائی کا شوق چرانے لگا اور اس کی یہی حماقت اس کے گلے پڑ گئی۔

چین بے شک ہمارا ایسا یار ہے جس پر جان بھی نثار ہے اور ہمارے ساتھ جس کی شہد سے

میٹھی، سمندروں سے گہری اور ہمالیہ سے بلند دوستی دنیا میں ضرب المثل بن چکی ہے مگر اس نے بھارت کو سبق اپنی سلامتی کو چیلنج ہوتا دیکھ کر سکھایا ہے، جس سے ہمارا بھرم بھی رہ گیا ورنہ جناب۔ دنیا چھوڑ ہماری مسلم دنیا نے بھی بے نیازی کی چادر اوڑھے رکھنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی۔ رہی بات بھارت کے ساتھ تجارتی مواسم کی تو وہ چین کے بھی اس کے ساتھ ہم سے زیادہ مراسم ہیں اور دو سال قبل عوامی جمہوریہ چین کے صدر کے دورۂ بھارت کے موقع پر دونوں ممالک میں تقریباً 42 ،ارب ڈالر کے تجارتی معاہدے ہوئے تھے۔ چین بھی اگر اس مجبوری کو پیش نظر رکھتا تو مقبوضہ کشمیر میں بھارتی ظلم و بربریت پر رسمی احتجاج کر کے خاموش ہو جاتا یا امریکہ کی طرح اسے بھارت کا اندرونی معاملہ قرار دے دیتا مگر وہ خم ٹھونک کر بھارت کے مقابل آ گیا اور اسے عالمی تنہائی کی صورت حال سے دوچار کر دیا۔ بس ایک ہم ہیں کہ ہماری آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔ کہنے کو ہم مسلم دنیا کے 54 کے قریب ممالک دنیا کی ہر نعمت و دولت سے مالا مال ہیں مگر ہر کوئی اپنے مفادات کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تو دشمنی پال سکتے ہیں، ایک دوسرے کا خون بہانے کے تو مواقع نکالتے رہتے ہیں مگر بحیثیت امہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہونے اور اپنے وسائل ایک دوسرے کی فلاح و بہبود کے لیے بروئے کار لانے کا کبھی احساس ہوتا ہے نہ خیال آتا ہے۔ ہم نے مقبوضہ کشمیر میں مودی سرکار کی زور زبردستی کے خلاف مسلم امہ کی قیادتوں اور اس کی نمائندہ تنظیم او آئی سی کو پکارا مگر کسی جانب سے مودی کے لیے چین جیسی دھمکی تو کجا، رسمی احتجاج کی کوئی لہر بھی اٹھتی دکھائی نہ دی۔ 48 مسلم ممالک کی اسلامی نیٹو فورس کو تو مظلوم کشمیریوں کی پکار پر جنونی ہندو مودی کے ہاتھ توڑنے اور اس کا خناس نکالنے کے لیے لشکر کشی کر دینی چاہئے تھی مگر بے عملی ہی نہیں، بے نیازی بھی اس عسکری اتحاد کا خاصہ بنی رہی۔

اور پھر برادر یو اے ای نے تو لٹیا ہی ڈبو دی جس نے عین اس موقع پر کہ مودی کے ہاتھ مظلوم کشمیریوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، اسے اعلیٰ ترین اماراتی سویلین ایوارڈ دینے کا اعلان کر دیا۔ گویا مودی کے ہاتھوں کشمیری مسلمانوں کے قتل عام کا جشن منانے کا اہتمام اس برادر مسلم ملک کی جانب سے کیا گیا جہاں مظلوم کشمیریوں اور دوسرے مظلوم مسلمانوں کو امان ملنی چاہئے تھی، کہا گیا ہے کہ یو اے ای نے یہ اقدام بھارت کے ساتھ اپنے تجارتی معاہدوں کی پاسداری میں اٹھایا ہے۔ ارے جناب۔ جو معاہدے ہم نے تحفظ امتِ مسلمہ کے لیے ذات باری

تعالٰی کے ساتھ کرر کھے ہیں اس پر جوابدہی کا بھی ہمیں کوئی احساس ہے یا نہیں۔ برطانوی مسلمان خاتون رکن پارلیمنٹ محترمہ ناز شاہ نے یہی سوال تو ابوظہبی کے ولی عہد شیخ محمد بن زائد النیہان کو دو صفحات پر لکھے گئے اپنے خط میں اٹھایا ہے اور مودی سرکار کے ہاتھوں کشمیری مسلمانوں کی درگت بننے کا پورا نقشہ کھینچ کر انہیں جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے کہ اگر آپ کے اقتصادی معاہدے آپ کو کشمیریوں کے لیے کھڑے ہونے یا بولنے کی اجازت نہیں دیتے تو کم از کم آپ امارات کے نمائندے کی حیثیت سے اس معاملہ پر خاموش رہیں اور دل میں مودی کے اقدامات کی مذمت کریں۔ صد حیف کہ مصلحتوں میں جکڑے ہمارے امہ کے قائدین کے لیے یہ کلام نرم و نازک بھی بے اثر ثابت ہوا اور قصاب مودی امہ کی ہزیمتوں کا اہتمام کرنے والا یہ ایوارڈ پورے پروٹوکول کے ساتھ وصول کرنے کے لیے آج بروز جمعۃ المبارک ابوظہبی پہنچ رہے ہیں۔

ہم اوروں کو کیا کہیں، خود اپنا معاملہ بھی دیکھ لیں۔ ہم نے بھارت کے ساتھ تجارت، دوستی بس اور سمجھوتہ ایکسپریس بند کرنے کا اعلان کیا مگر ہمارے جہاز بدستور بھارتی ائیر پورٹس پر اتر رہے ہیں اور دوطرفہ تجارت کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری ہے۔ ارے کوئی کہہ دے مظلوم کشمیریوں کو کہ انہوں نے اپنی آزادی کی جنگ خود ہی لڑنی ہے۔ وہ جیت گئے تو وہی ہماری بھی جیت ہوگی کہ ہم لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کے عادی ہیں۔ اب اتحاد امت کی دعا بھی کریں تو کس برتے پر کہ ہم میں تو احساسِ زیاں بھی نہیں رہا۔

پاکپتن کا سفر اور کیفیتِ دل

میں پاکپتن گیا تو اپنے بھتیجوں کی شادیوں میں شرکت کے لیے تھا مگر وہاں بیٹھے بیٹھے دل کا روگ لگا کر آ گیا۔ دونوں بھتیجوں کی باراتیں ہنسی خوشی بھگتا لیں مگر ان کے ولیمہ کی تقریب میں شمولیت کا موقع ہی نہ مل سکا کیونکہ سینے میں اچانک اٹھنے والے شدید درد نے مجھے ہسپتال پہنچا کر چھوڑا۔ کیفیت ایسی بن گئی کہ؟

درد ایسا ہے کہ جی چاہے ہے زندہ رہئے
زندگی ایسی کہ مر جانے کو جی چاہے ہے

سینے کا درد اٹھا تو بھائی، بہن، بیٹوں اور دوسرے عزیز و اقارب نے مجھے ایمبولینس میں ڈال کر پاکپتن کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال پہنچا دیا۔ رات بے ہوشی کے عالم میں ایمرجنسی وارڈ میں گزاری۔ شعبۂ امراض دل کے ڈاکٹر آصف منیر نے پوری توجہ سے چیک اپ کیا تمام ضروری ٹیسٹ کرائے اور ابتدائی معائنہ میں انجائنا کا شبہ ظاہر کیا۔ اسی بنیاد پر عارضۂ قلب کا فوری علاج شروع کر دیا گیا۔ ہسپتال کے وارڈز میں حبس اور گھٹن انتہا درجے کی تھی اس لیے میرا بیڈ ہسپتال کے کوریڈور میں لگوا دیا گیا۔ بھائی تنویر ساحر کو میری صحت کے حوالے سے زیادہ فکر لاحق تھی کیونکہ وہ بھی چند ماہ قبل انجائنا کو بھگت چکا ہے اور انجیو پلاسٹی بھی کرا چکا ہے اس لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ مجھے ابتدائی طبی امداد کے ساتھ ہی پی آئی سی لاہور منتقل کر دیا جائے۔ اس نے اور بیٹوں شہباز سعید اور سلمان سعید پوری رات نے میرے پاس کھڑے ہو کر جاگتے گزار دی۔ صبح تمام ٹیسٹوں کی رپورٹس آئیں تو ڈاکٹر آصف منیر نے خوشخبری سنائی کہ آپ انجائنا اٹیک سے محفوظ رہے ہیں۔ مجھے معدے کے درد کا اکثر سامنا رہتا ہے۔ اس بار یہ درد کچھ زیادہ شدت کے ساتھ اٹھا تو اوسان خطا کر گیا۔ ڈی ایچ کیو ہسپتال پاکپتن میں زندگی میں پہلی بار بغرض علاج جانے کا موقع ملا تو عوام

کو صحت کی سہولتوں کی فراہمی کے معاملہ میں حکومتی ترجیحات جانچنے کا بھی موقع مل گیا۔اس حوالے سے لاہور کے ہسپتالوں کا تو مجھے اچھا خاصہ تجربہ ہو چکا ہے۔ پاکپتن کے ضلعی ہسپتال میں مریضوں، ان کے لواحقین اور ہسپتال کے عملہ بشمول ڈاکٹروں اور لوئر سٹاف کی کسمپرسی دیکھ کر دل کو مزید ملال ہوا۔حبس کے موسم میں ہسپتال کے وارڈوں میں بغیر ائرکنڈیشنر کے مریضوں سمیت سب کا بُرا حال تھا۔وارڈوں میں صفائی نہ ہونے کے باعث تعفن اٹھ رہا تھا۔متعلقہ سٹاف کی بھی شدید کمی تھی اور پھر ایمرجنسی وارڈ میں بھی غریب مریضوں کے لواحقین کو مہنگی ادویات بازار سے لانا پڑتی ہیں کہ پی ٹی آئی حکومت نے اقتدار میں آتے ہی اپنی صحت کی ترجیحات ایمرجنسی وارڈوں میں مفت ادویات کی فراہمی بند کر کے متعین کی ہیں۔سرکاری ہسپتالوں میں اصلاحات کی جانب پہلے ہی توجہ نہیں دی جاتی۔ڈاکٹروں اور دوسرے عملہ سمیت سٹاف کی کمی ہے تو یہ کمی دور کرنا حکومتی ترجیحات میں شامل ہی نہیں۔سو مریضوں کے انبار میں ڈاکٹروں سے جو ممکن ہوسکتا ہے وہ کر گزرتے ہیں۔مناسب علاج معالجہ کے لیے مطلوبہ وسائل اور سہولتیں پوری کرنا تو بہرصورت ان کے بس کی بات نہیں۔یہ کام تو حکومت ہی کے کرنے کے ہیں کہ آئین نے شہریوں کی صحت، تعلیم، روزگار کی سہولتوں کی فراہمی ریاستی ذمہ داری گردانی ہوئی ہے۔جب ریاست اپنی یہ ذمہ داری ادا نہیں کر پاتی تو نجی علاج گاہوں میں ڈاکٹروں کو مریضوں اور ان کے لواحقین کی کھال اتارنے کا موقع ملتا ہے۔اگر حکومت نے شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے معاملہ میں قطعی لاتعلقی اختیار کر رکھی ہو تو جدید اسلامی، جمہوری، فلاحی ریاست کا تصور کیسے پنپ سکتا ہے۔ پاکپتن کے سرکاری ہسپتال میں ایک رات گزارتے ہوئے مجھے اس ملک خداداد کے غریب عوام کی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوا۔

پاکپتن کی معروف سماجی شخصیت حاجی عبدالواحد کو بھی غریب عوام کی اس کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے جو فلاحی جمہوری ریاست کی بات کرنے والے حکمرانوں کی جانب سے عوام کی فلاح کی ترجیحات میں عدم دلچسپی پر اکثر کڑھتے نظر آتے ہیں۔میری ان کے ساتھ دیرینہ تعلقداری ہے۔ان کے بیٹے عاصم کا عارضۂ قلب میں علاج معالجہ کی سہولتوں کے فقدان کے باعث نوعمری میں انتقال ہوا تو انہوں نے پاکپتن میں کارڈیالوجی ہسپتال بنانے کا بیڑہ اٹھالیا۔آج عاصم واحد کارڈیالوجی ہسپتال اس پورے علاقہ میں عارضۂ قلب کے علاج کا واحد معیاری ہسپتال

ہے جسے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال پاکپتن کے ساتھ منسلک کیا جا چکا ہے۔ حاجی عبدالواحد کو میرے ہسپتال میں داخلے کا علم ہوا تو وہ مجھے وہاں سے اٹھا کر عاصم واحد کارڈیالوجی ہسپتال لے آئے جہاں انہوں نے میرے سارے مطلوبہ ٹیسٹ نئے سرے سے کرائے اور اس ذات باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے سینے کے درد پر یہاں بھی انجائنا کا شبہ دور ہو گیا۔ پھر بھی دن بھر میں ڈاکٹروں کی ''حفاظتی تحویل'' میں رہا۔ حاجی عبدالواحد نے دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور دل کا روگ اٹھانے والا یہ مریض آج لاہور واپس لوٹ آیا ہے۔

اس بار لاہور سے پاکپتن اور وہاں سے لاہور واپسی کا سفر بھی انتہائی کٹھن رہا کہ عملاً گڑھے بنی سڑکیں آدمی کا انجر پنجر ہلا دیتی ہیں۔ ٹھوکر سے مانگا منڈی تک اور پھر اوکاڑہ سے دیپالپور تک کی کھڈوں، کھائیوں کا مجموعہ بنی سڑک پر کوئی دل گردے والا ہی سفر کرسکتا ہے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ شہریوں کے ترقیاتی کام کرنا پی ٹی آئی حکومت نے اپنی ترجیحات کا حصہ ہی نہیں بنایا۔ پاکپتن میں اب برصغیر کے نامور بزرگ صوفی شاعر بابا فرید گنج شکر کے عرض کی تقریبات کا آغاز ہو چکا ہے جس میں لاکھوں افراد شمولیت کے لیے اندرون اور بیرون ملک سے پاکپتن آتے ہیں مگر آج پاکپتن کی سڑکوں کی جو درگت بنی ہوئی میں دیکھ کر آیا ہوں اس کے پیش نظر عرس بابا فرید کے موقع پر اس بار زائرین کو بہت کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ وہاں جو بات میرے نوٹس میں آئی وہ ترقیاتی کاموں میں حکومت کی عدم توجہی کا شاہکار تھی۔ متعلقہ اداروں کو نہ صرف ترقیاتی کاموں سے روکا گیا ہے بلکہ سڑکوں کے پیچ ورک تک کے لیے فنڈز جاری نہ کرنے کی روایت بھی قائم کی گئی ہے چنانچہ متعلقہ ادارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور عوام ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ پاکپتن وزیر اعظم عمران خاں کا سسرالی شہر ہے، اگر وہاں ترقیاتی کاموں میں ایسی حکومتی بے نیازی ہے تو ملک کے دوسرے شہروں کا خدا ہی حافظ ہے۔ اگر تو پی ٹی آئی نے محض اقتدار کا شوق پورا کرنے کے لیے حکومت حاصل کی ہے تو بے شک وہ ملک اور عوام کی درگت بناتی رہے مگر اس نے مستقبل میں بھی اقتدار کی سیاست کرنی ہے تو اسے اپنی پالیسیوں اور ترجیحات میں عوام دوستی کا عنصر شامل کرنا ہوگا اور اپنے اقتدار کے اگلے چار سال خالصتاً عوام کی خدمت میں گزارنے ہوں گے ورنہ عام عوام کی زبانی میں جو کچھ پاکپتن میں سن کر آیا ہوں وہ آئندہ انتخابات تک حکومت کے لیے نوشتۂ دیوار بھی بن سکتا ہے۔

قائداعظم کی فہم وبصیرت اور ہماری عاقبت نااندیشیاں

کیا قائداعظم جیسی بے بدل قیادت ہمیں قیام پاکستان کی تحریک کے لیے دستیاب ہوسکتی تھی اور کیا اب بھی دستیاب ہوسکتی ہے۔ ماضی اور حال کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتا ہوں تو سوائے مایوسی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ قحط الرجال ہے، سب اپنی اغراض، اناؤں اور مایا کے پجاری ہیں۔ ملک کی خدمت اور اس کی ترقی واستحکام کے جذبے سے سرشار قائد جیسا لیڈر کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ ''ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم''۔ ایسی عظیم ہستی کی آج سے 71 برس قبل 11- ستمبر 1948ء کو جس کسمپرسی میں رحلت ہوئی کامریڈ لئیق عسکری اس کے عینی شاہد ہیں۔ مرحوم لئیق عسکری بھی مرد قلندر تھے، آل انڈیا مسلم لیگ کے گارڈ تھے۔ انہوں نے ساری عمر لاہور میں پیدل دھکے کھاتے گزاری۔ ہائیکورٹ سے چیئرنگ کراس تک ہمارا اکثر پیدل ساتھ رہتا اور اس دوران لئیق عسکری مسلم لیگ، قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح سے وابستہ یادیں میرے ساتھ شیئر کرتے رہتے۔ قائداعظم کے انتقال کا دلدوز واقعہ بھی انہوں نے اسی طرح میرے ساتھ شیئر کیا اور اپنے تئیں نتیجہ یہ اخذ کیا کہ ان کی سخت علالت میں قائداعظم ریذیڈنسی زیارت سے ہسپتال پہنچانے میں دانستہ غفلت کا مظاہرہ کر کے اور راستے میں جگہ جگہ خراب ہونے والی ان کی کھٹارا گاڑی میں ڈاکٹر کی تعیناتی نہ کر کے انہیں درحقیقت قتل کیا گیا تھا۔ بے شک موت تو برحق ہے اور برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے نجات دلا کر ایک الگ مملکت کا تحفہ دینے والے ہمارے بے بدل قائد ٹی بی جیسے موذی مرض کے ساتھ لڑ رہے تھے جس کی انہوں نے انگریز اور ہندو لیڈروں کو خبر تک نہ ہونے دی کہ کہیں یہ اطلاع پا کر وہ ان کی موت کے انتظار میں پاکستان کی تشکیل سے ہاتھ نہ کھینچ لیں مگر ہمارے اپنوں نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ ہم شائد احسان فراموشی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اس لیے جان کنی کی کیفیت میں مبتلا اپنے عظیم قائد کو شائد

اس وقت کی لیگی قیادت نے ان کی موت کی خبر سننے کی جلدی میں حالات کے تھپیڑوں کے سپرد کر دیا۔ لئیق عسکری کے مطابق محترمہ فاطمہ جناح اور وہ خود قائد کی گاڑی کے ساتھ تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح اپنے عظیم بھائی کے منہ پر بھنبھنانے والی مکھیاں ہٹانے کے لیے مسلسل دستی پنکھا جھلتی رہیں مگر قائد جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے بعد آنے والی قیادت کے جو لچھن سامنے آئے وہ کامریڈ لئیق عسکری کے الزام کو درست ثابت کرتے ہیں جنہوں نے جاہ و منصب کی خاطر قائد کے پاکستان کو ترقی معکوس کے سفر پر ڈال دیا۔

آج کچھ حلقے اور احباب قیام پاکستان کے حوالے سے قائداعظم کی فہم و بصیرت پر بھی سوال اٹھانے سے نہیں ہچکچاتے۔ ایک نشست میں میاں خورشید محمود قصوری آف دی ریکارڈ گفتگو کر رہے تھے۔ کشمیر کی صورتحال کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے آنکھیں نچاتے ہوئے پھبتی کسی کہ قیام پاکستان کے بعد اگر قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے اس وقت کے صدر ولبھ بھائی پٹیل کی یہ پیش کش قبول کر لیتے کہ کشمیر لے لو اور حیدر آباد دکن ہمیں دے دو تو آج کشمیر ہمارا حصہ ہوتا مگر یہ پیشکش ٹھکرا کے نہ کشمیر ہمیں ملا اور نہ حیدر آباد دکن۔ اسی طرح محترم سید افضل حیدر نے ہمارے سینئر کالم نگار اسداللہ غالب کے ساتھ ایک نشست میں پاکستان کی سرحدوں کے تعیّن کے حوالے سے اپنی، اپنے والد مرحوم سید محمد شاہ اور میرے والد مرحوم چودھری محمد اکرم کی یادیں شیئر کرتے ہوئے بتایا کہ سرحدوں کے تعیّن کے لیے اراضی کا جو ریکارڈ چودھری محمد اکرم نے ان کے والد سید محمد شاہ کو ان کی وساطت سے فراہم کیا اور جس کی بنیاد پر ان کے والد نے متعلقہ عدالت میں سرحدوں کے تعیّن کا کیس لڑا اس کے مطابق گورداسپور پاکستان میں شامل تھا اور اعلان آزادی کی دستاویز میں بھی گورداسپور کو پاکستان کا حصہ دکھایا گیا تھا مگر ریڈکلف نے ہندو کی ملی بھگت سے گورداسپور کو پاکستان سے کاٹ کر بھارت کا حصہ بنا دیا۔ اس حوالے سے غالب صاحب نے سوال اٹھایا کہ کیا قائداعظم، سید محمد شاہ ایڈووکیٹ، سید افضل حیدر اور چودھری محمد اکرم کو ریڈکلف کی جانب سے کئے جانے والے اس گھپلے کا علم نہیں ہوا تھا اور اگر علم تھا تو اس کی مزاحمت کیوں نہ کی گئی۔

میرے خیال میں ایسی باتوں کی بنیاد پر نہ قائداعظم کی بصیرت کا سوال اٹھایا جا سکتا ہے نہ ان کی ذات کے حوالے سے ایسی باتیں کرنا مناسب ہے کیونکہ انہوں نے شاطر ہندو اور انگریز

قیادتوں سے لڑتے الجھتے ہوئے بہرصورت مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ ارضی دنیا کے نقشے پر نمودار کر کے دکھایا تھا جو درحقیقت ہندو بنیا کے مہا بھارت کے تصور کی نفی اور ناکامی تھی اور پاکستان کو بھارت کی کوکھ سے نکال کر قائداعظم نے درحقیقت ہندو کا اکھنڈ بھارت کا خواب چکنا چور کیا تھا۔ گورداسپور پاکستان میں شامل رہتا یا قائداعظم ولبھ بھائی پٹیل کی حیدرآباد دکن کے بدلے کشمیر لینے کی پیشکش قبول کر لیتے تو یقیناً یہ مثالی صورت حال ہوتی مگر اس وقت کے معروضی حالات میں پاکستان کا حصول ہی بہت بڑا کارنامہ تھا جو یقیناً قائداعظم کی فہم و بصیرت کے باعث ہی ایک ایسی حقیقت کے روپ میں سامنے آیا تھا جو ہندو لیڈرشپ کو کسی صورت قبول نہیں تھا۔ ہندو نے بادل نخواستہ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کو قبول تو کر لیا مگر ایک گھناؤنی سازش کے تحت ایک کمزور اور کٹے پھٹے پاکستان کی بنیاد رکھوائی جس کے پاس نہ ادارے تھے نہ وسائل جبکہ گورداسپور کو پاکستان سے کاٹ کر تشکیل پاکستان کے عمل میں سکھوں کو پاکستان نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں پر بلوؤں اور ان کے قتل عام کا کھلا لائسنس فراہم کر دیا۔ سید افضل حیدر کے بقول بے شک پاکستان کی سرحدوں کا اعلان 17-اگست کو ہوا مگر پاکستان تشکیل تو پا گیا جسے قائداعظم نے اپنی فہم و بصیرت اور دوراندیشی کے تحت ہی اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے دکھایا۔

ہمیں ملنے والا پاکستان بھی بلاشبہ قدرتی وسائل سے مالا مال تھا جنہیں صحیح معنوں میں بروئے کار لایا جاتا تو یہ ارض وطن کب کی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو چکی ہوتی مگر قائد کے بعد کی قیادتوں لیاقت علی خاں سے لے کر آج تک کسی نے اس ارض وطن کے وسائل کو ملک اور قوم کے مفاد کے لیے بروئے کار لانے کا احساس تک نہیں کیا، مارشل لاؤں کی تو بات ہی چھوڑیں، سلطانی جمہور والوں نے بھی کیا جمہوریت کی بنیاد پر حاصل کئے گئے قائد کے پاکستان کو جمہوری اصولوں پر چلنے دیا ہے۔ بس سلطانی جمہور کو قصرِ سلطانی میں بدلنے کے کارنامے ضرور سرانجام دیئے گئے۔ کسی کو قائداعظم ثانی کہلانے کا شوق رہا اور کسی نے اسلامی جمہوری فلاحی معاشرے کے ساتھ سوشلزم کی بیخ لگا دی۔ آج ریاست مدینہ کے چرچے ہیں مگر قائد کا پاکستان قائد کے خواب کی تعبیر ہی ڈھونڈتا نظر آتا ہے۔ کیا کہیں، کس سے کہیں، کچھ بھی نظر آتا نہیں۔ قائد کے پاکستان کی سمت تو لیاقت علی خان نے ہی سوویت یونین کی دورے کی پیش کش ٹھکرا کر اور امریکی غلامی قبول کر کے بدل دی تھی چنانچہ ہم آج تک اسی غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ جس

امریکہ کو صرف اپنے مفادات سے غرض ہے اور صرف اپنا ملک عزیز ہے، اس کی خاطر ہم نے اپنے مفادات کی قربانی بھی دے دی ہے اور اپنی سلامتی بھی اس کے ہاتھوں داؤ پر لگا دی ہے۔ بھارت اپنے مفادات کے تحت اسی امریکہ کو سامراج کے نام سے پکارا اور سامراج مردہ باد کے نعرے لگاتا تھا مگر اسی بھارت نے سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اپنے مفادات کے تحت امریکی کیمپ میں شمولیت اختیار کر لی اور ہم امریکی حلیف ہونے کے باوجود راندۂ درگاہ بن گئے۔ سوویت یونین کے خلاف امریکی سرد جنگ سے نائین الیون کے بعد امریکی فرنٹ لائین اتحادی کے کردار تک ہم نے امریکی مفادات کے ٹوکرے ہی اٹھائے رکھے اور قائد کے پاکستان کو بٹہ لگاتے رہے۔ آج اسی امریکہ نے افغان امن عمل میں آٹھ ماہ تک ہمیں رگڑا دے کر اور طالبان کے ساتھ مذاکرات نتیجہ خیز بنانے کی نوبت لا کر عین معاہدے کے وقت دھوبی پٹڑا لگا کر ان مذاکرات کی میز الٹا دی ہے تو بھائی صاحب آج ہی ہوش کے ناخن لے لیں اور افغانستان کو طالبان کے ہاتھوں امریکیوں کا قبرستان بننے دیں۔ ہمیں اس کے مفادات سے کیا لینا دینا ہے۔ ہمیں بس اپنے امن سے سروکار ہونا چاہئے جو طالبان سے پہلے جیسے بہتر تعلقات کار کی بنیاد پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تو جناب! آج یوم قائد کے موقع پر قائداعظم کی فہم و بصیرت کو سامنے رکھتے ہوئے ٹرمپ کو ٹرمپی پٹڑا لگائیے اور اس کے مفادات کی جنگ اس کے منہ پر دے ماریئے۔ پھر دیکھئے وہ افغانستان سے الٹے پاؤں کیسے واپس بھاگتا ہے۔ اس کے لیے بس قائداعظم کی بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہمت دکھایئے، بسم اللہ کیجئے اور قائد کی روح کو خوش کرنے کا اہتمام کیجئے۔ بے شک خدا ہمارا حامی و ناصر ہوگا۔

ستمبر 65ء کا جذبہ اور آج کے حقائق

ستمبر 65ء کی جنگ کے وقت میری عمر محض گیارہ برس تھی اور پرائمری کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ ہائی سکول پاکپتن میں چھٹی کلاس میں داخل ہو چکا تھا۔ پاکپتن کا ماحول اس وقت بالکل دیہات والا تھا۔ اس وقت تک ہمیں بجلی کی سہولت بھی دستیاب نہیں تھی اس لیے گھروں میں برقی قمقموں اور پنکھوں کا بھی کوئی تصور نہیں تھا، ٹی وی، فریج جیسی الیکٹرانک اشیاء تو بہت دور کی بات تھی۔ گھروں میں مٹی کے دیئے اور لالٹین سے روشنی کی جاتی جبکہ گلیوں بازاروں میں کمیٹی والے کھمبوں پر مٹی کے تیل سے روشن ہونے والی لالٹین دن ڈھلنے کے بعد روشن کر دیا کرتے تھے۔ زیادہ تر گھر مٹی، گارے کے بنے ہوتے تھے اور بہت زیادہ باوسیلہ لوگ ہی پختہ اینٹوں کے گھر بنایا کرتے تھے۔ اس ماحول میں رات کو دیر تک جاگنے کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ محلہ پیر کریاں میں ہمارا گھر بھی چار پانچ مرلے پر مٹی گارے کا بنا ہوا تھا جس میں پانی کی سہولت ہینڈ پمپ (نلکے) سے حاصل کی جاتی تھی۔ گھر کے صحن میں بھینس باندھی جاتی اور گرمیوں میں چار پائیاں بھی اسی صحن میں بھینس کے اردگرد ڈالی جاتیں۔ والد صاحب چودھری محمد اکرم (گولڈ میڈلسٹ کارکن تحریک پاکستان) مسلم لیگی کارکن ہونے کے ناطے محلے اور شہر کی سیاسی سرگرمیوں میں بھی شریک رہتے تھے اور اس ناطے سے ہمارے گھر کی بیٹھک ایک دوسرے کے ساتھ ملکی حالات کو شیئر کرنے کا ذریعہ بنا کرتی جہاں ریوالونگ حقے کی نئے باری باری ہر شریک محفل کے منہ کا رخ کرتی اور پھر منہ سے دھویں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے ایک دوسرے کے سیاسی نظریات ملکی حالات کی مناسبت سے سامنے آتے۔ اس وقت پاک بھارت سرحدی کشیدگی عروج پر تھی چنانچہ ہماری بیٹھک میں ہونے والی نشستوں کا موضوع بھی پاکستان بھارت کشیدگی سے پیدا ہونے والی صورتحال کا بنا کرتا، اس وقت ہمیں مارشل لاء کے مضمرات کا کوئی زیادہ ادراک نہیں تھا چنانچہ ملکی حالات کی

مناسبت سے صدر جنرل ایوب خاں ہمیں اپنے قومی ہیرو کے روپ میں نظر آئے۔ بچپن میں ہی مجھے مصوری کا شوق چرایا تو دیگر مشاہیر کی طرح میں نے جنرل ایوب خاں کا پورٹریٹ بھی بنا ڈالا۔ تقریباً ہر گھر میں ایوب خاں کی تصویر آویزاں ہوتی تھی۔ پورے محلے میں صرف ہمارے گھر میں سیل سے چلنے والا ایک ٹرانسسٹر ریڈیو تھا جس پر تازہ ترین خبروں کا بلیٹن سننے کے لیے محلے کے لوگ جمع رہتے۔

انہی خبروں کے ذریعے 6- ستمبر 1965ء کو اطلاع ملی کہ دشمن کی فوج نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ کمیٹی والوں نے خطرے کے وقت بلیک آؤٹ کرنے اور سائرن بجانے کا اہتمام کیا اور لوگوں کو اپنے گھروں میں خندقیں کھودنے کی ہدایت کی چنانچہ والد صاحب نے ہمیں ساتھ لگا کر گھر کے صحن میں چھ فٹ گہری اور اتنی ہی لمبی خندق کھود دی، جیسے ہی سائرن بجتا ہم سب گھر والے اس خندق میں چلے جاتے اور خطرہ ٹلنے پر باہر نکل آتے مگر یہ پریکٹس چند گھنٹوں تک ہی برقرار رہ سکی کیونکہ لوگوں میں بھارتی جہاز دیکھنے اور اس پر پھبتیاں کسنے کا بھی جنون پیدا ہو چکا تھا چنانچہ 6- ستمبر ہی کی رات جب سائرن بجنا شروع ہوئے تو بلیک آؤٹ ہونے کے باوجود محلے کے سب بچے، بوڑھے، جوان، خندقوں میں جانے کے بجائے گھروں کی چھتوں پر یا کھلے میدان میں آ جاتے تاکہ حملہ کے لیے آنے والے بھارتی جہازوں کا مشاہدہ کر سکیں۔ ہمارے علاقے میں یہ جہاز ہیڈ سلیمانکی سے اڑ کر آیا کرتے تھے اور اکثر جہاز ہماری فضائیہ کے ہتھے چڑھ کر زمین بوس ہو جاتے۔ اسی طرح اپنے علاقے میں دو چار بھارتی جہاز گرنے کا نظارہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان تباہ شدہ جہازوں کا ملبہ ریلوے سٹیشن کے باہر گراؤنڈ میں چبوترہ بنا کر سجا دیا گیا اور جنگ کے دوران ہی لوگ جوق در جوق یہ ملبہ دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ اس وقت ریڈیو پاکستان اور ریڈیو آزاد کشمیر پر قومی ترانوں کے ذریعے عوام کے دل گرمائے جاتے اور ان میں پاکستان کے ساتھ محبت اور اس کے تحفظ کے لیے ہر قربانی دینے کا جذبہ اجاگر کیا جاتا۔ مادام نور جہاں کے ملی نغموں کی دھوم مچ گئی جبکہ مہدی حسن، شوکت علی، مسعود رانا، احمد رشدی، مالا، نسیم بیگم اور رونا لیلیٰ کے گائے ملی نغمے بھی دلوں کو گرمانے لگے۔ جنرل ایوب خاں نے ''ٹیڈی پیسہ دو ٹینک'' کے نام سے فنڈ قائم کیا تو اس فنڈ کے لیے مختلف مقامات پر رکھے گلّے پلک جھپکتے میں بھرنے لگے۔ قوم کا بچہ بچہ اپنی جری و بہادر سپاہ کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتا پاک فوج زندہ باد کے نعرے لگاتا نظر

آ تا۔ اس تناظر میں ایوب خاں کے پورٹریٹ بسوں، ٹرکوں اور دوسری پبلک ٹرانسپورٹ پر آویزاں ہونے لگے جبکہ ایوب خان کے ساتھ سیاسی اختلافات کی چادر بھی لپیٹ لی گئی اور پورے ملک میں مثالی ہم آہنگی کی فضا استوار ہوتی نظر آئی۔

یہ جذبہ ایسا تھا کہ لوگ غلیلوں سے پرندوں کی طرح بھارتی جہاز بھی شکار کرنے کی لگن سے سرشار نظر آتے تھے۔ ایسے جذبے والی قوم کو بھلا کون شکست دے سکتا ہے۔ ستمبر 65ء کی جنگ قوم کی ایسی ہی تابناکیوں کا شاہکار بنی اور بھارت کو گھٹنے ٹیک کر جنگ بندی کی راہ اختیار کرنا پڑی۔ اگر بھارت دسمبر 71ء کی جنگ میں مکتی باہنی کو آگے نہ لاتا تو یقیناً اس جنگ میں بھی وہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتا۔ آج پاکستان اور بھارت دونوں ایٹمی قوتیں ہیں اور بھارت کے سر پر جنگ کا بھوت سوار ہے۔ اسے شاید اندازہ ہی نہیں کہ آج عرصہ دراز تک چلنے والی روایتی جنگ کا زمانہ لد چکا ہے۔ اب تو بس چٹکی بجانے کی دیر ہوتی ہے اور اس دھرتی پر موجود ہر ذی روح سمیت سب کچھ جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ کیا مودی سرکار کو اس حقیقت کا علم نہیں ہوگا کہ ہمارے پاس ایٹمی وار ہیڈز بھارت سے کہیں زیادہ ہیں اور پھر ہمارے ٹیکٹیکل ہتھیار تو محدود رینج میں سب کچھ جلا کر بھسم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم نے 65ء کی روایتی جنگ میں اس شاطر دشمن کے قدم نہیں جمنے دیئے اور ہماری جری و غیور سپاہ نے جرأت، بہادری اور قربانیوں کی بے پناہ داستانیں اس جنگ کی تاریخ میں رقم کرائی ہیں تو آج جنونی مودی سرکار کس باغ کی مولی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرے گی تو اسے پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ تو حضور خبردار رہیے، ہمارا غلیل سے جہاز مار گرانے والا جذبہ آج بھی قائم و برقرار ہے۔ ہم سے مت ٹکرانا ورنہ بھسم ہو جاؤ گے۔

”اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

محسوس یہی ہو رہا ہے کہ ہمارے ساتھ ”سائیاں کدھرے تے ودھائیاں کدھرے“ کی مثال کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ ہم کشمیر میں جاری بھارتی مظالم کے خلاف پوری دنیا میں دُہائی دے رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل، ہیومن رائٹس کونسل، یورپی پارلیمنٹ، برطانوی پارلیمنٹ، واشنگٹن، بیجنگ، ماسکو اور برادر عرب ممالک کے ساتھ ساتھ او آئی سی، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دوسرے علاقائی اور عالمی نمائندہ فورم کے دروازوں پر دستک دے چکے ہیں۔ وزیر اعظم عمران خاں اور وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے دنیا بھر میں اپنے ہم منصبوں کے ساتھ روابط اور انہیں کشمیریوں کے ساتھ بھارتی مظالم سے آگاہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جواب میں بھی ہماری ان کوششوں پر بہت حوصلہ افزاء پیش رفت نظر آئی ہے مگر لگتا ہے یہ سب محض زبانی جمع خرچ ہے۔ عملاً بھارتی ہاتھ روکنے اور اسے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ کشمیر حل کرنے پر مجبور کرنے والی کوئی پیش رفت ہماری مسلم برادری کی جانب سے بھی ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ صرف دو ممالک کھل کر ہمارے موقف کے ساتھ کھڑے ہیں، ایک ہمارا بے لوث یار چین ہے اور دوسرا اپنی خودداری کا بھرم ٹوٹنے نہ دینے والا، رجب طیب اردوان کا ترکی ہے۔ ہم اپنے پلڑے میں زیادہ سے زیادہ اور کسی کو شامل کر پائیں گے تو وہ ایران ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی سلامتی سے متعلق اس کے مفادات کو کسی قسم کی ٹھیس نہ پہنچائیں یا پھر ہم بڑی چھلانگ ماریں گے تو ولادی میر پیوٹن کے روس کو اپنا ہمنوا بنا پائیں گے جو امریکہ اور افغانیوں کا ڈسا ہوا ہے چنانچہ اس پس منظر میں اسے اپنا بے لوث ہمنوا بنانے کے لیے ہمیں امریکہ اور طالبان کے ساتھ اپنا فاصلہ ظاہر کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا ہم نظر گھمائیں تو ہمیں دنیا بھر میں اپنے لیے سوائے منافقت اور دہرے پن کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کشمیر پر بار بار ثالثی کی پیشکش کرنے والے امریکی صدر ٹرمپ نے تو ہیوسٹن

میں اپنی منافقت اور دہرے پن کا جلوہ دکھا بھی دیا ہے۔ وہ مودی قصاب کی باہوں میں باہیں ڈال کر ہیوسٹن کے این آر جی سٹیڈیم میں داخل ہوئے جس کے باہر کشمیریوں پاکستانیوں اور سکھوں سمیت ہزاروں افراد مودی قصاب کے خلاف ریلی نکال کر فلک شگاف احتجاجی نعرے لگا رہے تھے اور مودی سے کشمیر سے واپس جاؤ کے تقاضے کرتے ہوئے کشمیر بنے گا پاکستان کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ ٹرمپ کے کانوں تک بھی یقیناً ان مودی مخالف نعروں کی آواز نے رسائی حاصل کی ہوگی مگر وہ ادائے بے نیازی کے ساتھ مودی کا ہاتھ تھامے سٹیڈیم میں قائم ڈائس تک پہنچے اور اپنا اور مودی کا ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے بھارت اور ہندوؤں کے ساتھ گہری دوستی کا اظہار و اعلان کر کے یہ باور کرانا ضروری سمجھا کہ اسلامی دہشت گردی کا خاتمہ امریکہ اور بھارت کا مشترکہ ایجنڈا ہے۔ اسی تناظر میں مودی نے بھی اپنے خطاب میں ٹرمپ کو یہ کہہ کر اُچکل دی کہ نائین الیون اور ممبئی حملوں میں ملوث اسلامی دہشت گرد ہمارے مشترکہ دشمن ہیں جن کی سرکوبی کے لیے مشترکہ کاوشیں کی جائیں گی۔

ارے بھائی صاحب! ٹرمپ، مودی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے تھے تو کشمیر پر بار بار ثالثی کی پیشکش کرنے والے ٹرمپ کیا مودی کو این آر جی سٹیڈیم کے باہر پیدا ہونے والی مودی مخالف فضا پر انہیں باور نہیں کرا سکتے تھے کہ ان کے لیے دنیا بھر میں مخالفت و مزاحمت کی لہر مقبوضہ کشمیر میں جاری ان کی ہٹ دھرمی کے باعث پیدا ہوئی ہے اس لیے وہ آج یہاں مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ان کی ثالثی قبول کرنے کا اعلان کر کے جائیں۔ ٹرمپ کے اپنے بقول انہوں نے کشمیر پر ثالثی کی پیشکش خود مودی کی درخواست پر کی تھی مگر ان کے اخلاص کو کیا نام دیں کہ انہوں نے مودی کے کندھے سے کندھا ملا کر ہیوسٹن کے سٹیڈیم میں داخل ہوتے وقت اشاروں کنایوں میں بھی مودی کے ساتھ کشمیر ایشو پر بات کرنا مناسب نہ سمجھی اور نہ ہی سٹیڈیم میں مودی کے ساتھ اپنی یاری کے بے پایاں اظہار کے وقت سٹیڈیم کے باہر موجود کشمیریوں، پاکستانیوں اور بھارتی سکھوں کے جذبات کی ترجمانی کرنا مناسب سمجھا، حتیٰ کہ ان کی زبان کشمیر کا لفظ ادا کرنا بھی بھول گئی۔ اگر ان کی زبان سے کچھ نکلا تو وہ امریکہ بھارت دفاعی معاہدے کو مضبوط بنانے اور بھارت کے ساتھ دستی نبھانے کا نکلا۔ پھر ہم کس برتے پر ان کی ثالثی کی پیشکش پر امید کے چراغ جلائے رکھیں۔ بھئی انہوں نے تو اپنی انتخابی مہم کے دوران بھی بھارتی ہندو کے ساتھ اپنی یاری کے اظہار میں کسی بخیلی

سے کام نہیں لیا تھا اور یہ اعلان کرنا بھی ضروری سمجھا تھا کہ وہ صدر منتخب ہو گئے تو ان کی بھارت اور ہندو کے ساتھ دوستی مزید مستحکم ہو گی۔ ہم اس ٹرمپ سے مسئلہ کشمیر پر یا اپنے مفادات کے حوالے سے کسی بھارت مخالف فیصلے کی توقع باندھے بیٹھے ہیں جو ہنود و یہود گٹھ جوڑ میں عملاً رابطے کے پل اور معاون و سہولت کار کا کردار ادا کر رہا ہے۔ ''اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا۔''

وہ تو ہندو کے لیے یک جان دو قالب ہیں مگر ہمارے ساتھ ہمارے اپنوں نے کیا کیا ہے اور خود ہم نے اپنے ساتھ کیا کیا ہے؟

''جے بولے تے ماردین گے، نہ بولے تے مرجاواں گے'' بات کہنے کی نہیں، بات ہے رسوائی کی۔ وزیراعظم صاحب کو نیو یارک جاتے ہوئے راستے میں برادر سعودی عرب سے ڈھیروں پروٹوکول مل گیا۔ باہمی مفادات میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھائے رکھنے کا عہد بھی ہو گیا اور پھر سعودی ولی عہد محمد بن سلمان نے کمالِ مروت و محبت میں اپنا خصوصی طیارہ بھی نیو یارک روانگی کے لیے وزیراعظم پاکستان کے یہ کہہ کر حوالے کر دیا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں اس لیے ہم آپ کو کمرشل پرواز پر نیو یارک کے لیے کیسے روانہ ہونے دے سکتے ہیں مگر وزیراعظم کی جانب سے سعودی شاہی میز بانوں کو کشمیر ایشو پر مکمل اور مفصل بریف کرنے اور بھارتی مظالم سے مدلل انداز میں آگاہ کرنے کے باوجود ان کی جانب سے اقوام متحدہ کے فورم پر پاکستان کی حمایت کرنے اور سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے آواز اٹھانے کے بارے میں ایک لفظ بھی ادا نہ ہو پایا۔ جناب ذرا سوچیے تو سہی کہ ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے اور ہم خود اپنے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔

گزشتہ ہفتے جنیواء میں اقوام متحدہ کی ہیومن رائٹس کونسل کا اجلاس شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے اور 27- ستمبر تک جاری رہنا ہے جس روز وزیراعظم پاکستان عمران خاں نے جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں خطاب کرنا ہے۔ اجلاس کے پہلے ہی روز بہت حوصلہ افزاء خبر آئی کہ ہیومن رائٹس کونسل کے 60 میں سے 58 رکن ممالک نے جن میں برادر مسلم ممالک بھی شامل ہیں۔ یک زبان ہو کر کشمیر میں جاری بھارتی مظالم کی مذمت کی ہے۔ اجلاس سے ایک روز قبل دنیا کے اس نمائندہ فورم کی چیئر پرسن دوٹوک الفاظ میں مودی سرکار سے کشمیر میں کرفیو اور لاک ڈاؤن ختم کرنے اور کشمیری عوام پر عائد پابندیاں اور ان پر جاری بھارتی فوجوں کے مظالم ختم کرنے کا

تقاضہ کر چکی تھیں، ہمارے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ اس نمائندہ فورم پر مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے پیدا ہونے والی مثبت فضا سے فائدہ اٹھائیں اور کشمیر پر سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی قراردادوں کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک قرارداد پیش کر کے منظور کرا لیں جس کے لیے 19- ستمبر کی ڈیڈ لائین مقرر تھی۔ ہمارے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی خود یو این ہیومن رائٹس کونسل کے اجلاس میں شریک تھے مگر نہ جانے کس نے ان کے ہاتھ باندھ دیئے کہ وہ اس فورم پر کشمیر کے لیے قرارداد تک پیش نہ کر سکے۔ اسی حوالے سے آج حامد میر نے بھی اپنے کالم میں تذکرہ کیا ہے کہ اب ہمارے پاس راستہ جنرل اسمبلی میں وزیر اعظم عمران خاں کے محض پر جوش خطاب کا رہ گیا ہے۔ وہ اس فورم پر اپنے پیشروؤں محترمہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی طرح کشمیر پر پر جوش خطاب کریں گے۔ بھارت کو مغموم اور دنیا کو حیران کریں گے مگر مسئلہ کشمیر کا حل یقینی بنانے والی کوئی قرارداد جنرل اسمبلی میں موجود ہی نہیں ہوگی چنانچہ ہمارے لیے پھر ''کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے'' والی صورتحال بن جائے گی۔ حضور ذرا سوچیے کہ ہم خود بھی اپنے اور مظلوم کشمیریوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ ''کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔'' بس پر جوش خطاب کرتے جایئے، دنیا کو آگاہ کرتے اور باور کراتے جایئے اور جب عملی پیش رفت کا معاملہ آئے تو نتیجہ صفر۔ بے شک کسی فورم پر کوئی پھولوں کے ہار لے کر ہمارا استقبال کرنے نہیں کھڑا ہوا مگر جو ہمارا بے لوث دم بھر رہے ہیں، کم از کم انہیں تو مایوس نہ کیجئے۔ انہیں تو اپنے ساتھ جوڑے رکھئے اور سب سے بڑھ کر اپنے معاملات کی اصلاح کے لیے تعمیری تنقید کے دروازے بند نہ کیجئے ورنہ تعفن ایسا پیدا ہوگا کہ سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔

''ڈبل فائٹنگ'' کی منظر کشی

جناب عزائم تو دونوں جانب کے ٹھیک نظر نہیں آ رہے۔ایک دوسرے کو آنکھیں دکھانے کا انداز بھی جارحانہ ہے۔وزیراعلیٰ کے پی کے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں۔''آپ کو اسلام آباد کی طرف جانے ہی نہیں دیا جائے گا۔''لب ولہجہ یہ پیغام دے رہا ہے کہ ریاستی طاقت کے آگے بھلا آپ کی کیا حیثیت ہے۔دوسری جانب سے اس سے بھی زیادہ تلخ جواب آتا ہے۔''ارے آپ بھلا ہمیں کیا روکیں گے، آپ تو اپنے گھر سے بھی نہیں نکل پائیں گے۔''یہ سیدھی سیدھی بُل فائٹنگ کی منظر کشی ہے جس میں تماشائی بھی رگڑے جاتے ہیں۔ 27-اکتوبر کی ڈیڈ لائین قریب آتے آتے کئی دھاڑتے چنگھاڑتے مناظر بنائے، دکھائے جا رہے ہیں۔ڈنڈہ بردار فورس تیار ہونے کی خبریں بھی گردش کر رہی ہیں جس کی ریہرسل کے مناظر بھی سوشل میڈیا پر دیکھے جا سکتے ہیں۔اونٹ برداروں کا ایک قافلہ تو سکھر سے اسلام آباد روانہ بھی ہو چکا ہے۔مولانا فضل الرحمان کے بارے میں بھی یہی شنید ہے کہ وہ سندھ حکومت کے تحفظ میں سندھ کے کسی علاقے سے ہی اسلام آباد کی جانب روانہ ہوں گے جن کے حفاظتی دستے میں لامحالہ سینکڑوں نہیں تو بیسیوں مسلح افراد ضرور شامل ہوں گے۔اور اب تو تنہا پرواز کے لیے ڈٹ جانے والے مولانا صاحب کو واضح طور پر دوسری اپوزیشن جماعتوں کی کمک حاصل ہوتی بھی نظر آ رہی ہے۔سندھ سے بلاول بھٹو زرداری گرج برس رہے ہیں، پنجاب میں میاں نواز شریف کے خط کی تاثیر سامنے آنے لگی ہے جہاں لاہور سے جے یو آئی کی ہمراہی میں اسلام آباد کی جانب لانگ مارچ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور خیبر پی کے میں اسفندیار ولی حضرت مولانا کے پلڑے میں وزن ڈال کر دھما چوکڑی کے ارادے باندھ رہے ہیں۔اگر حکومتی وزراء اور ترجمانوں کے بیانات واعلانات کا جائزہ لیا جائے تو 27-اکتوبر کو سیدھا سیدھا تصادم نظر آ رہا ہے۔بھئی ایسا ہو گیا تو نقصان کس کا ہوگا، یہ ذرا سوچ

رکھئے۔ اصل میں تو اس ساری دھما چوکڑی میں جمہوریت ہی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ پھر اس کو بچانے کی ذمہ داری کس نے نبھانی ہے؟

ذرا اگست 2014ء میں شروع ہونے والے حکومت مخالف لانگ مارچ اور اس کے بعد 126 دن کے پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر دھرنے کا موجودہ اعلان کردہ آزادی مارچ اور دھرنے کے ساتھ موازنہ کیجئے۔ اس کا سارا اہتمام بھی جمہوریت کا ''مکو ٹھپنے'' والا ہی نظر آ رہا تھا۔ اگر اس وقت کی حکومت بھی حکومت مخالف احتجاج کو روکنے کے لیے وزیر اعلیٰ خیبر پی کے جیسی حکمت عملی طے کر لیتی تو نکو نک ہوتی، دھکے ٹھیڈے کھاتی بے چاری جمہوریت شائد دو دن میں ہی منہ کے بل آ گرتی مگر حکومت نے ڈھیل دینے کی تدبیر اختیار کر لی۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر جارحانہ دھرنوں کا آغاز ہوا تو حکومت نے پارلیمنٹ ہاؤس کا مشترکہ اجلاس بلا لیا اور پیپلز پارٹی سمیت اپوزیشن اور حکومتی اتحادی جماعتوں کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہو گئی۔ اس تدبیر میں پیغام یہ تھا کہ پارلیمان پر شب خون مارنا ہے تو پارلیمنٹ کے اندر ہماری لاشوں سے گزر کر جانا ہو گا۔ اس تدبیر کے تحت پارلیمنٹ کے باہر دھرنے والوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی جو کنٹینروں اور رونق میلوں کے ساتھ حکومت کے طبلے بجاتے اودھم مچاتے نظر آتے مگر ریاستی طاقت کا ان کی جانب رخ تک نہ کرنے دیا گیا۔ اس دھرنے کے دوران ایسی ایسی ہوشربا داستانیں اور مناظر ملکی، غیر ملکی میڈیا اور سوشل میڈیا پر دیکھنے، سننے کو ملتے رہے کہ جمہوریت شرمسار ہوتی اور آئین و قانون کی حکمرانی لاچار ہوتی نظر آئی مگر اس پالیسی کے ذریعے ڈھیٹ بن کر جمہوریت کو بچا لیا گیا۔ اگر اس وقت ریاستی طاقت کو مدمقابل لانے کی حماقت سرزد ہو جاتی تو دھرنے والوں تک آج جمہوریت کا پھل کبھی نہ پہنچ پاتا۔

تو جناب! جمہوریت کا پھل کھاتے رہنے کے لیے آپ کو بھی کوئی ایسی ہی ''نیویں نیویں'' ہو کر رہنے کی پالیسی اختیار کرنا ہو گی۔ آپ کو اپنے دھرنے کی فیوض و برکات جمہوریت کے تسلسل کی صورت میں سمیٹنے کا موقع ملا ہے تو اس تسلسل میں اب کوئی رخنہ بھی آنے دیجئے ورنہ اقتدار کی بوٹی جن ہاتھوں میں جائے گی وہ جمہوریت کے کسی نام لیوا کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ آپ کے لیے مولانا صاحب اور ان کے حلیفوں کے آزادی مارچ اور دھرنے کی نوبت ہی نہ آنے دینے کی ایک ٹھوس حکمت عملی والا راستہ بھی موجود ہے۔ وہ راستہ اختیار کر لیں تو جمہوریت

کے لیے ''ستے خیراں''۔ اور یہ راستہ تو آپ کو اپنے منشور اور ایجنڈے کی بنیاد پر اپنے اقتدار کے آغاز ہی میں اختیار کر لینا چاہیے تھا۔ یہ راستہ ہے سلطانی جمہور کے ثمرات براہ راست عوام تک پہنچانے والا جس میں آپ فیل ہو کر ہی بالخصوص مولانا فضل الرحمان کے لیے دھما چوکڑی والا راستہ نکالنے کا باعث بنے ہیں۔

جناب اس حقیقت کو صدق دل کے ساتھ محسوس اور تسلیم کریں کہ آپ کی اقتصادی، مالیاتی پالیسیوں نے غریب طبقات کو تو راندۂ درگاہ کیا سو کیا ہے، ہر کاروباری طبقے بشمول تاجروں، سرمایہ کاروں، صنعتکاروں اور کسانوں کو بھی اپنے مستقبل کے تحفظ کی فکر میں غلطاں کر دیا ہے۔ عام آدمی کے لیے تو روزگار کے راستے بھی مسدود ہو گئے ہیں اور مہنگائی نے انہیں سر اٹھا کر سوچ بچار کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا جبکہ دوسرے طبقات بھی بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور آپ کے سابق چیئرمین ٹاسک فورس اکرم چودھری کے بقول جھولیاں اٹھا کر بددعائیں دے رہے ہیں۔

آپ کوئی ایسا راستہ نکال لیجیے کہ اس منفی سوچ اور بعضوں کے بقول آسیب کے سائے سے ملک و قوم کو نجات مل جائے مگر آپ کے وزیر مشیر تو آج بھی مشکل اقتصادی حالات کے مزید دو سال تک برقرار رہنے کے زندہ در گور عوام کو کچوکے لگائے جا رہے ہیں۔ آپ فی الوقت عوام کے روٹی، روزگار، غربت مہنگائی کے گھمبیر تر ہوتے مسائل سے عبوری طور پر انہیں نجات دلا کر مولانا کے آزادی مارچ کے ممکنہ نتائج والے خواب چکنا چور کر سکتے ہیں۔ ورنہ جناب! مارچ کو غیر موثر بنانا مقصود ہے تو آپ بھی وہی راستہ اختیار کریں جو آپ کے دھرنے کے معاملہ میں اختیار کیا گیا تھا۔ اتھل پتھل کرنا تو بہت آسان ہے مگر اس کا خمیازہ صرف آپ ہی نہیں پورا ملک اور پوری قوم بھگتے گی۔ آپ کے کریڈٹ میں تو ماضی جیسی جمہوری کٹھن جدوجہد کا کہیں شائبہ بھی نظر نہیں آتا اس لیے جو ہے اس پر ذرگزر کیجیے اور اسے برقرار رکھنے کا جتن کیے رکھیے، آپ طاقت کے استعمال کا راستہ کھولیں گے تو جبہ و دستار اور گریبانوں کے ڈھیر لگنے سے جسدِ جمہوریت میں تنفس کا سلسلہ برقرار نہیں رہ پائے گا، حضور ایسی کوئی نوبت لانے سے گریز کریں جو تہیۂ طوفان کیے بیٹھے عوام کو فی الواقعی خونین انقلاب کی راہ دکھا دے۔ آپ نے آسودہ رہنا ہے تو سلطانی جمہور میں جمہور کی آسودگی کا بندوبست کر دیجیے۔ پھر کوئی دھرنا، کوئی مارچ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔

”تیری کیا اوقات ہے بندے جس پہ تُو اتراتا ہے“

ابھی دو روز قبل ہی لرزتی، ہچکولے کھاتی زمین نے ہمارے اوسان خطا کیے اور میر پور آزاد کشمیر میں قیامت صغریٰ بپا کی۔ اس زلزلے کی شدت رچر سکیل پر چھ اشاریہ سے بھی کم تھی مگر اس نے پنجاب، خیبر پی کے اور سندھ سمیت عملاً پورے ملک کو لرزا دیا اور میر پور کا ایک گاؤں مکمل تباہ ہو گیا۔ اس زلزلے میں اب تک چالیس انسانوں کی شہادتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں اور مالی نقصان کی کوئی انتہا نہیں، جو گھر مکمل تباہ ہوئے وہ تو اپنی جگہ مگر جن مکانوں میں گہری دراڑیں پڑی ہیں وہ بھی انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہے۔ لرزتی زمین نے سڑکوں کو گڑھوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ سب کچھ محض چند ساعتوں میں ہوا۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں اتنی تباہی سرکش انسانوں کی عبرت کے لیے کافی ہونی چاہئے مگر ہم ٹھٹھہ مذاق سے باز نہیں آئے۔ بے شک یہ سارا نظام کائنات رب کائنات کی رضا پر چل رہا ہے۔ خالقِ کائنات کی منشاء کے آگے چاند کے بعد مریخ تک پہنچنے کی سوچ رکھنے والے ہم سرکش انسانوں کی بھلا کیا اوقات ہے۔ قدرت کے مظاہر ہمیں طوفانوں، سیلابوں، زلزلوں، آسمانوں پر کڑکتی بجلیوں اور دوسری قدرتی آفات کی شکل میں ہماری حیثیت و حقیقت کا احساس دلاتے ہیں مگر ہماری سرکشی ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ زمین پر خدا بنے بیٹھے حقیر انسانوں کی بھلا قدرت کے مظاہر میں کیا اوقات ہے مگر ہماری ”میں“ پدرم سلطان بود سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ دو روز قبل قدرت نے جھنجوڑا۔ چند لمحے کو موت یاد آئی اور پھر اپنی من مانیوں میں مگن ہو گئے، سو قدرت نے آج پھر جھنجوڑ دیا۔

ہلکے پھلکے آفٹر شاکس کا سلسلہ تو گزشتہ دو روز سے جاری تھا مگر آج کے نئے جھٹکے نے پھر دل و دماغ کو ہلا کر اور سوچوں کو ماؤف کر کے رکھ دیا۔ آج کے زلزلے کا مرکز بھی جہلم کے قریب تھا جس کی گہرائی دس کلومیٹر سے زیادہ اور رچر سکیل پر شدت بھی اعشاریہ پانچ کے قریب تھی۔ اس

لیے دو روز قبل جیسی تباہی سے محفوظ رہے مگر آج سے 14 سال قبل کے آٹھ اکتوبر 2005ء کے زلزلے کا آج بھی تصور کرتے ہوئے کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس زلزلے میں بھی ہولناک تباہی شمالی علاقہ جات، کشمیر اور خیبر پی کے میں ہوئی جہاں پلک جھپکتے میں ایک لاکھ کے قریب انسان اور ان کی املاک مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ ایک ہوٹل سمیت کئی عمارتیں زمین کے اندر غرق ہو گئیں۔ اس زلزلے نے جن انسانی المیوں کو جنم دیا ان کی ٹیسیں آج بھی رنج و غم میں ڈبو جاتی ہیں۔ اس زلزلے کی شدت سات عشاریہ چھ تھی جس نے زمین کو اس کے اوپر موجود ہر چیز سمیت ادھیڑ کر رکھ دیا۔ مگر اسکے گیارہ سال بعد 26- اکتوبر 2016ء کو قیامت کی طرح برپا ہونے والے آٹھ عشاریہ ایک شدت کے زلزلے نے عمارتوں اور انسانوں کو جھنجوڑنے، نچوڑنے کے باوجود بڑی تباہی سے بچا لیا۔ اس کے بارے میں ماہرین ارضیات کا کہنا تھا کہ اس زلزلہ کی گہرائی سطح زمین سے بہت نیچے تھی اس لیے اس کی شدت زیادہ ہونے کے باوجود نقصانات کم ہوئے۔ مگر جناب یہ نظام قدرت ہے جس میں کسی انسان کی کوئی رسائی، کوئی چارہ، کوئی یارا نہیں۔ قدرت چاہے تو پلک جھپکتے میں سب کچھ مٹی کے ڈھیر میں تبدیلی کر دے اور چاہے تو قیامت کے مناظر دکھا کر بھی سب کچھ بچا لے۔

آپ تصور کیجئے کہ ہماری فضاؤں میں ہماری زندگیوں کے لیے سانس کا اہتمام کرنے والی ہوا محض چند ساعتوں کے لیے بالکل بند ہو جائے تو کروفر والے انسان کے سارے مادی وسائل کیا اس کی زندگی کی ضمانت فراہم کر پائیں گے۔ سورج چند لمحوں کے لیے شعلہ بار ہو جائے تو ہم سرکش انسان اپنے سمیت ہر چیز کو بھسم ہونے سے بھلا بچا پائیں گے۔ سمندروں کے پانی کی سطح اپنے معمول سے تھوڑی سی بلند ہو جائے تو کیا ہم خود کو اور اپنے مادی وسائل کو بپھرے پانی کی نذر ہونے سے بچانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ بس ایک سانس کی مرہون منت ہی تو ہے ہماری انسانی اوقات جس کا آج کی موسمیاتی تبدیلیاں ہمیں پل پل احساس دلا رہی ہیں۔ مگر ہم ایک جھٹکے پر اللہ توبہ کر کے پھر دنیا و مافیہا میں مگن ہو جاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ۔۔۔۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

ہماری انسانی جبلت ہمیں دنیاوی آلائشوں میں ہی لپیڑے رکھتی ہے۔ہمیں آخرت کی فکر ہوتی ہے نہ عاقبت سنوارنے کی مگر عملاً ہماری اوقات یہ ہے کہ زلزلے کا معمولی سا جھٹکا بھی ہمارے پورے جسم پر کپکپی طاری کر دیتا ہے.....

اپنے پاؤں پہ آتا ہے نہ اپنے پاؤں پہ جاتا ہے
تیری کیا اوقات ہے بندے جس پہ تو اِتراتا ہے

جس طرح ہم نے 24- ستمبر اور آج 26- ستمبر کے زلزلے کے لمحات نوائے وقت کے آفس میں ہچکولے کھاتی بلڈنگ کے ساتھ گزارے اسی طرح ہم نے 26 اکتوبر 2016ء کے زلزلے کا تمام دورانیہ ذہن و دل پر مرتب ہونے والے اس کے اثرات سمیت نوائے وقت بلڈنگ کے چوتھے فلور پر ایڈیٹر دی نیشن سلیم بخاری صاحب کے آفس میں بیٹھ کر گزارا تھا۔اس وقت پوری عمارت اور ہم سب کی جو کیفیت تھی وہ زندگی کی آخری گھڑی آنے کی ہی عکاسی کر رہی تھی۔ بتدریج بڑھنے والے زلزلے کے جھٹکوں سے بلڈنگ کے عملی طور پر جھولنے کی کیفیت اور اس کے در و دیوار میں پیدا ہونے والے ارتعاش سے سورۃ الزلزال میں قیامت کے مناظر پر مبنی زمین کی بیان کی گئی حالت بنی تو دل و نگاہ ساکت ہو کر رہ گئے۔الحفیظ والامان۔جھٹکے تھے کہ بڑھتے ہی چلے گئے۔ ہمارے سامنے پڑے چائے کے کپ بھی طوفان اٹھاتے نظر آئے۔ کمرے کے شیلفوں میں رکھی کتابیں بھی باہم ٹکرانے سے خوفناک آوازیں پیدا کرنے لگیں۔در و دیوار سے پُراسرار آوازیں برآمد ہوتی سنائی دیں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے پوری بلڈنگ کو کوئی جھنجھوڑ کر اور دھکیل کر گرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ہماری زبانوں پر بے ساختہ ذکر الٰہی کا ورد جاری ہو گیا اور پھر ایک منٹ کے دورانیے کے بعد زلزلے کے آخری جھٹکے نے عملاً پوری بلڈنگ کے زمین بوس ہونے کا منظر بنا دیا۔ہم نے اس وقت خوف کے جس لمحے کا سامنا کیا' اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔الفاظ کی زبان نہیں دی جا سکتی۔اگر اتنا نزدیک آنے والی موت بھی ہمیں آغوش میں لئے بغیر نکل گئی اور جھولتے جھولتے زمین بوسی کے قریب پہنچی عمارت میں بھی یکا یک ٹھہراؤ آ گیا تو بھائی صاحب' ہم قدرت کی حقانیت تسلیم کرنے میں کیوں حجاب محسوس کرتے ہیں۔یہی تو معجزہ خداوندی ہے جس کے محض ''کن'' کہنے سے پوری کائنات تخلیق ہو جاتی ہے' جسے ارض و سماء کی

ہر چیز پر مکمل قدرت حاصل ہے، جس کے حکم اور اشارے کے بغیر کوئی پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔ وہی خدا ہے۔ کیا رب وحدہ لاشریک نے اپنی کتاب ہدایت میں تخلیق کائنات اور نظام کائنات کو، مقصد حیات و ممات کو، نیکی اور بدی کے تصور کو اور پھر نظام قدرت کو کائنات سے سرکشی اختیار کرنے والی اپنی مخلوق کے ماضی کے انجام اور ممکنہ انجام کو کھول کھول کر بیان نہیں کر دیا۔ کیا ہم سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر 2 میں بیان کی گئی رب کائنات کی اس حقیقت کے منکر ہو سکتے ہیں کہ ''وہی ہے رب کہ جو اس روئے زمین پر ہے اور جو آسمان میں ہے۔ سب اسی کا ہے اور کافروں کیلئے سخت عذاب کے باعث بڑی تباہی ہے۔''

بلاشبہ رب کائنات کی اس حقیقت کے منکرین ہی کافر ہیں جو رب کائنات کی ''کن فیکون'' والی اٹل حقیقت سے سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ اگر رب کائنات نے مقصد حیات بھی بتا دیا ہے، زندگی گزارنے کا چلن بھی متعین کر دیا ہے اور ہر موسم جس کی قدرت میں ہے اور جس نے قیامت کی نشانیاں بھی کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اس کی حقانیت اور قدرت کے مظاہر سے دانستہ صرف نظر کرنا موت کو دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کے ہی مترادف ہے۔ قدرت کی منشاء ہو تو اس کے محض ''کن'' سے اس ساری دھرتی کے جن و انس، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں اور روح و بُت کا کہیں کوئی وجود ہی نہ رہے۔ ہم قدرت کے ایسے مظاہر دیکھ کر بھی اکڑفوں اور برتری والے ذہنی خناس میں مبتلا ہیں تو یہ ضرور سوچ رکھیں کہ

جائے گا جب یہاں سے کچھ بھی نہ پاس ہوگا۔
دو گز کفن کا کپڑا تیرا لباس ہوگا

بس عاجزی سے یہ دعا کرتے رہئے کہ دو گز کفن کا کپڑا ضرور نصیب ہو جائے۔ قدرت کے مظاہر تو ہمیں پل پل جھنجوڑ رہے ہیں۔

''ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی''

کم از کم میری عقل و فہم تو یہ بات تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ جس حکومت کو غربت، مہنگائی اور روٹی روزگار کے گھمبیر ہوتے عوامی مسائل کی بنیاد پر پہلے ہی سخت عوامی ردعمل کا سامنا ہو اور اپوزیشن جماعتیں انہی عوامی مسائل پر پیدا ہونے والے اضطراب کو اپنے حق میں کیش کرانے کے لیے لانگ مارچ اور دھرنے جیسی تحریکوں کے لیے صف بندی کر رہی ہوں۔ وہ حکومت اپنے لیے پیدا ہونے والی اس مشکل صورت حال میں بھی بے نیازی یا خود اعتمادی کے تحت عوام کو روٹی اور روزگار سے محروم کرنے پر منتج ہونے والی اپنی پالیسیوں کی ہی وکالت کرتی رہے۔ بالخصوص وہ حکومت تو ایسی پالیسیوں کو اعلانیہ عملی جامہ پہنانے کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی جو سابق ادوار حکومت میں غربت، مہنگائی، روٹی روزگار کے گھمبیر ہوتے مسائل سے عوام کی گلوخلاصی کرانے اور ریاست مدینہ جیسی اسلامی فلاحی مملکت تشکیل دینے کے دعوؤں، وعدوں، منشور اور ایجنڈہ کے تحت عوام کی ہمدردیاں حاصل کر کے اقتدار میں آئی ہو۔ مگر اس کو کیا کہا جائے۔ ناطقہ سر بگریباں ہونے کا حوالہ دیا جائے تو اس سے طبع نازک پہ گراں گزرنے کی نوبت آ سکتی ہے مگر جناب! آپ تلخ زمینی حقائق کو کب تک نظرانداز کیے رکھ سکتے ہیں۔ نئے پاکستان کے اقتدار کے ایک سال کے دوران غربت، مہنگائی اور روٹی روزگار کے بڑھتے مسائل پر عوام کو ''مرے کو مارے شاہ مدار'' والی شاہانہ پالیسیوں نے جتنا زچ کیا ہے۔ اس پر اپوزیشن کو تو اپنی سیاست چمکانے کا نادر موقع ملا سو ملا ہے' خود حکومتی صفوں میں بھی مایوسی اور کھلبلی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جس کی صدائے بازگشت وزیراعظم عمران خاں کی زیرصدارت منعقد ہونے والے وفاقی کابینہ کے گزشتہ اجلاسوں میں بھی سنی گئی ہے اور حکومتی ترجمانوں کے اجلاسوں میں بھی ان گھمبیر مسائل کی بنیاد پر عوام کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہونے کی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔

ابھی چند ماہ قبل ہی وفاقی وزیر فیصل واوڈا نے پورے فخر و انبساط کے ساتھ قوم کو یہ خوش خبری سنائی تھی کہ حکومتی اقتصادی پالیسیوں کے نتیجہ میں ملک میں ملازمتوں کا سیلاب آنے والا ہے

مگر اس خوش خبری کے عملی قالب میں ڈھلنے کی اب تک نوبت نہیں آ سکی۔ اس کے برعکس وفاقی وزیر برائے سائنس و ٹیکنالوجی نے یہ کہہ کر مایوس عوام کے ذہنوں پر ہتھوڑے برسانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ حکومت تو اپنے چار سو سرکاری محکمے بھی بند کر رہی ہے۔ اس سے لوگوں کو روزگار دینے کی ہرگز توقع نہ رکھی جائے۔ روزگار دینا حکومت کا کام نہیں۔ حکومت نے تو اس کے لیے محض حالات سازگار بنانے ہوتے ہیں۔ ملازمتیں نجی سیکٹر میں ہی ملیں گی، حضور یہ سوچ کس کے ذہن رسا میں در آئی ہے؟ وزیر اعظم عمران خاں نے تو ایک کروڑ پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے اور نچلے طبقے کے عوام کے لیے پچاس لاکھ گھر فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا جبکہ ایسی اعلان کردہ حکومتی پالیسیوں کی بنیاد پر ہی نئے پاکستان میں ''سٹیٹس کو'' والے سابقہ حکمرانوں کے لتے لیے جاتے رہے ہیں اور عمران خاں کی کرشماتی شخصیت کے ساتھ عوام کا رومانٹزم ایسے دل خوش نعروں کی بنیاد پر ہی پرورش پا تا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضمنی میزانیوں اور قومی بجٹ میں لاگو کئے گئے نئے ٹیکسوں اور مروجہ ٹیکسوں میں اضافہ کیساتھ ساتھ بجلی' پانی' گیس اور پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں آئی ایم ایف کی شرائط کے تحت بتدریج اضافہ کرنے اور پاکستانی کرنسی کو ڈالر کے مقابلے میں بے وقعت بنانے سے بھی عوام کے غربت' مہنگائی کے بڑھتے مسائل نے ان کے رومانٹزم میں نقب لگائی اور اب تو چودھری فواد نے اس رومانٹزم کی رہی سہی کسر بھی نکال دی ہے جو ملازمتوں کے حصول کیلئے پریشان حال بیروزگاروں کو نجی سیکٹر کی جانب دھکیلنے کی پالیسی وضع کئے بیٹھے ہیں جبکہ نجی سیکٹر والے پہلے ہی تیل' گیس' بجلی کے آئے روز بڑھتے نرخوں' ایف بی آر' نیب اور دوسرے حکومتی انتظامی اداروں کی سختیوں سے عاجز آ کر اپنے کاروبار ٹھپ کر رہے ہیں جنہیں اپنے مستقبل کیلئے بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی۔ اس لئے محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے کہ جن نجی کاروباری' صنعتی اداروں پر پہلے ہی ہو کا عالم ہے اور وہاں سے بیروزگار ہونے والے لوگوں کی کھیپ کی کھیپ باہر نکل رہی ہے' وہ ہمارے دانشور وزیر مکرم فواد چودھری کے عوام کو نجی سیکٹر میں روزگار فراہم کرنے والے ارشادات کو اپنے لئے حرز جاں بنا لیں گے۔

ارے آپ تو ہنستے بستے انسانی معاشرے کو جہنم زار میں تبدیل کرنے کے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ اس وقت بیروزگاری کے سیل رواں نے پڑھے لکھے نوجوانوں کیلئے روزگار کے دروازے بند ہونے کے باعث جس معاشرتی گراوٹ کا ماحول بنا دیا ہے' وہ کسی مہذب ڈسپلنڈ معاشرے کی ہرگز عکاسی نہیں کر رہا کیونکہ روزگار کے حوالے سے اپنے مستقبل سے مایوس ہونے

والے نوجوان ہی نہیں' ان کے خاندانوں کے دوسرے افراد بھی خودکو کمزور سمجھ کر بھیک مانگنے اور چھینا جھپٹی کی سکت رکھنے والے راہزنی' چوری' ڈکیتی اور قتل و غارت گری جیسے قبیح جرائم کے راستے اختیار کررہے ہیں۔ جو زیادہ مایوس ہیں وہ خودکشی اور خودسوزی میں اپنی عافیت سمجھ رہے ہیں۔ پچھلے دنوں آئی جی پولیس سندھ کلیم امام میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے ملک کے اقتصادی حالات پر خود بھی بے بسی کی تصویر بن گئے اور یہ کہہ کر سسٹم کو کچوکا لگایا کہ جب میری اپنی بیوی اور ساس بھی راہزنی کی وارداتوں کی زد میں آرہی ہو تو اس سے گھر میں ہونے والی میری سبکی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے بقول بڑھتی ہوئی بیروزگاری ہی ایسے قبیح معاشرتی جرائم کا باعث بن رہی ہے۔

عوام میں ایسے حالات کا ردعمل کیا سامنے آیا' اس کا اندازہ فتح شاہ کے اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس میں ڈکیتی کی بڑھتی وارداتوں پر احتجاج کرنے والے علاقے کے لوگوں نے مفاہمت کیلئے آنے والے پولیس سب انسپکٹر اشرف کی بھی ٹھکائی کردی جسے عوامی تشدد کی زد میں آتا دیکھ کر اس کے ساتھی پولیس اہلکار رفوچکر ہوگئے۔ حضور والا' بیروزگاری اسی طرح بڑھتی گئی تو عوامی ردعمل کے ایسے واقعات جا بجا نظر آئیں گے جن میں کس کی پگڑی اور دستار اچھلے گی اور انسانی خون کی ندیاں بہنے میں کن کن جسموں کی معاونت حاصل ہوگی۔ آپ بس تصور میں لائیے' آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔ حضور! آئین پاکستان کی دفعات 25 سے 38 تک کا ان کی شقوں سمیت مطالعہ فرمالیجئے۔ کیا ان دفعات میں شہریوں کی تمام بنیادی ضروریات بشمول تعلیم' صحت اور روزگار بلا امتیاز پوری کرنا ریاست کی ذمہ داری نہیں گردانی گئی اور آپ ایک دانشور قانون دان ہوکر بھی عوام کو یہ لیکچر دے رہے ہیں کہ ملازمتیں فراہم کرنا حکومت کا کام نہیں۔ آپ کی محض آگاہی کیلئے گزشتہ دنوں شائع ہونے والی ایک خبر کا حوالہ دے رہا ہوں کہ صرف ایک حکومتی محکمے لیسکو میں 1148 خالی اسامیوں کا اشتہار شائع ہونے پر ایک لاکھ 25 ہزار بے روزگار نوجوانوں نے اپنی درخواستیں جمع کرائی ہیں۔ اگر تمام حکومتی محکموں میں خالی اسامیوں پر جمع ہونے والی درخواستوں کا حساب لگایا جائے تو اس سے بے روزگاری کے سرعت کے ساتھ پھیلتے ناسور سے ہمارے معاشرے کی مستقبل قریب کی گراوٹوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور آپ تو حضور والا عوام میں مزید مایوسی پھیلا رہے ہیں۔ اس پر کیا عوامی ردعمل سامنے آئے گا خود ہی تھوڑا سا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیجئے۔

''ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔''

ہاتھ الٹا گھما کر کان پکڑنے کی کوشش

آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے حوالے سے مجھے آج پھر اس سے متعلق کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ اور چیف جسٹس سپریم کورٹ جناب آصف سعید کھوسہ کے ریمارکس یاد آ رہے ہیں۔ انہوں نے اس کیس کے پس پردہ محرکات کو محسوس کر کے ہی ریمارکس دیئے تھے کہ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے معاملہ میں حکومت ہمارا کندھا استعمال نہ کرے اور اپنا بوجھ خود اُٹھائے، میں نے گزشتہ کالم میں بھی اس بحث سے اجتناب کیا تھا کہ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کو عدالت عظمٰی میں چیلنج کرنے کا مقصد کس کا اور کیا ہوسکتا ہے مگر اب گتھیاں خود ہی سلجھتی جارہی ہیں۔ آج آپ اس معاملہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد حکومتی رویے کا جائزہ لے لیں تو آپ کو متعلقہ کیس کے حوالے سے کسی قسم کا قیافہ لگانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔ وزیراعظم عمران خاں اپنے اپوزیشن کے دور میں آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار فرماتے رہے وہ سپریم کورٹ میں متذکرہ کیس کی سماعت کے دوران بھی لوگوں کی یادداشتیں کھولنے کا باعث بنتے رہے ہیں کیونکہ سوشل میڈیا پر ہمارے قائدین کے ماضی کے کہے ہوئے الفاظ ہمیشہ تروتازہ ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ عمران خاں کے متعلقہ بیانات ہی کی روشنی میں ان کے بطور وزیراعظم آرمی چیف کے منصب میں توسیع کا نوٹیفکیشن جاری کرنے کے عمل کو ان کی قانونی ٹیم کی محض نالائقی کے کھاتے میں ڈال کر فیس سیونگ تو کی جاسکتی ہے مگر اس کے پس پردہ سوچ کو بہرصورت کسی نالائقی کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت عظمٰی نے یقیناً اس سوچ کو محسوس کر کے ہی حکومت کو اس معاملہ میں خالصتاً آئین اور قانون کی پاسداری ملحوظ خاطر رکھنے کا رستہ دکھایا تھا۔ اگر اس حوالے سے مروجہ آئین و قانون کی پاسداری کی جائے تو اس سے آرمی چیف کے منصب میں توسیع کی سرے سے گنجائش ہی نہیں نکلتی۔ اگر آرمی چیف کی ملک و

قوم کے لیے بے پناہ خدمات اوران خدمات کے تسلسل کی ضرورت کے تحت ان کے منصب میں توسیع کی گنجائش نکالنا مقصود ہے تو آئندہ قانون کی پاسداری کی خاطر لازماً آئین اور آرمی ایکٹ میں اضافی شقیں لانا پڑیں گی مگر سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد حکومتی حلقوں کی جانب سے صرف آرمی ایکٹ میں ترمیم سے کام چلانے کا عندیہ دیا جانے لگا۔ دوسری جانب وزیر ریلوے شیخ رشید احمد اور بعض دوسرے حکومتی اکابرین اس امر کے داعی نظر آئے کہ اپوزیشن بنچوں سے بھی متعلقہ ترامیم کی خوشی خوشی منظوری دے دی جائے گی۔ آج مسلم لیگ (ن) کے سیکرٹری جنرل احسن اقبال نے بھی یہ کہہ کر متعلقہ ترامیم کے لئے اپوزیشن کی رضامندی کا عندیہ دے دیا ہے کہ آرمی چیف کے لئے قانون سازی اتفاق رائے سے ہونی چاہئے۔ یقیناً یہی باعزت راستہ ہے کہ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے حوالے سے کسی اختلاف رائے کی گنجائش ہی پیدا نہ ہونے دی جائے۔

اگر حکومتی اکابرین اور احسن اقبال کے بقول پارلیمنٹ میں متعلقہ ترمیم کی منظوری کے لیے فضا مکمل سازگار ہے تو حکومت کو اس فضا سے فائدہ اُٹھا کر اب تک پارلیمنٹ میں اس ترمیم کے معاملہ میں سرخرو ہو جانا چاہئے تھا مگر وزیر دفاع پرویز خٹک نے گزشتہ روز یہ بیان دے کر پس پردہ محرکات والی حکومتی ذہن کی کئی پرتیں خود ہی کھول دی ہیں کہ آرمی چیف سے متعلق تفصیلی عدالتی فیصلہ کے بعد حکومت لیگل ٹیم سے مل کر فیصلہ کرے گی۔ حضور والا! جب عدالت عظمیٰ نے اپنے مختصر فیصلہ میں ہی اس معاملہ میں یہ سب کچھ واضح کر دیا ہے اور حکومت و پارلیمنٹ کے کرنے کا کام انہی کے لئے چھوڑ کر متعلقہ آئین و قانون سازی کے لئے چھ ماہ کی مہلت دے دی ہے تو کیا حکومتی قانونی ٹیم کو عدالتِ عظمیٰ کے مفصل فیصلہ میں اس کے برعکس کسی معاملہ کی توقع ہے؟ اگر کان کو پکڑنا مقصود ہو تو ہاتھ کو الٹا گھما کر اور مشقت کر کے پکڑنے کے بجائے آسانی کے ساتھ سیدھے سیدھے پکڑ کر مطلوبہ مقصد پورا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے لیے حکومتی خوشدلی شامل حال ہے تو اسے کوئی الٹا راستہ اختیار کرنے اور مزید سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ سپریم کورٹ کا مختصر فیصلہ صادر ہونے کے بعد تو حکومتی ٹیم کو متعلقہ ترامیم کے لئے ہوم ورک پر جت جانا چاہئے تھا۔ بے شک اپوزیشن کی جانب سے بھی ایسی قانون و آئین سازی کے لئے کسی قسم کے اختلافِ رائے یا تحفظات کا اظہار سامنے نہیں آیا پھر بھی فضا

مزید سازگار بنانے کے لئے اپوزیشن جماعتوں کے قائدین سے رابطہ کرلیا جانا چاہئے تھا تاکہ اس معاملہ میں پارلیمنٹ میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہ نکل سکتی اور آرمی چیف کے لئے مکمل اتفاق رائے والی سرخروئی حاصل ہو جاتی مگر سپریم کورٹ کا فیصلہ صادر ہوتے ہی خود وزیراعظم نے جس جارحانہ انداز میں اپوزیشن پر چڑھائی کی اور اس کے بعد حکومتی وزیروں مشیروں نے یہ کہہ کر اپنی تنقیدی توپوں کا رخ تسلسل کے ساتھ اپوزیشن کی جانب کر رکھا ہے کہ مجرموں سے قانون سازی کیوں کرائی جائے تو کیا یہ متعلقہ قانون سازی کے لئے اپوزیشن کو خوش دلی کے ساتھ اتفاق رائے کی جانب لانے کی پالیسی ہے یا اس سے بنا بنایا کام بگاڑنا مقصود ہے؟

اس مصلحت کا تقاضا کیا ہے؟ اگر آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے معاملہ میں اپوزیشن حکومتی رویہ کی بنیاد پر مخالفانہ ووٹ دینے پر اتر آئی تو اس سبکی کا ذمہ دار کسے ٹھہرایا جائے گا۔ یہ کوئی ایسی جلیبی والی گتھی نہیں کہ اس کا سرا ہاتھ میں نہ آسکے بلکہ حکومتی رویئے اور پالیسیوں سے تو گتھیاں خود بخود سلجھتی جا رہی ہیں۔ شاید حکمران پی ٹی آئی اب آرمی چیف کے منصب میں توسیع کیلئے آئین و قانون سازی نہ ہونے کا الزام اپوزیشن بنچوں پر دھر کر اس معاملہ میں اپنی اصل سوچ اور حکمت عملی کو برقرار رکھنا چاہتی ہے تاکہ آنے والے کسی وقت میں اسے اپنے ''زریں اصول'' کو کیش کرانے کا موقع مل سکے۔ اب دیکھنا یہی ہے کہ اپنے مقصد کے لئے دوسروں کا کندھا استعمال کرنے کی حکمران پی ٹی آئی کی حکمت عملی پر اسے اپوزیشن کی جانب سے بھی سپریم کورٹ جیسا ''سیدھا'' راستہ دکھایا جاتا ہے یا مجوزہ ترمیم کیلئے حکومتی حکمت عملی پر ہی صاد کیا جاتا ہے۔ جذبات سے عاری سیاست کے کھیل میں ایسے الٹ پھیر کوئی اچنبھے کی بات نہیں جس میں اپنے مقصد کے حصول کیلئے ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' والی حکمت عملی ہی بہترین حکمت عملی تصور کی جاتی ہے۔ ارے جناب! کبھی تو اپنا بوجھ خود اٹھا کر بھی سرخروئی کی منزل حاصل کرنے کی کوشش کر لی جائے۔

افغان الیکشن کمشن کا ''معرکہ'' اور ہماری سر پھٹول

ہم اپنے الیکشن کمشن کی جو بھد اڑاتے ہیں، وہ اس ادارے اور اس کے سربراہ کی ہی ہمت ہے کہ کانٹوں کی سیج پر چھید چھید ہو کر بھی وہ ہر مرحلے کے آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخابات کی ذمہ داریوں میں جتے رہتے ہیں، شائد غالب کا یہ شعر اس خودمختار قومی ادارے کے پیش نظر رہتا ہو گا کہ......؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

آپ ذرا اپنے پڑوسی ملک افغانستان کے الیکشن کمشن کی ''بے مثال'' کارکردگی کے ساتھ اپنے الیکشن کمشن کی کارکردگی کا موازنہ تو کریں، آپ کو آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخابات کے معاملہ میں دال آٹے کا بھاؤ خوب معلوم ہو جائے گا۔ اندازہ لگایئے کہ تین ماہ قبل 29- ستمبر 2019ء کو منعقد ہونے والے افغان صدر کے انتخاب کا نتیجہ گزشتہ روز ابھی غیر رسمی طور پر سامنے آیا ہے جس میں موجودہ صدر اشرف غنی کو ہی دوبارہ منتخب صدر قرار دے دیا گیا ہے جبکہ ان کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر آنے والے صدارتی امیدوار عبداللہ عبداللہ نے ان انتخابی نتائج کو فراڈ قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا اور ساتھ ہی یہ الزام بھی عائد کیا کہ الیکشن کمشن نے مکمل طور پر اشرف غنی کو سپورٹ کیا ہے۔

افغان الیکشن کمشن کی خاتون سربراہ مس حوا عالم نورستانی نہ جانے کس بکھیڑے میں پڑی رہیں کہ صدارتی انتخاب میں پڑنے والے ووٹوں کی گنتی میں تین ماہ لگا دیئے۔ ذرا اندازہ لگایئے کہ اس انتخاب میں دوبارہ منتخب قرار پانے والے صدارتی امیدوار اشرف غنی کو 9 لاکھ 23 ہزار

ووٹ ملے جبکہ ان کے قریب ترین حریف عبداللہ عبداللہ نے سات لاکھ 20 ہزار ووٹ لئے جبکہ سابق افغان وزیراعظم اور مجاہدین دور کے مقبول لیڈر گلبدین حکمت یار کے کھاتے میں صرف 70 ہزار' 273 ووٹ آئے اور چوتھے صدارتی امیدوار رحمت اللہ نبیل کے بکس میں سے 33 ہزار 927 ووٹ برآمد ہوئے۔ یہ پڑنے والے مجموعی ووٹ 18 لاکھ سے زیادہ نہیں۔ اشرف غنی نے مجموعی ووٹوں کے پچاس عشاریہ صفر 6 فیصد اور عبداللہ عبداللہ نے 39 عشاریہ 52 فیصد ووٹ لیے جبکہ باقیماندہ دو امیدواروں کے ووٹوں کا تناسب آٹھ فیصد سے زیادہ نہیں۔ اگر پورے افغانستان کا صدارتی حلقۂ انتخاب 30 لاکھ ووٹروں پر بھی مشتمل ہو تو یہ ہمارے قومی اسمبلی کے پندرہ حلقوں سے زیادہ نہیں بنتا۔ پھر ووٹوں کی گنتی کا عمل بھی اتنا پیچیدہ نہیں کہ اس سے گزرتے گزرتے تین ماہ لگ جائیں مگر یہ سارا عرصہ افغان صدارتی امیدواروں نے صبر وسکون کے ساتھ گزارا۔ نتائج میں تاخیر پر کسی نے واویلا کیا نہ نتائج آنے تک کسی نے الیکشن کمشن کو دھاندلیوں کا مرتکب قرار دیا۔ اب بھی صرف عبداللہ عبداللہ نے الیکشن کمشن کو اشرف غنی کی باندی قرار دیا ہے مگر نتائج کے خلاف پورے افغانستان میں کہیں سے بھی کسی ہنگامے کی خبر نہیں آئی گویا دوسرے امیدواروں نے پہلے ہی کی طرح تقدیر کا لکھا سمجھ کر صبر کا گھونٹ بھر لیا ہے۔ اگر ایسی ہی صورت حال ہمیں درپیش ہوتی تو اب تک اتھل پتھل ہو چکا ہوتا۔

ہمارا الیکشن کمشن تو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی ایک ہزار سے زائد نشستوں کے انتخابات کراتا اور اسی رات غیر سرکاری نتائج کے اعلان کا پابند ہوتا ہے۔ ان انتخابات میں پانچ سے سات کروڑ تک ووٹ پول ہوتے ہیں پھر بھی چابکدستی کے ساتھ ووٹوں کی گنتی کی جاتی ہے اور امیدواروں کو پڑنے والے درست ووٹوں کے ساتھ ساتھ مسترد شدہ ووٹوں کی بھی گنتی کر کے قوم کو آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ پھر الیکشن کے ماتحت ضمنی انتخابات اور بلدیاتی انتخابات کے مراحل بھی چلتے رہتے ہیں مگر مجال ہے الیکشن کمشن کے سربراہ، ارکان اور دوسرے سٹاف کی پیشانیوں پر ان فرائض کی ادائیگی کے دوران کبھی بل آیا ہو جبکہ امیدواران اور سیاسی جماعتوں کے قائدین لٹھ لیکر الیکشن کمشن پر چڑھ دوڑے ہوتے ہیں۔

الیکشن کمشن کو انتخابی دھاندلیوں کے الزام کے زیر بار رکھنا تو ہمارا قومی کلچر بن چکا ہے جو اب تک ہر الیکشن کمشن بھگتتا آیا ہے۔ جب چیف الیکشن کمشنر اور ارکانِ الیکشن کمشن کا تقرر صرف وزیراعظم کی صوابدید تھی، اس وقت تو الیکشن کمشن پر حکومتی پارٹی کے لیے جانبداری کا الزام بچ بھی جاتا تھا جبکہ انفرادی سطح پر انتخابی دھاندلیوں سے بچنا ویسے ہی مشکل ہوتا ہے مگر اب تو سیاسی جماعتوں کے اتفاق رائے سے الیکشن کمشن کو 18 ویں آئینی ترمیم کے ذریعے خودمختار بنا دیا گیا ہے جس کے سربراہ اور ارکان کا تقرر حکومت اور اپوزیشن کی باہمی مشاورت اور اتفاقِ رائے سے عمل میں آتا ہے۔ اگر ہمارے انتخابی کلچر میں شکست تسلیم کرنے کی روایت بھی پڑ جائے تو الیکشن کمشن سب کے لئے قابلِ قبول بنا رہ سکتا ہے مگر خوشدلی کے ساتھ شکست تسلیم کرنا ہمارے خمیر میں شامل ہی نہیں اس لئے خودمختار الیکشن کمشن نے بھی دھاندلیوں کے شور شرابے والے ہمارے کلچر کا کچھ نہیں بگڑنے دیا۔ ہماری تسکین صرف اس صورت ہی ہو سکتی ہے کہ الیکشن کمشن کے سربراہ اور ارکان کے منصب پر ہمارا اپنا بندہ موجود ہو۔ اسی کشمکش میں آج خودمختار الیکشن کمشن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے انتخابات متنازعہ بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی اور بطور خاص چیف الیکشن کمشنر تو دشنام طرازی کی زد میں ہی رہتے ہیں۔ اس کلچر نے نیک نام چیف الیکشن کمشنر فخر الدین جی ابراہیم کو بھی زچ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی جس پر وہ آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخابات کے انعقاد کے مشن سے توبہ تائب ہو کر استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گئے اور پھر اس منصب کے لئے بعض دوسری نیک نام شخصیات کی جانب سے بھی معذرت سامنے آنے لگی، پھر جسٹس (ر) سردار رضا خاں نے یہ بھاری پتھر اٹھایا جن پر سیاسی قائدین کی جانب سے پہلے تو اعتماد کا اظہار کیا گیا مگر شکست کو قبول نہ کرنے کی روش نے جلد ہی اس اعتماد میں خلل پیدا کرنا شروع کر دیا۔ 2013ء کے انتخابات اس وقت کی اپوزیشن بالخصوص پی ٹی آئی کے نزدیک متنازعہ بنے رہے اور اسی بنیاد پر لانگ مارچ اور دھرنا تحریک کا شور شرابا ہوا اور نوبت لاک ڈاؤن تک آ گئی۔ اب 2018ء کے انتخابات موجودہ اپوزیشن بشمول مسلم لیگ (ن) پیپلز پارٹی، جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام (ف) اے این پی وغیرہ وغیرہ کو ہضم نہیں ہو رہے اور سب یار

لوگ تہہ طوفان کئے بیٹھے ہیں جبکہ اب چیف الیکشن کمشنراور دوارکان کی ریٹائرمنٹ کے بعد الیکشن کمشن کی تشکیل نو ہی ممکن نہیں ہو پا رہی اور دو ملاؤں میں مرغی حرام والی نوبت آ گئی ہے۔ وزیراعظم اوراپوزیشن لیڈر کسی ایک نام پر متفق نہیں ہوئے تو معاملہ پارلیمانی کمیٹی کے پاس آیا اور اعلیٰ عدلیہ میں بھی چیلنج ہوگیا۔اسلام آباد ہائیکورٹ سے دوبار دس دس دن کی مہلت کسی ایک نام پر اتفاق رائے کی خاطر لی جا چکی ہے۔اب آج 24- دسمبر کواس اتفاق رائے کے لئے پارلیمانی کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا ہے مگراب بھی کوئی امید برنہ آنے والی کیفیت ہی نظر آ رہی ہے۔پھر عدلیہ کے ہاتھ میں باگ ہوگی جس پر اعتماد کا معاملہ مشرف کیس کے حوالے سے پہلے ہی دگرگوں ہو چکا ہے تو بھائی صاحب! ذرا اپنے پڑوسی افغانستان کے الیکشن کمشن سے ہی کچھ گر سیکھ لیجئے کہ انتخابی نتائج کے اعلان میں دوتین ماہ تاخیر کر کے بھی دھاندلیوں کے الزامات پر ہنگاموں کی نوبت نہ آنے دینے کی فضا کیسے بنائی جاتی ہے۔الیکشن کمشن میں ''اپنا بندہ'' لانے کی تگ ودو میں ہم کب تک اپنا تماشہ بناتے رہیں گے۔اس سے بہتر ہے کہ افغانستان کا الیکشن کمشن ہی مستعار لے لیں۔شائد آنکھ کی شرم ہمارے لئے بھی سدھار کی کوئی صورت حال بنا دے۔

مشرف کیس کا مفصل فیصلہ اور آئین کی پاسداری کا سوال

پرویز مشرف صاحب کی قومی خدمات اور دفاع وطن کے لئے ان کے بے مثال کردار پر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ اگر ان کے دفاع وطن کے جاندار عسکری کردار کے حوالے سے کوئی بدطینت ان پر غدارِ وطن کا لیبل لگائے تو بلاشبہ اس کا منہ توڑ دیا جانا چاہیے اور ایسا سبق سکھانا چاہیے کہ ایسے دوسرے بدخواہوں کو بھی سبق حاصل ہو۔ اس معاملہ میں میرا اپنا ردعمل بھی متشددانہ ہوگا۔ بے شک دفاع وطن کی ذمہ داریوں میں عساکر پاکستان اور عسکری قیادتوں نے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں، مشاقی اور دفاع وطن میں ان کی لازوال قربانیوں کی پوری دنیا قائل اور معترف ہے۔ اس لئے ان ذمہ داریوں کی بنیاد پر جنرل مشرف سمیت کسی بھی فوجی سربراہ پر ملک سے غداری کا لیبل لگانا ملک کے دشمنوں کی زبان بولنے کے مترادف ہوگا۔ ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونا چاہیے جو ملک کے دشمنوں کے ساتھ کئے جانے کا متقاضی ہوتا ہے۔ مگر یہاں مسئلہ ملک سے غداری کا تو ہے ہی نہیں۔ یہاں تو آئین وقانون کی بالادستی وحکمرانی کا معاملہ ہے۔ اگر آج اس ملک کا سسٹم (سول اور عدالتی نظام) آئین وقانون کی عملداری کے ماتحت چل رہا ہے تو پھر آئین وقانون کی عملداری نے ہی غالب ہونا ہے۔ اگر آئین کی دفعہ 6 میں آئین کو توڑنے، معطل کرنے، سبوتاژ کرنے اور معلق کرنے کو سنگین غداری کے جرم کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے اور اس کی سزا موت مقرر کی گئی ہے تو کسی کے ماورائے آئین اقدام کی بنیاد پر اس پر سنگین غداری کا جرم ثابت ہونے کی صورت میں اسے وہی سزا ملے گی جو آئین کی متعلقہ دفعہ اور اس کو سپورٹ کرنے والی قانون کی متعلقہ شق میں متعین ہے۔ اس معاملہ میں متعلقہ عدالت کی کارروائی،

اس کے طریق کار اور فیصلے پر ملزم کو یا کسی اور کو بھی کسی قسم کا اعتراض ہو فیصلے اور متعلقہ قانون میں کوئی سقم یا ابہام نظر آ رہے ہوں یا انصاف کی عملداری کے تقاضے پورے نہ کئے جاتے محسوس ہوں تو ان سارے معاملات میں دادرسی کے لئے اپیلٹ کورٹ کا مجاز فورم سپریم کورٹ کی صورت میں موجود ہے۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر جسٹس آصف سعید کھوسہ تو ویسے ہی آئین و قانون کی عملداری و پاسداری کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی متعدد تقاریر میں بھی اور آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے کیس میں بھی باور کرا چکے ہیں کہ عدلیہ نے آئین و قانون کے دائرے میں رہ کر اور اس کے تقاضوں کی روشنی میں ہی اپنے فرائض ادا کرنے ہیں۔ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے معاملہ میں بھی ان کا بنیادی تجسس یہی تھا کہ توسیع کی آئین و قانون میں کہیں گنجائش ہی نہیں ہے تو عدالت ماورائے آئین و قانون کسی نوٹیفکیشن کو کیونکر جائز تسلیم کر سکتی ہے۔ یہ ''سقم'' دور کرنے کے لئے ہی فاضل چیف جسٹس نے حکومت کو آئین و قانون کی متعلقہ شقوں میں ترمیم کے لئے چھ ماہ کی مہلت دی تا کہ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کی ضرورت ہے تو اس کی آئین اور قانون میں بھی گنجائش موجود ہو۔

تو جناب! آپ کے پاس آئین و قانون کی حکمرانی و عملداری کا پرچم تھامے کھڑی عدلیہ موجود ہے تو جنرل مشرف کے کیس میں خصوصی عدالت کی جانب سے آئین و قانون سے ہٹ کر کئے گئے کسی فیصلے کے خلاف آئین و قانون کے تقاضوں کے مطابق دادرسی کے لئے آپ کے پاس مجاز فورم موجود ہے اور خصوصی عدالت کے فیصلہ کے حوالے سے نامور اور سینئر قانون دانوں سمیت ملک کے مختلف طبقات کی جانب سے متذکرہ فیصلہ کے خلاف جو مضبوط و جاندار سوال اور نکات اٹھائے گئے ہیں ان کی بنیاد پر یہ سزا کے خلاف اپیل کا مضبوط کیس بنتا ہے۔ بالخصوص خصوصی عدالت کا مفصل اکثریتی فیصلہ جاری ہونے کے بعد تو اس کیخلاف اپیل اور بھی مضبوط ہو گئی ہے کیونکہ اس فیصلہ میں یہ قرار دیکر شعائر اسلامی اور شرف انسانیت کی بھی توہین کی گئی ہے کہ مشرف اگر فیصلہ پر عملدرآمد سے پہلے انتقال کر جائیں تو انکی لاش ڈی چوک پر لا کر تین دن تک لٹکائی جائے۔ ان ریمارکس سے تو یہ فیصلہ صادر کرنیوالے جج حضرات کے مشرف کے بارے میں ذاتی تعصبات اور بھی کھل کر سامنے آ گئے ہیں جبکہ کسی فیصلہ میں ایسے توہین آمیز الفاظ استعمال کرنے کی عدلیہ میں کوئی مثال موجود نہیں۔ اسی بنیاد پر اٹارنی جنرل انور منصور، وزیر قانون فروغ

نسیم، وفاقی وزیر فواد چودھری' مشرف کے وکیل سلمان صفدر، سابق اٹارنی جنرل عرفان قادر، سابق وزیر قانون سید علی ظفر باہمی مشاورت سے ایک مضبوط کیس تیار کر سکتے ہیں اور کیس کو مزید مضبوط بنانے کے لئے سینئر قانون دانوں وسیم سجاد اور بیرسٹر اعتزاز احسن کی معاونت بھی حاصل کر سکتے ہیں جو پہلے ہی خصوصی عدالت کے فیصلہ پر اپنے تحفظات کا اظہار کر چکے ہیں۔ چنانچہ مشرف کیس کے فیصلہ میں قانونی اور آئینی اسقام موجود ہوں گے یا کیس کی کارروائی کے حوالے سے کسی قسم کی بے ضابطگی سرزد ہوئی ہوگی تو اپیل میں یہ فیصلہ اُڑنے میں ذرہ بھر دیر نہیں لگے گی اور مشرف صاحب اور ان کے متعلقین کو عدالتی سرخروئی بھی حاصل ہو جائے گی۔

پھر حضور والا! جھگڑا کیا ہے۔ یہی کہ مشرف کے 3- نومبر 2007ء والے ماورائے آئین اقدام پر آئین کی دفعہ 6 کو بروئے کار کیوں لایا گیا ہے۔ جناب یہ دفعہ آئین میں موجود ہے تو اس کے زمرے میں آنے والے کسی ماورائے آئین اقدام پر یہ دفعہ لاگو بھی ہوگی۔ آئین کی عملداری تو اسی طرح قائم ہو سکتی ہے۔ البتہ اس پر مختلف آراء ہو سکتی ہیں کہ آئین میں یہ دفعہ موجود ہونی چاہیئے یا نہیں۔ اگر کسی کو آئین و قانون کی حکمرانی والے سسٹم میں یہ آئینی دفعہ سوٹ نہیں کرتی تو آئین میں ردوبدل کے متعینہ آئینی طریق کار کے مطابق پارلیمنٹ میں ترمیمی آئینی بل لا کر یہ دفعہ آئین سے حذف کی جا سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ دفعہ آئین میں موجود بھی ہو اور اس کی ذیل میں آنے والے کسی اقدام کے خلاف اس آئینی دفعہ کو بروئے کار بھی نہ لایا جائے۔

میں آج مشرف کیس کے میرٹ پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سارے معاملات یقیناً سپریم کورٹ کے روبرو اپیل میں اٹھائے جا سکتے ہیں اور اٹھائے بھی جائیں گے کہ 3 نومبر 2007ء کے اقدام میں مشرف کے معاونین و مشیروں بشمول شوکت عزیز' زاہد حامد' جسٹس عبدالحمید ڈوگر اور اس وقت کی کابینہ کے ارکان تک کو اس کیس میں کیوں ملزم نامزد نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے اگر پہلے ہی سپریم کورٹ کا کوئی فیصلہ موجود ہے تو اس پر بھی اپیل کے مراحل میں بات ہو جائے گی۔

میرا تجسس آج صرف آئین و قانون کی عملداری کے حوالے سے ہے اور میں اس امر کا قائل ہوں کہ ملک میں جو بھی آئین اور جو بھی قانون مروج ہے اس کی پاسداری ہونی چاہیئے۔ اگر موجودہ وفاقی پارلیمانی جمہوری آئین کسی کو ناقص نظر آتا ہے تو اس کی جگہ آئینی طریق کار کے

مطابق نیا آئین منظو کرالیں۔ بہر حال ملک میں جو بھی آئین ہو' اسے لاگو ضرور ہونا چاہئے۔ اگر موجودہ آئین کی دفعہ 6 میں' جو 1973ء کے آئین میں پارلیمنٹ کی منظوری کے ساتھ شامل کی گئی ہے کسی کو اعتراض تھا تو اس کو آئین سے نکالنے کے بے شمار مواقع حاصل ہوئے تھے۔ جنرل ضیاء الحق مختار کل تھے جو اپنی ہی لائی گئی غیر جماعتی اسمبلی میں آئین کی 8 ویں ترمیم کی منظوری کے مراحل میں دفعہ 6 آئین سے حذف کرا سکتے تھے۔ اسی طرح جنرل پرویز مشرف کے پاس بھی ایسے کئی مواقع تھے جنہیں ان کے 12 اکتوبر 1999ء کے ماورائے آئین اقدام کو جائز قرار دینے والی سپریم کورٹ نے آئین میں ترمیم تک کا اختیار دیدیا تھا۔ وہ اپنے اس اختیار کو بروئے کار لا کر دفعہ 6 کا گلا گھونٹ سکتے تھے اور پھر ان کے پاس انہی کی لائی گئی ایسی اسمبلی بھی موجود تھی جس میں بیٹھے لوگ انہیں مزید اس ٹرموں کیلئے وردی سمیت صدر منتخب کرنے پر بھی تیار تھے۔ یہ اسمبلی تو آئین کی دفعہ 6 سے چھٹکارا پانے کیلئے انتہائی ساز گار تھی۔

اور اب بھی حالات کوئی ایسے دگر گوں تو نہیں ہیں۔ موجودہ اسمبلی میں بھی شیخ رشید اور دوسرے احباب کو مکمل اعتماد ہے کہ آرمی چیف کے منصب کی توسیع کے بل کی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) سمیت پوری اپوزیشن بھی خوشی خوشی منظوری دے دے گی۔ پھر جناب ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ لگے ہاتھوں اس خوشی خوشی میں آئین کی دفعہ 6 سے بھی اس اسمبلی کے ذریعے چھٹکارا پا لیں مگر جب تک یہ دفعہ آئین میں موجود ہے' اس کی عملداری قائم کرنا ہوگی۔

گزرتے سال کا آخری المیہ

نیب ترمیمی آرڈی ننس کو گزرتے سال کا آخری لطیفہ قرار دیا جائے یا ٹونٹی ٹونٹی (2020ء) کی ممکنہ خوشگوار سیاست کی اس آرڈی ننس کے ذریعے تمہید باندھی جائے۔ اس بارے میں تو آرڈیننس کے روبہ عمل ہونے پر ہی کوئی رائے قائم کی جاسکے گی تاہم امرواقع تو یہی ہے کہ کرپشن فری سوسائٹی کے ایجنڈے پر عوام کا مینڈیٹ حاصل کر کے اقتدار کی منزل حاصل کرنے اور پھر تواتر کے ساتھ کسی چور ڈاکو کو نہ چھوڑنے کے دلپذیر اعلانات کرنے والے وزیراعظم عمران خاں نے خود کراچی میں سٹاک ایکسچینج کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے شرکائے تقریب کی جانب معنی خیز اشارے اور زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ یہ "مژدۂ جانفزا" سنایا تھا کہ بزنس کمیونٹی کو نیب کے دائرۂ اختیار سے باہر نکالا جارہا ہے۔ پھر ان کے اس اعلان کے ساتھ ہی وفاقی کابینہ سے منظور کیا گیا۔ نیب ترمیمی آرڈی ننس صدرمملکت کے دستخطوں کے ساتھ جاری کر دیا گیا جس کے حوالے سے اگلے روز قومی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں میں واضح طور پر یہ بتایا گیا کہ اس آرڈی ننس کی بنیاد پر نیب کسی سرکاری ملازم کے خلاف محکمانہ نقائص کی بنیاد پر کارروائی نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی سرکاری ملازم کی جائیداد عدالتی حکمنامہ کے بغیر منجمد کی جاسکے گی تاہم سرکاری ملازم کے اثاثوں میں بے جا اضافے پر اختیارات کے ناجائز استعمال کی کارروائی ہوسکے گی۔ خبر میں واضح طور پر یہ بھی درج تھا کہ نیب پچاس کروڑ روپے سے زائد کی کرپشن پر کارروائی کر سکے گا۔ خبر کی رو سے ترمیمی آرڈیننس کے تحت ٹیکس، سٹاک ایکسچینج اور آئی پی اوز سے متعلق معاملات پر بھی نیب کا دائرۂ اختیار ختم ہو جائے گا اور ان تمام معاملات پر ایف بی آر، ایس ای سی پی اور بلڈنگ کنٹرول اتھارٹیز کارروائی کرسکیں گی۔

یہ خبر پوائنٹ سکورنگ کی سیاست پر اپوزیشن کے لیے تو اندھے کے ہاتھ بٹیرہ آنے کے

مصداق تھی اس لئے بالخصوص پیپلز پارٹی کے قائدین کی جانب سے اس خبر پر وزیر اعظم عمران خاں کی تقریر کا بطور خاص حوالہ دے کر حکومت پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی گئی اور نیب ترمیمی آرڈی ننس کو این آر او کی ماں قرار دے دیا گیا جبکہ مسلم لیگ (ن)، جماعت اسلامی اور اے این پی کی قیادتوں کو بھی اس آرڈی ننس کی بنیاد پر کرپشن فری سوسائٹی کی داعی حکومت پر تنقید کے نشتر چلانے کا موقع مل گیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت اپنے ہی پیدا کردہ ایک بحران سے مکمل طور پر نکل نہیں پاتی کہ اپوزیشن کو تنقید کا موقع فراہم کرنے کے لئے خود ہی دوسرا بحران منظر عام پر لے آتی ہے۔ آرمی چیف کے منصب میں توسیع، سابق صدر پرویز مشرف کی سزائے موت اور چیف الیکشن کمشنر کے تقرر کے معاملہ میں حکومت کے اپنے پیدا کردہ بحران ابھی ٹلنے کی نوبت تک نہیں پہنچے اور ان کے قانونی اور آئینی پہلوؤں پر حکومتی موقف کے حوالے سے ابھی تک قیاس آرائیاں جاری ہیں کہ اب حکومت نے ایک نیا بحران اپنے گلے ڈال لیا ہے اور اب وضاحتوں پر وضاحتیں پیش کی جا رہی ہیں کہ نیب ترمیمی آرڈی ننس میں وہ سب کچھ ہے ہی نہیں جس پر اپوزیشن تنقید کا شوق پورا کر رہی ہے۔ اس حوالے سے بالخصوص پچاس کروڑ روپے تک کی کرپشن اور سرکاری ملازمین کو نیب کے دائرۂ اختیار سے باہر نکالنے کی خبر کو حکومتی حلقوں کی جانب سے بے بنیاد قرار دیا جا رہا ہے تاہم وزیر اعظم کے معاون خصوصی برائے احتساب و داخلہ امور بیرسٹر شہزاد اکبر نے گزشتہ روز جو وضاحتی پریس کانفرنس کی اس میں متذکرہ دونوں معاملات پر کسی قسم کی وضاحت کرنے کے بجائے یہ باور کرانا زیادہ ضروری سمجھا کہ نیب کا کام کرپشن کو پکڑنا ہے۔ اداروں کو ٹھیک کرنا نہیں۔ بالفرض محال اگر نیب آرڈی ننس میں پچاس روپے تک کی کرپشن اور سرکاری ملازمین کے محکمانہ نقائص پر نیب کی گرفت ختم کرنے کی کوئی شق شامل نہیں تو پھر یہ صورت حال حکومتی گورننس کے حوالے سے اور بھی تشویشناک ہونی چاہئے کہ وزیر اعظم عمران خاں کی تقریر کے فوری بعد متذکرہ مندرجات پر مبنی خبر قومی میڈیا کو کیسے جاری ہو گئی۔ اگر اس خبر کی بنیاد محض قیاس آرائی اور قیافہ تصور کی جائے تو ہر اخبار میں اور ہر ٹی وی چینل پر ایک دوسرے سے مختلف خبر آتی، اگر شائع اور نشر ہونے والی خبر کے مندرجات ایک ہی تھے تو یقینی بات ہے کہ یہ خبر کسی حکومتی ادارے کی جانب سے پورے وثوق کے ساتھ جاری کی گئی اور اس سے یہی پیغام دینا مقصود تھا کہ وزیر اعظم نے آج تاجر کمیونٹی کو خوش اور مطمئن کر دیا ہے۔ پھر جناب! اپوزیشن کیوں یہ الزام عائد نہیں کرے گی کہ نیب

ترمیمی آرڈی ننس کے ذریعے درحقیقت اپنوں کو نیب کے شکنجے سے باہر نکالا گیا ہے۔ اپوزیشن تو پہلے ہی نیب کی کارروائیوں سے شاکی تھی کہ یہ صرف اس کے خلاف انتقامی سیاسی کارروائیاں ہیں اور چیئرمین نیب کے ہوا کارخ بدلنے کے اعلان نے بھی حکمران جماعت اور اس کی حلیف جماعتوں کے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑا، اب نیب ترمیم آرڈی ننس نے اس معاملہ میں اپوزیشن کے الزامات کو مزید تقویت پہنچا دی ہے۔ پھر آپ لگے ہاتھوں قوم کو یہ بتا ہی دیجئے کہ اگر نیب کے اختیارات میں کسی قسم کی کمی نہیں کی گئی تو نیب ترمیمی آرڈی ننس جاری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور وزیراعظم عمران خاں کو خالصتاً تاجروں کی تقریب میں انہیں نیب کے شکنجے سے نکالنے کی خوشخبری سنانے کی ضرورت کیوں پڑی۔ شائد یہ 2019ء کا آخری جھٹکا تھا جو حکومت نے خود کو لگایا مگر اس کے آفٹر شاکس 2020ء میں بھی حکومت کو جھنجوڑنے کا باعث بنتے رہیں گے۔ اپوزیشن تو نیب سے پہلے ہی خلاصی چاہتی تھی جس کے لیے نیب کی مبینہ یکطرفہ کارروائیوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اب نیب کے اپوزیشن کے اپنے بقول پر کٹے ہیں تو اسے مطمئن ہونا چاہئے کہ نیب کو ختم کرنے یا غیر موثر بنانے کی اس کی خواہش حکومت کے ہاتھوں پوری ہو رہی ہے۔ مگر پوائنٹ سکورنگ کی سیاست میں اپنے ممکنہ فائدے کو بھی پس پشت ڈال کر ضرب لگائی جاتی ہے۔

اس آرڈی ننس کے بعد نیب کتنا خودمختار اور غیر جانبدار رہ پائے گا اور اس کے بے لاگ اقدامات کے دعوؤں کا کیا بنے گا، اس کا تو آرڈی ننس کے آپریشنل ہونے کے بعد اندازہ ہوتا ہی رہے گا مگر کیا ایسے حکومتی اقدامات کے بعد پی ٹی آئی قائد کے سٹیٹس کو توڑنے، سسٹم کی اصلاح کرنے اور کرپشن فری سوسائٹی تشکیل دے کر اسے ریاست مدینہ کے تصور سے ہمکنار کرنے کے اعلانات کی آب و تاب اسی طرح برقرار رہے گی؟ جناب! اگر اسی فرسودہ روایتی سیاست کا چلن اختیار کرنا ہے تو تبدیلی کے نعرے لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ کم از کم عوام کا یہ شش و پنج تو دور کر دیجئے کہ......

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوال ترمیم کا نہیں، سول سپرمیسی کا ہے

مسئلہ یہ ہرگز نہیں کہ صرف آرمی ایکٹ میں ترمیم کر کے آرمی چیف کی میعاد ملازمت اور ملازمت کی میعاد میں توسیع کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے یا اس کے لئے آئین کی دفعہ 243 کی متعلقہ شق میں ترمیم لازمی ہوگی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آرمی چیف اور مسلح افواج کے دیگر سربراہوں کے تقرر کے لئے متعلقہ اتھارٹی کے آئینی اختیار کے ہوتے ہوئے اس معاملہ میں کسی قانونی اور آئینی ترمیم کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے۔ میں اس بارے میں سینئر قانون دان بیرسٹر اعتزاز احسن کی اس رائے سے سو فیصد متفق ہوں کہ آرمی چیف کے منصب پر تقرر اور توسیع کا اختیار آئین کی دفعہ 243 (3) B کے تحت قطعی طور پر ریاست کے سربراہ کا اختیار ہے اس لئے اس معاملہ میں کسی قانون سازی کی ضرورت نہیں۔ اس تناظر میں بلاشبہ آج مسئلہ صرف سول سپرمیسی کا ہے اور سپریم کورٹ نے آرمی چیف کے منصب میں توسیع کے کیس میں درحقیقت سول سپرمیسی ہی کا تقاضہ کیا ہے۔ فاضل چیف جسٹس مسٹر جسٹس آصف سعید کھوسہ نے اسی حوالے سے صرف دو نکات پر فوکس کیا اور یہ دونوں نکات سول سپرمیسی کے حوالے سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اس کیس میں (مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ کیس کس نے کس نیت سے دائر کیا) فاضل چیف جسٹس نے سب سے پہلے یہی استفسار کیا کہ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کی آئین اور قانون کی کون سی شق اجازت دیتی ہے جبکہ اس حوالے سے آئین کی متعلقہ دفعہ 243 میں ایسی کوئی شق موجود نہیں۔ اسی طرح جب فاضل چیف جسٹس نے کیس کی سماعت کے دوران وفاقی کابینہ کے مشاورتی اجلاس میں آرمی چیف کی شمولیت کا نوٹس لیتے ہوئے ریمارکس دیئے کہ حکومتی قانونی مشیروں کی نااہلیت کی وجہ سے آج آرمی چیف کو خود کابینہ کے مشاورتی اجلاس میں شریک ہونا پڑا ہے جو ان کی آئینی ذمہ داریوں کا تقاضہ نہیں تھا۔

یہی دو نکات ہیں جن کی تہہ تک حکومتی اکابرین و دانشمندان پہنچ جائیں تو انہیں آئین اور قانون کی متعلقہ شقوں میں ترمیم کے لئے اپوزیشن بنچوں کو قائل کرنے اور اپنی حلیف جماعتوں کو ساتھ ملائے رکھنے کا تردد ہی نہ کرنا پڑے کیونکہ فاضل عدالتِ عظمٰی کے عبوری فیصلہ کی تہہ تک پہنچنے کی صورت میں اس ایشو پر سرے سے کسی قانونی اور آئینی ترمیم کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے بے ضابطگی تو صرف وزیراعظم کے دستخطوں کے ساتھ آرمی چیف کے منصب میں توسیع کا نوٹیفکیشن جاری کرنے کی ہوئی تھی کیونکہ یہ نوٹیفکیشن براہ راست وزیراعظم کی جانب سے نہیں بلکہ آئین کی دفعہ 243(3)B کے تحت وزیراعظم کی ایڈوائس پر صدر مملکت کی جانب سے جاری کیا جاتا ہے اور وزیراعظم کو اس کے لئے صدر مملکت کو مراسلہ بھجوانا ہوتا ہے۔ مجھے آج اس بحث سے بھی کوئی سروکار نہیں کہ یہ غلطی سہواً ہوئی یا اس میں کسی بدنیتی کا عمل دخل تھا۔ مجھے صرف اس کیس میں فاضل چیف جسٹس کے ریمارکس میں موجود انکے مافی الضمیر کو فوکس کرنا ہے۔ اگر فاضل چیف جسٹس نے متعلقہ نوٹیفکیشن پر نظرثانی کا کہا تو اس کا مقصد صرف آئین کی دفعہ 243 (3)B کو پیش نظر رکھ کر نوٹیفکیشن کی تصحیح کرانے کا تھا مگر اٹارنی جنرل انور منصور اور آرمی چیف کی جانب سے پیش ہونے والے وزیر قانون بیرسٹر فروغ نسیم نے اپنے دلائل میں آرمی چیف کے منصب میں توسیع کیلئے آئین اور قانون میں خلا موجود ہونے کا اعتراف کر کے فاضل عدالت کو یہ خلا دور کرنے کا حکم دینے پر مجبور کر دیا۔

اب ظاہر ہے یہ خلا سپریم کورٹ کے فیصلہ کی منشا کے مطابق دور کرنا مقصود ہوگا تو اس کیلئے صرف آرمی ایکٹ میں ترمیم سے کام نہیں چلے بلکہ آئین کی دفعہ B (3) 243 میں مزید ایک شق شامل کر کے آرمی چیف کے منصب کی مدت اور اس منصب میں توسیع کی مدت کا تعین کرنا پڑے گا۔ یہی گلے کی وہ پھانس ہے جو سول سپریمیسی کیلئے زہر قاتل ہے اور اسے قبول کرنا کم از کم سول حکمرانی کیلئے تو جان جوکھوں کا ہی کام ہوگا۔ اگر آج بھی ہماری عدلیہ نظریہ ضرورت والی ہوتی تو اس ترمیم کیلئے حکومت کو زحمت ہی نہ دیتی بلکہ خود ہی اسی طرح ترمیم کر کے کسی کیلئے سرخرو ہو جاتی جیسا کہ جنرل مشرف کے ماورائے آئین اقدام کے خلاف سید ظفر علی شاہ کی آئینی درخواست کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے اس وقت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس ارشاد حسن خان نے اس اقدام کو جائز قرار دیتے ہوئے جرنیلی آمر کو بغیر استدعا کے آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی دیدیا تھا مگر

نظریہ ضرورت کو سپریم کورٹ کے احاطہ میں دفن کرنے والی آج کی عدلیہ آئین و قانون کی پاسداری و عملداری کا عہد کر چکی ہے۔ اس لئے فاضل چیف جسٹس آصف سعید کھوسہ نے موجودہ کیس میں سب سے پہلے یہی باور کرایا کہ ہم آئین اور قانون کے دائرے سے ہرگز باہر نہیں نکل سکتے۔ ان کا یہ کہنا درحقیقت حکومت کو آئین کی دفعات 243' 244 اور 245 میں وضع کی گئی سول سپریمیسی کو برقرار رکھنے اور اس پر کسی قسم کی مفاہمت نہ کرنے کی تلقین تھی جبکہ تین دن تک اس کیس کی سماعت کے دوران فاضل چیف جسٹس کے ریمارکس کے ذریعے اس تلقین کا ہی اعادہ کیا جاتا رہا۔ سو یہ سوال آرمی چیف کے منصب میں توسیع کی خاطر آئین اور قانون میں کسی ترمیم کا نہیں بلکہ سول سپریمیسی پر کوئی گزند نہ پہنچنے دینے کا ہے جس کیلئے بہرصورت آئین اور قانون کی پاسداری اور عملداری مقصود ہے۔ مگر حضور والا! جس حکومت میں خود وزارت داخلہ کی جانب سے جرنیلی آمر مشرف کے خلاف ایک نہیں دوبار آئین کو پاؤں تلے روندنے کی مستوجب سزا غداری کیس کا فیصلہ صادر ہونے سے رکوانے کیلئے اسلام آباد ہائیکورٹ سے رجوع کیا جا رہا ہو اور جس حکومت کی کابینہ میں اس کیس میں جنرل مشرف کی وکالت کرنے والے بیرسٹر فروغ نسیم وزیر قانون کے منصب پر فائز ہوں اور پھر جس حکومت کی کابینہ میں مشرف کو قوم کا محسن قرار دینے اور ان کے خلاف دفعہ 6 کے تحت آئین توڑنے کے جرم کا مقدمہ چلانے کا تقاضا کرنے والوں کے خلاف آئین کی دفعہ 4 کے تحت کارروائی کرنے کا تقاضا کرنے والے فواد چودھری بھی وفاقی وزارت کے اہم منصب پر فائز ہوں اور اسی طرح جس حکومت کی کابینہ میں آرمی چیف کے منصب میں توسیع کی خاطر چیف جسٹس اور دوسرے آئینی مناصب میں توسیع کا بھی دانہ ڈالنے والے وزیر ریلوے شیخ رشید احمد موجود ہوں' کیا اس سے فاضل چیف جسٹس کے ریمارکس کے مافی الضمیر کے مطابق آئین و قانون کی عملداری کی بنیاد پر سول سپریمیسی کیلئے ڈٹ کر کھڑے ہونے کی توقع کی جائے۔ نہیں جناب' نہیں۔ آج کی فضا تو حضور والا! علامہ اقبال کے شعر کے اس مصرے کی عملی طور پر منظر کشی کر رہی ہے کہ......ع

نادان گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

یہی وہ فضا ہے جس کی بنیاد پر نامور قانون دان وسیم سجاد اور محمد اکرم شیخ حامد میر کے ٹاک شو میں متفق الیہہ تھے کہ آرمی چیف کے منصب کی میعاد مقرر کرنے اور اس منصب میں توسیع کے

لئے آئین اور قانون میں ترمیم کی جائے گی تو اس سے سول سپر میسی کے زد میں آنے کا خدشہ لاحق رہے گا۔ آپ سول سپر میسی کے قائل ہیں تو عسا کر پاکستان کے مناصب کے حوالے سے آئین اور قانون میں کسی ترمیم کا تردد ہی کیوں کریں گے۔ میرا ابھی یہی استفسار ہے جس کے جواب میں سول سپر میسی کے ساتھ کھڑا ہونے کا عزم کسی آئینی اور قانونی ترمیم اور اس کے خلاف کسی کے دوبارہ عدلیہ کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت ہی نہیں آنے دے گا۔ حضور یہ مجرب نسخہ ہے۔ بس ذرا آزما کر دیکھ لیجئے۔

KUTUB KHANA.
JALALI BOOKS
JALALI

’’ناطقہ سر بگریباں ہے‘ اسے کیا کہیے‘‘

میں نے گزشتہ کالم میں سول سپر میسی کا سوال اُٹھایا تو اس حوالے سے کئی احباب کو جنرل مشرف کے خلاف آ ئین سے غداری کے کیس میں سابق اور موجودہ حکومت کی جانب سے اختیار کئے گئے طرزِ عمل سے بھی سول سپرمیسی کا معاملہ غتر بود ہوتا نظر آیا۔ جناب! آ ئین پاکستان میں تو سول حکمرانی میں منتخب پارلیمنٹ نے ہی دفعات 243, 244, 245 کے ذریعے سول سپرمیسی کی ضمانت فراہم کی ہے۔ اگر ہمارے منتخب سول حکمران ہی سول سپرمیسی کی پاسداری نہیں کر پا رہے تو اس میں آ ئین کا کیا قصور ہے اور اس حوالے سے سول حکمرانوں اور پارلیمنٹ کے کرنے کا کام عدلیہ کیوں سرانجام دے۔ آرمی چیف کے منصب کی توسیع کے کیس میں چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس آصف سعید کھوسہ نے آ ئین کی دفعہ 243 کا حوالہ دے کر درحقیقت حکومت اور پارلیمنٹ کو سول سپرمیسی کے تحفظ کیلئے ان کا کردار ہی یاد دلایا تھا۔ آ ئین کی متعلقہ دفعات میں سول سپرمیسی کس طرح راسخ کی گئی ہے ذرا ملاحظہ فرمالیجئے۔

دفعہ 243 اور اسکی ذیلی شقوں میں جہاں مسلح افواج کو وفاقی حکومت کی کمان اور کنٹرول میں دیا گیا ہے اور صدر مملکت کو آرمڈ فورسز کی سپریم کمان سونپی گئی ہے وہیں مسلح افواج کے تمام سربراہان کے تقرر کا بھی وزیراعظم کی مشاورت کے ساتھ صدر مملکت ہی کو اختیار دیا گیا ہے۔ پھر آ ئین کی دفعہ 244 کے تحت مسلح افواج کے سربراہ سے رینکر تک ہر رکن کو حلف اُٹھانے کا پابند کیا گیا ہے جو آ ئین کے تھرڈ شیڈول میں شامل ہے۔ یہ حلف آرمڈ فورسز سے متقاضی ہوتا ہے کہ وہ آ ئین میں متعین اپنی ذمہ داریوں کے پابند ہوں گے۔ آ ئین پاکستان کی پاسداری کریں گے اور خود کو کسی سیاسی سرگرمی میں ملوث نہیں کریں گے۔ اسی طرح آ ئین کی دفعہ 245 شق ایک کے تحت آرمڈ فورسز وفاقی حکومت کی ہدایات کیمطابق کسی بیرونی جارحیت کے خلاف دفاع پاکستان کی

ذمہ داریاں اوراسی طرح دوسری ذمہ داریاں ادا کرینگی جس کیلئے انہیں سول انتظامیہ کی معاونت کیلئے طلب کیا جائیگا جبکہ اس آئینی دفعہ کی شق 2 میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ شق ایک کے تحت وفاقی حکومت کے اُٹھائے گئے کسی اقدام کا کسی بھی عدالت میں سوال نہیں اُٹھایا جائیگا۔حضور والا! سول سپرمیسی کیلئے اس سے بڑی ضمانت اور کیا ہوسکتی ہے جبکہ آئین کی دفعہ 6 سول سپرمیسی پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔جس کے تحت آئین کو توڑنے،سبوتاژ کرنے کا کسی فرد واحد کا اقدام ہی غداری کا جرم نہیں بنایا گیا بلکہ دفعہ 6 کی ذیلی دفعہ 2 کے تحت فرد واحد کے اس اقدام کی معاونت کرنیوالے بھی آئین سے غداری کے جرم کے ہی مرتکب ہوں گے۔

73ء کے آئین سے پہلے تو کسی ماورائے آئین اقدام کے تحت آئین توڑنے یا لپیٹنے کا جرم سرے سے غداری کا جرم تھا ہی نہیں اس لئے جنرل ایوب خاں، جنرل یحیٰی خاں اور انکے ساتھیوں کو غداری کے جرم کا مستوجب قرار نہیں دیا جاسکتا مگر 73ء کے آئین میں اس آئین کی خالق پارلیمنٹ نے دفعہ 6 ذیلی دفعہ ایک اور دفعہ 6 ذیلی دفعہ 2 کے تحت آئین کو سبوتاژ کرنا فرد واحد اوراسکے معاونین و متعلقین کیلئے غداری کا جرم بنا دیا جس کی سزا کا بھی اسی آئینی دفعہ میں تعین کر دیا گیا ہے تو سول سپرمیسی کی حفاظت منتخب سول حکمرانوں اور پارلیمنٹ کے ہی دست قدرت میں ہے جسے تسلیم کرانے کی پہلی آزمائش سول سیٹ اپ کیلئے جنرل مشرف کے حوالے سے سامنے آئی۔میاں نواز شریف اپنے اپوزیشن کے دور میں بلند بانگ دعوے کیا کرتے تھے کہ وہ اقتدار میں آکر جنرل مشرف کو آئین سے غداری کے جرم میں کٹہرے میں لائیں گے اور غداری کے اس جرم کا ارتکاب مشرف نے نواز شریف ہی کی حکومت کی بساط لپیٹ کر آئین پاکستان کو معطل کرنے والے اپنے 12 اکتوبر 1999ء والے اقدام کی بنیاد پر کیا تھا۔مشرف کا 3 نومبر 2007ء کو ملک میں ایمرجنسی اور پی سی او نافذ کرنیوالا اقدام تو بنیادی طور پر عدلیہ کے خلاف تھا جسکے نتیجے میں چیف جسٹس افتخار چودھری سمیت سپریم کورٹ اور ہائیکورٹ کے تمام جج اپنے مناصب سے فارغ ہو گئے تھے اور پھر جنہوں نے پی سی او کے تحت حلف اُٹھانا قبول کرلیا تھا وہ دوبارہ عدالتی مناصب پر فائز ہوگئے تھے۔

اس حوالے سے سول سپرمیسی کیلئے گیند مکمل طور پر میاں نواز شریف کی 2013ء کو قائم ہونے والی حکومت کی کورٹ میں آگئی تھی جن سے آئین کی دفعہ 6 اس امر کی متقاضی تھی کہ و،

اپنے اپوزیشن لیڈر والے اعلانات کی پاسداری کرتے ہوئے مشرف کو انکے 12 اکتوبر 1999ء والے ماورائے آئین اقدام کے تحت کٹہرے میں لائیں مگر وہ اپنے اقتدار کے پہلے ایک سال تک شش و پنج میں ہی پڑے رہے اور جب انہوں نے مشرف کے خلاف آئین کی دفعہ 6 کے تحت ریفرنس دائر کرایا تو انکے 12۔ اکتوبر 1999ء والے اقدام کے بجائے یہ کہہ کر انکے 3 نومبر 2007ء والے اقدام کو انکے غداری کے جرم کا جواز بنایا کہ وہ ان سے ذاتی انتقام نہیں لینا چاہتے کیونکہ مشرف کا 12۔ اکتوبر کا اقدام ان کیخلاف تھا۔ جب مشرف کیخلاف انکے 3۔ نومبر 2007ء والے اقدام کی بنیاد پر ریفرنس دائر ہوا تو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اسی جواز کے تحت خود اس کی سماعت سے گریز کیا کہ ان کا 3۔ نومبر 2007ء کا اقدام عدلیہ کے خلاف تھا اس لئے وہ بھی ان سے ذاتی انتقام نہیں لینا چاہتے۔ حضور! اس کیس میں مقصد ذاتی انتقام نہیں، آئین کی پاسداری و عملداری اور سول سپریمیسی تسلیم کرانے کا تھا۔ یقیناً مشرف کے خلاف ان کے 3۔ نومبر 2007ء کے اقدام کی بنیاد پر دفعہ 6 کے تحت دائر کیا گیا کیس ایک کمزور کیس تھا مگر اس کیس میں بھی ہر سطح پر مفاہمت ہوتی رہی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مشرف قانون و آئین اور انصاف کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہو گئے اور سول سپریمیسی اپنی جبینِ نیاز سے بس خجالت کے قطرے ہی اُتارتی رہ گئی۔

جناب! اس مشرف کیس کے حوالے سے اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے وزیراعظم عمران خان کے بیانات بھی ہماری تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں جو گاہے بگاہے سوشل میڈیا پر اجاگر ہوتے رہتے ہیں مگر جب غداری کیس کی سماعت کرنیوالی خصوصی عدالت کی جانب سے کیس کے فیصلہ کی تاریخ متعین ہوئی تو سول سپریمیسی کی ضامن موجودہ حکومت کی جانب سے بھی اسکی وزارت داخلہ کے ذریعے اس کیس کا فیصلہ رکوانے کیلئے اسلام آباد ہائیکورٹ سے رجوع کر لیا گیا جس کے باعث فیصلہ صادر ہونے کی نوبت تو نہیں آئی مگر متعلقہ خصوصی عدالت نے یہ کہہ کر اسلام آباد ہائیکورٹ کے احکام کی تعمیل سے معذرت کر لی کہ ہم صرف سپریم کورٹ کے احکام کے پابند ہیں۔ حضور والا! سپریم کورٹ تو سول سپریمیسی کے ساتھ کھڑی ہے مگر کیا سول سپریمیسی والے بھی اپنے پاؤں کھڑے ہیں؟

اس کیلئے حکومت کا مذ۔ سے مشاورت کر رہی ہے جس کے ارکان میں سے ایک مشرف کو قوم

کا محسن قرار دے چکے ہیں اور انکے خلاف غداری کا کیس بنانے والوں کے خلاف آئین کی دفعہ 4 کے تحت کارروائی کا تقاضا کر رہے ہیں۔ دوسرے رکن غداری کیس پر آج بھی مشرف کے وکیل ہیں اور تیسرے رکن آرمی چیف کے منصب کی توسیع کی ڈن ڈن ڈن کہہ کر ڈنکے کی چوٹ پر تائید کر رہے ہیں۔

اب لاہور ہائیکورٹ نے مشرف کی جانب سے دائر کی گئی درخواست پر مشرف کیخلاف غداری کے کیس کا اسی جواز کے تحت سوال اٹھا دیا ہے کہ یہ کیس تو انکے 3- نومبر 2007ء کے اقدام کیخلاف دائر ہوا ہے۔ اس میں ان سے آئین کو توڑنے کا جرم کہاں سرزد ہوا ہے۔ پھر جناب اب بھگتیں اور قوم کو بتائیں کہ مشرف پر غداری کے جرم کے اطلاق کیلئے سول سپر میسی والوں کو کن حالات نے انکے 12- اکتوبر 1999ء والے اقدام کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے روکا تھا۔ آج تو غداری کیس میں حکومت خود عدلیہ کے روبرو مشرف کا دفاع کر رہی ہے چاہے یہ بالواسطہ ہی سہی۔ ایسے حالات میں ہم سول سپر میسی کے سہانے خواب کہاں تک اور کس بنیاد پر دیکھتے رہیں۔ ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیئے۔

عوام اور اشرافیہ کے لئے الگ الگ قانون کا پراپیگنڈا

آپ عام آدمی اور مراعات یافتہ اشرافیہ طبقات کیلئے صرف قانون اور انصاف کے الگ الگ ہونے کی بات کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب آپ کو سیاست چمکانا ہوتی ہے مگر ذرا اس بات کا بھی تو جائزہ لے لیجئے کہ بے وسیلہ عام عوام کا کس شعبہ میں کوئی پرسان حال ہے۔ انصاف کے ایوانوں میں تو وسائل نہ ہونے کے باعث کسی مظلوم عام آدمی کی رسائی ہی نہیں ہو پاتی۔ کورٹ فیس اور وکیل کی تمام لوازمات سمیت فیس کے علاوہ کیس کو فکس کرانے کیلئے متعلقہ عدالتی اہلکار کی مٹھی گرم کرنے کے ایسے کٹھن مراحل ہیں جو کوئی غریب آدمی حصول انصاف کیلئے طے کرنے کا یارا ہی نہیں رکھتا۔ باوسیلہ مراعات یافتہ اشرافیہ اور حکمران طبقات کیلئے انصاف اسی لئے ان کی جیب کی گھڑی بن جاتا ہے کہ مہنگے وکیل سے لوئر عدالتی سٹاف کے ساتھ ساز باز تک کے سارے مراحل طے کرنے میں انہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ حضور! عدلیہ نے تو اپنے روبروز زیر سماعت کسی مقدمے کا متعلقہ قانون، آئین، دستیاب حقائق وشواہد کی بنیاد پر اور کیس کے میرٹ کے مطابق ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے اس کیلئے یقیناً بااختیار اور باوسیلہ طبقات کے پاس بے وسیلہ عام آدمی کی نسبت زیادہ مواقع ہوتے ہیں جن کے مہنگے وکیل کیس کا میرٹ بھی بنا لیتے ہیں، مضبوط ایف آئی آر بھی کٹوا لیتے ہیں اور اپنے مؤقف کے حق میں ثبوت اور شواہد بھی اکٹھے کر لیتے ہیں۔ عام آدمی تو ایسی سہولت کا تصور بھی نہیں کر سکتا جن کیلئے پہلے تو عدالت تک رسائی حاصل کرنا ہی محال ہوتا ہے، اگر کسی وسیلے سے رسائی ممکن ہو جائے تو دوسرے لوازمات پورے کرتے کرتے وہ ویسے ہی نڈھال ہو جاتا ہے۔ سو جناب! یہ دہرے قانون کا نہیں، قانون کی عملداری کا سوال ہے۔ قانون تو سب کیلئے ایک ہی ہوتا ہے۔ ڈنڈی صرف قانون کی عملداری پر ماری جاتی ہے۔ اس لئے سب کیلئے ایک ہی قانون اور ایک ہی انصاف کا تقاضا عدلیہ سے نہیں، عدلیہ کو فراہمی

انصاف کے لوازمات فراہم کرنے کے ذمہ داروں سے کیا جانا چاہئے۔ پھر آپ کا سوال تو خود آپ ہی سے بنتا ہے۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر جسٹس آصف سعید کھوسہ نے اس حوالے سے وزیراعظم عمران خان کے جوشیلے خطاب کے جواب میں جو ردعمل ظاہر کیا' اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے معاملات کا جائزہ لے لیجئے۔ آپ کو یکساں قانون اور یکساں انصاف کے سوال کا ہی نہیں' اور بھی بہت سے دوسرے سوالوں کا جواب دینا پڑے گا۔ حضور! زندگی کے کس شعبے میں عام آدمی کی شنوائی اور پذیرائی ہوتی ہے۔ آئین پاکستان نے تو ریاست کے ہر شہری کی مساوی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ ہر شہری کو صحت' تعلیم' روزگار اور انصاف کی بلا روک ٹوک اور بلا امتیاز فراہمی' ریاست کی ذمہ داری گردانا ہے۔ پھر خدا لگتی کہئے' ریاست اپنی یہ ذمہ داری عام آدمی کیلئے کب اور کہاں تک نبھاتی ہے۔ ظاہر ہے ریاست کوئی جاندار چیز تو نہیں۔ اس کے نام پر حکومت وقت نے ہی اپنی انتظامی مشینری کے ذریعے شہریوں کی سہولتوں کیلئے ریاستی ذمہ داری نبھانی ہوتی ہے۔ اس تناظر میں شہریوں کیلئے انصاف کی فراہمی صرف عدلیہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ ہر ریاستی آئینی اور قانونی ادارے نے ملک کے تمام شہریوں کو انصاف کے یکساں مواقع فراہم کرنا ہوتے ہیں اور انصاف صرف کسی فوجداری' کمرشل اور سول مقدمے سے متعلق نہیں ہوتا۔ شہریوں کے بنیادی آئینی حقوق کے تحت روزگار دینا بھی عوام کے ساتھ انصاف ہے۔ صحت کی سہولتیں بھی بلا ردوکد فراہم کرنا شہریوں کے ساتھ انصاف کے زمرے میں آتا ہے۔ امن و آشتی والا فلاحی معاشرہ فراہم کرنا بھی جناب قانون و انصاف کی عملداری ہی کا حصہ ہے۔ ملک کی ترقی و استحکام اور عوام کی خوشحالی کی بنیاد مضبوط بنانا بھی شہریوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے نبھانے کے ہی مترادف ہے۔

پھر آپ ادارہ جاتی کارکردگی کا جائزہ لے لیجئے۔ پبلک ڈیلنگ میں عدلیہ کے علاوہ محکمہ پولیس' محکمہ تعلیم' محکمہ مالیات (ایف بی آر)' محکمہ صحت غرض کسی بھی محکمے میں بے وسیلہ عام آدمی کی میرٹ پر شنوائی ہو رہی ہے؟ کہاں ہر شہری کی عزت نفس کی پاسداری کی جاتی ہے' کہاں شرف انسانیت کے تقاضے نبھائے جاتے ہیں اور کہاں کسی شہری کا جائز کام بھی بغیر کسی رکاوٹ کے خوش دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہوتا نظر آتا ہے۔ ان محکموں میں اپنے کسی بھی معاملہ میں شہریوں کو منیر نیازی کے اس شعر کا ہی سامنا کرنا پڑتا ہے کہ.....

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

درحقیقت کاہلی، بدنیتی، خیانت اور رشوت خوری ہمارے کلچر کا حصہ بن چکی ہے۔ آپ اس میں سے صرف ایک عنصر رشوت خوری کو لیکر طوفان اٹھانے چل پڑیں اور دوسری معاشرتی قباحتیں دور کرنے کی جانب توجہ ہی نہ دیں تو ریاست مدینہ کا خواب کیسے شرمندہ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ریاست مدینہ میں تو شرف انسانیت کو فوقیت حاصل ہے۔ ہمارے معاشرے میں بالخصوص حکومتی سطح پر کس نے کس حد تک شرف انسانیت کے تقاضے پورے کئے ہیں؟ اوروں کو نصیحت، خود میاں فصیحت کی مثال بن کر سسٹم اور معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھانا زبانی جمع خرچ کی حد تک اور مخالفین پر سیاسی پوائنٹ سکورنگ کیلئے تو کارگر ہو سکتا ہے مگر یہ محض نعرے ہی رہتے ہیں۔ اس سے راندۂ درگاہ عوام کی عزت، عافیت اور آسودگی کا کوئی معاملہ نہیں بن سکتا۔

بدقسمتی ہے ہم آج ایسے ہی معاشرے میں زندہ ہیں اور زندہ درگور ہیں۔ ابھی آپ جائزہ لیجئے کہ میاں نواز شریف کی خرابی صحت کی بنیاد پر انہیں بیرون ملک علاج معالجہ کی حکومتی اور عدالتی سہولت ملنے پر سیاسی دکانداری چمکاتے ہوئے کس طرح امیر اور غریب کیلئے الگ الگ قانون کا پراپیگنڈا کیا گیا اور پھر اس فرق کا بالواسطہ عدلیہ پر ملبہ ڈالتے ہوئے وزیراعظم عمران خان نے موجودہ اور آنے والے فاضل چیف جسٹس سپریم کورٹ کو باور کرا دیا کہ وہ عوام میں عدلیہ کا اعتماد بحال کریں۔ حضور! عوام نے جن معاملات میں آپ پر اعتماد کا اظہار کیا اور 2018ء کے انتخابات میں آپ کو حکمرانی کا مینڈیٹ دیا، آپ خود بھی تو ان معاملات پر عوام کا اعتماد بحال کریں۔ عوام تو اپنے غربت، مہنگائی، روٹی روزگار کے مسائل کے فوری حل کیلئے، جو آپ کے بقول سابق حکمرانوں نے اپنی بے بہا کرپشنوں کے باعث عوام پر مسلط کئے ہیں، آپ پر اعتماد کرتے کرتے پچھاوے ہو گئے ہیں۔ مایوس اور مضطرب ہوئے بیٹھے ہیں اور انہیں آپ کی ٹیم کی جانب سے امید کی کوئی کرن دکھانے کے بجائے مایوسیوں کے دلدل کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔ پھر اس سے بڑی ناانصافی عام عوام کے ساتھ بھلا کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ان کے روزگار اور کاروبار بھی چھن گئے ہیں اور اس معاملہ میں انہیں مستقبل میں اپنے لئے کسی اچھے کی امید بھی نظر نہیں آ رہی۔ آپ اشرفیہ طبقے میں سے کسی ایک کو بیرون ملک علاج معالجہ کیلئے باہر جانے کی اجازت دیکر انہیں ملنے

والی عدالتی سہولت پر امیر اور غریب کیلئے الگ الگ قانون کا رونا روتے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہے ہیں اور عام عوام کی زندگی کے دوسرے معاملات میں ان کے ساتھ کی جانے والی بے انصافی کا نوٹس لینا آپ ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ جناب آج گفتار و کردار میں یکسانیت پیدا کرنے اور ملک کے ہر شہری کو محض زبانی کلامی نہیں، عملی طور پر ہر شعبۂ زندگی میں آسودگی کے یکساں مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے ورنہ تو بس ریا کاری ہی ریا کاری ہے۔عوام ایسی سیاست کاری سے پہلے ہی عاجز آئے ہوئے ہیں۔ مزید عاجز ہو نگے تو صرف عدالتی نہیں، پورے سماجی، ریاستی اور حکومتی ڈھانچے سے لاتعلق ہو جائیں گے۔ خدارا عام عوام کو کیڑے مکوڑے سمجھنے کی روش ترک کردیں اور شرف انسانیت کو مقدم رکھیں ورنہ ہم زندہ معاشرے میں محض قبروں کے مجاور بن کر رہ جائیں گے۔

''بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے''

سیاسی اصطبل میں ''گھوڑوں'' کی خرید وفروخت کا سلسلہ تو غیر منقسم ہندوستان کے وقت سے ہی جاری ہے جس کے توڑ کے لیے فلور کراسنگ کے سدباب والا قانون اور پارٹی صدر کو ودیعت کیا گیا آئینی اختیار بھی کارگر نہیں ہوسکا۔ بس آنکھ کی شرم فروخت ہونے والے گھوڑوں کو سرعام بے نقاب ہونے سے بچانے کے لئے کام آتی رہی ہے۔ ابھی چند ماہ قبل ہی چیئرمین سینیٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو ناکام بنانے کے لئے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے سیاسی اصطبل سے ہانکے گئے گھوڑوں کی پردہ پوشی ہوئی اور ان جماعتوں کی قیادتوں کی جانب سے ان ''گھوڑوں'' کے خلاف انضباطی کارروائی کے بلند بانگ اعلانات بھی آنکھ کی شرم کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے، مگر اب سپیکر پنجاب اسمبلی چودھری پرویز الٰہی نے تو بھانڈہ ہی پھوڑ دیا ہے اور یہ بھانڈہ بھی انہوں نے بیچ چوراہے میں پھوڑا ہے۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں جہاں انہوں نے مولانا فضل الرحمان کے اسلام آباد دھرنے کو ختم کرانے والی ''حکمتِ عملی'' کو ملفوف انداز میں اجاگر کیا اور کمٹمنٹ والی ''امانت'' کا تذکرہ کر کے سارے معاملات سود و زیاں بھی کھول دیئے، وہیں انہوں نے حکمران تحریک انصاف کی 2010ء میں ہونے والی پرورش کی بھی اعلانیہ ساری پرتیں کھول دیں۔ کیسے مسلم لیگ (ق) کے لوگ جستیں بھرتے ہوئے تحریک انصاف کی جانب لڑھکے اور کس طرح چودھری صاحبان کی بھی عمران خاں سے ملاقات کے لئے گراؤنڈ بنانے کی بات کی گئی، اس کے بعد تو آنکھوں کی شرم میں لپٹے سارے معاملات سود و زیاں آشکارا ہونے کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ حائل ہی نہیں رہی۔ چودھری پرویز الٰہی نے یہ راز کسی بھولپن میں منکشف کئے ہیں یا سوچ سمجھ کر گگلی کرائی ہے۔ ان کا ذہن میں آگے کا کوئی نقشہ تو بہر طور موجود ہوگا مگر ان کی گگلی نے کئی بھرم توڑ دیئے ہیں۔ اب مولانا فضل الرحمان کی طرح دفاعی پوزیشن پر آ کر کوئی

چودھری پرویز الٰہی کے بیان کردہ حقائق کی تردید کرے تو یہ الگ بات ہے مگر اب اصطبل فروشی میں درپردہ طے پانے والے معاملات کو زبان ضرور لگ گئی ہے اور آئندہ سوچ سمجھ کر ہی عالی دماغ کنگز پارٹی کی بنیاد رکھ کر اس کی پرورش کیا کریں گے۔

ویسے تو سپریم کورٹ میں دائر کردہ اصغر خاں مرحوم کا کیس بھی ایسے معاملات بھی عاقبت بچانے اور سنوارنے کے لئے کارآمد ہو سکتا تھا مگر اس کیس کی بھی محض صدائے بازگشت ہی سنائی دیتی ہے۔ فہم و فراست والوں نے اس کیس سے بھی سبق نہیں سیکھا تو اب چودھری پرویز الٰہی کے انکشافات سے تو ''چٹے ننگے'' چور پڑنے کے امکانات ہی بڑھیں گے۔ ہمارے سیاستدانوں کی موجودہ تقریباً ساری کھیپ 80ء کی دہائی سے اب تک کے اصطبل فروشی اور کنگز پارٹیوں کی تشکیل کے منصوبہ سازوں سے فیض پاتے ہی مقبول و توانا ہوئی ہے۔ اصولوں کی پاسداری کرنے والے سیاسی حلقوں کو آج بھی اس امر کا پچھتاوا ہے کہ جنرل ضیاء کی مزاحمت کرنے والی ایم آر ڈی ان کے اعلان کردہ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ نہ کرتی تو سیاست کاری میں سیاسی بونوں کے قلانچیں بھرنے کا کبھی موقع نہ بن پاتا۔ آج کے سارے قدآور سیاستدان ایم آر ڈی کے اس بائیکاٹ کی مہربانی سے انتخابی سیاست میں کود کر اور مہربانوں کے مہرے بن کر قبولیت عامہ کی منزلوں سے ہمکنار ہوئے تھے۔ اندازہ لگا لیجئے، اگر ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں پیپلز پارٹی، تحریک استقلال، اے این پی، پی این پی، مسلم لیگ (خیرالدین گروپ) جمہوری وطن پارٹی کے تمام قائدین 85ء کے انتخابات میں موجود ہوتے تو ان غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے بھی جنرل ضیاء الحق کو اپنی مطلق العنانیت مضبوط بنانے کا موقع نہ مل سکتا۔ اگر وہ غیر جماعتی انتخابات میں اپنی من مرضی کے تحت کٹھ پتلیوں کو بھی اسمبلی میں لا کر ان کے ہاتھوں زچ ہو گئے تھے تو ایم آر ڈی کی مرکزی قیادتیں اس اسمبلی میں بیٹھی ہوتیں تو انہیں عملاً تگنی کا ناچ نچا دیتیں۔

ان قیادتوں کو بائیکاٹ والے پچھتاوے نے تو ضرور کچوکے لگانے کا اہتمام کئے رکھا مگر ضیاء آمریت کی کوکھ سے نکلنے والی جمہوریت کو اصطبل فروشی کے ذریعے راندۂ درگاہ بنانے میں انہوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس ناطے سے چھانگا مانگا اور بھوربن والی اصطبل فروشی تو آج ضرب المثل بن چکی ہے۔ سیاسی محاذوں میں در آنے والی اسی کمزوری کو بعدازاں مہربانوں کی جانب سے کنگز پارٹی کی تشکیل کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کی کوکھ سے پیپلز

پارٹی پیٹریاٹ، پیپلز پارٹی شیر پاؤ گروپ، پیپلز پارٹی زیڈ اے بھٹو اور پیپلز پارٹی (شہید بھٹو) کو نکالنے کے لیے راستے بہت آسانی کے ساتھ ہموار ہوتے رہے۔ ان میں صرف مرتضیٰ بھٹو فیم پیپلز پارٹی (شہید بھٹو) مہربانوں کی جانب سے ڈوریاں ہلے بغیر معرض وجود میں آئی تھی جبکہ پیٹریاٹ راؤ سکندر اقبال کے خالصتاً جنرل مشرف کے کلاس فیلو ہونے کی برکت سے پھلدار درخت بنی تھی۔، مخدوم فیصل صالح حیات سے کھوج لگا کر اس کے مقاصد و منابع تک پہنچا جا سکتا ہے۔ پھر پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کا تو سود و زیاں والا معاملہ ہی کچھ اور رہا ہے۔ کنونشن مسلم لیگ ایوب خاں کی مہربانی سے محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے پر اُتاری گئی، پھر پگارا لیگ، فنکشنل لیگ بھٹو اور ضیاء آمریت کو زچ کرنے والی اپوزیشن کا خم ٹھونکنے کے لیے دستیاب رہی۔ کونسل مسلم لیگ پہلے خواجہ خیر الدین گروپ کے قالب میں ڈھلی پھر یہ قاسم لیگ ہوگئی اور پھر اس قاسم لیگ کے بھی مختلف دھڑے، بچہ پارٹیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ 85ء کے غیر جماعتی انتخابات میں جنرل ضیاء الحق کی ''بصیرت'' کے تحت مسلم لیگ جونیجو گروپ بنی جس نے اسلامی جمہوری اتحاد کی بنیاد رکھ کر بے نظیر بھٹو کو زچ کرنے کا بیڑہ اُٹھایا اور پھر مسلم لیگ (ن) کے قالب میں ڈھل گئی اور پھر مشرف آمریت نے نون کے اندر سے قاف کی شاخ نکال کر مسلم لیگ (ق) کیلئے حکمرانی کی راہ ہموار کر دی۔

یہی سارے معاملات سود و زیاں تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خاں مرحوم نے سپریم کورٹ میں دائر کی گئی اپنی آئینی درخواست میں اجاگر کئے تھے جس کے فیصلہ کی ان کی زندگی میں نوبت ہی نہ آسکی، اگر ان ادوار والی اقتدار کی غلام گردشوں کا جائزہ لیا جائے تو ہماری سیاست کاری میں متبرک و مقدس چہروں کے بے نقاب ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوسکتی۔ بس چودھری پرویز الٰہی جیسے حوصلے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے 2010ء والے معاملات سود و زیاں کا انکشاف کر کے درحقیقت اس شعر کو عملی قالب میں ڈھالا ہے کہ......

اس شہر میں ہر شخص کا ایمان بکا ہے
قیمت مجھے معلوم ہے، تم نام بتاؤ

کیا یہ چودھری صاحب کی محض معصومیت کا معاملہ ہے؟ جی نہیں حضور۔ یہ ایک نپی تلی حکمت عملی کے اجراء کا آغاز ہے اور ''بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے''

چھپن چھپائی کا سفا کانہ کھیل

محسوس یہی ہورہا ہے کہ نواز شریف کے معاملہ میں متعلقین آپس میں چھپن چھپائی کا کھیل کھیل رہے ہیں مگر یاد رکھئے کہ اس کھیل کے نتیجہ میں نواز شریف کی جان چلی گئی تو یہ تہمت ہمیشہ کے لئے ایک منتخب حکومت کے گلے پڑ جائے گی۔ بھٹو مرحوم کے عدالتی قتل کا داغ تو ایک جرنیلی آمر پر لگا تھا جنہوں نے یہ کہہ کر جنرل ضیاء الحق کو رحم کی اپیل بھجوانے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے بہتر ہے میں ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں قتل ہو کر تاریخ میں امر ہو جاؤں۔ ذوالفقار علی بھٹو کا عدالتی قتل اسی تناظر میں آج بھی ضرب المثل بن کر گونج رہا ہے۔ اگر اب ایسی تہمت ایک منتخب حکومت کے سر لگ گئی تو کیا جرنیلی اور کیا سول حکمرانی، سب کچھ ہی بے اعتبارہ ہو جائے گا۔ وزیر اعظم عمران خاں کے حکومتی حلیف مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے اسی فکر مندی کی بنیاد پر انہیں باور کرایا ہے کہ وہ اپنے ماتھے پر ایسا ٹیکہ نہ لگنے دیں جسے دھونا مشکل ہو جائے، وہ ان ہاتھوں میں نہ کھیلیں جو انہیں تباہ کر دیں اس لئے نواز شریف کے ملک سے باہر جانے کے حوالے سے جو طوفان کھڑا ہوا ہے، وزیر اعظم کو اسے قابو کرنا ہوگا اور۔ اندازہ لگائیے کہ یہ بات وہ آدمی کر رہا ہے جس نے نواز شریف کے ساتھ مخالفانہ سیاست میں کسی سمجھوتے کی سوچ اپنے دل میں پیدا ہی نہیں ہونے دی اور چودھری پرویز الٰہی کو پنجاب کی وزارت اعلیٰ دینے کی مسلم لیگ (ن) کی قیادت کی پیشکش ٹھکرا کر اقتدار کے کھیل میں عمران خاں کا دم بھرا۔ آج وہ اسی نواز شریف کی خرابی صحت کی بنیاد پر اپنی حلیف حکومتی پارٹی کی قیادت کو باور کرا رہے ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کچھ لوگ مینگنیاں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حضور۔ نواز شریف کی فیملی اور پارٹی تو نواز شریف کی صحت پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے، آپ کے پروانوں کے بقول سیاست کر رہی ہو گی مگر آپ کے حکومتی حلیف بھی نواز شریف کی صحت پر فکر مند ہیں تو تھوڑا سا اپنی انا سے باہر نکل کر بھی سوچ لیں۔ آپ کے پارٹی رکن

معروف قانون دان سید علی ظفر آپ کو جھنجوڑ رہے ہیں کہ نواز شریف کو سات ارب روپے کا بانڈ بھر کر چار ہفتے کے لئے ملک سے باہر جانے کی اجازت دینے کا کابینہ کمیٹی کا فیصلہ قانون کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا، اگر یہ عدلیہ میں چیلنج ہوا تو اس کے مسترد ہونے کا قوی امکان ہے اور پھر اپنی حلیف ایم کیو ایم کے سینیٹر محمد علی سیف کی بھی سن لیجئے، وہ آپ کو باور کرا رہے ہیں کہ یہ فیصلہ قانونی نہیں، سیاسی ہے جسے کوئی منطقی دماغ قبول نہیں کر رہا۔ معروف قانون دان عابد حسن منٹو کی بھی یہی رائے ہے کہ حکومت کا یہ سارا عمل سیاسی ہے اور کیا آپ نے اپنے شروع دن کے ساتھی اور قانون دان حلقوں کی معتبر شخصیت حامد خاں کی اس بات پر غور کیا ہے کہ کسی مجرم کو اس کی خرابیٔ صحت کی بنیاد پر علاج کے لئے ملک سے باہر بھجوانے کی شرائط بہر صورت نرم ہونی چاہئیں۔ صرف یہی نہیں فوجداری قوانین کے ماہر حلقے تو فتویٰ دینے کے انداز میں یہ مؤقف سامنے لا رہے ہیں کہ انڈیمنٹی بانڈز کی فوجداری قانون میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ایسے بانڈ سول مقدمات میں بھرے جاتے ہیں جبکہ نواز شریف تو سراسر فوجداری قانون کی ذیل میں آنے والے جرم میں سزا یافتہ ہوئے ہیں۔

خدا لگتی کہئے، کمانڈو صدر پرویز مشرف سے کون سے بانڈز بھروا کر انہیں علاج معالجہ کے لئے ملک سے باہر جانے کی اجازت دی گئی تھی جبکہ وہ قانون اور عدلیہ کو چکمہ دے کر ابھی تک ملک سے باہر بیٹھے ہیں۔ یہ طرفہ تماشہ ہے کہ اسی مشرف کے وکیل بیرسٹر فروغ نسیم نے کابینہ کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے نواز شریف کی ملک سے باہر جانے کی مشروط اجازت کا فیصلہ سناتے ہوئے میڈیا کے روبرو ازخود یہ وضاحت کر دی کہ ان سے مشرف کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھا جائے۔ پھر انہوں نے یہ بھی ازخود وضاحت کرنا ضروری سمجھا کہ مجرم اور ملزم میں فرق ہوتا ہے جن پر قانون کا یکساں اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مشرف کو تو ملک سے باہر جاتے وقت تک کسی کیس میں سزا نہیں ہوئی تھی۔ حضور والا۔ آپ کے اس استدلال کو نواز شریف ہی کے ایک سابق کیس میں کہاں پر منطبق کیا جائے۔ جب مشرف آمریت میں وہ ان کا طیارہ اغوا کرنے کے کیس میں عمر قید کی سزا پا چکے تھے مگر انہیں سزا یافتہ ہونے کے باوجود بغیر کسی قسم کا بانڈ بھروائے جیل سے نکالا گیا اور ان کے خاندان سمیت انہیں ایک طیارے میں ڈال کر سعودی عرب بھجوایا گیا۔ آج تو معاملہ اور بھی سنگین ہے۔ خود وزیر اعظم عمران خان وفاقی کابینہ کے اجلاس میں ڈاکٹروں کی رپورٹوں کی بنیاد پر کہہ چکے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ نواز شریف کی صحت اتنی زیادہ خراب ہے اور وزیر خارجہ شاہ

محمود قریشی نے تو یہ تک کہہ دیا کہ ہمیں تو نواز شریف کی نیت پر کوئی شبہ نہیں، وہ علاج معالجہ کیلئے ملک سے باہر جانے کے بعد یقیناً واپس آئیں گے۔ پھر جناب انہیں ملک سے باہر جانے کیلئے سات ارب روپے کا بانڈ بھرنے کی شرط لگانا انسانی ہمدردی کا اظہار ہے یا خالص سیاست ہے؟

کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ نواز شریف کی جان بچانے کیلئے سات ارب روپے کی کیا وقعت ہے‘ وہ سیاست کو خیر باد کہیں‘ بانڈ بھریں اور علاج کرانے لندن روانہ ہو جائیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ حکمرانوں کی جانب سے سیاست بھی یہی کی جا رہی ہے کہ کسی کی موت و حیات کے اس کھیل میں ان کا شملہ اونچا ہی رہے۔ پھر اِدھر سیاست ہو گی تو اُدھر سیاست کیوں نہیں ہو گی۔ اگر بھٹو نے جرنیلی آمر کو معافی نامہ لکھ کر دینے کے بجائے تاریخ میں امر ہونے کا راستہ اختیار کیا تھا تو نواز شریف نے بھی بانڈ بھرنے سے انکار کر کے آج یہی راستہ اختیار کیا ہے۔ ظاہر ہے وہ بانڈ نہیں بھریں گے تو ملک سے باہر نہیں جا سکیں گے اور اسی کشمکش میں جان سے گزر جائیں گے تو حضور والا ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ اس کا ملبہ کس پر گرے گا۔ یہی ملبہ گرنے سے خود کو بچانے کیلئے تو عدلیہ اور نیب نے بھی یہ کہہ کر گیند حکومت کی جانب واپس اچھال دی ہے کہ کسی کا نام ای سی ایل سے نکالنا وفاقی حکومات کا صوابدیدی اختیار ہے۔ اور اس کھیل میں اصل مشکل حکومت ہی کو درپیش ہے جس نے اپنی انا پر کوئی زد نہ پڑنے دینے کی خاطر نواز شریف کا نام ای سی ایل سے نکالے بغیر انہیں سات ارب روپے کے بانڈز کے عوض چار ہفتے کیلئے ملک سے باہر جانے کی اجازت دی۔ اس فیصلے کے پیچھے یقیناً یہی فلسفہ کارفرما ہو گا کہ نواز شریف بانڈ بھرنے سے انکار کریں گے اور دوبارہ عدلیہ سے رجوع کرنے کا راستہ اختیار کریں گے، جو نواز شریف کی جانب سے اختیار کر بھی لیا گیا ہے تو عدالت سے انہیں ریلیف ملنے کی صورت میں حکومت‘ انہیں ملک سے باہر بھجوانے کے معاملے سے بری الذمہ ہو جائے گی۔

حضور اس سفاکانہ سیاست سے رجوع کر کے درگزر کے اس راستے پر آ جائیں جو آپ کے حلیف چودھری شجاعت حسین آپ کو دکھا اور سجھا رہے ہیں۔ نواز شریف اپنی موجودہ خرابیٔ صحت پر فوری طور پر ملک سے باہر نہیں جا پائیں گے تو جان سے گزرنے کی صورت میں بھٹو ہی کی طرح تاریخ میں امر ہو جائیں گے۔ پھر کیا منتخب سول حکمرانی یہ ملبہ اٹھانے کی متحمل ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں اپنے وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ سے ضرور مشاورت کر لیجئے۔ کہیں تدبیریں الٹی ہی نہ پڑ جائیں۔ اب ”الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا“ والی حکمت عملی کارگر نہیں ہو پائے گی۔

یوم اقبال اور کرتار پور راہداری

چلیں میں تصور کر لیتا ہوں کہ جب کرتار پور راہداری کے وزیر اعظم عمران خاں کے ہاتھوں افتتاح کے لئے 9- نومبر کی تاریخ طے کی گئی، اس وقت حکومتی اکابرین کے ذہن میں نہیں آیا ہوگا کہ 9- نومبر تو مصور پاکستان علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا یوم پیدائش ہے اور یہ دن یوم اقبال کے طور پر منایا جاتا ہے جس کا آغاز مزار اقبال پر گارڈ کی تبدیلی کی رسم کی ادائیگی اور ملک کی سلامتی، ترقی اور استحکام کی خصوصی دعاؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ حکومتی سطح پر بھی یہ دن عقیدت واحترام کے ساتھ منانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور بالعموم وزیر اعظم پاکستان یوم اقبال کی کسی تقریب کی صدارت کرتے ہیں۔ اس ملک خداداد کی تشکیل کے حوالے سے اقبال کی خدمات کی اہمیت کا اندازہ بانی پاکستان حضرت قائداعظم کے ان ارشادات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جن کے ذریعے انہوں نے علامہ اقبال کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ تحریک پاکستان میں مسلمانوں کی مملکت کے لئے اقبال کے وضع کئے گئے اصولوں پر ہی کاربند رہیں گے۔ یہی اقبال تھے جنہوں نے ترک وطن کر کے مستقل طور پر برطانیہ میں سکونت اختیار کرنے والے بیرسٹر محمد علی جناح کو خط لکھ کر ملک واپس آنے اور مسلمانوں کے الگ خطہ کے لئے تحریک شروع کرنے پر قائل اور آمادہ کیا اور پھر اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ وہ قائداعظم کے ہاتھوں اپنی خواہش کے مطابق برصغیر کے مسلمانوں کے لئے مملکتِ خداداد تشکیل پاتے تو نہ دیکھ سکے مگر اس مملکت کا وجود خطبۂ الٰہ آباد میں مسلمانوں کے الگ خطہ کے لئے وضع کئے گئے ان کے زریں اصولوں کی بنیاد پر ہی عمل میں آیا جس میں دو قومی نظریے کا تصور بھی صراحت کے ساتھ موجود تھا۔ اسی تناظر میں اقبال کا شمار بانیانِ پاکستان اور قومی مشاہیر میں ہوتا ہے جبکہ ان کی بطور قومی شاعر بھی اپنی الگ پہچان ہے اور مسلمانوں کی غیرت وحمیت کو جگانے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ

کے احیاء کا درس دینے والی ان کی شاعری کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔

بے شک بانیان پاکستان اور قومی مشاہیر کے جوش و جذبے کے ساتھ دن منانا اور ان کی عزت وتوقیر پر کوئی حرف نہ آنے دینا ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔ اگر صدر مملکت اور وزیراعظم سے لے کر ارکان پارلیمنٹ تک اپنے مناصب کا حلف اٹھاتے ہوئے قیام پاکستان کا باعث بننے والے اسلامی نظریہ کی مکمل پاسداری کا عہد کرتے ہیں تو اس نظریہ کی بنیاد پر مسلمانوں کی الگ مملکت کا تصور پیش کرنے والے اسلامیان ہند کے قائد علامہ اقبال کی عزت وتوقیر میں کوئی حرف نہ آنے دینا بھی ارباب اقتدار سمیت ملک کے ہر شہری کی ذمہ داری ہے۔ یوم اقبال منا کر درحقیقت اسی عزم کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ان کے قومی لیڈر والے تشخص میں کوئی کمی نہیں آنے دی جائے گی۔

میں نے تو اپنے تئیں یہ تصور کرلیا کہ کرتار پور راہداری کے افتتاح کے لئے 9- نومبر کی تاریخ طے کرتے وقت حکومتی اکابرین کے ذہن سے یوم اقبال کی 9- نومبر کی تاریخ محو ہوگئی ہوگی مگر محض میرے تصور کرنے سے کیا ہوسکتا ہے۔ کرتار پور راہداری کے لئے 9- نومبر کی تاریخ کے تعین پر سوشل میڈیا حیرتوں کے اظہار میں ڈوبا نظر آیا، تو کیا یہ بھی تصور کرلیا جائے کہ اس بارے میں سوشل میڈیا پر کئے جانے والے تحفظات کے اظہار سے بھی حکومتی اکابرین لاعلم رہے۔ پی ٹی آئی کا سوشل میڈیا کا نیٹ ورک تو ویسے ہی بہت متحرک ہے اور ہر حکومتی اقدام کے دفاع اور اپوزیشن کو بے نقط سنانے میں پیش پیش ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ 9- نومبر کو کرتار پور راہداری کے افتتاح کے حوالے سے سوشل میڈیا پر جاری تنقید حکومتی سوشل میڈیا کی ٹیم کی آنکھوں سے اوجھل رہی ہو۔ اگر اس تنقید سے دانستہ طور پر صرفِ نظر کیا جاتا رہا ہے اور وزیراعظم عمران خاں کل 9- نومبر کو یوم اقبال ہی کے موقع پر نارووال جا کر کرتار پور راہداری کا افتتاح کررہے ہیں تو راز ونیاز کے کچھ معاملات ضرور ایسے ہیں جنہوں نے 9- نومبر ہی کو کرتار پور راہداری کا افتتاح ہمارے حکومتی اکابرین کی مجبوری بنایا ہے۔ ان میں ایک معاملہ تو یقیناً بابا گورونانک کے جنم دن کے موقع پر سکھ کمیونٹی کو اس سہولت کے ذریعے خوش کرنے کا ہے مگر جناب۔ کیا ہمیں اپنے قومی مشاہرین کے ایام کو نظرانداز کر کے دوسروں کے دینی پیشواؤں کے پیروکاروں کی عزت افزائی کرنی چاہئے۔ اگر اس پر ہمارا ضمیر مطمئن ہو جائے تو بھلے اپنے ایجنڈے پر کاربند رہیئے مگر تحریک

پاکستان اور تشکیل پاکستان کے مراحل میں اس ارض وطن کے لیے ہجرت کرنے اور اپنی جانوں اور عصمتوں کی قربانیاں دینے والے مسلم خاندانوں کے ذہنوں میں موجود تلخیاں کچوکے مار کر جگانے کا اہتمام کرنے سے بہرصورت گریز کیجئے۔

میں نے اپنے گزشتہ کالم میں ان تلخیوں کا تذکرہ کیا تو مجھ تک پہنچنے والی ''چاک دامنوں'' کی کراہوں نے میرا سکون بھی چھین لیا، جبکہ اسلامیان پاکستان کے ذہنوں میں موجود ایک اور تلخی بھی عود کر آئی کہ پی ٹی آئی کی قیادت نے اقتدار میں آنے کے بعد 18 فیصد جی ایس ٹی لگا کر ان کے لئے تو فریضۂ حج وعمرہ کی ادائیگی مزید مہنگی اور مزید مشکل بنادی ہے مگر سکھوں کو کرتارپور میں اپنے مذہبی پیشوا بابا گورونانک کے دربار کی زیارت کے لئے پاسپورٹ، ویزہ اور شناختی کارڈ کے بغیر آنے کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ انہیں فری انٹری کی بھی سہولت دے دی گئی ہے۔ یہ تو بین المذاہب ہم آہنگی کی اچھوتی مثال ہے جناب جس میں ملک کی سلامتی کے تقاضوں کا بھی احساس نہیں کیا گیا اور مکار دشمن ملک سے سکھوں ہی نہیں، ہندوؤں سمیت تمام مذاہب کے لوگوں کے لئے کرتارپور راہداری کے ذریعے پاکستان آنے کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔

یہ تو ہمارے دشمن ملک کا معاملہ ہے جس کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلقات کے حوالے سے ہمیں ہر پل محتاط رہنے کی ضرورت ہے مگر کیا کوئی دوست ملک بھی کسی دوسرے ملک کے شہریوں کی اپنے ملک میں پاسپورٹ اور ویزہ فری انٹری کا متحمل ہوسکتا ہے؟ برادر سعودی عرب کے لئے حج اور عمرہ قومی ریونیو بڑھانے کا بہترین ذریعہ ہے جبکہ اس فریضے کی ادائیگی کے لئے صرف مسلم کمیونٹی کے لوگوں کو ہی سعودی عرب آنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اگر سعودی حکومت انہیں پاسپورٹ اور ویزہ فری انٹری کی سہولت دے دے تو اس کا قومی خزانہ لبالب بھر جائے مگر کیا سعودی عرب اپنے مسلمان بھائیوں کی بھی پاسپورٹ اور ویزہ فری انٹری کا متحمل ہوسکتا ہے؟ پھر ہمیں ایسی کیا مجبوری آن پڑی ہے کہ ہم اپنے دشمن ملک کے غیر مسلم شہریوں کو بھی اپنے ملک آنے کی کھلی چھوٹ دیئے جارہے ہیں۔ جناب! آج ہمیں ملکی سلامتی کے تقاضوں اور قومی مفادات کی پاسداری کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہم اس تقاضے سے ہٹیں گے تو کہیں کے نہیں رہیں گے۔

کرتار پور راہداری والی سرشاری

کہنے کوتو ہم کرتار پور راہداری کو پاکستان بھارت سازگار تعلقات کے لئے اہم پیش رفت قرار دے سکتے ہیں۔ بھارتی سکھ کمیونٹی کے لئے تو اس راہداری کا کھلنا سرشاری کا مقام ہے، ایک بھارتی فنکار، کھلاڑی اور مودی مخالف سیاستدان نوجوت سنگھ سدھو نے کرتار پور راہداری کھلوانے کے لئے اکیلے ہی ہماری حکومتی سیاسی اور عسکری قیادتوں سے اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دلا دیا۔ مگر بھائی صاحب اس راہداری کے معاملہ میں آگے کی جتنی بھی پیش رفت ہے وہ ہمارے حکومتی اکابرین کے ذہن رسا ہی کا کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان ہجرت کرنے والے بھارتی مسلمانوں کے سفاکانہ قتل عام اور ان کی عفت مآب خواتین کو ہزاروں کی تعداد میں اغواء کر کے ان کی عزتیں تار تار کرنے اور انہیں مذہب تبدیل کرا کے اپنے گھروں کی زینت بنانے والی ساری تلخیاں فراموش کر کے اور اس سے بھی بڑھ کر پاکستان کی سلامتی کے خلاف مودی سرکار کی اعلانیہ اور ننگی سازشیں دیکھتے ہوئے بھی سرانجام دیا گیا ہے۔ ابھی آج ہی میڈیا پر اس بھارتی سازش کے چرچے ہوئے ہیں جس کے تحت مقبوضہ کشمیر کو ہڑپ کرنے کے بعد آزاد کشمیر کے تین اضلاع اور گلگت بلتستان کے تین علاقوں کو بھی بھارتی نقشے میں بھارت کا حصہ قرار دے دیا ہے۔

اگر بھارت دیدہ دلیری کی انتہاء کو پہنچتے ہوئے مظفر آباد، میر پور، پونچھ اور گلگت وزارت، چلاس اور پاکستان کے قبائلی علاقے کو بھی مقبوضہ وادی سے الگ کئے گئے لداخ میں شامل کر رہا ہے جس کے لیے وہ یقیناً آگے چل کر پاکستان پر جنگ مسلط کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا تو جناب ہمیں اپنی سلامتی اور خودمختاری کی فکر کرنی چاہئے یا اس نازک موقع کرتار پور راہداری کے ذریعے سکھوں ہی نہیں، ہندوؤں سمیت ہر مذہب کے بھارتی باشندوں کو بلا روک ٹوک پاکستان آنے کی کھلی چھوٹ دے کر مودی سرکاری کی منشاء کے مطابق آزاد کشمیر اور ملک کے قبائلی علاقے بھی پلیٹ میں رکھ کر اس کے حوالے کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ کرتار پور راہداری کھولنے کا جو

معاہدہ پاکستان اور بھارت کے مابین گزشتہ ماہ 24 اکتوبر کو طے پایا اس میں روزانہ کی بنیاد پر پانچ ہزار یاتریوں کے پاکستان میں داخل ہونے کے لیے ویزہ کی شرط تو ختم کردی گئی مگر ہر یاتری کے لیے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ ہمراہ لانا لازمی قرار دیا گیا اور بھارت کو بھی پابند کیا گیا کہ وہ پاکستان آنے والے یاتریوں کی فہرست دس روز قبل پاکستان کو فراہم کرے گا تاکہ ان یاتریوں کی ضروری جانچ پڑتال ہو سکے۔ اسی طرح ہر یاتری کی انٹری فیس 20 ڈالر مقرر کی گئی اور اسی حوالے سے اس مد میں پاکستان کا ریونیو بڑھانے اور اس راہداری کے ذریعے سیاحت و تجارت کو فروغ دینے کا کریڈٹ اپنے کھاتے میں ڈالا گیا۔

اس حکمت و تدبر کو کیا کہا جائے کہ کرتار پور راہداری کھولنے کا فیصلہ تو صرف سکھوں کو ان کے روحانی پیشوا بابا گورو نانک کے گردوارہ کی زیارت کے لیے آنے کی سہولت فراہم کرنے کی خاطر کیا گیا مگر راہداری کھولنے کے معاہدے میں سکھوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی اس راہداری کے ذریعے پاکستان میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی اور اب بھارت کے لیے سرشاری کا اگلا قدم اٹھاتے ہوئے یاتریوں کی 20 ڈالر کی انٹری فیس بھی ختم کردی گئی ہے، ان کے لیے پاسپورٹ ساتھ لانے کی شرط بھی واپس لے لی گئی ہے اور تصدیقی مراحل والی دس روز قبل یاتریوں کی فہرست فراہم کرنے کی شرط سے بھی رجوع کرلیا گیا ہے۔ یہ اعلان کسی اور نے نہیں، ہمارے وزیراعظم عمران خاں نے خود اسی گلگت میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کیا جسے مودی سرکار بھارتی نقشے میں شامل کرکے اس پر اپنا حق جتا رہی ہے۔ ابھی 9 نومبر کو کرتار پور راہداری کے افتتاح کی تقریب میں نہ جانے اور کون کون سے سرشاری والے مناظر دکھائے جائیں گے۔

جناب یہ سرشاری تو ہمیں لے ڈوبے گی، آپ ذرا تصور کیجیے کہ جو بھارت پہلے ہی یہاں اپنا دہشت گردی کا نیٹ ورک پھیلا کر سی پیک سمیت ہمارے ہر قومی ترقیاتی منصوبے کو دہشت گردی کے ذریعے سبوتاژ کرنے کی سفاکانہ منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا اور پھر دہشت گردی کا ملبہ بھی ہم پر ڈالے جا رہا ہے وہ اب کرتار پور راہداری والی کھلی چھوٹ ملنے کے بعد ہماری سرزمین پر دہشت گردی کے کیا کیا گل نہیں کھلائے گا کیونکہ اب تو ویزہ فری اور پاسپورٹ فری انٹری کی سہولت اور وہ بھی ''مفتو مفت'' ملنے کے بعد اس کے لیے یاتریوں کے بھیس میں اپنے سفاک دہشت گرد اور جاسوس پاکستان میں داخل کرنے کی مکمل سہولت موجود

ہے۔ کیا ہم مودی سرکار سے یہ توقع رکھیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ایسی ہی خیر سگالی کا مظاہرہ کرے گا اور ہماری سلامتی وخودمختاری کا پورا پورا احترام کرے گا۔ جناب یہ وہ سانپ ہے جسے جتنا مرضی دودھ پلاتے رہو، اس نے ڈسنے کی علت سے باز نہیں آنا۔ پھر ذرا قوم کو بھی سمجھا دیجئے کہ دشمن کے لیے ایسی سرشاری والا اصل ایجنڈہ کیا ہے۔ یہاں ایک طبقہ امرتا پریتم کی حسرتوں کو اجاگر کرنے والی ''واہگے والی لکیر'' مٹانے کے درپے رہا ہے جسے ہندو بنیئے کے خلاف چلائی گئی تحریک پاکستان اور پھر اس تحریک کی بنیاد پر ''مہابھارت'' کی کوکھ سے نکال کر تشکیل دی گئی مملکت خداداد پاکستان سے خدا واسطے کا بیر ہے اور اس کے لیے وہ اپنے خبثِ باطن کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ آج اگر بھولپن میں یا کسی منصوبے کے تحت کرتار پور راہداری سے ہر نوع کے بھارتی باشندوں کو بلا پاسپورٹ، بغیر ویزہ اور بلا روک ٹوک پاکستان میں داخل ہونے کی اجازت مل رہی ہے تو اس سے کہیں واہگے والی لکیر مٹانے کا پاکستان دشمنوں کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوئی تدبیر تو نہیں نکالی جا رہی؟ پاکستان آنے والے جن مہاجروں کے خون سے یہ لکیر کھینچی گئی ہے ذرا ان کے سامنے ایسی کسی سازش کا اشارہ بھی کر کے دیکھئے۔ آپ کو بخوبی سمجھ آ جائے گی کہ اپنے عزیزوں، پیاروں کی جانوں اور عصمتوں کی قربانیاں دے کر مسلمانوں کے لیے الگ خطے کا بانیان پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے والوں کے دل میں اس ملک خداداد کی کتنی قدر ہے اور وہ اس کی حفاظت کا کیا جذبہ اور کیسا عزم رکھتے ہیں۔ مجھے ایک تقریب کبھی نہیں بھولتی جو پاکستان بھارت سازگار تعلقات کی کوششوں کے حوالے سے لاہور کے ایک ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ اس میں ایک لبرل مقرر نے واہگے کی لکیر مٹانے کی ترغیب دی تو سٹیج پر موجود سابق جج لاہور ہائیکورٹ ملک سعید حسن عملاً دھاڑتے ہوئے ان پر برس پڑے اور باور کرایا کہ آپ میرے سامنے یہ بات کر رہے ہیں جس نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں سمیت اپنے پورے خاندان کی اس لکیر کی خاطر قربانی دی ہوئی ہے۔ ان کی اس دھاڑ کے بعد تقریب کے منتظمین کو مجبوراً تقریب سمیٹنا پڑی۔ یقیناً ایسی تلخیاں آج بھی تشکیل پاکستان میں اپنی جانوں اور عصمتوں کی قربانیاں دینے والے خاندانوں کی نئی نسل تک میں موجود ہیں اس لیے انہیں بھولے سے بھی چھیڑنے کا رسک مت لیجئے اور ''پاکستان کوئی سَوکھا بنیا'' کے زیر عنوان لکھی گئی ہمارے پنجابی شاعر ظہور حسین ظہور کی نظم کا مطالعہ کر لیجئے۔ مکار دشمن کے ساتھ سرشاری کی سوچ پر آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

دہشتگردی کی اصل تشریح اور حکمرانوں کی منشاء

انسداد دہشت گردی ایکٹ حکمرانوں کے لئے امرت دھارا بنا رہا ہے۔ کسی سیاسی مخالف کو ''کینڈے'' میں رکھنا ہو یا مزہ چکھانا ہو تو اس کی کسی تقریر کو بنیاد بنا کر انسداد دہشت گردی ایکٹ کی کسی شق کے تحت اس کے خلاف دہشت گردی کے جرم کا مقدمہ درج کرا دیا جاتا ہے۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے سیاسی مخالف چودھری ظہور الٰہی سے انتقام لینے کے لئے ان کے خلاف بھینس چوری کا مقدمہ درج کرا دیا تھا۔ غالباً اس وقت انسداد دہشت گردی ایکٹ موجود نہیں تھا ورنہ چودھری ظہور الٰہی خوفناک دہشت گرد بھی قرار پاتے۔ یہ ایکٹ ضیاء الحق کی جرنیلی آمریت کے دوران معرضِ عمل میں آیا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو سمیت طیارہ ہائی جیکنگ کے ملزمان انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت ہی گردن زدنی ٹھہرائے گئے تھے۔ اس قانون کا مقصد بنیادی طور پر اپنے مخالفین پر اپنے اقتدار کی دھاک بٹھانا اور کسی کو پر مارنے کی بھی اجازت نہ دینا تھا اور جرنیلی آمروں نے یہ قانون اسی مقصد کے تحت استعمال کیا جس میں اپنی سہولت کے تحت وقتاً فوقتاً ترامیم بھی کی جاتی رہیں۔ جرنیلی آمر پرویز مشرف نے تو اہل صحافت کو بھی انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت ''دھر گڑا'' دینے کی پالیسی طے کر لی اور اس ایکٹ میں ایک نئی شق شامل کر کے حکومت مخالف تحریر و تقریر کو دہشت گردی کے ارتکاب والا جرم بنا دیا۔ صحافی تنظیموں نے اس پر سخت احتجاج کیا جس کے باعث کسی صحافی کے خلاف متذکرہ شق کے تحت مقدمہ کے اندراج سے تو گریز کیا گیا مگر یہ شق بدستور ایکٹ میں شامل رہی۔ صرف یہی نہیں، ملکی، قومی اور ریاستی مفادات کی بھی غلط توجیح کرتے ہوئے سیاسی مخالفین کو انسداد دہشت گردی ایکٹ کا رگڑا دیا جاتا رہا ہے۔ کسی پر یہ الزام اور تہمت لگانا تو بہت ہی آسان ہے کہ اس کا فلاں اقدام ملکی سلامتی کے تقاضوں اور قومی مفادات کے منافی ہے۔ ایسی تہمت کے تحت کسی کو ملک دشمن قرار دینا بھی بہت آسان ہوتا ہے چنانچہ ہماری سیاسی تاریخ ایسے ''ملک دشمنوں'' سے بھری پڑی ہے۔

آ ئین کی دفعہ 19 کے تحت شہریوں کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے جو پریس کی آزادی پر بھی منطبق ہوتی ہے تاہم اسے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے تحفظ، دفاع پاکستان، بیرونی ریاستوں کے ساتھ تعلقات، شائستگی اور اخلاقیات اور عدالتی تقدس و احترام کے تابع کیا گیا ہے اور اسی سے حکمران طبقات اپنی من مرضی کی تشریح کر کے میڈیا اور اظہار رائے کی آزادی کا گلا گھونٹنے کی سہولت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح حکمران طبقات کو بعض دوسرے مروجہ قوانین کو بھی موم کی ناک بنا کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی سہولت مل جاتی ہے۔ کسی قانون کو وضع کرنے کی نہ جانے قانون سازوں کی کیا منشاء ہوتی ہے مگر کسی قانون کو اپنی منشاء کے مطابق استعمال کرنا حکمران طبقات کا خاصہ ہے۔ بے شک سپریم کورٹ آ ئین اور قانون کی کسی شق کی تشریح کرنے کا مجاز فورم ہے مگر اس کے لئے کوئی عدالتِ عظمیٰ سے رجوع کرے گا تو ہی فاضل عدالت اپنی یہ ذمہ داری نبھائے گی۔ بالعموم لوگ ایسے معاملات سے یا تو نابلد ہوتے ہیں یا کسی قانون کی تشریح کے لئے عدالتِ عظمیٰ سے رجوع کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ چنانچہ قانون کی اصل منشاء سے ہٹ کر کسی قانون کو بروئے کار لانے کی بے شمار نظیریں ہماری قانونی کتب میں مل سکتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ انسداد دہشت گردی ایکٹ کے غلط اور ناجائز استعمال کی مثالیں موجود ہوں گی۔

آج تو پیمرا ایکٹ میں بھی ایسے ایسے نادر اور اچھوتے تجربات کئے جا رہے ہیں کہ ایسے قوانین وضع کرنے والوں کی سوچ پر ہنسی آتی ہے۔ پچھلے دنوں پیمرا کے جاری کردہ ایک آرڈر کا بہت چرچا ہوا جس کے تحت ٹی وی اینکروں پر بعض اچھوتی پابندیاں عائد کی گئیں اور میڈیا مالکان کو اس آرڈر کی تعمیل کا پابند کیا گیا۔ اس پر حکومت کی اپنی صفوں میں سے اضطراب کی لہریں اُٹھتی ہوئی نظر آ ئیں اور قائمہ کمیٹی برائے خزانہ کے چیئرمین اسد عمر کے علاوہ وفاقی وزراء چودھری فواد حسین اور ڈاکٹر شیریں مزاری تک نے پیمرا کا متعلقہ آرڈر نکالنے والوں کی عقل پر ماتم کیا۔ شنید ہے کہ وفاقی کابینہ کے گزشتہ اجلاس میں ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان نے وزیراعظم عمران خاں کے روبرو ان وزراء کی خوب شکایت لگائی۔ حضور! اگر آ ئین و قانون کی متعلقہ شقوں کی اصل منشاء کے مطابق آ ئین و قانون کی عملداری کے اقدامات اٹھائے جائیں تو ''گھر جا کے شکایت لاواں گی'' کے کسی منظر نامہ کی نوبت ہی نہ آئے۔ پھر شرف انسانیت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور انسانوں کی توقیر بھی کوئی معنی رکھتی ہے۔ آپ بازو کو الٹا گھما کر کان کو پکڑنے کی کوشش کریں گے تو

یہ منظر آپ کے لئے ٹھٹھہ مذاق کی نوبت لاسکتا ہے۔اس لئے کسی بھی قانون کواس کی روح کے مطابق استعمال کریں اور جہاں قانون کا مفہوم سمجھ میں نہ پڑ رہا ہوتو اس کی تشریح کے لئے مجاز فورم سپریم کورٹ سے رجوع کرنے میں ہرگز شرم محسوس نہ کریں۔

ایسا ہی ایک معاملہ سپریم کورٹ کو دہشت گردی کی تعریف کا درپیش آیا جس پر چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر جسٹس آصف سعید کھوسہ کی سربراہی میں عدالت عظمٰی کے بنچ نے گزشتہ روز مفصل فیصلہ صادر کیا ہے اور دوٹوک الفاظ میں قرار دیا ہے کہ ذاتی دشمنی یا عناد کے سبب کسی کی جان لینا، گھر جلا دینا، بھتہ خوری اور ذاتی عناد پر مذہبی منافرت پھیلانا دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتا البتہ سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سکیورٹی فورسز پر حملہ کرنا، منصوبے کے تحت مذہبی فرقہ واریت پھیلانا اور کاروباری برادری، عوام، سوشل سیکٹر اور صحافیوں پر حملے کرنا صریحاً دہشت گردی ہے۔

فاضل چیف جسٹس کے تحریر کردہ ساٹھ صفحات پر مشتمل اس فیصلے میں جن جرائم کو دہشت گردی کے جرم سے باہر نکالا گیا ہے ان سب کو انسداد دہشت گردی ایکٹ میں دہشت گردی والا جرم ہی گردانا گیا ہے اس لئے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان جرائم کے مرتکب کتنے افراد اب تک دہشت گردی کے سنگین جرم کے مرتکب ٹھہرا کر ''کیفر کردار'' کو پہنچائے جا چکے ہوں گے اور کتنے مجرمان کیفر کردار کو پہنچائے جانے کے منتظر ہوں گے۔

آج اس معاملہ پر بات کرنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اب بھی فضا اختلاف رائے کے اظہار کو روکنے اور سیاسی مخالفین کو کسی نہ کسی طرح کیفر کردار کو پہنچانے کے اقدامات اٹھانے کی راہ ہموار کی جارہی ہے جس کے لئے انسداد دہشت گردی ایکٹ ہمیشہ امرت دھارا کا کردار ادا کرتا ہے۔اب سپریم کورٹ کی جانب سے دہشت گردی کے جرم کی تشریح کے بعد ممکن ہے ''امرت دھارے'' کا استعمال کچھ دیر کے لئے مؤخر ہو جائے مگر خدا لگتی کہیئے۔تکریم انسانیت کی پاسداری کرنے والے کسی معاشرے میں کسی کو عبرت کا نشان بنانے کے لئے باز و الٹا گھما کر کان پکڑنے کی ایکسر سائز کرنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے۔کیا ہم سیدھے سبھاؤ انسانوں والے کام نہیں کر سکتے؟۔بھئی کسی کو دوش نہ دو، اپنے معاملات ہی ٹھیک کر لو تو شرف انسانیت والے معاشرے کی وہ تصویر بن جائے گی جس کا عوام کو اب تک محض لالی پاپ دیا جارہا ہے۔

لاک ڈاؤن نہیں' آنکھ کی شرم کا اہتمام کریں

مجھے ڈاکٹر طاہر القادری کے 2012ء کے دھرنے کا ایک منظر بہت بھلا محسوس ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کینیڈا سے واپس آ کر انقلاب کا نعرہ لگایا، پوری گھن گرج کے ساتھ اس وقت کی پیپلز پارٹی کی حکومت کو چیلنج کیا اور اس کا ''پھلکا'' اُڑانے کیلئے لانگ مارچ کی صورت میں لاہور سے اسلام آباد کا رخت سفر باندھا۔ بالآخران کا پڑاؤ ڈی چوک اسلام آباد میں ہوا جہاں انواع و اقسام سے مزین ان کا کنٹینر پہلے ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ حکومت نے انکے اس دھرنے میں کسی قسم کا رخنہ نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا چنانچہ وہ عوامی تحریک اور تحریک منہاج القرآن کے کارکنوں کے جلو میں حکومت کو نو نقد سناتے ہوئے خوب چوکڑیاں بھرتے رہے۔ اس وقت بھی اشارہ کبھی کبھی اسٹیبلشمنٹ کی جانب ہو جاتا تھا مگر ان کی جانب سے بھی سسٹم کو چلانا مقصود تھا اس لیے علامہ صاحب کو دال گلتی نظر نہ آئی البتہ کینیڈا سے کشید کر کے لائے گئے اپنے انقلاب کی لاج رکھنے کی خاطر دھرنا برقرار رکھنا انہوں نے اپنی مجبوری بنا لیا جبکہ حکومت نے بھی طے کر لیا کہ ڈاکٹر صاحب کھیل تماشہ جاری رکھیں، ہماری صحت پر بھلا اس کا کیا اثر پڑے گا۔

اسی شغل میلے میں ایک دن وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات قمر الزمان کائرہ پیپلز پارٹی اور اتحادی جماعتوں کے چار پانچ وزراء کا ''لشکر'' لے کر علامہ طاہر القادری کے کنٹینر میں آ دھمکے۔ اس دوران علامہ صاحب اور وفاقی وزراء کے مابین ہونے والے ڈائیلاگ پوری قوم نے ٹی وی چینلز کے ذریعے سُنے اور انکے ممکنہ نتائج کا بھی اپنے تئیں اندازہ لگا لیا۔ حکومتی مذاکراتی ٹیم یقیناً علامہ صاحب کا دل بہلانے کیلئے ہی آئی تھی اس لیے اس کھیل تماشے میں علامہ صاحب جو مطالبہ بھی داغتے اس پر وزراء کی جانب سے سرِ تسلیم خم ہو جاتا۔ پھر ایک تحریری معاہدہ بھی طے پا گیا جس پر فریقین کے دستخط ثبت ہونے کے بعد علامہ صاحب نے اپنا دھرنا ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور پھر کینیڈا واپس چلے گئے، لانگ مارچ اور دھرنے کے اسی تجربے نے بعدازاں 2014ء میں عمران

خاں کو بھی حکومت مخالف احتجاج کا یہ راستہ دکھایا کہ میڈیا کی فعالیت میں یہ "کارخیر" کمپنی کی مشہوری کیلئے بہت سودمند ہوسکتا تھا۔ علامہ طاہر القادری نے بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے حکومت گرانے کے ایک ہی کاز کیلئے اپنے الگ لانگ مارچ اور دھرنے کا اہتمام کیا اور پھر ان دونوں کا پڑاؤ ڈی چوک اسلام آباد میں ایک دوسرے سے متصل مقامات پر ہوا۔ علامہ صاحب نے تو دھرنے کے مقام پر قبریں بھی کھدوالیں اور اس وقت کی مسلم لیگ (ن) کی حکومت کو زچ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسکے برعکس عمران خاں کا دھرنا دن کو ویران ہوتا اور رات کو میلے ٹھیلے میں بدل جاتا۔ علامہ صاحب مستقل طور پر کنٹینر میں ہی موجود رہے مگر عمران خاں دن کا زیادہ حصہ بنی گالہ میں اپنی اقامت گاہ پر گزارتے اور رات کو قائد دھرنا بن جاتے۔ علامہ طاہر القادری کو اس وقت بھی یقیناً کسی اشارے پر دھرنا سمیٹ کر اپنے ملک کینیڈا واپس لوٹنا پڑا مگر عمران خاں ہٹ کے پکے تھے اس لیے انہوں نے دھرنا برقرار رکھا۔ اس دھرنے کے دوران جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ انہوں نے 16-دسمبر 2014ء کو سانحۂ اے پی ایس پشاور کے باعث اپنا دھرنا 126 دن بعد ختم کرنے کا اعلان کیا مگر حکومت مخالف احتجاجی تحریک برقرار رکھی جو بالآخر اسلام آباد کے لاک ڈاؤن تک جا پہنچی۔

یقیناً مسلم لیگ (ن) نے بھی دھرنا سیاست سے عہدہ براء ہونے کیلئے جمہوریت کی عملداری و تسلسل کو پیش نظر رکھا اور پارلیمنٹ میں موجود دوسری جماعتوں بشمول اپوزیشن کو ساتھ ملا کر دھرنوں والوں کو فری ہینڈ دینے کی پالیسی اختیار کی سو جمہوریت امپائر کی انگلی کھڑی ہونے کے "دل خوش کن" اعلانات کے باوجود نہ صرف بچ گئی بلکہ آج تک رواں دواں بھی ہے اور موجودہ حکمران پی ٹی آئی اسی بچائی گئی جمہوریت کے ثمرات سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں کہ وزیراعظم عمران خاں اور ان کی حکومتی پارٹی جمہوریت کو نقصان پہنچانے والا کوئی قدم اُٹھانے کی سوچ رکھتی ہوگی، اس لیے مجھے اس وقت بہت اطمینان ہوا تھا جب وزیراعظم عمران خان نے مولانا فضل الرحمان کے آزادی مارچ اور اسلام آباد میں دھرنا دینے کے اعلان کے بعد پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر انہیں اس دھرنے کیلئے کنٹینر فراہم کرنے اور شرکائے دھرنا کو کھانا فراہم کرنے کا اعلان کیا۔ دھرنے کے کھیل تماشہ سے عہدۂ براہ ء ہونے کیلئے یقیناً ایسی ہی پالیسی کارگر ہوسکتی ہے۔ آخر آنکھ کی کوئی شرم اور حیا بھی ہوتی ہے۔ کوئی مہمان اپنے مہربان میزبان کو آنکھیں نہیں دکھاتا۔ حضرت علامہ ڈاکٹر طاہر القادری نے بھی اپنے دونوں دھرنے سمیٹنے کیلئے آنکھ کی اسی

شرم کی پاسداری کی تھی اور کیا خیال ہے؟ اگر مولانا فضل الرحمان کو بھی وزیر اعظم عمران خاں کے اعلان کیمطابق اسلام آباد میں دھرنے کی سہولت دیکر کنٹینرز اور شرکائے دھرنا کیلئے کھانا فراہم کر دیا جائے تو ان کی آنکھ کی شرم انہیں ہتھ ہولا رکھنے کا سوچنے پر مجبور نہیں کرے گی؟

جناب۔ آپ یہ پالیسی آزما کر تو دیکھتے مگر یہ کس جلد باز کی رائے آپکی سوچ پر غالب آ گئی ہے کہ آزادی مارچ اور دھرنے والوں سے نمٹنے کیلئے آپ نے خود ہی اسلام آباد اور ملک کے صوبائی دارالحکومتوں کو لاک ڈاؤن کرنے کی پالیسی طے کر لی ہے۔ ارے صاحب۔ ذرا سوچئے، اسلام آباد آنے والی ملک کی تمام شاہراہیں آپ کنٹینرز اور خاردار تاریں لگوا کر بند کر رہے ہیں اور پھر اسلام آباد کی دوسری گزرگاہوں کو خندقیں کھود کر بند کرنے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ چاک و چوبند اسلام آباد پولیس نے جڑواں شہروں کے تمام کیٹررز کو ایک گشتی مراسلہ بھجوا کر پابند کر دیا ہے کہ وہ دھرنے والوں کو تنبو، قناتیں، کرسیاں، سٹیج اور پانی تک فراہم نہیں کرینگے۔ یقیناً خوراک کا کاروبار کرنیوالے تاجروں دکانداروں کو بھی اس مراسلے کے تحت پابند کیا گیا ہوگا کہ وہ دھرنے والوں کو کافر اور ملک دشمن سمجھیں اور انہیں کسی بھی قسم کی خوراک ہرگز فراہم نہ کریں۔

میرے لیے تو آج اطمینان کی یہ بات سامنے آئی تھی کہ وزیر اعظم عمران خاں نے مولانا فضل الرحمان کو اسلام آباد ہائیکورٹ کے فیصلہ کی روشنی میں آزادی مارچ کی اجازت دے دی ہے۔ آئین کے تحت صادر ہونے والے اس فیصلے کی بنیاد پر تو آزادی مارچ والوں کو اسلام آباد میں یا کسی بھی دوسرے مقام پر اجتماع کرنے اور بالالفاظ دگر دھرنا دینے سے بھی نہیں روکا جا سکتا تاآنکہ اس اجتماع یا دھرنے سے کسی خلفشار یا خانہ جنگی کی فضا پیدا نہ ہو جائے۔ اگر اسلام آباد پولیس اس وقت بھی آزادی مارچ سے نمٹنے کیلئے شہر میں چھ سو کنٹینرز لگانے کی تیاریاں کر رہی ہے تو اس سے اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی کے آئینی حق اور اسلام آباد ہائیکورٹ کے فیصلہ کی کیسے پاسداری ہو پائے گی اور پھر تھوڑا سا تصور باندھیئے کہ ملک کی سڑکیں کنٹینروں سے بند کرنے اور پورے اسلام آباد کو خندقیں کھود کر محصور کرنے کے عام پبلک اور علاقہ کے مکینوں کی سوچوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ حضور آپ مارچ اور دھرنا سیاست کو کھیل تماشہ ہی سمجھیں اور اسی انداز میں اس سیاست کا توڑ کریں۔ ریاستی جبر والے راستے اختیار کر کے کہیں آپ جمہوریت کو نہ توڑ بیٹھیں، اب کی بار جمہوریت ٹوٹی تو پھر آپ کو دل بہلانے کے لئے کوئی کھلونا دستیاب نہیں ہوگا۔

’’یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا‘‘

ایسی غلطیاں سہواً ہوتی ہیں یا کسی مقصد اور ایجنڈا کے تحت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں یا ایسی غلطیاں کسی اور کی جانب سے متعلقین کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بزور کرائی جاتی ہیں، اس بارے میں بحث شروع کی جائے تو اس گتھی کا سرا کبھی ہاتھ نہیں آئے گا کیونکہ ایسے معاملات سود وزیاں میں مفادات کی کڑیاں ملتے ملتے بہت دور تک جا پہنچتی ہیں، اس لئے بیکار سر پھٹول کے بجائے سیدھا موضوع کی طرف آنا ہی بہتر ہے۔

گزشتہ روز وفاقی کابینہ کے اجلاس میں جس افراتفری میں قادیانیوں کو قومی اقلیتی کمشن میں شامل کرنے کی منظوری دی گئی، جس کے بارے میں اب وفاقی وزیر برائے مذہبی امور نورالحق قادری صاحب نے وضاحت کی ہے کہ وفاقی کابینہ نے اقلیتی کمشن کے ممبران کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس سے مذہبی، سیاسی اور عوامی حلقوں کو حکومت کو بطور خاص اس حوالے سے کڑی تنقید کا نشانہ بنانے کا نادر موقع مل گیا ہے کہ اس وقت جب پوری دنیا کرونا وائرس کی لپیٹ میں ہے اور اس کے باعث پیدا ہونے والے اقتصادی اور مالی بحرانوں اور فاقہ کشی کے خطرات سے نمٹنے کیلئے تمام عالمی قیادتیں فکر مند ہیں اور خود ہماری حکومت کی بھی ان حالات میں اولین ترجیحات کرونا وائرس کے چیلنج میں سرخرو ہونے کی ہیں، اسے آخر ایسی کیا مجبوری لاحق ہوئی کہ اس نے قادیانیوں کے معاملہ کو چھیڑ کر اپنے لئے بیٹھے بٹھائے ’’آ بیل مجھے مار‘‘ والی فضا استوار کر دی۔

اس بارے میں ایک تصور تو یہ ہے جو قرین قیاس بھی ہے کہ ایف اے ٹی ایف کی گرے لسٹ سے پاکستان کا نام نکلوانے کیلئے اس کے رکن ممالک کو پاکستان کا اجلا، سافٹ اور لبرل چہرہ دکھانا مقصود ہے جس کیلئے اقلیتوں بالخصوص قادیانیوں کو مساوی حقوق کا حامل شہری بنا کر دکھانا ہے۔ ایسا عالمی دباؤ ہم پر شاتم رسول کی سزائے موت سے متعلق آئینی شق کے حوالے سے بھی ڈالا

جاتا رہا ہے اور قادیانیوں کے حقوق کے حوالے سے بھی اقوام عالم کی مخصوص لابی جو پاکستان اور اسلام دشمنی میں اپنی خاصیت رکھتی ہے، حکومت پاکستان کو دباؤ میں رکھنے کے مواقع نکالتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ مفروضہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ حکومت کو ایسی لابی کے دباؤ کے تحت پاکستان کا سافٹ امیج اجاگر کرنے کیلئے قادیانیوں کو قومی اقلیتی کمشن میں نمائندگی دینے کی مجبوری لاحق ہوئی ہوگی۔ دوسرا مفروضہ محض سیاست برائے سیاست کے زمرے میں آتا ہے کہ حکومت کی اپنی صفوں میں بھی ایسی لابی موجود ہوسکتی ہے جسے قادیانیوں کو ان کے مذہبی حقوق دلوانے کی جلدی ہوگی۔ ہمیں اس مفروضے سے کوئی سروکار نہیں مگر فکرمندی اس معاملہ پر ضرور ہے کہ جب قادیانی (احمدی اور لاہوری گروپ) خود کو غیر مسلم تسلیم ہی نہیں کرتے اور انہوں نے اس حوالے سے آج تک آئین کی دفعہ 260 شق تین بی کو کبھی تسلیم نہیں کیا، جس کے تحت 7 ستمبر 1974ء کو پیپلز پارٹی کے دور حکومت والی قومی اسمبلی نے 3 ہفتے کے طویل بحث مباحثہ اور قادیانی تنظیم کے اس وقت کے سربراہ مرزا طاہر احمد کا مؤقف سن کر قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کیا تھا ورقادیانیوں کو غیر مسلموں کی فہرست میں شامل کیا تھا تو پھر حکومت کو یکایک قادیانیوں کو قومی اقلیتی کمشن میں نمائندگی دینے کی ضرورت کیوں آن پڑی۔

حکومت کے اس فیصلے کو جس کے بارے میں وزیر مذہبی امور یہ وضاحت کر رہے ہیں کہ ابھی اس معاملہ میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا، اس حوالے سے تو صائب بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس سے قادیانیوں کے غیر مسلم والے آئینی سٹیٹس پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی ہے مگر یہ فیصلہ صائب تبھی ہوسکتا ہے جب قادیانیوں کی قیادت کی جانب سے باضابطہ طور پر آئین کی دفعہ 260(3)B پر صاد کر کے خود کو غیر مسلم اقلیت تسلیم کر لیا جائے اور اس بنیاد پر قومی اقلیتی کمشن میں اپنی نمائندگی کی حکومت پاکستان کو درخواست دی جائے۔ اس حوالے سے بنیادی جھگڑا ہی یہی ہے کہ قادیانی آج بھی خود کو مسلمان ظاہر کر کے مسلمانوں والے ہی مذہبی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں جو آئین کی متعلقہ دفعہ کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ اس ناطے سے وہ خود کو غیر مسلموں کی کیٹگری میں شامل ہی نہیں کرتے اور اس کے برعکس وہ مرزا غلام احمد (ملعون ومردود) پر ایمان نہ لانے والے کو غیر مسلم گردانتے ہیں جن میں پاکستان کی 22 کروڑ کی آبادی میں موجود تمام مسلمان شامل ہیں تو پھر انہیں کسی بھی قسم کی مشاورت کے بغیر قومی اقلیتی کونسل میں نمائندگی دینا ان کے وہی مذہبی حقوق

تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا جس کے وہ خود کو مسلمان ظاہر کر کے داعی ہوتے ہیں۔ان کے ان مذہبی حقوق میں مسلمانوں کی طرز کی مساجد کی تعمیر، مسلمانوں ہی پر فرض ہونے والی نماز پنجگانہ کی ادائیگی اور فریضہ حج کی ادائیگی سمیت وہ تمام مذہبی حقوق شامل ہیں جو صرف مسلمانوں کیلئے مخصوص ہیں جبکہ آئین پاکستان نے قادیانیوں کیلئے مسلمانوں کی عبادات پر پابندی عائد کی ہوئی ہے۔اگر قادیانی آئین کی متعلقہ شق کو تسلیم کر کے خود کو غیر مسلم اقلیت قرار دیتے ہیں تو وہ اپنے لئے مسلمان کا ٹائٹل استعمال کر سکتے ہیں نہ ان کی عبادات اور عبادت گاہوں کو اپنی عبادات اور عبادت گاہیں قرار دے سکتے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک فتنہ ہے جو مرتد کے زمرے میں آتا ہے اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو توڑنے کے لئے ایک گھناؤنی سازش کے تحت کھڑا کیا گیا ہے اس لئے ہمارے عقیدۂ ختم نبوت کی بنیاد پر اس فرقے کا وہی درجہ ہے جو ایک مرتد کا ہوتا ہے چنانچہ ان کے مذہبی حقوق کی بات کی جائے تو اس کے لئے ان کے اصل سٹیٹس کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

اگر اس واضح سوچ کے باوجود حکومت کی سطح پر قادیانیوں کے مذہبی حقوق کی از خود بات کی جائے گی تو یہ سوچ ان کے گلے ہی پڑے گی۔حکومت کی سطح پر ایسی سوچ کے راستے مسلم لیگ (ن) کے سابق دور حکومت میں بھی نکالے جاتے رہے ہیں جب قومی اسمبلی میں اچانک ایک آئینی ترمیمی بل پیش کر کے منظور کرایا گیا جس کے تحت صدر، وزیراعظم اور ارکان پارلیمنٹ کے حلف کی عبارت کے اس حصے میں تبدیلی کر دی گئی جس کے تحت دوٹوک الفاظ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی قرار دیا گیا ہے اور ختم نبوت پر مسلمانوں کے راسخ ایمان کا اظہار کیا گیا ہے۔اس وقت کی حکومت کو بھی اس پر لینے کے دینے پڑ گئے تھے اور وہ حلف نامہ کی عبارت سے متعلق اپنی آئینی ترمیم واپس لینے اور متعلقہ عبارت من وعن بحال کرنے پر مجبور ہو گئی۔اب بجائے اس کے کہ حکومت کرونا وائرس کے چیلنج سے نمٹنے میں ہی کوشاں نظر آئے، اس نے قادیانیوں کو قومی اقلیتی کمشن میں شامل کرنے کی منظوری دے کر خواہ مخواہ ہی اپنے خلاف محاذ کھڑا کر لیا ہے اور حکومتی اتحادی مسلم لیگ (ق) کے قائدین چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی تو خم ٹھونک کر اس ایشو پر حکومتی فیصلہ کی مزاحمت کیلئے میدان میں آ گئے ہیں جن کے بقول وہ حکومت کی طرف سے قادیانیوں کی پذیرائی اور آئین سے کھلواڑ کبھی قبول نہیں کریں گے۔انہوں نے ساتھ ہی ساتھ حکومت کو یہ بھی باور کرا دیا کہ موجودہ حالات میں قادیانیت کا پنڈورا بکس کھولنا

نا قابل فہم ہے۔اس ایشو پر یکا یک تمام مذہبی حلقے بھی مزاحمت پر آمادہ نظر آ رہے ہیں اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور متحدہ تحریک ختم نبوت کے علاوہ حکومتی ہمدرد جید علماء کرام کی جانب سے بھی حکومت کو باور کرایا جارہا ہے کہ قادیانی جب تک خود کو غیر مسلم تسلیم نہیں کرتے انہیں قومی اقلیتی کمشن میں نمائندگی نہیں دی جاسکتی۔اس حوالے سے یقیناً حکمران پی ٹی آئی کو بھی سابق حکمران مسلم لیگ (ن) کی طرح اپنا فیصلہ واپس لینا پڑے گا یا قادیانیوں کی تنظیم کی جانب سے قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کا باضابطہ اعلان کرانا پڑے گا مگر یہ سوال قادیانیوں کی مذموم سرگرمیوں کے تناظر میں اٹھتا ہی رہے گا کہ قادیانیوں کی خواہش کے بغیر حکومت کو انہیں قومی اقلیتی کمشن میں نمائندگی دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ حکومتی دانشمند حلقے یقیناً اس پر سوچ بچار کر رہے ہوں گے۔اگر وہ حکومتی تحریک کے پس منظر سے بھی قوم کو آگاہ کر دیں تو حکمرانوں کا جھنڈہ بلند اور سر بلند ہو جائے گا۔مگر بھائی صاحب! یہ ایسا کیا معمہ ہے جو سمجھنے کا اور سمجھانے کا نہیں ہے۔

کریڈٹ اور دُہائی

اگر تحریک انصاف کے دو سال قبل کے اپوزیشن والے دور میں اسد عمر صاحب کے پیش کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر پاکستان میں پٹرولیم مصنوعات کے آج کے نرخوں کا تعین کیا جائے تو وہ فی لٹر 20، 25 روپے ہی بنیں گے۔ دو سال قبل تک عالمی مارکیٹ میں پٹرولیم مصنوعات کے نرخ 60 ڈالر فی بیرل تک تھے اور اسد عمر صاحب نے پٹرولیم پر عائد ٹیکسوں سمیت سارے اعداد و شمار اکٹھے کر کے دعویٰ کیا تھا کہ عالمی مارکیٹ کے نرخوں کی بنیاد پر پاکستان میں پٹرولیم مصنوعات کے نرخ زیادہ سے زیادہ 40 روپے فی لٹر تک ہونے چاہئیں۔ باقی حکومت سارا منافع کما رہی ہے۔ اس وقت پٹرولیم نرخ 80 روپے فی لٹر سے زیادہ نہیں تھے، آج عالمی مارکیٹ میں پٹرولیم مصنوعات کے نرخ 36.48 ڈالر فی بیرل ہیں جو دو روز قبل 28 ڈالر فی بیرل تھے تو اسد عمر صاحب والا دو سال قبل کا حساب کتاب لگا کر ہمیں پٹرول 20 روپے فی لٹر ہی دستیاب ہونا چاہئے۔

اگر ہم اس موازنے میں نہ بھی پڑیں تو پھر بھی غنیمت ہے کہ آج ہمارے ملک میں پٹرولیم مصنوعات کے نرخ کم ہوتے ہوتے 75 روپے فی لٹر تک آ گئے ہیں۔ وزیراعظم عمران خان کے بقول اس خطے میں پٹرولیم مصنوعات کے سب سے کم نرخ اس وقت پاکستان میں ہیں۔ ویسے تو ان کا یہ دعویٰ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار نہیں۔ اگر کسی کو تقابلی جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہو تو وہ گوگل پر سرچ کر کے خطے کے دوسرے ممالک کے آج کے نرخ معلوم کر سکتا ہے۔ میں نے بھی عالمی مارکیٹ میں پٹرولیم مصنوعات کے آج کے نرخ گوگل پر سرچ کر کے ہی حاصل کئے ہیں۔ اب تو سب کچھ ایک ''کلک'' پر دستیاب ہے، اس لئے کسی کے کسی بھی دعوے کی حقیقت جانی ہو تو یہ چنداں مشکل نہیں۔ مجھے گوگل سرچ سے ہی معلوم ہوا کہ اوپیک باسکٹ میں کروڈ آئل

(خام تیل) کے آج کے نرخ 34.95 ڈالر فی بیرل تھے جبکہ عالمی مارکیٹ میں یہ نرخ 36.48 ڈالر فی بیرل پائے گئے اور پٹرولیم مصنوعات کے ''ٹکے ٹوکری'' سے بھی کم نرخ ہونا ابھی کوئی زیادہ دور کی بات نہیں۔ تین چار ماہ قبل ہی کی بات ہے کہ یہ نرخ کم ہوتے ہوئے منفی ایک سے بھی نیچے چلے گئے اور دلچسپ صورتحال یہ بنی کہ عالمی منڈی میں مفت تیل لینے کیلئے بھی کوئی تیار نہیں تھا۔ اب یہ نرخ 36 ڈالر فی بیرل تک پہنچے ہیں جبکہ اس سال پٹرولیم نرخوں میں دلچسپ اتار چڑھاؤ جاری رہے گا چنانچہ یہ نرخ پھر سے گر کر دس ڈالر فی بیرل تک پہنچنے کا امکان بھی ظاہر کیا جا رہا ہے۔ مجھے یہ وضاحت کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں کہ پٹرولیم مصنوعات کے نرخ ایک دم انحطاط پذیر کیوں ہوئے ہیں کیونکہ عام آدمی کو بھی پتہ ہے کہ کرونا وائرس نے متاثرہ ممالک کی معیشتوں کا بھٹہ بٹھایا ہے اور صنعت و کاروبار کا پہیہ جام کیا ہے تو پٹرولیم مصنوعات کی مانگ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی چنانچہ اس کے نرخوں کا غوطے لگا کر نیچے جانا فطری امر تھا۔

میری اور آپ کی دلچسپی آج اس امر میں زیادہ ہے کہ پٹرولیم منصوعات کے نرخوں میں کمی کا عام آدمی کو کیا فائدہ پہنچا اور اس کے قومی معیشت پر کیا مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اگر عام آدمی اسی طرح مہنگائی کی چکی میں پس رہا ہے۔ غربت و افلاس اور بیروزگاری کے عفریت اسی طرح عام آدمی سے زندہ رہنے کی رمق تک نکال رہے ہیں۔ اور تو اور۔ پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں انتہائی درجہ کی کمی کا براہ راست فائدہ سمیٹنے والے ٹرانسپورٹر حضرات اور محکمہ ریلوے تک نے ٹرانسپورٹ اور ریلوے کے کرائے کم کرنے کیلئے کسی حکومتی حکمنامہ کو درخور اعتناء نہیں سمجھا اور عام مارکیٹوں میں اسی طرح اشیائے خورد و نوش کے نرخ آسمان تک پہنچا کر عوام کو عملاً دونوں ہاتھوں سے لوٹا جا رہا ہے حتیٰ کہ جان بچانے والی ادویات کے نرخ بھی عام آدمی کی پہنچ سے دور ہو چکے ہیں تو حضور والا! پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں کمی کا کریڈٹ لینا چہ معنی دارد؟ بھلے یہ نرخ عالمی مارکیٹ کے نرخوں کی بنیاد پر ہی کم ہوئے ہیں۔ آپ اس کا کریڈٹ لے رہے ہیں تو جناب اس کریڈٹ میں عوام کو حصہ دار بنا کر انہیں بھی تو سکھ کا سانس لینے دیں۔ وہ تو آج بھی حبیب جالب والا یہی رونا رو رہے ہیں کہ......

کہاں بدلے میں دن فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے

ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

اگر آج فی الواقع مہنگائی کا طوفان بدتمیزی اٹھ رہا ہے اور کسی احتساب، قانون کے کسی شکنجے اور حکومت کی کسی اتھارٹی سے بے خوف ہو کر ناجائز منافع خور طبقات نے اپنی مصنوعات کے نرخ شتر بے مہار بڑھانے کی دیدہ دلیری برقرار رکھی ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں سبزیوں، دالوں، چکن، گوشت، گھی، چینی، چاول، گندم، آٹا اور مصالحہ جات کی مہنگائی کنٹرول سے باہر ہوئی نظر آتی ہے اور فاقہ کشی بے بس و مجبور عوام کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے تو وہ ریاست مدینہ والے جدید اسلامی فلاحی مملکت کے تصور کو اپنی ممکنہ آسودہ زندگی کی خاطر کہاں پر اور کہاں تک ڈھونڈتے پھریں گے۔ کیا وہ وزیراعظم کی جانب سے مہنگائی بڑھنے کا نوٹس لینے اور پٹرولیم نرخوں میں کمی کے ثمرات عوام تک نہ پہنچ پانے پر کابینہ کے اجلاس میں انکے ناراضی کا اظہار کرنے کی بنیاد پر ہی شکم سیر ہونے کا تصور باندھ کر خوش اور مطمئن ہو جائیں اور وزیراعلیٰ پنجاب کی اس وارننگ کو ہی اپنی خوشحالی کی بنیاد تصور کر لیں کہ کسی کو آٹا، چینی، گھی اور پولٹری سمیت اشیائے ضروریہ کی قیمتیں نہیں بڑھانے دینگے۔ اگر اس وارننگ کی موجودگی میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے تو حضور والا! مجبور و غریب عوام کو ذرا بتا دیجئے کہ حکومتی گورننس کہاں پر اور کس بھاؤ دستیاب ہے۔ محض باتوں، دعوؤں، وعدوں سے راندۂ درگاہ عوام کو بھلا کیا سروکار ہو سکتا ہے جبکہ ان کیلئے ظلمت شب طویل سے طویل تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور ''بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کیلئے'' والے ماحول کو بھانپ کر ان کے دل مایوسیوں کے دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ حضور! افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر۔ عوام میں مایوسیاں اتنی نہ بڑھائیں کہ وہ زہر کو ہی تریاق سمجھ کر پینا شروع کر دیں۔ سرکشوں اور اتھرے طبقات سے حکومتی رٹ تسلیم کرائیے اور عملیت پسندی کے ساتھ فلاحی ریاست کے خدوخال نمایاں کیجئے ورنہ دعوؤں اور وعدوں کی بیساکھیاں زیادہ دیر تک سہارا نہیں دے پائیں گی کیونکہ......

بُھکھے کولوں بُر کی کھوہ کے کہندے او کہ بولے نہ
جس دا جھگا بھجے آخر اوہ تے رولا پاوے گا

نظریہ ضرورت کو پہلا ڈنٹ

پہلے میرا بھی یہی گمان تھا کہ مسٹر جسٹس ارشاد حسن خان کی سربراہی میں سپریم کورٹ نے سید ظفر علی شاہ کیس کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے نظریہ ضرورت سے بھی آگے کا کوئی معرکہ مارلیا ہے کہ اس میں تو ماورائے آئین اقتدار والے جرنیلی آمر کو بن مانگے آئین میں ترمیم کا اختیار بھی دے دیا گیا ہے مگر میں نے سابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس ارشاد حسن خان کی سوانح عمری ''ارشاد نامہ'' کے اوراق الٹنا شروع کئے تو میرے ذہن میں اس فیصلہ کے حوالے سے موجود سارے تحفظات دور ہوتے چلے گئے اور اس فیصلہ کے معجزاتی ثمرات مجھے صاف دکھائی دینے لگے جس سے یہ حتمی نتیجہ اخذ ہوا کہ یہ فیصلہ نظریہ ضرورت سے آگے کا معرکہ ہرگز نہیں بلکہ اس نے تو عدلیہ کے نظریہ ضرورت کو ریورس گیئر لگا دیا ہے۔ یہ نتیجہ کیسے اخذ ہوا' یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ پہلے میں جسٹس ارشاد حسن خان صاحب کی شخصیت کے حوالے سے اپنے تاثرات سے آپ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مجھے بطور عدالتی رپورٹر بہت سی عدالتی شخصیات کے مشاہدہ کا موقع ملا ہے اور انکے بارے میں میرے تاثرات الگ الگ حوالے سے ہیں۔ لاہور ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے بعض فاضل جج صاحبان سے میری نیازمندی پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور کے 1974ء تا 1976ء کے دور سے شروع ہوئی جب میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہ لاء کالج میں میرے اساتذہ تھے۔ ان میں جسٹس محمد عارف' جسٹس خلیل رمدے' جسٹس خالد رانجھا' جسٹس میاں آفتاب فرخ قابل ذکر ہیں۔ یہ اس وقت ہائیکورٹ میں وکالت کرتے تھے اور پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کی اساتذہ کی ٹیم کا حصہ تھے۔ حامد خان صاحب بھی لاء کالج میں میرے اساتذہ میں ہی شامل ہیں جن کے ساتھ بعدازاں ہائیکورٹ رپورٹر کی حیثیت سے زیادہ تعلق استوار ہوا۔ اپنے لاء کالج کے

اساتذہ کے ساتھ بطور ہائیکورٹ رپورٹر ادب آداب والا تعلق بھی استوار رہا اور بذلہ سنجی والے دوستانہ بے تکلفانہ مراسم بھی قائم ہوئے جو انکے جج کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی برقرار رہے۔ اس کا مجھے ہائیکورٹ کی بیٹ میں فائدہ بھی ہوا کہ ہنسی مذاق میں کئی خصوصی خبریں بھی نکل آتی تھیں۔

ہائیکورٹ کے جج کے منصب پر فائز ہونیوالے بعض وکلاء کے ساتھ میرے اچھے مراسم اپنی عدالتی بیٹ کی سرگرمیوں کے دوران ہی قائم ہوئے، جن میں اٹارنی جنرل اور ایڈووکیٹ جنرل آفس کے لاء افسران (ڈپٹی اٹارنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل، ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل، اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل حضرات) کے ساتھ زیادہ نشستیں ہونے کے باعث زیادہ بے تکلفی رہی۔ یہ حضرات جج کے منصب پر فائز ہوئے تو انکے ساتھ بے تکلفی کی بنیاد پر برادرانہ تعلقات کی نوعیت اور طرح کی بنی۔ خلیل رمدے صاحب ایڈووکیٹ جنرل پنجاب بنے تو نوٹیفکیشن جاری ہوتے ہی انہوں نے اسکی سب سے پہلے مجھے بذریعہ ٹیلی فون بے تکلفانہ اطلاع دی۔ سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ شیخ ریاض احمد ایڈووکیٹ جنرل پنجاب تھے تو انکے ساتھ گہری اور بے تکلفانہ دوستی رہی۔ پی ڈی پی کے چودھری محمد اشرف اس زمانے میں پنجاب بار کونسل کے وائس چیئر مین تھے۔ بار کے اگلی ٹرم کے انتخابات کا شیڈول تیار ہو رہا تھا۔ شیخ ریاض صاحب بطور چیئر مین پنجاب بار کونسل انتخابات کو آگے لے جانا چاہتے تھے، اس پر چودھری اشرف (اشرف لیڈر) انکے ساتھ الجھ پڑے اور وکلاء کے ذریعے انکے گھیراؤ کی کوشش کی تو شیخ ریاض صاحب کسی طرح اپنے آفس سے باہر نکل کر میرے پاس نوائے وقت کے آفس میں آ گئے۔ ابھی انہیں آئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ مجھے نوائے وقت استقبالیہ سے فون آیا کہ چودھری اشرف صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ شیخ ریاض صاحب نے ان کا نام سنا تو کچھ پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ ان سے ہی تو جان چھڑا کر میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ یہ ادھر بھی آ دھمکے۔ انہوں نے مجھے اشرف لیڈر سے آمنا سامنا ہونے اسے بچانے کا کہا تو میں نے انہیں نوائے وقت بلڈنگ کے عقبی دروازے کا راستہ بھا دیا جو شاہراہ قائداعظم پر جا نکلتا تھا۔ انکے جانے کے بعد میں نے چودھری اشرف صاحب کو بلوایا تو وہ آتے ہی کہنے لگے "میرے پاس مصدقہ اطلاع ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب آپ کے پاس آئے ہیں، وہ کدھر گئے۔" میں نے انہیں از راہ تفنن کہا کہ آپ میری جامہ تلاشی لے لیں۔ اس پر

وہ کچھ کھسیانے ہوئے اور کچھ دیر گپ شپ کے بعد واپس چلے گئے۔ یہ تفصیل بتانے کا مقصد صرف ان فاضل دوستوں کے ساتھ بے تکلفانہ مراسم کو اجاگر کرنا تھا جو انکے جج کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی اسی طرح استوار رہے۔ جسٹس خلیل رمدے صاحب بہت سخت گیر جج کے طور پر مشہور تھے۔ اکثر کورٹ روم میں کشیدگی کی فضا طاری رہتی۔ کبھی کبھار کورٹ رپورٹروں پر بھی غصہ اتار لیتے مگر پھر اپنے چیمبر میں بلا کر یار باش ماحول پیدا کر دیتے۔ ایسی کتنے ہی فاضل ججوں کے ساتھ یادیں وابستہ ہیں۔ ان میں سب سے رعب دار شخصیت جسٹس مولوی مشتاق کی تھی جن سے پہلا آمنا سامنا 1977ء میں سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کیخلاف انکی عدالت میں زیر سماعت نواب محمد احمد خان کے مقدمہ قتل کی سماعت کے موقع پر ہوا۔ مولوی مشتاق کی جسامت بھی دیوہیکل تھی اور وہ کورٹ روم میں داخل ہوتے ہی عقابی آنکھوں کے ساتھ کمرۂ عدالت کا جائزہ لیتے تو ایک عجیب سی وحشت پورے ماحول پر طاری ہو جاتی۔ کبھی کبھار تو وہ کسی بات پر اپنے برادر ججوں کو بھی جھاڑ پلا دیا کرتے تھے۔ ایک بار جسٹس ذکی الدین پال بھی اس جھاڑ کی زد میں آئے جو اس کیس کی سماعت کرنیوالے پانچ رکنی بنچ کے سینئر رکن تھے۔

ارشاد حسن خان صاحب بھی اس زمانے میں ڈپٹی اٹارنی جنرل کے منصب پر فائز تھے مگر انکے ساتھ بے تکلفی والی فضا کبھی استوار نہ ہو سکی۔ انکے بارے میں مشہور تھا کہ یہ سیلف میڈ انسان ہیں اور اپنے بیڈن روڈ والے چیمبر سے اپنی قابلیت کے زور اور میرٹ پر وفاقی لاء افسر بنے ہیں۔ ان سے اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے دوران رسمی ملاقاتیں ہی رہیں چنانچہ انکے ہائیکورٹ کے جج کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی حفظ مراتب کی ہی پاسداری رہی۔ بطور جج ان کا تشخص ایک بارعب شخصیت والا ابھرا۔ سائلین تو کجا، وکلاء بھی انکے کورٹ روم میں دبک کر بیٹھتے تھے اور انکے روبرو پیش ہونے کیلئے بہت تیاری کر کے آتے تھے تاکہ انہیں کسی مرحلہ پر فاضل جج کی جھاڑ سے سبکی نہ اٹھانی پڑے۔ انکی عدالت میں ہم کورٹ رپورٹرز بھی بہت چوکنا ہو کر بیٹھتے تھے کہ کہیں رپورٹنگ میں کوئی کوتاہی نہ ہو جائے۔ یقیناً وہ اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہی ہائیکورٹ کے جج کے منصب کے ساتھ وفاقی لاء سیکرٹری کے منصب تک آئے اور پھر سپریم کورٹ کے ایڈہاک جج کی حیثیت سے قائم مقام چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ اور پھر چیف جسٹس سپریم کورٹ کے منصب تک پہنچے جس کے دوران انہیں قائم مقام صدر مملکت کے منصب

پر سرفراز ہونے کا اعزاز بھی ملا جبکہ سپریم کورٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد سید ظفر علی شاہ کیس کے فیصلہ کی روشنی میں ملک میں انتخابات کرانے کے حوالے سے چیف الیکشن کمشنر کیلئے بھی قرعہ فال جسٹس ارشاد حسن خان کے نام ہی نکلا جسے انہوں نے بہت ردوکد کے بعد قبول کیا۔ بے شک یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔ میں انکے بارے میں فاضل چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس گلزار احمد کی اس رائے سے متفق ہوں کہ جسٹس ارشاد حسن خان نے صف اول کا انسان بننے کی مستقل کوششیں جاری رکھیں اور ساتھ ہی زندگی میں آنیوالے معاملات کو عبور کرنے کا ہنر بھی سیکھا اور یہ قابل امر بات ہے کہ اس دوران ہوشیاری اور چکر بازی بھی کی لیکن جس قسم کی ہوشیاری اور چکر بازی کی' بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں۔

اب آتے ہیں سید ظفر علی شاہ کیس کے فیصلہ کے حوالے سے پیدا ہونیوالے فوری تاثر اور اسکے مابعد مثبت اثرات کی جانب۔ ہم اپنی عدالتی تاریخ کا جائزہ لیں تو نظریہ ضرورت کے تحت ماورائے آئین اقدام والوں کے آگے سرنگوں ہونے کی جس بدعت کا جسٹس منیر نے آغاز کیا تھا وہ آگے چل کر مزید پختہ ہوتی ہی نظر آئی۔ یحییٰ خان کے جرنیلی اقتدار کیخلاف عاصمہ جیلانی کے کیس میں فاضل عدلیہ کا فیصلہ ضرور جرأت رندانہ کے زمرے میں آتا ہے جس میں جنرل یحییٰ خان کو غاصب قرار دیا گیا مگر اس جرأت رندانہ کا اظہار فیصلے کی صورت میں اس وقت کیا گیا جب جنرل یحییٰ خان سانحۂ سقوط ڈھاکہ کے بعد اقتدار سے فارغ ہو چکے تھے۔ اسکے بعد جسٹس انوارالحق کی سربراہی میں سپریم کورٹ کی فل کورٹ نے بیگم نصرت بھٹو کے کیس میں جنرل ضیاء الحق کے پانچ جولائی 1977ء کے ماورائے آئین اقدام کو باقاعدہ آداب بجالاتے ہوئے نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دیا اور انکے پی سی او کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ اس سے بادی النظر میں یہی تاثر پختہ ہوا کہ نظریہ ضرورت اور عدلیہ لازم و ملزوم ہو چکی ہے۔ اس تناظر میں جنرل پرویز مشرف کے 12 / اکتوبر 1999ء کے ماورائے آئین اقدام کو مسلم لیگ (ن) کی جانب سے سید ظفر علی شاہ نے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا تو اس جرنیلی اقدام کے آگے بھی کسی کے پر نہ مانے کی فضا ہی برقرار تھی۔ بے شک اس سے پہلے ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں سپریم کورٹ کی فل کورٹ جسٹس سید سجاد علی شاہ کے محض ایک اختلافی نوٹ کے ساتھ صدر غلام اسحاق خان کے آئین کی دفعہ 58۔ٹو بی کے تحت نواز شریف کی حکومت ختم کرنے کے 1993ء کے اقدام کو

غیر قانونی اور کالعدم قرار دے چکی تھی اور یہ فیصلہ فریم کرا کے چیف جسٹس کے کورٹ روم میں آویزاں بھی کر دیا گیا تھا تاہم یہ فیصلہ ایک سول حکمران کے اقدام کیخلاف صادر ہوا تھا۔ پھر بھی اس فیصلہ کی ''ورتھ'' محض ایک ماہ تک ہی قائم رہ سکی اور ماورائے آئین اقدام والوں نے نظریۂ ضرورت ہی کا سہارا لے کر میاں نواز شریف کی بحال کی گئی حکومت پھر انہی کے ہاتھوں ٹوپل کرادی اور نواز شریف کے ساتھ غلام اسحاق خان کو بھی فارغ کر دیا۔ اس طرح نظریہ ضرورت کمزور ہونے کے بجائے مزید پختہ ہو گیا۔ چنانچہ چیف جسٹس ارشاد حسن خان کی سربراہی میں جنرل مشرف کے ماورائے آئین اقدام کیخلاف سپریم کورٹ کی فل کورٹ کے روبرو سید ظفر علی شاہ کی آئینی درخواست کی سماعت کا آغاز ہوا تو فریقین کو نظریۂ ضرورت سے ہٹ کر کسی فیصلے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس کیس کی سماعت کے دوران جو اتار چڑھاؤ ہوتے رہے اور درخواست گزار پارٹی خود مشرف کے 12 اکتوبر کے اقدام کو آئینی تحفظ دینے کی تجویز پیش کر کے آگے کے لائحہ عمل پر زور دیتی رہی' اسکی جزئیات تک ''ارشاد نامہ'' میں آپ کے زیر مطالعہ آئیں گی۔

جب خالد انور اور عدالتی معاون ایس ایم ظفر کے اسی حوالے سے دیئے گئے دلائل کی روشنی میں عدالتِ عظمیٰ نے متفقہ طور پر ملک میں جمہوری عمل کی بحالی کیلئے جنرل پرویز مشرف کو تین سال کی مہلت دینے کا فیصلہ صادر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی قرار دیا کہ وہ اس مقصد کیلئے آئین میں ترمیم کر سکتے ہیں بشرطیکہ آئین کی کوئی شق انکے اس اختیار کی راہ میں حائل نہ ہو۔ اس وقت کئی دوسرے مفکرین اور آئینی و قانونی ماہرین کی طرح میرا بھی فوری تاثر یہی تھا کہ اس سے تو نظریۂ ضرورت کو مزید موٹا تازہ ہونے کا موقع فراہم کر دیا گیا ہے مگر اب ''ارشاد نامہ'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری رائے یکسر بدل گئی ہے اور میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ عدالتِ عظمیٰ کے اس فیصلہ سے تو درحقیقت نظریۂ ضرورت کو بریک لگی ہے۔

نظریۂ ضرورت والی عدلیہ تو پہلے ہر ماورائے آئین اقدام کے آگے سر تسلیم خم کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کرتی رہی ہے جبکہ ظفر علی شاہ کیس کے فیصلہ کے تحت ایک حاضر سروس جرنیلی آمر کو یہ قرار دیکر انکے اقتدار کے تین سال کے اندر قید کر دیا گیا کہ جو ہو چکا سو ہو چکا' اب آپ تین سال کے اندر ملک کو جمہوریت کی پٹڑی پر ڈالیں گے اور خود بیرکوں میں واپس جا کر دفاع وطن کی اپنی اصل مہ داریاں سنبھالیں گے۔ بھلا یکا و تنہاء اقتدار والے جرنیلی آمر مطلق کو انکے اندھے اقتدار کی

موجودگی میں ایسا حکم دینا کوئی آسان کام تھا۔ یہ تو شیر کے منہ سے نوالہ اور جنگل کے بادشاہ کے پنجے سے اس کا شکار چھیننے کے مترادف تھا مگر جسٹس ارشاد حسن خان بے خوف ہو کر یہ کارنامہ سرانجام دے گئے اور اس فیصلہ کی بنیاد پر جنرل مشرف بھی پہلے بلدیاتی انتخابات اور پھر 2002ء کے عام انتخابات کے ذریعے جمہوریت کو واپس ٹریک پر ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

اب آیئے ذرا جرنیلی آمر کو آئین میں ترمیم کا اختیار دینے کی جانب۔ بظاہر تو یہ آمر مطلق کو بن مانگے تحفہ دینے والا منظر نظر آتا ہے مگر اس کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیجئے تو اس فیصلہ کے تحت درحقیقت جرنیلی آمریت والی اس سوچ کی موجودگی میں کہ آئین تو محض چند کاغذوں کی کتاب ہے جسے میں جب چاہوں پھاڑ کر پھینک دوں' ایک کمانڈو جرنیل کو آئین کی تابع فرمانی اور پاسداری کا راستہ دکھایا گیا۔ مشرف نے بھی تو اس وقت آئین کو معلق ہی کر رکھا تھا جبکہ انہیں آئین میں ترمیم کا دانہ ڈال کر درحقیقت آئین کی حکمرانی کا پابند کیا گیا اور انہیں باور کرایا گیا کہ آئین بدستور موجود ہے اور ملک کا برتر قانون ہے جس کے آپ کو تابع رہنا ہے۔ عدالت عظمیٰ کے اس فیصلہ کے پس منظر میں یقیناً یہ سوچ کارفرما ہوگی کہ اس وقت پارلیمنٹ کا تو وجود ہے نہیں اس لئے اگر مشرف کو جمہوریت کی بحالی کے پراسس میں آئین کی کسی شق میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہو تو وہ ذہن میں آئین کو پھاڑ کر پھینکنے والا فتور لائے بغیر آئینی تقاضا پورا کر لیں۔ اس طرح عدالت عظمیٰ نے جسٹس ارشاد حسن خان کی سربراہی میں درحقیقت عدالتی نظریہ ضرورت کو پہلا ڈنٹ ڈالا جس سے تقویت پا کر عدالت عظمیٰ نے 2007ء میں جسٹس افتخار محمد چودھری کیخلاف صدارتی ریفرنس کے فیصلہ کے تحت نہ صرف انہیں چیف جسٹس کے منصب پر بحال کیا بلکہ نظریہ ضرورت سپریم کورٹ کے احاطہ میں دفن کرنے کا اعلان بھی کیا۔ جسٹس خلیل رمدے کی سربراہی میں سپریم کورٹ کی فل کورٹ نے یہ فیصلہ صادر کرتے وقت یقیناً ظفر علی شاہ کیس کے فیصلہ سے ہی رہنمائی لی ہوگی اس لئے یہ فیصلہ جہاں ملک میں جمہوریت کو ٹریک پر رکھنے کی بنیاد بنا ہے وہیں عدلیہ کی نظریہ ضرورت کو دفن کرنیوالی سرخروئی پر بھی منتج ہوا ہے۔ اگر اس حوالے سے کوئی لمحہ فکریہ ہے تو ہمارے ان قومی سیاسی قائدین کیلئے جو جرنیلی آمر مشرف کو مزید دس ٹرموں کیلئے باوردی صدر منتخب کرنے کو بے قرار تھے' یقیناً اس سوچ سے ہی تقویت پا کر مشرف دوسری ٹرم کیلئے بھی وردی سمیت صدر منتخب ہوئے مگر پھر سخت عوامی تحریک کے نتیجہ میں انہیں وردی اتار کر جرنیلی چھڑی اپنے

جانشین جنرل کیانی کے سپرد کرنا پڑی جس کے بعد دانت نکلے اور پنجے کٹے جنگل کے اس شیر کے زمین پر پاؤں جم ہی نہ پائے اور مواخذے کی تحریک کا سامنا کرنے سے پہلے ہی وہ سیاسی بزرجمہروں کے ریڈ کارپٹڈ پروٹوکول کا سہارا لے کر اقتدار کے ایوانوں سے باہر نکل آئے۔ سیاہ و سفید کے اختیارات والے اقتدار سے انکی مراجعت درحقیقت عدلیہ کی سرخروئی ہے جس کا سہرا تاریخ کے اوراق میں بجا طور پر جسٹس ارشاد حسن خان کے سر پر ہی سجا ہوا نظر آئیگا۔ ''ارشاد نامہ'' کا آپ اس سنہرے تصور کے ساتھ مطالعہ کرینگے تو آپ کو روشن جمہوری پاکستان کیلئے تاریخ کے دھارے بدلتے اور درست سمت کی جانب گامزن ہوتے نظر آئینگے۔

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

عاصمہ جہانگیر

اتوار کے روز اپنے سمدھی یٰسین چغتائی ایڈووکیٹ کے بھائی کے چہلم میں شرکت کیلئے راولپنڈی میں تھا چنانچہ وہاں موجودگی تک ٹی وی اور سوشل میڈیا سے دور رہا، چہلم کے بعد سائلنٹ پر لگائے اپنے موبائل فون پر آئے پیغامات دیکھے تو اپنے گرائیں سید منظور علی گیلانی ایڈووکیٹ کے بھجوائے پیغام پر نگاہ جم گئی۔ پیغام میں درج تھا "عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ نے بنیادی انسانی حقوق، عورتوں، مزدوروں، کسانوں، وکلاء، طلبہ، پسے ہوئے طبقات، جمہوریت کی بحالی، آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کیلئے بے مثال جدوجہد کی، ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی"۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایسے پیغامات تو بالعموم تعزیتی پیغامات ہوتے ہیں، ہمارے شاہ جی کو یہ پیغام بھجوانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، دل کو بے چینی سی لگ گئی۔ میں نے یٰسین چغتائی صاحب کو بھی یہ پیغام دکھایا اور پوچھا کہ اس پیغام کا کیا مقصد ہوسکتا ہے جبکہ اس پیغام میں عاصمہ کی زندگی کے حوالے سے کوئی اطلاع بھی موجود نہیں تھی۔ اسی شش و پنج میں گیلانی صاحب کو کال ملائی اور استفسار کیا کہ عاصمہ جہانگیر خیریت سے تو ہیں نا! پیر جی نے پہلے تو میری لاعلمی پر حیرت کا اظہار کیا تاہم جب میں نے انہیں اپنی راولپنڈی موجودگی کا بتایا تو انہوں نے انتہائی افسردہ لہجے میں مجھے عاصمہ جہانگیر کے اچانک انتقال کی تمام تفصیلات بتا دیں۔ دل چاہا کہ دھاڑیں مار کر روؤں مگر پہلے سے ایک افسردہ تقریب میں شریک ہونے کے باعث ضبط کا بندھن ٹوٹنے سے بچائے رکھا مگر یادوں کے ایسے انبار لگے کہ راولپنڈی سے لاہور واپسی تک کا سفر بھی بوجھل نظر آنے لگا۔

میری عاصمہ جہانگیر کے ساتھ نیازمندی کا سلسلہ ان کے والد ملک غلام جیلانی کی وساطت سے 80ء کی دہائی کے آغاز میں شروع ہوا تھا۔ 1977ء میں تحریک استقلال کے

ترجمان روزنامہ ''آزاد'' سے بطور سٹاف رپورٹر وابستگی ہوئی اور اعلیٰ عدلیہ کی کورتج میری بیٹ کا حصّہ بنی۔اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف لاہور ہائیکورٹ کے پانچ رکنی بنچ کے روبرو نواب محمد احمد خان کے مقدمہ قتل کی سماعت کا آغاز ہو چکا تھا۔بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو ہر تاریخ سماعت پر کمرۂ عدالت میں موجود ہوتیں اور وقفے کے دوران ہائیکورٹ بار کے خواتین وکلاء کے لئے مخصوص کمرے میں آجاتیں۔اس کمرے میں کبھی کبھار عاصمہ جہانگیر بھی بھٹو فیملی کے ساتھ شریک گفتگو ہو جاتیں۔ملک غلام جیلانی تحریک استقلال میں شامل تھے چنانچہ پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے دوران تحریک استقلال کے دیگر رہنماؤں کی طرح ان سے بھی رابطہ رہنے لگا اور پھر گلبرگ ان کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء مسلط کیا تو ملک غلام جیلانی تن تنہا پاکستان کا جھنڈا تھامے ضیائی مارشل لاء کے خلاف احتجاج کے لئے مال روڈ پر آ گئے۔ایسے ہی انفرادی احتجاج کے ذریعہ وہ یحیٰی خان کے مارشل لاء کو بھی چیلنج کیا کرتے تھے جس کی پاداش میں وہ جیل میں گئے تو انہوں نے اپنی کمسن صاحبزادی عاصمہ جیلانی کے نام پر ایک آئینی درخواست عدالت عظمیٰ میں داخل کرائی جس میں یحیٰی خان کی جرنیلی آمریت باطل قرار دینے کی استدعا کی گئی۔شومئی قسمت اس کیس کا فیصلہ یحیٰی خان کا اقتدار ختم ہونے کے بعد جاری ہوا اور فاضل عدالت نے یحیٰی خان کو غاصب قرار دیدیا۔عاصمہ جیلانی کا نام پہلی بار اس کیس کے حوالے سے منظر عام پر آیا۔اعلیٰ عدلیہ میں آج بھی جرنیلی آمروں کے خلاف دائر مقدمات میں اسی کیس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔پھر عاصمہ جہانگیر ضیاء کے مارشل لاء کے خلاف 1981ء میں میاں محمود علی قصوری کی اقامت گاہ پر تشکیل پانے والے اپوزیشن اتحاد ایم آر ڈی کی سرگرمیوں میں شمولیت کی بنیاد پر اجاگر ہونا شروع ہوئیں، اسی وقت خواتین کا ایک فورم ویمن ایکشن فورم (ویف) بھی انسانی حقوق کے حوالے سے سرگرم ہوا جس میں نواب مظہر علی خاں کی اہلیہ طاہرہ مظہر علی خاں، مسعود کھدر پوش کی صاحبزادی شیریں مسعود اور عاصمہ جہانگیر اولین صفوں میں نظر آتیں۔ان دنوں جرنیلی آمریت کے خلاف ہر تحریک اور ہر آواز لاہور ہائیکورٹ بار کے پلیٹ فارم سے اٹھا کرتی تھی چنانچہ وکلاء کا پروفیشنل گروپ ملک میں آئین و قانون کی حکمرانی اور انصاف کی عملداری کا عملاً ترجمان بن گیا۔اس گروپ کے مقابل کوئی دوسرا گروپ نہ ٹھہر سکا چنانچہ 1977ء سے 2000ء تک بار کی سیاست پر اس گروپ کا راج رہا۔عاصمہ جہانگیر نے بھی خود کو

اس گروپ کا حصہ بنایا اور ہائیکورٹ بار کے پلیٹ فارم پر جرنیلی آمریت کے خلاف منعقد ہونے والے وکلاء کنونشنوں میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہونے لگیں۔ آل پاکستان وکلاء کنونشن میں علی احمد کرد کے بعد عاصمہ جہانگیر کو سب سے زیادہ داد ملتی۔ ان کنونشنوں کے بعد جرنیلی آمریت کو چیلنج کرنے کیلئے وکلاء ہائیکورٹ بار ہی کی زیر قیادت احتجاج کے لئے مال روڈ پر آجاتے اور اکثر ان کی پولیس لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے شیلوں کے ذریعے دھنائی ہو جاتی۔ ویمن ایکشن فورم بھی ان کے احتجاجی مظاہروں کا حصہ بن جاتا چنانچہ عاصمہ جہانگیر وکلاء برادری کے علاوہ ''ویف'' کی بھی نمائندگی کرتیں۔ ایسے ہی ایک احتجاجی مظاہرے پر ضیاء الحق کے پالتو لوگوں نے ہلہ بول دیا چنانچہ ہائیکورٹ سے ریگل چوک تک ہلہ بولنے والوں اور پولیس نے باہم مل کر مظاہرین کا حشر کر دیا۔ اس مظاہرے میں خواتین کو بچاتے ہوئے حبیب جالب اور سید حیدر فاروق مودودی بھی پولیس تشدد کا نشانہ بنے۔ سب سے زیادہ تشدد بیگم مہناز رفیع اور عاصمہ جہانگیر سمیت ویمن ایکشن فورم کی عہدیدار خواتین پر ہوا۔ عاصمہ جہانگیر کی قائدانہ صلاحیتیں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران اجاگر ہوئیں جو اپنے گھر ایم آر ڈی کے قائدین کی مہمان داری میں اپنے والد ملک غلام جیلانی کی معاون بنی بھی نظر آتیں۔ ایسی ہی ایک تقریب میں نواب اکبر بگٹی بھی موجود تھے جو خود بھی تحریک استقلال میں شامل تھے۔ وہ عاصمہ جہانگیر کی طرف سے کی جانے والی آؤ بھگت سے بہت متاثر ہوئے اور ان میں موجود قائدانہ صلاحیتوں کا بھی دل کھول کر اعتراف کیا۔ ان کی یہی صلاحیتیں تھیں جو انہیں وکلاء کی سیاست میں بھی نمایاں مقام پر لے آئیں۔ پروفیشنل گروپ کے قائد حامد خان نے تحریک انصاف میں شمولیت اختیار کی تو وکلاء کی سیاست میں ان کی غیر جانبدارانہ حیثیت پر حرف آنے لگا جس سے اس گروپ میں بھی کمزوری در آئی اور پھر ان کے مقابل آنے والے لطیف کھوسہ گروپ اور عاصمہ جہانگیر نے اپنا الگ گروپ قائم کر لیا۔ اس کے باوجود پروفیشنل گروپ میں دراڑ نہ ڈالی جا سکی۔ ججز بحالی تحریک میں عاصمہ جہانگیر اپنی انفرادی حیثیت میں اجاگر ہونا شروع ہوئیں اور پھر پروفیشنل گروپ کے مقابل وکلاء کا گروپ ان کے نام کے ساتھ منسوب ہو گیا جس نے لاہور بار، ہائیکورٹ بار اور سپریم کورٹ بار میں انتخابی معرکے مارنا شروع کر دیئے اور پھر وہ خود بھی احمد اویس کے مقابل سپریم کورٹ بار کے صدر کے منصب پر منتخب ہو گئیں۔ آج وکلاء کی سیاست پر اس گروپ کا طوطی بولتا ہے جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ عاصمہ

جہانگیر نے کسی سیاسی جماعت میں شامل ہونے کے بجائے اپنی غیر جانبدارانہ حیثیت برقرار رکھی اور ہمیشہ جمہوریت کی سربلندی اور آئین و قانون کی حکمرانی کا علم اٹھائے رکھا۔ضیاء سے مشرف تک کی جرنیلی آمریت کے خلاف ان کی جدو جہد ایک تاریخ کا درجہ رکھتی ہے جبکہ انہوں نے حکمرانوں کے ہاتھوں انسانی حقوق کی پامالی اور آمرانہ اقدامات پر بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کی سول منتخب حکومتوں کو بھی نہ بخشا اور خالص جمہوریت کی بے باک ترجمان بنی رہیں۔

وہ کئی حوالوں سے متنازعہ بھی بنیں مگر جمہوریت کی عملداری کے لئے ان کی بے لاگ اور بے لوث جدو جہد پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔انہوں نے خود کو پسے ہوئے، محروم طبقات کی وکالت کے لئے وقف کر رکھا تھا اور اسی مقصد کے تحت انہوں نے ہیومن رائٹس کمشن آف پاکستان تشکیل دیا۔مجھے انسانی حقوق کی جدو جہد میں ان کا بے لوث تعاون کبھی نہیں بھول پائے گا۔میں نے سبزہ زار ویلفیئر سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے اس علاقے میں لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن اور ضلعی انتظامیہ کے ایما پر قائم سلاٹر ہاؤس اور کیٹل مارکیٹ کی شہر سے باہر منتقلی کے لئے 1994ء میں رٹ درخواست دائر کی جس کا تقریباً ڈیڑھ سو پیشیوں کے بعد 2006ء میں فیصلہ صادر ہوا۔اس کیس کے دوران ایک مضبوط مافیا میرے خلاف سرگرم عمل رہا جس کے دباؤ پر کئی بار ہمیں عدالت عالیہ میں بھی حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ایک بار جسٹس چودھری اعجاز احمد (مرحوم) نے ان ریمارکس کے ساتھ میری درخواست کی سماعت سے معذرت کر لی کہ سعید آسی کے ساتھ میری ذاتی دوستی ہے اس لئے اس کیس کی سماعت میرے لئے مناسب نہیں۔بیگم عاصمہ جہانگیر بھی اس وقت کمرہ عدالت میں موجود تھیں جنہوں نے انسانی حقوق کے لئے جدو جہد پر میری حوصلہ افزائی کی۔اس کیس کے حوالے سے جب مافیا عملاً میری جان کے درپے ہوا تو لاہور بچاؤ تحریک کی سربراہ عمرانہ ٹوانہ، بیگم عاصمہ جہانگیر، رافع عالم ایڈووکیٹ اور دوسری این جی اوز کے عہدیداران عملاً میرے لئے ڈھال بن گئے اور میڈیا پر آواز اٹھانا شروع کر دی جس سے میرے کاز کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔جب یہ کیس لاہور ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس شیخ عظمت سعید کی عدالت میں منتقل ہوا تو عاصمہ جہانگیر نے یہ بے لاگ تبصرہ کر کے میری کامیابی کی نوید سنائی کہ اب آپ کو کسی وکیل کی معاونت کی بھی ضرورت نہیں ہے، جج صاحب انسانی حقوق کی جدو جہد کی پاسداری کریں گے۔یقیناً ایسا ہی ہوا۔بے شک اس کیس میں قانونی معاونت کیلئے بیرسٹر کامران شیخ، راجہ

عبدالرحمان اور اظہر صدیق ایڈووکیٹ نے بےلوث میرا ساتھ نبھایا اور کیس کے اخراجات بھی خود ہی اٹھاتے رہے جبکہ جسٹس شیخ عظمت سعید نے سلاٹر ہاؤس اور کیٹل مارکیٹ شاہ پور کانجراں میں منتقل کرنے کا حتمی حکم صادر کرنے کے بعد اپنے فیصلہ پر عملدرآمد بھی یقینی بنایا اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر بھی کیٹل مارکیٹ کے شہر کے اندر بشمول سبزہ زار سکیم میں مختلف سپاٹ بنانے کی مقامی انتظامیہ کی سازش ناکام بنادی۔ انسانی حقوق کی عملداری کے ایسے یادگار مواقع پر عاصمہ جہانگیر بےساختہ یاد آتی ہیں جو تکریم و تقدیس انسانیت کا استعارہ بن چکی ہیں۔

ع..... خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

KUTUBKHANA JALALI BOOKS JALALI

انڈہ پہلے یا مرغی

یہ تو انڈہ پہلے یا مرغی والا ہی سوال ہے۔ آپ پانی میں مدھانی ڈال کر اسے بلوتے جائیں، رات دن ایک کر دیں، بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک پہنچ جائیں۔ انڈہ پہلے یا مرغی کے سوال کا آپ کو تشفی بخش جواب نہیں مل پائے گا۔ آج اسی طرح سر پھٹول ہو رہی ہے۔ آئین نے پارلیمنٹ کو بالادست بنایا ہے یا سپریم کورٹ کو؟ محترم عدلیہ کے قائد نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ قانون ساز ادارہ ہونے کے ناطے پارلیمنٹ کو فوقیت حاصل ہے اور عدلیہ اس کے قانون سازی کے اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتی مگر اگلے ہی روز انہوں نے پارلیمنٹ کی برتری کے حوالے سے یہ کہہ کر انڈہ پہلے یا مرغی جیسا سوال پھر اٹھا دیا کہ پارلیمنٹ سپریم ہے مگر دستور اس کے اوپر ہے۔ ان کے اس استدلال پر یہ نئی بحث شروع ہو گئی ہے کہ دستور کو بنانے والی بھی تو پارلیمنٹ ہی ہے اس لئے دستور اس کے اوپر کیسے ہو سکتا ہے۔ شائد یہ اپنا بابا اوپر رکھنے والا معاملہ بن گیا ہے۔ اس بحث میں الجھے محترمین کو اپنا بابا اوپر رکھنے والا زبان زدِ عام لطیفہ تو بخوبی یاد ہو گا اس لئے مجھے اس لطیفے کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں، بس نام ہی کافی ہے، مگر بھلے لوگو، اس بیکار بحث سے حاصل کیا ہونا ہے اس لئے کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ شرمندگی والے فعل میں اپنا بابا اوپر رکھوانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ماضی میں پارلیمنٹ کے ساتھ کھلواڑ کیسے ہوتا رہا اور کس کس نے کس کے ہاتھوں کرایا، اس کا جائزہ لے کر بھی کیا سبق حاصل کرنے کا موقع نہیں بنا۔

حضور! ایسی مثالی صورتحال کو تو ہم ترس رہے ہیں کہ ریاستی آئینی اداروں کے جو اختیارات اور حدود و قیود آئین میں متعین کر دی گئی ہیں ان میں رہ کر ہی ادارے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہیں۔ اس سے آئین و قانون کی حکمرانی کا تصور بھی پختہ ہو گا اور جس نظام کو وفاقی پارلیمانی آئین کے تابع کیا گیا ہے اس کی طرف میلی نگاہ سے دیکھنے کی کسی کو جرأت بھی نہیں ہو گی۔ اگر آئینی حدود و قیود کی پاسداری ہوتی رہے تو سلطانیٔ جمہور میں جمہور کے مینڈیٹ سے مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے والے جمہوری سلطان کو کبھی مطلق العنان بننے کا موقع نہ ملے۔ آج ایک دوسرے کی جانب انگلی اٹھ رہی ہے تو یہ سلطانیٔ جمہور میں جمہور کا مردہ خراب کرنے کا ہی نتیجہ ہے، اس لئے جمہور کو کسی دوسرے آئینی ادارے کی جانب سے اپنے خراب مردے میں نئی روح پھونکے جانے کا شائبہ بھی

گزرتا ہے تو یہی جمہور خود کو "راج کرے گا خالصہ" کے سحر سے باہر نکالنے کے لئے اس آئینی ادارے کے لئے دعا گو ہو جاتی ہے جسے اس کے غربت، مہنگائی، روٹی روزگار اور صحت و تعلیم جیسے بنیادی مسائل حل کرنے کا آئینی مینڈیٹ ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔

منتخب ایوان کی عوامی مسائل کے حل میں دلچسپی کی ایک بڑی مثال میڈیا کے ذریعے آج ہی میرے سامنے آئی ہے۔ راندۂ درگاہ جمہور کو پنجاب اسمبلی کی گزشتہ روز کی کارروائی یا کارگزاری کی خبر پڑھ کر میری طرح ہی جھٹکا لگا ہوگا کہ جمہور کے مینڈیٹ سے جمہور کی نمائندگی کے لئے منتخب ہونے والے اس معزز و مقدس ایوان میں سرکاری و اپوزیشن بنچوں کے تمام ارکان نے یکسو ہو کر اپنے لئے تاحیات پاسپورٹ کی فراہمی کی قرارداد منظور کر لی مگر جب ادویات کے نرخ ہائے بالاکن کے آگے بند باندھنے کے لئے قانون سازی کا معاملہ درپیش ہوا تو اس پر اجلاس کی کارروائی جھٹ پٹ مؤخر کر کے متعلقہ بل کی منظوری کی نوبت ہی نہ آنے دی گئی، اگر جمہور کے منتخب ایوان میں موجود ان کے نمائندگان جمہور کے ودیعت کردہ اپنے اختیار کی بدولت "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے" کی مثال بنے نظر آئیں گے تو راندۂ درگاہ جمہور کو انڈہ پہلے یا مرغی کی بیکار بحث میں خود کو الجھانے کی بھی کیوں ضرورت محسوس ہوگی، وہ اسی منتخب کردہ پارلیمان کے کرموں کا "پھل" کھاتے اتنی اوتاؤلی ہو گئی ہے کہ آب حیات کا جھا کا دے کر پیش کئے جانے والے زہر کو بھی تریاق سمجھ کر پی جانے کے لئے آمادہ و تیار بیٹھی ہے۔ جمہور کو جہاں سے بھی اپنے گوناں مسائل کے بوجھ سے نکلنے کا کوئی چارہ نظر آئے گا اس کے پپڑیوں جمے مایوس چہرے کا رخ اسی ناخدا کی طرف ہو جائے گا۔ بھئی جمہور کے لئے ایسے پیدا کردہ حالات میں آپ کس اصول، نظریئے اور فلسفے کی بات کرتے ہیں......

مفلسی حسنِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک اطوار کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتی

آپ پارلیمنٹ کے تقدس اور اس کی فوقیت کی بات کرتے ہیں۔ اس کے لئے قیام پاکستان سے اب تک کے واقعات کا جائزہ لے لیجئے۔ منتخب پارلیمنٹ پر شب خون مارنے کی سہولت طالع آزما جرنیلوں کو سب سے پہلے ہمیشہ مفاد پرست سیاستدانوں نے فراہم کی ہے۔ عدلیہ کی آزمائش تو اس شب خونی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس حوالے سے عدلیہ کو مطعون کرنے والے ریاکاروں کو اپنی عدالتی سیاسی تاریخ کی کتاب ہاتھ میں رکھنی چاہئے کہ تاریخ کی اسی کتاب میں ملک کی پہلی

پارلیمنٹ کو گھر بھجوانے والی گورنر جنرل غلام محمد کی شب خونی کو مغربی پاکستان ہائیکورٹ کی جانب سے باطل قرار دینے کا روشن مثال بنا فیصلہ موجود ہے جو اس وقت کی اسمبلی کے سپیکر ناظم الدین کی دائر کردہ آئینی درخواست پر صادر کیا گیا تھا سپریم کورٹ کے جسٹس محمد منیر نے اس فیصلہ کے خلاف وفاق پاکستان کی دائر کردہ درخواست منظور کرتے ہوئے نظریہ ضرورت کو لاگو کر کے غلام محمد کی شب خون کو آئینی کور فراہم کیا تھا اور یقیناً مفاد پرست سیاستدانوں کی اس شب خونی کے لئے مداح سرائی کو بھانپ کر ہی جسٹس منیر نے نظریہ ضرورت کا سہارا لیا تھا۔

آمروں کو آئینی تحفظ فراہم کرنے کے سلسلہ میں جس عدلیہ کو رگیدا جاتا ہے، اسی عدلیہ نے 1993ء میں صوابدیدی آئینی اختیارات کے تحت گھر بھجوائی گئی 90ء کی اسمبلی اور میاں نواز شریف کی حکومت کو بحال کیا۔ اس وقت شاید یہ سیاسی فلسفہ لاگو ہوا ہوگا کہ سپریم کورٹ کے دس ججوں نے عوام کی عدالت کے فیصلہ کی لاج رکھ لی ہے مگر سپریم کورٹ کی طرف سے رکھی گئی اس لاج کو عوامی مینڈیٹ والوں نے بھلا کتنا سنبھالے رکھا؟ صرف ایک مہینے بعد سپریم کورٹ سے بحال ہونے والے وزیراعظم صاحب نے سپریم کورٹ کی اسی بحال کردہ اسمبلی کو توڑنے کی ایڈوائس اپنے دستخطوں کے ساتھ اسی صدر مملکت کو بھجوا دی جس کے صوابدیدی اختیار کے تحت اس کے ہاتھوں اسمبلی کا ٹوٹنا انہیں گوارا نہیں ہوا تھا۔ اور پھر ''ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہئے''۔ صدر کو اسمبلی توڑنے کا صوابدیدی اختیار بھی تو اسی پارلیمنٹ نے دیا تھا جس کے فورم پر اس کی آئینی فوقیت تسلیم کرانے کیلئے اسی فورم میں بحث کرانے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ آپ تو خود آئین و قانون وضع کرنے والی اس برتر پارلیمنٹ کو اس کے بنائے ہوئے آئین کے تحت ہی توڑنے کا اختیار اس شخص کو سونپ رہے ہیں جس کا براہ راست اس پارلیمنٹ کے معاملات سے کوئی سروکار بھی نہیں ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اس نے سال میں ایک بار اس فورم پر آ کر رسمی خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اگر صدر کے اس صوابدیدی اختیار پر پہلی زد لگائی تو اسی عدلیہ نے جس کے پانچ فاضل ججوں نے آپ کی دانست میں آپ کے حاصل کردہ عوامی مینڈیٹ کی توہین کی ہے۔ آپ کو تو آئینی ترمیم کے ذریعے اس صوابدیدی اختیار سے خلاصی پانے کا راستہ بھی اسی سپریم کورٹ نے آپ کی حکومت اور اسمبلی بحال کر کے دکھایا تھا۔ آج آپ اسی سپریم کورٹ کے حوالے سے قوم کو ''پہلے انڈہ یا مرغی'' کی بیکار بحث میں الجھا رہے ہیں تو جناب بھر پائیے۔ پاکیٔ داماں کی حکایت بڑھانے سے آپ سے ''ذرا بند قبا دیکھ'' کا تقاضہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر رہے نام اللہ کا!

بھٹو لیگیسی اور زرداری قیادت

بھٹو مرحوم کی برسی پر گڑھی خدا بخش میں ہر سال کسی پیر کامل کے عرس کی طرح میلے کا سماں بندھتا ہے۔ میں اپنے بچپن میں اپنے شہر پاکپتن میں برصغیر کے پہلے پنجابی صوفی شاعر اور کشف و کرامات والے بزرگ بابا فرید گنج شکر کے عرس کے موقع پر لگائے جانے والے میلوں ٹھیلوں اور محافل سماع میں پورے ذوق شوق سے شریک ہوتا رہا ہوں۔ شہر فرید درحقیقت بزرگوں کا شہر ہے جہاں صحابیؓ رسولؐ عزیز مکی اور تحریک پاکستان کے سرگرم لیڈر چن پیر سمیت کئی بزرگانِ دین مدفون ہیں اور سب کے عرس ذوق شوق سے منائے جاتے ہیں۔ اسی طرح لاہور میں حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش اور دوسرے مدفون بزرگان دین کے عرس کی تقریبات میں بھی دلی لگن کے ساتھ شریک ہوتا رہا ہوں۔ یہ مواقع ایک طرح سے روحانی تسکین کے مراحل سے گزار کر وجدان کے دروازے کھولنے کا باعث بنتے ہیں۔ اولیائے کرام نے اپنی زندگیاں خود کو قرآن وسنت کے قالب میں ڈھال کر گزار دیں اور اپنی ذات کو اسوۂ حسنہ کا عملی نمونہ بنایا اس لئے وہ بعد از زندگی بھی خلق خدا سے محبُوبیت سمیٹ رہے ہیں اور ان کی درگاہوں پر حاضری دے کر غم روزگار اور دُنیاوی جھمیلوں سے وقتی طور پر بے نیاز ہو جاتے ہیں جبکہ بزرگان دین کی درگاہوں پر ہمہ وقت جاری لنگر خلق خدا کا عرصہ حیات تنگ کرنے والے حکمرانوں کے مقابل خلقِ خدا کی بھوک مٹانے کا نادر وسیلہ بن چکا ہے جوان بزرگان دین کی خلق خدا میں محبُوبیت کی نشانی ہے۔ سندھ کی دھرتی بھی کامل بزرگوں، ولیوں کی دھرتی ہے جہاں سے شاہ لطیف بھٹائی کی سوز و گداز سے مزین شاعری کی پھوٹنے والی کرنیں چار دانگ عالم کو منور رکھتی ہیں اور خلق خدا کو روحانی بالیدگی کی منازل طے کراتی ہیں۔

بھٹو خاندان کا کوئی فرد کشف و کرامات والے مراحل سے تو شائد نہیں گزرا ہو گا مگر اس

خاندان کے گڑھی خدا بخش والے آبائی قبرستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے دفن ہونے کے بعد یہاں کا منظر اور نقشہ ہی بدل گیا ہے اور اب ہر چار اپریل کو گڑھی خدا بخش میں فی الواقع بزرگانِ دین کے عرس والا منظر ہی بنا نظر آتا ہے کہ ملک بھر سے بھٹو کے جیالے اور جیالیاں سفر کی صعوبتوں اور زندگی کی کٹھنائیوں سے گزر کر 4 اپریل کو گڑھی خدا بخش میں ڈیرے لگاتی ہیں۔ 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کی پھانسی کی سزا پر عملدرآمد کے بعد 9 سال تک تو بھٹو کی برسی جنرل ضیاء کے مارشل لاء کی سختیوں میں سنگینوں کے سائے میں منائی جاتی رہی مگر ان سختیوں اور جیالوں اور جیالیوں پر ڈھائے جانے والے مارشل لائی ستم و جبر نے بھٹوازم کے ساتھ ان کے جذبات کو پیوستہ کر دیا۔ چنانچہ جبر کا کوئی بھی ہتھکنڈہ ان کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکا اور بھٹو کی برسی پر کسی پیر کامل کے عرس کا گمان بڑھتا ہی گیا۔ اب تو اس قبرستان میں بھٹو خاندان کی تین اور قبریں بھی الگ الگ حوالے سے اپنی شناخت پیدا کر چکی ہیں جن میں بھٹو کے بڑے بیٹے میر مرتضیٰ بھٹو اور اس کے بعد محترمہ بینظیر بھٹو اور ان کی والدہ بیگم نصرت بھٹو کی قبریں ہیں جو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہی ہیں۔

مجھے گڑھی خدا بخش میں ستمبر 1997ء کو میر مرتضیٰ بھٹو کی پہلی برسی کے موقع پر جانے کا موقع ملا جس کا اہتمام میر مرتضیٰ کی بیوہ غنویٰ بھٹو نے پیپلز پارٹی کے مقابل اپنی سیاست کی رونمائی کے لئے بھی بطور خاص کیا تھا۔ لاہور سے ڈاکٹر مبشر حسن اور فرخ سہیل گوئندی مجھے اور حامد میر کو گڑھی خدا بخش لے کر گئے جہاں لاڑکانہ کے ایک ہوٹل میں ہمارا قیام تھا چنانچہ برسی کی تقریب سے پہلے غنویٰ بھٹو اور فاطمہ بھٹو کی مہربانی سے بھٹو کی قیام گاہ المرتضیٰ کے ایک ایک حصّے اور وہاں موجود نوادرات سمیت تمام اشیاء اور بھٹو مرحوم کے علاوہ ان کے بچوں کی خواب گاہوں تک ہماری رسائی ہوگئی۔ مرتضیٰ بھٹو اپنی ہی بہن کی حکومت میں جس بے دردی کے ساتھ قتل ہوئے اس کے باعث پیپلز پارٹی کے جیالوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے غصّے نے مرتضیٰ کی پہلی برسی کو بھٹو مرحوم کی برسی جیسے اجتماع میں بدل دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے المرتضیٰ والے بھٹو کے قلعہ میں نقب لگ گئی ہے۔ بیشک غنویٰ بھٹو بعد میں متحرک نہ رہ سکیں اور ان کی شہید بھٹو پارٹی کے لوگ بھی تتر بتر ہو گئے مگر میں سمجھتا ہوں کہ بھٹوازم کو میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل سے بھٹو کی پارٹی کے اندر سے جو تیر لگے تھے وہی اس پارٹی کو بھٹوازم سے کھسکانے کے لئے کارگر ثابت ہوئے ہیں۔

بھٹو کے مقدمہ قتل پر بات شروع ہو تو بہت طویل ہو جاتی ہے کیونکہ میں نے اس قتل کیس کی

بطور صحافی کوریج کی ہوئی ہے اور اس کیس کی تیاری کے کئی مراحل کا عینی شاہد بھی ہوں اور اس بنیاد پر ہی اس کیس کو انصاف کا نہیں، بھٹو سے بوجوہ دشمنی پالنے والوں کی ذاتی اناؤں کی تسکین اور ان کے ذاتی مفادات کی تکمیل کا کیس سمجھتا ہوں۔ جنرل ضیاء نے یہ سوچ کر کہ بھٹو زندہ رہے تو وہ پھر اقتدار میں آئیں گے اور انہیں قبر میں اُتروا دیں گے، نواب محمد احمد خاں قتل کیس کے ذریعے بھٹو کو قبر میں اُتروانے کا اہتمام کیا تھا اس لئے انصاف نام کی عملداری کا اس کیس میں کوئی وجود نہیں تھا۔ اِس کیس میں بے انصافی کی بنیاد تو اس کی سماعت کے لئے ہائیکورٹ کو ٹرائل کورٹ بنا کر رکھی گئی تھی کیونکہ اس سے بھٹو کے لئے ہائیکورٹ میں اپیل کا ایک قانونی حق ختم کیا گیا تھا جبکہ ٹرائل کورٹ کے سربراہ بھٹو سے ذاتی مخاصمت رکھنے والے قائم مقام چیف جسٹس مولوی مشتاق بنائے گئے اور استغاثہ کی ٹیم کی سربراہی ایم انور بارایٹ لاء کو سونپی گئی جو اس وقت پی این اے کی تحریک میں بھٹو کو کوہالہ پل پر لٹکانے کا اعلان کرنے والے ائر مارشل اصغر خان کے قریبی ساتھی اور ان کی پارٹی تحریک استقلال میں شامل تھے۔ چنانچہ انہوں نے کیس کے فائل ورک کے بعد بلند بانگ دعویٰ کیا کہ اب اس کیس میں بھٹو کو خدا تعالیٰ بھی پھانسی سے نہیں بچا پائیں گے، یہ الگ بات کہ اپنے اس دعوے کے ایک ماہ بعد وہ خود اس جہان فانی سے گزر گئے مگر ان کی جانب سے بے انصافی کی بنیاد پر تیار کئے گئے کیس کا وہی نتیجہ نکلنا تھا جس کا انہوں نے دعویٰ کیا اور جو ذوالفقار علی بھٹو نے بالآخر پھانسی کے پھندے پر لٹک کر بھگت لیا۔ مگر ضیاء الحق سے رحم کی اپیل کی تجویز حقارت سے ٹھکراتے ہوئے انہوں نے جو فقرہ ادا کیا وہ ان کی کامل شخصیت کا حصّہ بن چکا ہے۔ رحم کی اپیل کا یہ مسودہ ان تک بیگم نصرت بھٹو کے ذریعے پہنچایا گیا جسے دیکھ کر انہوں نے کہا کہ میں ایک آمر سے زندگی کی بھیک مانگنے کے بجائے اس کی پھانسی قبول کر کے تاریخ میں امر ہونا پسند کروں گا۔ اب ہر چار اپریل بھٹو کی برسی کے موقع پر گڑھی خدا بخش میں جمع ہونے والا انسانی ہجوم ان کے اس قول کو حقیقت کے قالب میں ڈھالتا نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً پیر کامل نہیں ہوں گے۔ شائد کشف و کرامات والے مراحل سے بھی نہیں گزرے ہوں گے مگر انہوں نے خلق خدا میں موجود محروم طبقات کے دلوں میں روحانی بالیدگی کی جوت ضرور جگائی ہے جو ان کی ہر برسی کو کسی پیر کامل کے عرس کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔ اگرچہ پیپلز پارٹی کی زرداری قیادت کے ہاتھوں بھٹو ازم کو لگنے والا تیر کارگر ثابت ہو چکا ہے اور اس پارٹی میں روائتی جیالا پن فرزند بے نظیر بلاول بھٹو

کی جانب سے پارٹی کو متحرک کرنے کی کاوشوں کے باوجود کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا مگر بھٹو کی قبر کسی پیر کامل کے مزار کی طرح لوگوں کی عقیدت کے پھولوں سے ضرور معطر رہتی ہے۔ زرداری قیادت نہ جانے کس حکمت عملی کے تحت بھٹو کی برسی پر بیلٹ بکس کے ذریعے جمہور کو طاقت منتقل کرنے کے خواب دکھا رہی ہے اور ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات بلاول نہ جانے کس کے ایجنڈے پر بغاوت کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں مگر اپنے عقیدت مندوں کی روحانی تسکین کا جو اہتمام بھٹو نے تاریخ میں امر ہو کر کیا ہے وہ بھٹو لیگیسی کو شائد کبھی مرنے نہیں دے گا۔

''بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور''

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

سینئر کالم نگاروں اور ناشرانِ کتاب کی آراء

سعید آسی سو فیصد دیانتدار صحافی ہیں جنہوں نے متانت اور وقار کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور مجید نظامی کی مسند پر بیٹھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ ہم اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں سعید آسی بھی شامل ہے۔ سعید آسی نے اپنے کالموں میں ہمیشہ یہ پیغام دیا کہ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ (مجیب الرحمٰن شامی)

سعید آسی سے میری دیرینہ رفاقت ہے۔ ہم دونوں ایک طویل عرصہ تک نوائے وقت سے وابستہ رہے۔ وہ میری ہی طرح ایک شریف آدمی ہے اور میری ہی طرح صف اول کا شاعر ہے۔ ہمارے ہاں کچھ کالم کالم ہوتے ہیں اور ایک آدھ کالم کے پردے میں ''کٹا کٹی'' یعنی گالم گلوچ کر رہا ہوتا ہے مگر سعید آسی کالم لکھتا ہے جس سے اتفاق بھی کیا جاتا ہے اور اختلاف بھی۔ اس کا تعلق میڈیا کی لفافہ کلاس سے نہیں ہے۔ اس کی اپنی کلاس ہے اور یوں سعید آسی اپنی ''کیتی کرائی'' کا خود ذمہ دار ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

سعید آسی کا میدانِ ادب و صحافت کے شہسواروں میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے 70ء کی دہائی میں اپنے قلمی سفر کا آغاز کیا اور آج 2021ء میں بھی ان کا قلم علم و ادب کی روشنی بکھیر رہا ہے۔ وہ ملک کی ترقی و استحکام اور عوام کی خوشحالی کی مثبت سوچ کے ساتھ تحریری اور نشری تبصرے کرتے ہیں اور گزشتہ پندرہ برس سے نوائے وقت کے لیڈر رائٹر کی حیثیت سے حکمران اشرافیہ طبقات کو راہ عمل دکھا رہے ہیں اور مجبور و محکوم عوام کو سلطانئ جمہور کے ثمرات سے فیضیاب ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ (علامہ عبدالستار عاصم، محمد فاروق چوہان)

9789697470558

Rs: 1500/-

QALAM FOUNDATION INTERNATIONAL

JALALI BOOKS